اور تلوار ٹوٹ گئی
نسیم حجازی

اور تلوار ٹوٹ گئی

نسیم حجازی

جہانگیر بک ڈپو

لاہور ۰ راولپنڈی ۰ ملتان ۰ حیدرآباد ۰ کراچی

محمد بہادر خان

نواب بہادر یار جنگ مرحوم

کے نام

پیش لفظ

"معظم علی" اور "اس کے بعد" ـــــ اور "تلوار ٹوٹ گئی" لکھتے وقت میرے دل و دماغ پر یہ احساس ہمیشہ غالب رہا کہ سلطان شہیدؒ کی شخصیت کو کسی ناول کا موضوع بنانا ایک بہت بڑی جسارت تھی۔

ابتداً میں ایک ایسے اولوالعزم مجاہد کے کردار سے متاثر ہوا تھا جس نے ہندی مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی تھی لیکن سلطنت خداداد کی تاریخ کے اوراق الٹتے وقت میں یہ محسوس کرتا تھا کہ سلطان فتح علی خان ٹیپوؒ کی زندگی کے کئی اور حسین پہلو ابھی تک میری نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ شیرِ میسور کی فتوحات صرف جنگ کے میدانوں تک محدود نہ تھیں بلکہ وہ بیک وقت ایک ایسا حکمران، عالم، مفکر اور مصلح تھا جس کے دل و دماغ کی وسعتوں میں اسلامیانِ ہند کے ماضی کی عظمتیں، حال کے ولولے اور مستقبل کی آرزوئیں سما گئی تھیں۔ وہ ہمیں زندگی کی ہر دوڑ میں اپنے وقت سے کئی منزلیں آگے دکھائی دیتا ہے۔ اس نے ایک ایسے دور میں فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کیا تھا جب کہ باقی ہندوستان کے نواب اور راجے اپنی رعایا کی ہڈیوں پر عشرت کدے تعمیر کر رہے تھے۔ اس نے اس زمانے میں بین الاسلامی اتحاد کے لیے جدّ و جہد کی تھی، جب کہ عالمِ اسلام اپنے نااہل حکمرانوں کی تنگ نظری، کمزوری، بے حسی اور باہمی رقابتوں

کے باعث مغرب کے سامراجی بھیڑیوں کے لیے ایک عظیم شکارگاہ بن چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کے ایک ایسے پسماندہ علاقے میں اسلامی عدل و مساوات کے جھنڈے گاڑے تھے جہاں صدیوں سے جہالت اور افلاس کی تاریکیاں مسلط تھیں۔ حیدر علی اور سلطان ٹیپو سے قبل میسور کے عوام کی کوئی تاریخ نہ تھی لیکن ان کی حکمرانی کے چند برس پورے ہندوستان کی تاریخ پر چھائے ہوئے ہیں۔

جب ہندوستان کے عوام اپنے حال اور مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے تو میسور میں حوصلوں اور ولولوں کی ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔ جب مشرقی ہندوستان کے قلعوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے جھنڈے نصب ہو رہے تھے، تو سلطنت خداداد کے یہ معمار سرنگاپٹم، منگلور اور چیتل ڈرگ میں قوم کی آزادی کے نئے حصار تعمیر کر رہے تھے۔

حیدر علی کے عہد حکومت کے آخری ایام میں میسور کی ریاست ایک عظیم سلطنت بن چکی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ طاقتیں جو جنوبی ہندوستان میں ایک اسلامی سلطنت کے قیام کو اپنے لیے ایک مستقل خطرہ سمجھتی تھیں اس کے خلاف متحد اور منظم ہو چکی تھیں — انگریز میسور کو دلّی کے راستے کی آخری دیوار سمجھتے تھے۔ میر نظام علی نہ صرف اہل میسور بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کو اپنی ذلیل سودا بازیوں کا مسئلہ سمجھتا تھا۔ اور مرہٹے سلطنت مغلیہ کے کھنڈروں پر برہمنی استبداد کی عمارت کھڑی کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ شیر میسور نے اس وقت سلطنت خداداد کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لی، جب بھیڑیوں، گیدڑوں اور گدھوں کے لشکر اس کے کچھار کا محاصرہ کر رہے تھے اور وہ اس وقت تک ان کے سامنے سینہ سپر رہا جب تک کہ اس کی رگوں کا سارا خون میسور کی خاک میں جذب نہیں ہو چکا تھا۔

اس ناول کے بیشتر کردار وہ مجاہد ہیں جو ایک عظیم فوجی رہنما کے جلو میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میسور کی جنگیں اس داستان کا اہم ترین حصہ بن گئی ہیں۔ ان

طویل اور صبر آزما جنگوں کا معمولی جائزہ ہمیں یہ اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ انگریزوں نے باقی ہندوستان پر تسلط جمانے کے لیے جو جنگیں لڑی تھیں وہ اپنی شدت اور وسعت کے اعتبار سے میسور کے معرکوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ ہندوستان کی پوری تاریخ میسور کے مجاہدوں کے صبر و استقلال اور ایثار و خلوص کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ ایک فوج حملہ کرتی ہے اور دوسری اس کے مقابلے کے لیے نکلتی ہے۔ پھر مختلف محاذوں پر اکا دکا جھڑپوں کے بعد کسی میدان میں فیصلہ کن معرکہ ہوتا ہے اور جو فریق شکست کھا جاتا ہے وہ برسوں تک اپنے طاقتور حریف کے سامنے سر اٹھانے کا نام نہیں لیتا۔

از منہ قدیم میں آرین وسط ایشیا سے نکلتے ہیں اور چند لڑائیوں کے بعد ہندوستان کی قدیم اقوام کو مغلوب کر لیتے ہیں۔ سکندر اعظم یونان سے نکلتا ہے۔ دریائے جہلم کے کنارے راجہ پورس کو شکست دیتا ہے اور اس کے بعد یونان کے لشکر کو اپنے سامنے پانچ دریاؤں کی سرزمین خالی نظر آتی ہے۔ محمد بن قاسم، ایک سترہ سالہ نوجوان کے ساتھ آنے والے مٹھی بھر مجاہدین دیبل اور برہمن آباد کے میدانوں میں راجہ داہر کو شکست دینے کے بعد ہمیشہ کے لیے سندھ سے برہمنی اقتدار کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ محمود غزنوی اپنے ابتدائی چند حملوں میں پورے شمالی ہندوستان سے راجپوتوں کا اقتدار ختم کر دیتا ہے اور اس کے بعد قنوج اور سومنات میں عبرتناک شکستیں کھانے والے راجوں کو صدیوں تک مسلمانوں کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ پھر بابر مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور اس ملک کی تاریخ کا رخ بدل دیتا ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مرہٹے "ہر ہر مہادیو" کے نعرے لگاتے ہوئے اٹک تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ ایک بار پٹنے کے بعد وہ دوبارہ شمالی ہندوستان کی طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کرتے۔

پھر ایسٹ انڈیا کمپنی پلاسی اور بکسر کی نمائشی جنگوں کے بعد کلکتہ سے لے کر لکھنؤ تک اپنی فتوحات کے جھنڈے نصب کر دیتی ہے ـــــ لیکن میسور میں سلطان ٹیپو کی تلوار کے سامنے انگریزی جارحیت کا سیلاب رک جاتا ہے اور مسلسل سولہ برس تک ایسٹ انڈیا کمپنی جنوب سے دلی کی طرف کوچ کرنے کا خواب نہیں دیکھ سکتی۔

میسور کی دفاعی قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میسور کے بعد جب مرہٹوں کی باری آئی تو سندھیا، بھونسلے اور ہلکر جن کی افواج کی مجموعی تعداد میسور سے کہیں زیادہ تھی، چند ماہ سے زیادہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ۱۸۰۳ء میں سندھیا اور بھونسلہ کو پے در پے شکستیں دینے کے بعد کمپنی کے دستے دہلی میں داخل ہو چکے تھے اور شاہ عالم مرہٹوں کی بجائے کمپنی کی سرپرستی قبول کر چکا تھا۔ ۱۸۰۴ء میں فرخ آباد کے مقام پر ہلکر بھی شکست کھا چکا تھا۔ چند سال بعد مرہٹوں نے فرنگی جارحیت سے نجات حاصل کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ لیکن انگریزوں کی سنگینوں کے سامنے ان کے لاکھوں سپاہی بھیڑوں کے ریوڑ ثابت ہوئے۔ اس کے بعد سارا ہندوستان انگریزوں کے رحم و کرم پر تھا۔

یہاں پر ہمیں ایک اور حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سلطان شہیدؒ کے وہ پیش رو جنھوں نے اپنی نوکِ شمشیر سے ہندوستان کی تاریخ کو زریں عنوان عطا کیے تھے اپنے زمانے کے عظیم جرنیل ہی نہ تھے بلکہ اُن زندہ اور متحرک اقوام کے جذبہ تسخیر کی نمود تھے، جن کے ماضی کی تاریخ شکست، پسپائی، مایوسی اور ناکامی کے الفاظ سے ناآشنا تھی۔ محمد بن قاسم اس قوم کی غیرت کا مظہر تھا، جس کے مجاہد مشرق میں چین اور مغرب میں اندلس کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ محمود غزنوی کی سلطنت وسطِ ایشیا سے لے کر خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ احمد شاہ ابدالی بھی ایک عظیم سلطنت کا مالک تھا اور اس کے جھنڈے تلے افغانوں، مغلوں، روہیلوں اور بلوچوں کا بہترین عنصر جمع ہو گیا تھا لیکن سلطان ٹیپو نے جن لوگوں کو آزادی کی تڑپ عطا کی تھی، ان کا ماضی صرف پس ماندگی، غربت اور جہالت کے تذکروں تک محدود تھا۔ میسور کی بیشتر آبادی غیر مسلم تھی۔ ہندو سماج میں ان فرومایہ لوگوں کو اُن بہادر راجپوتوں یا جنگجو مرہٹوں کی برابری کا دعویٰ نہ تھا۔ جو اپنے اسلاف کے کسی کارنامے پر فخر کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کے دوش بدوش کھڑا کر کے کئی برس انگریزوں، مرہٹوں اور حیدر آباد کی سلطنت کا مقابلہ کرنا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ آخر وہ کون سے حالات تھے جنھوں نے ان لوگوں کے دل و دماغ میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا؟

اس اہم سوال کا جواب تلاش کرتے وقت سلطان شہید کی سیرت و کردار کے کئی اور حسین پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں اور ایک ضخیم ناول لکھنے کے بعد بھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ سلطان شہیدؒ کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے ایک ناول نگار سے زیادہ جب مؤرخ اور سیرت نگار اپنی متاعِ گم گشتہ کی تلاش میں نکلیں گے تو سرنگا پٹم ان کے راستے کی ایک اہم ترین منزل ہو گی۔

میسور کی جنگِ آزادی صرف ایک اولوالعزم حکمران کی جنگ نہ تھی بلکہ صدیوں کے ان پسماندہ، مظلوم اور بے بس انسانوں کے ذوقِ نمود کا مظاہرہ تھا جنھیں سلطان شہیدؒ نے جہالت اور افلاس کی دلدل سے نکال کر تہذیب و اخلاق کی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ یہ داستان ان سرفروشوں کی ہمت، شجاعت اور ایثار کی داستان ہے، جنھیں ایک صحیح الخیال مسلمان حکمران نے زندگی کے آداب سکھائے تھے۔ لیکن کاش یہ رُوح پرور اور ولولہ انگیز داستان ان عریبں قسمت آزماؤں کے تذکرے سے خالی ہوتی جن کی ابن الوقتی، ملت فروشی اور غداری کے باعث سرنگا پٹم کے شہیدوں کی بے مثال قربانیاں ایک بدنصیب قوم کی تقدیر نہ بدل سکیں۔ کاش ہمیں اپنے ماضی کی تاریخ کے

روشن ترین صفحات میں میر صادق، قمرالدین، پورنیا، میر نظام علی اور میر عالم جیسے لوگوں کے نام دکھائی نہ دیتے!

میں یہ داستان اس ملّت کے جوانوں کو پیش کر رہا ہوں جس کی سطوت کے پرچم سلطان ٹیپو کی شہادت کے دن سرنگوں ہو گئے تھے اور جسے قدرت نے ایک طویل غلامی کے بعد پاکستان کو اپنا حصار بنانے کا موقع دیا ہے۔ آج ڈیڑھ سو سال بعد سلطان شہیدؒ کی رُوح سرنگاپٹم کے کھنڈروں کی طرف اشارہ کر کے ہمیں یہ پیغام دے رہی ہے کہ جو قوم اپنی صفوں میں کسی میر صادق کو جگہ دیتی ہے اس کا کوئی قلعہ محفوظ نہیں ہوتا۔ جس جہاز کا کوئی مسافر اس کے پیندے میں سوراخ کر رہا ہو اُسے دنیا کے بہترین ملّاح بھی ڈوبنے سے نہیں بچا سکتے۔ ملّت کے عظیم ترین راہنماؤں کے خون پسینے اور آنسوؤں سے صرف اس خاک پر آزادی کے نخلستان سیراب ہوتے ہیں، جو غدّاروں کے وجود سے پاک ہو۔

نسیم حجازی

راولپنڈی

۶ مارچ ۱۹۵۴ء

آں شہیدانِ محبت را امام
آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر
خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر
از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین
فقرِ سلطاں وارثِ جذبِ حسینؑ

—— اقبالؒ ——

پہلا باب

مُعاہدہ منگلور کی رُو سے میسور اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی دوسری جنگ کا خاتمہ فوجی اور سیاسی لحاظ سے سُلطان ٹیپو کی ایک بہت بڑی فتح تھی. انگریزوں نے میر نظام علی اور مرہٹوں کی اعانت کے بھروسے پر جنگ شروع کی تھی اور ابتدا میں ان کی کامیابیاں حوصلہ افزا تھیں. تاہم نظام اور مرہٹے جنگ کے نتائج کے متعلق پورا اطمینان حاصل کیے بغیر میدان میں کودنے کے لیے تیار نہ تھے. بدنور کی فتح کے بعد انگریزوں کو یہ امید ہو گئی تھی کہ اب ان کے مذبذب حلیف مالِ غنیمت میں حصّہ دار بننے کے لیے میسور پر اچانک یلغار کر دیں گے لیکن جنگ کے دُوسرے دَور میں میسور کا زخمی شیر اپنے فولادی پنجے انگریزوں کے سینے میں گاڑ چکا تھا اور وُہ گِدھ جنھیں گھِرے ہوئے شکار پر جھپٹنے کی دعوت دی جا رہی تھی اپنے اپنے نشیمن سے ایک بدلی ہُوئی صورتِ حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

انگریزوں نے اس وقت صُلح کا جھنڈا بلند کیا تھا جب منگلور میں ان کے محصور لشکر کو کسی فوری اعانت کی اُمید نہ تھی. سلطان کے توپ خانے کی بے پناہ گولہ باری کے باعث قلعے کی دیواریں ایک ایک کر کے منہدم ہو رہی تھیں. رسد اور بارُود کے ذخیرے ختم ہو چکے تھے. انگریز قلعے کے باہر

نگاہ دوڑاتے تو انھیں آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل نظر آتے۔ وہ قلعے کے اندر دیکھتے تو انھیں زخموں، وبائی امراض اور بھوک سے دم توڑتے ہوئے ساتھیوں کی قابلِ رحم صورتیں دکھائی دیتیں۔ منگلور کی طرح وہ دوسرے محاذوں پر بھی بُری طرح مار کھا رہے تھے۔ کڈلور میں ان کی بہترین فوج فرانسیسی لشکر کے ہاتھوں مکمل تباہی کا سامنا کر رہی تھی۔

جنوبی ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جارحانہ عزائم کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملانے کا یہ بہترین موقع تھا لیکن اچانک یورپ سے یہ خبر پہنچی کہ برطانیہ اور فرانس کے درمیان صلح ہو گئی ہے اور وہ ہندوستان میں بھی لڑائی بند کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ فرانسیسی سپہ سالار نے یہ خبر سنتے ہی انگریزوں کے ساتھ جنگ بند کر دی۔

فرانس کے تعاون سے محروم ہو جانے کے باوجود سلطان ٹیپو کے پاس اتنی طاقت تھی کہ وہ انگریزوں پر ایک فیصلہ کن ضرب لگا سکتا تھا لیکن جنگ جاری رکھنے کی صورت میں سلطان کو ایک طرف نظام اور مرہٹوں کے حملے کا اندیشہ تھا اور دوسری طرف اس کے لیے ان باجگزار راجوں اور پالیگاروں کی سرگرمیاں ایک خطرۂ عظیم بن چکی تھیں جنھوں نے انگریزوں، مرہٹوں اور میر نظام علی کی شہ پر بغاوت کے جھنڈے بلند کر دیے تھے۔

اس کے علاوہ سلطان ٹیپو محض ایک اولوالعزم سپاہی ہی نہ تھا بلکہ ایک ان تھک معمار بھی تھا۔ رعایا کی فلاح و ترقی کے ساتھ اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جنگ کے میدان میں بھی دریاؤں پر بند باندھنے، نہریں کھودنے، بنجر زمینیں آباد کرنے، سڑکیں تعمیر کرنے اور صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے علاوہ عوام کی تعلیمی اور معاشرتی حالت سدھارنے کے عظیم منصوبے تیار کیا کرتا تھا۔ میسور کے عوام کی ترقی و خوش حالی کے متعلق اپنے سپنوں کی تعبیر کے لیے اسے امن کی ضرورت تھی لیکن اس کے دشمن یہ سمجھ چکے تھے کہ سلطان ٹیپو ان کے راستے کا آخری پتھر ہے اور اگر اسے امن کے چند سال مل گئے تو سلطنتِ خداداد ہندوستان کی عظیم ترین طاقت بن جائے گی۔ چنانچہ صلح نامۂ منگلور کے بعد انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کی یہ کوشش تھی کہ سلطان

کو کسی نہ کسی محاذ پر مصروف رکھا جائے۔

○

جنگ سے فارغ ہوتے ہی سلطان کو سب سے پہلے نرگنڈ اور کورگ کی طرف توجہ دینی پڑی۔ یہ ریاستیں میسور کی باجگزار تھیں، لیکن گزشتہ جنگ سے فائدہ اٹھا کر وہاں کے رئیس سلطان کے خلاف بغاوت کر چکے تھے۔ سلطان نے مصالحت کے لیے نرگنڈ کے برہمن راجہ ونکٹ راؤ کے پاس ایلچی بھیجا لیکن وہ مرہٹوں کی شہ پا کر مصالحت کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ سلطان نے مرہٹوں کو میسور کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے باز رکھنے کے لیے ایک سفارت پونا روانہ کی لیکن نانا فرنویس ایک مدت سے میسور کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف تھا اور پیشوا کے علاوہ قریباً تمام مرہٹہ راجے اس کے قبضے میں تھے۔ اس لیے سلطان کی مصالحانہ کوششیں کامیاب نہ ہوئیں۔

سلطان نے مجبوراً برہان الدین کی قیادت میں ایک لشکر نرگنڈ کی طرف روانہ کر دیا۔ برہان الدین نے نرگنڈ سے چند میل دور ونکٹ راؤ کو شکست دی اور اسے نرگنڈ کے قلعے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ نانا فرنویس نے تیس ہزار سپاہی ونکٹ راؤ کی مدد کے لیے روانہ کر دیے اور برہان الدین نے مرہٹوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے نرگنڈ کے قلعے کا محاصرہ اُٹھا لیا۔

برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا اور راستے کے نالوں اور دریاؤں میں طغیانیوں کے باعث مرہٹوں کے لیے اپنے بھاری ساز و سامان کے ساتھ آگے بڑھنا دشوار تھا۔ چنانچہ مرہٹہ فوج کا سپہ سالار پرس رام بھاؤ رام دُرگ میں پڑاؤ ڈال کر برسات کے اختتام اور مزید فوج کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ برہان الدین نے مرہٹوں کے حملے کا انتظار کرنے کی بجائے اچانک منولی کی طرف یلغار کر دی۔ مرہٹوں نے مجبوراً آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن میسور کی فوج نے انھیں پے در پے شکستیں دینے کے بعد منولی اور رام دُرگ پر قبضہ کر لیا۔ چند دنوں میں مرہٹہ لشکر پیہم شکستیں کھانے کے بعد دریائے کرشنا تک تمام علاقے خالی کر چکا تھا اور نرگنڈ کی طرف اس

کے تمام راستے منقطع ہو چکے تھے۔

ان شاندار فتوحات کے بعد برہان الدین نے دوبارہ نرگنڈ کے قلعے کی طرف توجہ دی۔ ونکٹ راؤ نے چند دن مقابلہ کیا لیکن مرہٹوں کی پسپائی کے باعث اُس کا حوصلہ ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ نرگنڈ کا قلعہ فتح کرنے کے بعد برہان الدین نے ونکٹ راؤ کے دوسرے حلیف راجوں اور پالیگاروں پر چڑھائی کر دی اور کھتور، دودواڑ، خانہ پور، ہوسکوٹ، پادشاہ پور اور جمبوٹی کے قلعے فتح کر لیے۔

تقریباً اسی زمانے میں سُلطان کی فوج کا ایک اور سالار سید علی بیگ کورگ کے نائروں کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا۔ کورگ کی مہم جس قدر اہم تھی اسی قدر مشکل تھی۔ یہ علاقہ مغربی گھاٹ کے ان پہاڑوں میں واقع ہے جہاں سال میں چھ مہینے لگاتار بارش ہوتی ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں چشموں اور خوشنما جھیلوں کے علاوہ بانس، ساگوان، صندل اور دوسرے درختوں کے گھنے جنگل تھے۔ جن میں جگہ جگہ شیروں اور چیتوں کے علاوہ ہاتھیوں کے ریوڑ دکھائی دیتے تھے۔ کہیں کہیں وادیوں کے نشیب میں جنگلوں کی بجائے دھان کے کھیت اور پھل دار درختوں کے باغ نظر آتے تھے۔

کورگ میں نائر قوم کے قدآور، دلیر اور صحت مند باشندے تہذیب و تمدن کے الفاظ سے ناآشنا تھے۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی نیم عریاں لباس میں رہتی تھیں۔ ہمسایہ اضلاع کے بہت کم لوگ کورگ کے دشوار گزار پہاڑوں اور جنگلوں کا رُخ کرنے کی جرأت کرتے تھے۔ متمدن ہندوستان کے لیے اس علاقے کے باشندوں کی خوبصورتی، عریانی، اخلاقی بے راہ روی، وحشت اور بربریت کی داستانیں کوہ قاف کی پریوں اور جنوں کے قصوں سے مختلف نہ تھیں۔

میسور کی فوج نے ابتدا میں کورگ کے باغیوں کے خلاف چند کامیابیاں حاصل کیں، لیکن دشوار گزار جنگلوں اور پہاڑوں میں باغیوں کا پلّہ بھاری ہونے لگا۔ نائر اپنی خفیہ پناہ گاہوں سے نکل کر اچانک میسور کے لشکر کے عقب یا میمنہ اور میسرہ پر حملہ کرتے اور آن کی آن میں پہاڑوں

اور جنگلوں میں روپوش ہو جاتے۔ سید علی بیگ اس خطرناک مہم کے نااہل ثابت ہوا اور اس نے ایک گھنے جنگل میں دشمن کے پے در پے حملوں سے بدحواس ہو کر پسپائی اختیار کی۔

ان حالات میں سلطان ٹیپو کو بذاتِ خود میدان میں آنا پڑا۔ نائروں نے قدم قدم پر ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن سُلطان کے سامنے اُن کی پیش نہ گئی اور انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ سلطان نے زین العابدین مہدوی کو کورگ کا صُوبیدار مقرر کیا اور خود سرنگاپٹم لوٹ آیا۔ اس عرصہ میں نانا فرنویس جسے نرگنڈ اور کورگ میں سلطان کی فتوحات نے بہت مضطرب کر دیا تھا۔ سلطان کے خلاف مرہٹوں، نظام اور انگریزوں کا متحدہ محاذ بنانے کی کوشش میں مصروف تھا اور اس کی افواج دریائے کرشنا کے کنارے جمع ہو رہی تھیں۔

○

ایک دن فرحت بالاخانے کے ایک کمرے میں بیٹھی اپنی خادمہ سے باتیں کر رہی تھی۔ اچانک سیڑھیوں پر کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی اور آن کی آن میں ایک سانولے رنگ کا لڑکا جس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی، کمرے میں داخل ہوا۔

خادمہ نے کہا "منور، تم کیسے نالائق ہو۔ بی بی جی نے تمھیں کتنی بار سیڑھیوں پر بھاگنے سے منع کیا ہے؟"

منور نے خادمہ کو کوئی جواب دینے کی بجائے فرحت کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "بی بی جی، آج ایک مہمان آئے ہیں۔ وہ کوئی بہت بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کریم خان نے ان کا گھوڑا اصطبل میں باندھ دیا ہے اور میں انھیں دیوان خانے میں بٹھا آیا ہوں۔ انھوں نے آتے ہی بھائی جان انور علی اور بھائی جان مراد علی کے متعلق پوچھا۔ میں نے جواب دیا کہ بھائی جان انور علی یہاں نہیں ہیں اور مراد علی صاحب اس وقت مدرسے میں ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دلاور خان اور صابر کے متعلق پوچھا۔ میں نے جواب دیا کہ صابر مر چکا ہے اور دلاور خان بھائی جان انور علی کے ساتھ

گیا ہُوا ہے۔ پھر انھوں نے پُوچھا تم کون ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں بی بی جی کا نوکر ہُوں۔"

فرحت نے کہا: "تم نے ان کا نام نہیں پُوچھا؟"

"جی اُنھوں نے خود ہی یہ کہا تھا کہ بی بی جی سے میرا سلام کہو اور انھیں یہ بتاؤ کہ میرا نام اکبر خان ہے۔"

فرحت کے لیے یہ خبر غیر معمُولی تھی۔ وہ چند ثانیے بے حس و حرکت بیٹھی رہی اور پھر مضطرب ہو کر بولی: "منوّر! جاؤ انھیں اندر لے آؤ اور نیچے کے بڑے کمرے میں بٹھا دو۔"

منوّر بھاگتا ہُوا کمرے سے باہر نکلا لیکن نصف سے زیادہ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد وہ اچانک رُکا اور دبے پاؤں نیچے اُترنے لگا۔

رہائشی مکان کی چار دیواری سے باہر نکل کر وہ دیوان خانے کے ایک کمرے میں داخل ہُوا۔ اکبر خان کسی گہری سوچ میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس کی ٹھوڑی اور کنپٹیوں کے قریب داڑھی کے کچھ بال سفید ہو چکے تھے لیکن چہرے پر ابھی تک جوانی کی دلکشی کے کچھ آثار باقی تھے۔

منوّر نے کہا: "جناب بی بی جی آپ کو اندر بُلاتی ہیں۔"

اکبر خان کچھ کہے بغیر اُٹھا اور منوّر کے ساتھ چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رہائشی مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہُوئے اور منوّر نے کہا: "جناب آپ تشریف رکھیں میں بی بی جی کو اطلاع دیتا ہُوں۔"

منوّر باہر نکل گیا اور اکبر خان ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں قالین کے اُوپر شیروں اور چیتوں کی چند کھالیں بچھی ہُوئی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ کھونٹیوں پر چند تلواریں اور بندوقیں ٹنگی ہُوئی تھیں۔ دوسری دیوار کے ساتھ آبنوس کی ایک خوب صورت تختی پر ایک خنجر اور دو پستول پڑے ہُوئے تھے۔ باقی دو دیواروں کے ساتھ کتابوں کی الماریاں تھیں اور یہ سب اس شخص کی یادگاریں تھیں جو اکبر خان کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز تھا۔ معظّم علی کے ساتھ رفاقت کے زمانے کے اَن گنت واقعات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ رہے تھے۔ اُس کی

شہادت کی خبر سُننے سے پہلے یہ بات کبھی اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ کسی دن وہ سرنگاپٹم جائے گا اور وہاں معظّم علی نہیں ہوگا۔ تنہائی، بے بسی کے ایک کرب انگیز احساس کے تحت اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

کمرے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ فرحت ایک سفید چادر اوڑھے اس کے سامنے کھڑی تھی: "بھائی اکبر! السلام علیکم۔" اُس نے لرزتی ہُوئی آواز میں کہا۔

اکبر جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سلام کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

فرحت نے دروازے کے قریب ایک کُرسی پر بیٹھتے ہُوئے کہا: "اکبر بیٹھ جاؤ!" وہ بیٹھ گیا۔ چند ثانیے دونوں خاموش رہے۔ بالآخر اکبر خان نے گردن اٹھائی اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا، "بھابی جان! قدرت کی اِس سے زیادہ ستم ظریفی کیا ہو سکتی ہے کہ میں زندہ تھا اور مجھے دو سال تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میرا عزیز ترین بھائی اور اس کے دو جوان بیٹے شہید ہو چکے ہیں۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ پچھلے دنوں سرنگاپٹم کا ایک تاجر حیدر آباد گیا اور وہاں اس کی ملاقات ملیقیں کے ماموں جان سے ہو گئی اور انھوں نے یہ خبر سنتے ہی مجھے خط لکھ دیا۔"

فرحت نے آب دیدہ ہو کر کہا: "مجھے افسوس ہے کہ میں تمھیں اطلاع نہ دے سکی۔ مجھے اُن کی شہادت کے بعد کئی ماہ تک اپنا ہی ہوش نہ تھا۔"

اکبر نے کہا: "بھابی جان! میں آپ سے شکایت نہیں کرتا۔ مجھے صرف اس بات کی ندامت ہے کہ میں آپ کے حالات سے اس قدر بے خبر رہا۔ بھائی جان کے ساتھ میرا رشتہ ایسا تھا کہ ان کے پاؤں میں کانٹا چُبھتا تو مجھے کوسوں دُور رہ کر بھی اس کا درد محسوس کرنا چاہیے تھا۔ مجھے آپ کے نوکر نے بتایا ہے کہ انور علی یہاں نہیں، وہ کہاں گیا ہے؟"

"انور علی کسی مہم پر پانڈی چری گیا ہُوا ہے۔"

"کیسی مہم؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہاں اُسے جو کام سونپا گیا ہے اُس کے لیے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو فرانسیسی زبان جانتا ہو اور انور علی نے فوجی مکتب کے ایک فرانسیسی استاد سے یہ زبان سیکھی تھی۔ تمھارا چھوٹا بھتیجا بھی فرانسیسی زبان جانتا ہے۔"

"مراد علی کب تک گھر آئے گا؟"

"وہ اب آ ہی رہا ہوگا۔"

اکبر خان نے قدرے توقف کے بعد کہا: "بھابی جان! صابر کب فوت ہوا؟"

فرحت نے جواب دیا: "وہ انور علی کے ابا جان کی شہادت سے کوئی پانچ ماہ بعد وفات پا گیا تھا۔ بڑھاپے میں اس کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اُسے اِس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ وہ شہید ہو چکے ہیں۔ اُس نے اُن کی قبر دیکھنے کے لیے میسور جانے کی اجازت مانگی۔ ہم کچھ مدت اسے ٹالتے رہے۔ بالآخر میں نے اسے وہاں جانے کی اجازت دے دی۔ جب وہ واپس آیا تو اُس کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی۔ کوئی پندرہ دن کے بعد ایک رات مجھے نوکر نے اطلاع دی کہ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ میں نے جا کر دیکھا تو وہ بستر پر بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے نوکر کو طبیب کے پاس بھیجا لیکن اس کے آنے سے پہلے وہ وفات پا چکا تھا۔ تم نے مجھے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا، بلقیس، شہباز اور تنویر کیسے ہیں؟"

"وہ سب ٹھیک ہیں۔ بلقیس آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ شہباز اب جوان ہو چکا ہے اور میں نے اپنے کئی فرائض اُسے سونپ دیے ہیں۔ تنویر بھی اب چودہ سال کی ہو چکی ہے۔ میں نے اس کی منگنی اُس کے خالو کے لڑکے ہاشم بیگ کے ساتھ کر دی ہے۔ اس کی چھوٹی بہن ثمینہ کی عمر نو سال ہے۔ میں اسے کہا کرتا تھا کہ شہباز کے علاوہ تمھارے چار بھائی اور ہیں اور وہ سرنگاپٹم میں رہتے ہیں۔ کبھی شہباز یا تنویر سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تھا تو وہ یہ دھمکی دیا کرتی تھی کہ میں اپنے سرنگاپٹم والے بھائیوں کے پاس چلی جاؤں گی۔ نماز کے بعد وہ ہمیشہ صدیق، مسعود،

انور اور مراد کے لیے دعائیں کیا کرتی تھی اور بار بار مجھ سے یہ گلہ کیا کرتی تھی کہ میں انھیں اپنے گھر کیوں نہیں بلاتا اور میں نے اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ جب شہباز یا تنویر کی شادی ہوگی تو میں ان سب کو بلاؤں گا۔ اُن کے ساتھ تمھارے چچا اور چچی جان بھی آئیں گے۔ بھائی جان کی شہادت کے متعلق شیخ فخرالدین کا خط ملنے سے پہلے وہ بڑی بے تابی کے ساتھ اپنی بہن اور بھائی کی شادی کے دن کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اب جب میں اس طرف آ رہا تھا تو وہ میرے ساتھ آنے پر بضد تھی اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمھاری چچی اور تمھارے بھائیوں کو ساتھ لے کر آؤں گا۔"

فرحت نے کہا: "کاش! میں وہاں جا سکتی"

اکبر خاں نے کہا: "راستے میں میں ایک دن عطیہ کے ہاں ٹھہرا تھا۔ وہ بھی آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔"

فرحت نے پوچھا: "عطیہ کے بچوں کا کیا حال ہے؟"

اکبر خاں نے جواب دیا: "ہاشم بیگ کے سوا اس کی کوئی اولاد نہیں۔ وہ بڑا ذہین اور خوش وضع نوجوان ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ دُنیا میں کوئی اچھا کام کرے گا لیکن طاہر بیگ نے اُسے اودھ کی فوج میں ملازم کروا دیا ہے۔"

کمرے سے باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور فرحت نے کہا: "مراد آ گیا۔"

مراد علی جو پندرہ سال کی عمر میں ہی پورا جوان معلوم ہوتا تھا، کمرے میں داخل ہو کر حیران سا ہو کر اکبر خان کی طرف دیکھنے لگا۔

فرحت نے کہا: "بیٹا تم نے انھیں سلام نہیں کیا، یہ تمھارے چچا اکبر خان ہیں۔"

"چچا جان! السلام علیکم۔" مراد علی یہ کہہ کر آگے بڑھا۔ اکبر خان نے اُٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔

فرحت نے کہا: "بیٹا آج تم نے بہت دیر کر دی۔"

مُراد علی نے جواب دیا "امّی جان آج جب چھٹی ہونے والی تھی تو برہان الدین اچانک مکتب کے معائنہ کے لیے آگئے تھے۔ اس کے لیے ہمیں کچھ دیر وہاں رُکنا پڑا۔"

اکبر خان نے پُوچھا "مراد تمھاری تعلیم کب ختم ہوگی؟"

مُراد علی نے جواب دیا "چچا جان میں قریباً تین ماہ کے بعد مکتب سے فارغ ہوجاؤں گا۔"

"اور اس کے بعد تم کیا کرو گے؟"

اس کے بعد میرے لیے فوج میں شامل ہونے کے سوا کچھ اور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے مکتب کے ہر فارغ التحصیل نوجوان کے لیے فوج میں شامل ہونا ضروری ہے؟"

"ہاں چچا جان فوجی درس گاہ کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ فوج کو تربیت یافتہ افسر مہیا کیے جائیں لیکن فوج میں شامل ہونے کے لیے ہر طالب علم کا فارغ التحصیل ہونا ضروری نہیں، اشد ضرورت کے وقت ہمیں تعلیم کے دوران میں بھی فوجی خدمات کے لیے بُلایا جا سکتا ہے، بعض لڑکے تعلیم میں مجھ سے پیچھے تھے لیکن انھیں صرف اس لیے کمان مل گئی ہے کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ پچھلے دنوں ہمارے مکتب کے کئی طالب علم آخری امتحان سے پہلے ہی کورگ کے محاذ پر چلے گئے تھے۔ میں نے بھی اُن کے ساتھ جانے کی کوشش کی تھی لیکن میری درخواست صرف اس لیے نامنظور ہوگئی تھی کہ میں عمر میں چھوٹا تھا۔"

اکبر خاں نے کہا "مراد فرض کرو اگر میں تمھیں یہ مشورہ دُوں کہ تمھارے لیے ایک سپاہی بننے کی بجائے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا بہتر ہے تو تم کیا جواب دو گے؟"

مُراد علی مُسکرایا "میرے نزدیک سپاہی بننا پیشہ نہیں بلکہ قوم کی خدمت ہے۔ چچا جان! ابّا جان کہا کرتے تھے کہ آپ پانی پت کے میدان میں ان کے ساتھ تھے۔ میں آپ سے بہت کچھ پُوچھنا چاہتا ہوں لیکن اِس وقت مجھے تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا ہے میں ابھی آجاؤں گا۔"

"تم کہاں جا رہے ہو بیٹا؟" فرحت نے پوچھا

"امّی جان میں نیزہ بازی کے لیے جا رہا ہوں۔"

منوّر کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے کہا "جناب کریم خان کہتا ہے کہ میں نے آپ کے گھوڑے پر زین ڈال دی ہے۔"

مُراد علی اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اکبر خان نے کہا "بھابی جان مَیں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہُوں ـــــ بُرا نہ مانیے گا۔ آپ کا خاندان قوم کے لیے بڑی قربانیاں دے چکا ہے۔ اب قوم کو یہ حق نہیں کہ آپ سے مزید قربانیوں کا مطالبہ کرے۔ میں یہ محسوس کرتا ہُوں کہ سرنگاپٹم میں آپ کے بچے محفوظ نہیں۔ آپ میرے پاس چلیں، مجھے یقین ہے کہ میں انور اور مراد کے لیے کئی اور دلچسپیاں تلاش کر سکوں گا۔ وہاں اُن کے لیے نہایت اچھی زمین حاصل کی جا سکتی ہے۔"

فرحت نے کہا "اکبر تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں اُس وطن کو کیسے چھوڑ سکتی ہُوں جس کی حفاظت کے لیے میرے شوہر اور میرے بیٹوں نے اپنا خُون پیش کیا تھا۔"

"لیکن بھابی جان اِس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ آخر یہ جنگیں کب ختم ہوں گی۔ کل تک سلطان ٹیپو انگریزوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھا اور آج وہ اندرونی بغاوتوں کا سامنا کر رہا ہے۔ اس کے بعد شاید نظام اور مرہٹے میدان میں نکل آئیں۔"

فرحت نے کہا "میں صرف اتنا جانتی ہُوں کہ ہماری جنگ ایک مقصد کے لیے ہے۔ اُس مقصد کے لیے جو تمھارے بھائی کو اپنی اور اپنے بیٹوں کی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ میں یہ گوارا کر سکتی ہوں کہ میرے باقی دو بیٹے بھی اس مقصد پر قربان ہو جائیں لیکن یہ گوارا نہیں کروں گی کہ وہ زندہ رہنے کے لیے اس مقصد سے منحرف ہو جائیں۔"

اکبر خان نے لاجواب سا ہو کر کہا "کبھی میں بھی زندگی کے اعلیٰ اور ارفع مقاصد پر ایمان رکھتا تھا لیکن ایک مدت سے میں اس نعمت سے محروم ہو چکا ہُوں۔ مجھے آپ کے سامنے ایسی

گفتگو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ایک اندھا دُوسروں کو راستہ نہیں دکھا سکتا۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہُوں۔"

فرحت نے کہا "بھائی تمھاری کوئی بات مجھے رنجیدہ نہیں کر سکتی مجھے اُن المناک واقعات کا علم ہے جن کے باعث تمھاری زندگی میں یہ انقلاب آیا تھا۔ تمھارے بھائی کو اس بات کا افسوس تھا کہ تمھارا راستہ اُن سے الگ ہو گیا لیکن اپنی دُعاؤں میں وہ ہمیشہ تمھیں یاد کیا کرتے تھے، وہ یہ کہا کرتے تھے کہ اکبر خان نے زمانے کا جو انقلاب دیکھا ہے اس کے بعد اُس کا زندگی کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو جانا میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے۔"

اکبر خان نے کہا "بھابی جان روہیل کھنڈ چھوڑنے کے بعد مجھے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہُوا کہ میں زندہ ہوں۔ میں نے جنگلوں کو کاٹ کر سرسبز باغات اور لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ میں علی الصباح گھوڑے پر سوار ہوتا ہُوں اور سارا دن اپنی زمین کی دیکھ بھال کرنے کے بعد گھر واپس آتا ہوں۔ میں نے برسوں کی محنت کے بعد اپنے گاؤں میں ایک عالیشان مکان تعمیر کیا ہے۔ میں نے اپنے ساتھ آنے والے بے نوا گڈریوں کی خوشحالی اور ترقی کے لیے بہت کچھ کیا ہے اور اب تک اُن کی پانچ بستیاں آباد ہو چکی ہیں۔ وہ اس قدر آسودہ حال ہیں کہ اب انھیں روہیل کھنڈ کی یاد نہیں ستاتی۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے پیشِ نظر میں نے بھائی جان سے الگ راستہ اختیار کیا تھا۔ مجھے اپنی کارگزاری پر مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ لیکن میں اسی طرح بے چین ہوں۔ میں یہ محسوس کرتا ہُوں کہ میرے جینے کی تمام مسرتیں روہیل کھنڈ کی خاک میں دفن ہو چکی ہیں۔ مجھے ذرا ذرا سی بات پر غصّہ آ جاتا ہے۔ جو لوگ مجھ سے محبت کرتے تھے وُہ اب مجھ سے ڈرتے ہیں۔ کبھی کبھی میں اپنا محاسبہ کرتا ہوں اور یہ عہد کرتا ہُوں کہ اب اپنے نوکروں یا قبیلے کے لوگوں پر سختی نہیں کروں گا۔ میں انتہائی غصّے کی حالت میں بھی مسکرانے کی کوشش کیا کرتا ہُوں۔ لیکن چند دن بعد میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہاں آنے کی خواہش پیدا ہوتی تھی اور میں یہ تصور کیا کرتا تھا کہ بھائی جان میری آمد کی اطلاع پا کر مسکراتے ہُوئے مکان کے کسی کمرے

سے نمودار ہوں گے اور مجھے گلے لگا لیں گے۔ پھر میری دنیا کی خاموش فضائیں قہقہوں سے لبریز ہو جائیں گی لیکن عمل کی دنیا میں میرے ان حسین سپنوں کی کوئی تعبیر نہ تھی۔ کاش میں وفات سے پہلے انھیں ایک بار دیکھ لیتا۔ آج میری بیچارگی اور بے بسی اُس بچّے سے کہیں زیادہ ہے جسے انھوں نے قید خانے کی ایک تاریک کوٹھڑی میں زندگی کے نئے حوصلوں اور ولولوں سے آشنا کیا تھا ــــ اب وُہ چراغ جس کی روشنی نے کبھی میرے دل میں بھیانک تاریکیوں سے لڑنے کی جرأت پیدا کی تھی بُجھ چکا ہے اور میں بھٹک رہا ہُوں ـــــ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اس ملک کے نااہل اور ظالم حکمرانوں سے میرا آخری انتقام یہی ہو سکتا ہے کہ میں اپنی تلوار ہمیشہ کے لیے نیام میں ڈال دوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری بغاوت ان حکمرانوں سے زیادہ اس اکبر خاں کے خلاف ہے جس کا دل کبھی قوم کی خدمت کے ولولے سے لبریز تھا اور جو پانی پت کے میدان میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکتا تھا۔ میں اس انسان کی اُمنگوں اور آرزوؤں کی لاش ہوں جس کی رگوں میں خون کی بجائے بجلیاں دوڑتی تھیں۔ بہن مجھے آپ کی دُعاؤں کی ضرورت ہے۔"

اکبر خان کی آنکھوں میں پھر ایک بار آنسو جمع ہو رہے تھے۔

فرحت نے کہا "اکبر تمھیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں میری دُعائیں ہر وقت تمھارے ساتھ ہیں منور کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے کہا "بی بی جی مہمان کے لیے کھانا تیار ہے لے آؤں؟"

"ہاں جلدی کرو۔"

اکبر خان نے کہا "نہیں۔ میں نے کھانا راستے میں کھا لیا تھا۔ آپ نے یونہی تکلیف کی۔"

فرحت نے کہا "تھوڑا بہت کھا لو۔"

"نہیں بھابی جان میں تکلّف نہیں کر رہا۔ میں واقعی کھا چکا ہُوں۔ اب عصر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے میں ذرا مسجد سے ہو آؤں۔"

"بہت اچھا۔ منوّر تم ان کے ساتھ جاؤ۔"

اکبر خان کرسی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ فرحت کو اس کی چال میں کوئی غیر معمولی بات نظر آئی۔ وہ چلتے وقت ایک پاؤں پر ذرا زیادہ بوجھ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس کی وجہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کوئی بات کرتی اکبر خان کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

○

تھوڑی دیر بعد جب اکبر خان نماز پڑھ کر واپس آیا تو فرحت برآمدے میں ایک مونڈھے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ صحن عبور کرتے وقت اکبر خان اسی طرح لنگڑا رہا تھا۔ فرحت نے کہا۔ "اکبر کیا بات ہے تمھارے پاؤں میں کوئی تکلیف ہے؟"

اکبر چند قدم سنبھل کر چلنے کے بعد برآمدے میں داخل ہوا اور ایک مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "جی کچھ نہیں۔ گزشتہ سال ایک لڑائی میں میری ٹانگ پر گولی لگ گئی تھی۔ اب اگر میں کبھی زیادہ سواری کروں یا پیدل چلوں تو ٹانگ میں تکلیف ہو جاتی ہے۔"

"تمھاری لڑائی کس کے ساتھ ہوئی تھی؟"

"مرہٹہ لٹیروں کے ایک گروہ نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ میرا زندہ بچ نکلنا ایک معجزہ تھا۔ اگر اس دن میری چھوٹی بچی [illegible] نہ ہوتی تو آج آپ مجھے یہاں نہ دیکھتیں۔ روہیل کھنڈ سے ہجرت کے بعد میں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو آباد کرنے کے لیے ادھونی کی سرحد پر ایک غیر آباد علاقہ حاصل کیا تھا۔ اس علاقے سے چند میل کے فاصلے پر ایک گھنا جنگل ہے اور اس جنگل سے آگے ایک چھوٹا سا دریا ہے جو ادھونی اور مرہٹہ سلطنت کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔ ادھونی کی حکومت کی طرف سے ہمیں اس بات کی اجازت تھی کہ ہم جتنا جنگل چاہیں آباد کر سکتے ہیں۔ اس جنگل میں کہیں کہیں بھیل لوگ آباد تھے جو عام طور پر شکار پر گزارہ کیا کرتے تھے میں نے ان لوگوں میں کھیتی باڑی کا شوق پیدا کر کے انھیں کام پر لگا دیا اور چند سال میں جنگل کاٹ کر بہت سی زمین آباد کر لی۔ میرے قبیلے کے لوگوں کی بستیوں کے ارد گرد ان بھیل کسانوں کے گاؤں

آباد ہو چکے تھے جو اب خوش حال انسانوں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن سرحد پار سے مرہٹہ سردار کا ایلچی میرے پاس آیا اور اس نے مجھے یہ پیغام دیا کہ اگر آپ لوگ اس علاقے میں امن کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہر سال اپنی آمدنی کا ایک چوتھائی ادا کرتے رہیں۔ یہ مطالبہ میرے نزدیک ایک گالی تھا اور میں نے سردار کے ایلچی کو ڈانٹ ڈپٹ کر واپس کر دیا۔

"چند ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ مرہٹہ سردار کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر بعض کسان مجھ سے بالا بالا انھیں چوتھ دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ میں نے ایک دن علاقے کے تمام بھیل جمع کیے اور اُن سے یہ وعدہ لیا کہ وہ مرہٹوں کو ایک کوڑی بھی ادا نہیں کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں نے ایک رات دریا عبور کر کے ان لوگوں کی چند بستیاں لوٹ لیں اور چند مردوں اور عورتوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے ان آدمیوں کو چھڑانے کے متعلق مرہٹہ سردار کے ساتھ بات چیت شروع کی تو اس نے ایک بھاری رقم کا مطالبہ کیا۔ بھیل اپنے مال مویشی بیچ کر یہ رقم فراہم کرنے پر تیار ہو گئے لیکن میں نے ایک رات تین سو آدمیوں کے ساتھ دریا عبور کیا اور مرہٹہ سردار کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ سردار ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی لڑائی میں مارا گیا اور باقی دو بھائی، ایک بیٹا اور اس کے چند اور رشتے دار اور نوکر ہم نے زندہ گرفتار کر لیے۔ اس کے بعد مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی اور سردار نے اپنے آدمیوں کے بدلے ہمارے آدمی چھوڑ دیے۔ اس کے بعد کافی دیر امن رہا تاہم میں نے کسی غیر متوقع حملے کے پیش نظر اپنے مزارعین کو مسلح کر دیا اور اب بھیل جنھیں عام طور پر بزدل خیال کیا جاتا تھا اچھے خاصے سپاہی بن چکے تھے۔ کئی بار مرہٹہ سردار نے میرے پاس اپنے ایلچی بھیج کر اس بات پر احتجاج کیا کہ میں ان لوگوں کو مسلح کر کے اس علاقے کے لیے خطرہ پیدا کر رہا ہوں لیکن میں ہمیشہ اسے یہی جواب دیا کرتا تھا کہ جب تک تمھاری طرف سے کوئی شرارت نہ ہو گی یہ لوگ تمھیں پریشان نہیں کریں گے۔

پچھلے سال میں نے اپنے گاؤں سے چند میل دور ایک نئی زمین آباد کرنے کے لیے جنگل کٹوانا شروع کیا۔ ایک صبح میں اور شہباز مزدوروں کے کام کی نگرانی کے لیے گھوڑوں پر سوار ہو کر

گھر سے نکلے۔ گاؤں سے باہر ثمینہ بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور ضد کرنے لگی کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ ثمینہ کو سواری کا بہت شوق ہے اور کبھی کبھی جب کہیں نزدیک جانا ہوتا ہے تو میں اُسے اپنے ساتھ بٹھا لیا کرتا ہوں لیکن اس مرتبہ ہم دُور جا رہے تھے اور میں نے اسے بہت سمجھایا کہ تم تھک جاؤ گی۔ ایسے موقعوں پر آنسو اس کا سب سے خطرناک حربہ ثابت ہُوا کرتے ہیں، چنانچہ شہباز نے اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا۔
شام سے کچھ دیر پہلے ہم اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس آ رہے تھے۔ اچانک تھوڑی دُور پر گھنے درختوں کی اوٹ سے یکے بعد دیگرے چند فائر ہُوئے۔ میرا گھوڑا زخمی ہو کر گر پڑا اور اس کے ساتھ ہی ایک گولی میری ٹانگ میں لگی۔ میں اپنی بندوق سنبھال کر پاس ہی ایک گرے ہُوئے درخت کی آڑ میں لیٹ گیا۔ شہباز مجھ سے چند قدم آگے تھا۔ اُس نے فوراً گھوڑا روکا اور ثمینہ سمیت نیچے کُود پڑا۔ ثمینہ اس کا اشارہ پا کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں لیٹ گئی اور وُہ بھاگ کر میرے قریب آ گیا۔ حملہ آور سامنے گھنے درختوں میں چھپے ہُوئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اچانک باہر نکل کر ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اچانک ہمیں اپنے عقب میں گھوڑے کی ٹاپ سُنائی دی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو ثمینہ گھوڑے کی گردن کے ساتھ چمٹی ہُوئی تھی اور وہ پُوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ثمینہ گھر میں ایک چھوٹے سے ٹٹو پر سواری کیا کرتی تھی، لیکن اس کا گھوڑے پر سوار ہونا اور اسے اس طرح بھگانا میرے نزدیک ایک معجزہ تھا۔ ہمیں زیادہ دیر ثمینہ کے متعلق سوچنے کا موقع نہ ملا۔ درختوں کے جھنڈ سے اچانک گولیوں کی بارش ہونے لگی اور ہم نے جوابی فائر شروع کر دیے۔ پھر تھوڑی دیر بعد دشمن کی بندوقیں خاموش ہو گئیں اور کسی نے بلند آواز میں کہا "اکبر خان اب لڑائی بے سُود ہے۔ اب تم بچ کر نہیں جا سکتے لیکن اگر تم ہتھیار پھینک دو تو ہم تمھاری جان بچانے کا وعدہ کرتے ہیں۔"
میں نے کوئی جواب نہ دیا اور دشمن نے دوبارہ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ دشمن دن کی روشنی میں درختوں کی آڑ سے باہر نکل کر ہم پر حملہ نہیں کریں گے

لیکن شام کی تاریکی سے وہ پُورا فائدہ اٹھائیں گے۔
ثمینہ کے متعلق میرا یہی خیال تھا کہ وہ شاید خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ گئی ہے لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہُوا۔ غروبِ آفتاب کے وقت میں نے شہباز سے کہا کہ تھوڑی دیر بعد تاریکی چھا جائے گی اور تمھیں اس سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں دشمن کو اپنی طرف متوجہ رکھوں گا۔ لیکن وُہ ایسا مشورہ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ پھر جب تاریکی چھا رہی تھی اور ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ دشمن اچانک درختوں کی آڑ سے نکل کر ہم پر حملہ کرنے والے ہیں، دُور سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر میں ایک بستی کے اٹھارہ جوان ہماری مدد کو پہنچ گئے۔ یہ ثمینہ کا کارنامہ تھا۔ وہ ڈر کر نہیں بھاگی تھی۔ خدا معلوم اس کے دماغ میں یہ بات کیسے آ گئی کہ ہم زیادہ دیر دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ وہ قریب ترین بستی کے لوگوں کو خبردار کرنا چاہتی تھی لیکن راستے کی پہلی بستی پر وہ گھوڑا روک نہ سکی اور جب دوسری بستی آئی تو وہ سرکش گھوڑے کو روکنے کی بجائے دھان کے ایک کھیت میں کُود پڑی اور اتنی دُہائی مچائی کہ آن کی آن میں سارا گاؤں اس کے گرد جمع ہو گیا۔ بھابی جان وہ عجیب لڑکی ہے۔ تمیز کی یہ حالت ہے کہ وہ چھپکلی سے ڈرتی ہے اور ثمینہ نے سات سال کی عمر میں کوئی دو گز لمبا سانپ مار ڈالا تھا۔"
فرحت نے کہا: "اچھا ان حملہ کرنے والوں کا پھر کیا بنا؟"
"وہ سواروں کو دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ ہم نے اُن کا تعاقب کر کے دو آدمیوں کو مار ڈالا اور ایک کو زندہ گرفتار کر لیا۔ اس کی زبانی ہمیں معلوم ہُوا کہ یہ آدمی جن کی تعداد آٹھ تھی سرحد پار سے مرہٹہ سردار نے مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجے تھے۔"
فرحت نے پوچھا "اور اب اس کے ساتھ تمھارے تعلقات کیسے ہیں؟"
"اس کے بعد کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ادھونی کی حکومت کے احتجاج پر پونا کی حکومت نے مرہٹہ سردار سے سخت باز پُرس کی تھی۔"

تیسرے روز فرحت صبح کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہی تھی۔ مراد علی کمرے میں داخل ہُوا اور کچھ دیر اُس کے پاس کھڑا رہا۔ فرحت دُعا سے فارغ ہو کر اُس کی طرف متوجہ ہُوئی۔ مُراد علی نے کہا "امّی جان چچا اکبر خان سفر کے لیے تیار ہیں اور آپ سے رخصت کی اجازت چاہتے ہیں۔"

"اچھا، انھیں اندر لے آؤ۔"

مُراد علی واپس چلا گیا اور فرحت کمرے سے نکل کر صحن میں آگئی۔

تھوڑی دیر بعد اکبر خان اور مراد علی صحن میں داخل ہُوئے۔

اکبر خان نے کہا "اب مجھے اجازت دیجیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں انور علی سے نہیں مل سکا۔ آپ مُراد اور انور کو کسی دن میرے پاس بھیجیے۔ وعدہ نہ بُھولیں۔"

فرحت نے کہا "اگر حالات نے اجازت دی تو میں انھیں ضرور بھیجوں گی۔"

اکبر خان نے گھٹی ہوئی آواز میں خدا حافظ کہا اور مُراد علی کے ساتھ چل پڑا اور فرحت بے حس و حرکت کھڑی زندگی کی اُن رنگینیوں کا تصور کر رہی تھی جو ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہو چکی تھیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ اکبر خان کی رفاقت کا زمانہ اسے ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔

باہر دیوان خانے کے سامنے کریم خان، اکبر خان کے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ مراد کے اشارے سے وہ اُن کے پیچھے چل دیا۔ ڈیوڑھی سے نکل کر تھوڑی دُور سڑک پر پہنچنے کے بعد اکبر خان رُکا اور اس نے مُصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہُوئے کہا "مراد اب تمھیں آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ خدا حافظ!"

مُراد علی نے اس کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے مُصافحہ کرتے ہُوئے کہا، "چچا جان، شہباز اور چچی جان کو میرا سلام کہیے۔"

"بہت اچھا۔" اکبر خان نے یہ کہہ کر نوکر کے ہاتھ سے باگ پکڑی اور گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

"چچا جان!" مراد علی نے جھجکتے ہوئے کہا "بہن تنویر اور ثمینہ کو بھی میرا سلام کہیے۔"

اکبر خان نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا "بہت اچھا، خدا حافظ۔"

"خدا حافظ! چچا جان!"

گھوڑا چند چھلانگیں لگانے کے بعد پاس ہی سڑک کے موڑ پر اوجھل ہوگیا اور مراد علی کریم خان کے ساتھ واپس چل دیا۔ جب وہ ڈیوڑھی کے قریب پہنچے تو منوّر پوری رفتار سے بھاگتا ہُوا باہر نکلا اور اس نے ہانپتے ہُوئے پوچھا "بھائی جان، مہمان چلے گئے؟"

مراد علی نے جواب دیا "ہاں لیکن تم اس قدر بدحواس کیوں ہو؟"

منوّر نے شکایت کے لہجے میں کہا "بھائی جان، کریم بخش ہمیشہ میرے ساتھ دشمنی کرتا ہے، اس نے وعدہ کیا تھا کہ میں تمھیں جگا دوں گا۔"

کریم خان نے کہا "ارے میں نے تمھیں آواز دی تھی لیکن تم گدھے کی طرح خرّاٹے لے رہے تھے۔"

منوّر نے فریادی ہو کر کہا "بھائی جان یہ جھوٹ کہتا ہے میں کبھی خرّاٹے نہیں لیتا۔"

مراد علی نے کہا "اچھا یہ بتاؤ مہمان کے ساتھ تمھارا کیا کام تھا؟"

"جی میں انھیں سلام کرتا۔ دیکھیے کل مجھے انھوں نے ایک مُہر دی تھی۔ یہ خالص سونے کی ہے۔ میں نے بی بی جی کو بھی دکھائی تھی۔ کریم بخش مجھ سے جلتا تھا اس لیے اس نے مجھے نہیں جگایا۔"

منوّر نے جیب سے اشرفی نکال کر انور علی کو دکھائی۔ کریم خان نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو اشرفیاں نکال کر منوّر کے سامنے کرتے ہُوئے کہا "اب مجھے جلنے کی کیا ضرورت تھی۔ خان صاحب تم سے پہلے مجھے دو مُہریں دے چکے تھے اور چوکیدار کو بھی ایک مُہر دے گئے ہیں۔"

منوّر نے مُنھ بسور کر اپنی اشرفی جیب میں ڈال لی اور مُراد علی ہنستا ہُوا ڈیوڑھی میں داخل ہوگیا۔

دوسرا باب

ایک دوپہر پانڈی چری کی بندرگاہ پر لوگوں کا ہجوم ایک فرانسیسی جہاز سے اُترنے والے مسافروں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ جہاز کے ملاح اور بندرگاہ کے مزدور سامان اُتارنے میں مصروف تھے اور چند سپاہی تماشائیوں کو بندرگاہ کے احاطے سے دُور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جہاز کا کپتان ایک طرف کھڑا چند فرانسیسی حکام اور فوجی افسروں سے باتیں کر رہا تھا اور اس کے پاس ہی ایک سائبان کے نیچے ایک محرّر میز لگائے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے چند حبشی اور یورپین جن میں سے بعض کے لباس نکبت اور افلاس کے آئینہ دار تھے، ایک نصف دائرہ میں کھڑے تھے۔ محرّر کی کرسی کے دائیں اور بائیں دو نوجوان جو اپنے لباس سے پانڈی چری کی بجائے میسور کی فوج کے سپاہی معلوم ہوتے تھے کھڑے تھے۔ ایک دراز قامت اور خوش وضع نوجوان تماشائیوں کے ہجوم میں سے اپنا راستہ صاف کرتا ہوا آگے بڑھا اور محرّر اسے دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

نوجوان نے ایک ثانیہ کے لیے سائبان میں جمع ہونے والے آدمیوں کی طرف دیکھا اور پھر محرّر کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: "اس جہاز پر صرف یہی آدمی آئے ہیں؟"

"جی! اس جہاز کے کپتان نے مجھے بتایا ہے کہ اگلے مہینے مریشس سے دوسرا جہاز آئے گا۔

ان گیارہ آدمیوں میں سے پانچ یورپین اور باقی افریقی ہیں۔ خدا معلوم جہاز کا کپتان انھیں کہاں سے پکڑ لایا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی فوجی تجربہ نہیں رکھتا۔"

نوجوان ان آدمیوں کی طرف متوجہ ہوا اور فرانسیسی زبان میں بولا: "ہمیں میسور کی فوج کے لیے بہترین آدمی درکار ہیں۔ میں تمھاری حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا لیکن تم میں سے کسی کو اگر یہ غلط فہمی ہے کہ میسور کی فوج بے کار لوگوں کی جائے پناہ ہے تو یہ غلط فہمی ابھی سے دُور ہو جانی چاہیے۔ میسور کی فوج میں شامل ہونے سے پہلے تمھیں ابتدائی تربیت کے انتہائی صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ تم میں سے جو ہمارے معیار پر پورا اُترے گا اس کے لیے ترقی اور عزت کے راستے کھلے ہوں گے۔ تم میسور کے حکمران کو ہر اچھے سپاہی کا بہترین قدر دان پاؤ گے۔ ابتدائی تربیت کے لیے تمھیں چند ہفتے یہاں رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد جو لوگ فوجی خدمت کے قابل سمجھے جائیں گے انھیں میسور بھیج دیا جائے گا اور باقی کو ایک ماہ کی زائد تنخواہ دے کر واپس کر دیا جائے گا۔"

پیچھے سے کسی کی آواز سنائی دی: "مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ آپ کی بہترین توقعات پوری کر سکیں گے۔ یہ سیر و تفریح کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے ایک نئی زندگی کی تلاش میں آئے ہیں۔"

نوجوان نے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے جہاز کا عمر رسیدہ کپتان اور چند فرانسیسی افسر کھڑے تھے۔

"موسیو فرانسسک!" نوجوان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

کپتان فرانسسک نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "انور علی مجھے تمھاری توقع نہ تھی۔ تم کب سے یہاں ہو؟"

ایک فرانسیسی افسر نے کہا: "آپ ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہیں؟"

انور علی نے جواب دیا: "کپتان فرانسسک سرنگاپٹم کی فوجی درس گاہ میں ہمارے اُستاد رہ چکے ہیں۔ میں نے فرانسیسی زبان انھی سے سیکھی تھی۔"

کپتان فرانسسک نے پوچھا: "آپ کے والد اور بھائیوں کا کیا حال ہے؟"

انور علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا: "بھائی صدیق، مسعود اور ابا جان بدنور کی جنگوں میں شہید

ہو گئے تھے۔ مراد سرنگا پٹم میں تعلیم پا رہا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے" کپتان فرانسک نے مغموم لہجے میں کہا: "معظم علی میرے بہترین دوست تھے۔"

انور علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "آپ پانڈی چری میں کتنے دن قیام کریں گے؟"

"میں یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہروں گا۔ مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ آپ کا قیام کس جگہ ہے؟"

انور علی نے بندرگاہ سے کوئی ڈیڑھ سو قدم دور چند خیموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ میرا کیمپ ہے۔ اگر آپ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

ایک فوجی افسر نے کہا۔ "کھانے پر یہ نہیں آسکیں گے۔ آج رات گورنر کے ہاں دعوت ہے۔"

فرانسک نے کہا۔ "اگر آپ سو نہ گئے تو گورنر کی دعوت سے فارغ ہوتے ہی میں آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

انور علی مسکرایا۔ "میرے سو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ضرور تشریف لائیے۔"

"میں ضرور آؤں گا۔ مجھے آپ کے ساتھ ایک ضروری کام بھی ہے۔"

○

رات کے گیارہ بجے انور علی کپتان فرانسک کی آمد سے مایوس ہو کر سونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دلاور خان خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "جناب کپتان صاحب آگئے ہیں۔"

انور علی اپنی کرسی سے اٹھا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔ کپتان فرانسک ایک اور آدمی کے ساتھ باہر کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر انور علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "میرا خیال تھا کہ آپ سو گئے ہوں گے۔ گورنر کی دعوت پر مجھے چند پرانے دوست مل گئے تھے اور ان

کے ساتھ باتوں میں بہت دیر لگ گئی۔ پھر آپ کے پاس آنے سے پہلے میرا اپنے جہاز پر جانا بھی ضروری ہے۔"

انور علی نے کہا: "میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید آپ اس وقت نہ آئیں۔ چلیے اندر بیٹھتے ہیں۔"

کپتان فرانسک انور علی کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا لیکن اُس کا ساتھی تذبذب کی حالت میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ فرانسک نے مڑ کر باہر جھانکتے ہوئے کہا: "لیگرانڈ! آؤ تم باہر کیوں کھڑے ہو؟"

کپتان کا ساتھی خیمے کے اندر داخل ہوا۔ وہ کوئی بیس سال کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس کے خدوخال میں ایک غیر معمولی جاذبیت تھی تاہم اس کی جھکی ہوئی گردن اور مغموم اُداس اور سہمی نگاہیں کسی پریشانی اور ذہنی اذیت کا پتہ دے رہی تھیں۔

فرانسک نے انور علی کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا "بیٹا بیٹھ جاؤ، تمہارے لیے یہ خیمہ میرے جہاز سے زیادہ محفوظ ہے۔"

پھر وہ انور علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "پانڈی چری پہنچ کر میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ اس نوجوان کے لیے جائے پناہ تلاش کرنا تھا۔"

انور علی نے کہا: "اگر کوئی خطرہ ہے تو میں انھیں اسی وقت سرنگا پٹم بھیجنے کا انتظام کر سکتا ہوں۔"

فرانسک نے کہا "اگر اسے صرف سرنگا پٹم بھیجنے کا سوال ہوتا تو میرے لیے کوئی پریشانی کی بات نہ تھی لیکن بعض وجوہات کے باعث اسے کچھ عرصہ یہاں رہنا پڑے گا۔ پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ اسے اپنے کسی فرانسیسی دوست کے پاس چھوڑ دوں گا۔ پانڈی چری کی فوج کے کئی افسر ایسے ہیں جن کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات ہیں لیکن پیرس کی پولیس اسے تلاش کر رہی ہے اور کوئی فرانسیسی اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالے بغیر اس کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکے گا۔

اسے ایک لڑکی کے انتظار کے لیے یہاں ٹھہرنا پڑے گا اور جب وہ یہاں پہنچ جائے گی تو یہ اُس کے ساتھ میسور چلا جائے گا۔ یہ کچھ عرصہ پیرس کے فوجی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے لیے سلطان ٹیپو کی فوج کے یورپین دستے میں کوئی معقول عُہدہ حاصل کرنا مشکل نہ ہوگا۔ میں یہ چاہتا ہُوں کہ اس وقت آپ اسے اپنے ایک نجی مُلازم کی حیثیت سے یہاں رکھیں۔ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا باپ میرا دوست تھا، کہیں آپ یہ خیال نہ کریں کہ میں کسی عادی مجرم کو آپ کی پناہ میں دینا چاہتا ہُوں۔ میری نظر میں یہ بالکل بے گناہ ہے اور جو واقعات اسے پیش آئے ہیں وہ فرانس میں ہر شریف آدمی کو پیش آسکتے ہیں۔"

انور علی نے کہا: "میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ انھیں میری اعانت کا مستحق سمجھتے ہیں، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں آخری دم تک ان کی حفاظت کروں گا اور یہ ایک ملازم کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک دوست کی حیثیت میں میرے پاس رہیں گے۔"

فرانسسک نے نوجوان کی طرف دیکھا اور کہا: "بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ پیرس کی پولیس تمھیں یہاں تک تلاش کرے گی، لیکن پھر بھی تمھیں بہت محتاط رہنا چاہیے، یہاں اپنے کسی ہم وطن کے ساتھ میل جول رکھنا تمھارے لیے مفید نہ ہوگا۔ تمھیں ہر وقت یہی محسوس کرنا چاہیے کہ اس خیمے سے باہر تمھارے لیے ہر جگہ غیر محفوظ ہے اور اس کے بعد میسور پہنچ کر بھی تمھارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ تم اپنا اصلی نام کسی پر ظاہر نہ کرو۔"

انور علی نے کہا: "انھیں یہاں کے کسی آدمی نے آپ کے ساتھ آتے ہُوئے تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، یہاں پہنچ کر میں نے اسے جہاز سے باہر جھانکنے کی بھی اجازت نہیں دی اور اب بھی بندرگاہ کے جن پہرے داروں نے اسے میرے ساتھ آتے دیکھا ہے وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ یہ میرے ملّاحوں میں سے ایک ہے۔ راستے میں جہاز کے مُسافروں کو بھی اس کے متعلق یہی معلوم تھا کہ یہ جہاز کے عملہ سے تعلق رکھتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ بندرگاہ پر آپ

سے ملاقات ہوگئی ورنہ میں اس کے متعلق بہت پریشان تھا۔"

انور علی نے نوجوان سے مخاطب ہوکر کہا: "دیکھیے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، میں آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔"

نوجوان نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ انور علی کی طرف دیکھا اور کہا: "مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوگی۔"

کپتان فرانسسک نے کہا: "اب میں میسور کے متعلق آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں آج گورنر کی دعوت پر قریباً تمام وقت کورگ اور نرگنڈ میں سلطان ٹیپو کی فتوحات ہماری گفتگو کا موضوع بنی رہیں اور میں بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا رہا کہ مجھے کسی قیمت پر میسور کی ملازمت چھوڑنی نہیں چاہیے تھی۔ مجھے ماریشس پہنچ کر حیدر علی کی وفات کی اطلاع ملی تھی اور میں فرانس جانے کی بجائے واپس آنا چاہتا تھا، لیکن ماریشس میں ایک طویل علالت کے باعث میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ علالت کے ایام میں میری تمام دلچسپیاں میسور کی تازہ اطلاعات معلوم کرنے تک محدود تھیں اور میں یُوں محسوس کیا کرتا تھا کہ میسور میرا وطن ہے۔ میسور کی عزت اور آزادی میری عزت اور آزادی ہے۔ میں میسور کی فوج کی ہر شکست کو اپنی شکست اور ہر فتح کو اپنی فتح سمجھتا تھا۔ پھر جب میں مارسیلز پہنچا تو وہاں ہر مجلس میں ٹیپو کی فتوحات کے چرچے ہو رہے تھے۔ جن لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ میں میسور کی حکومت کا ملازم رہ چکا ہوں وہ مجھ سے عجیب و غریب سوالات کرتے تھے: ٹیپو کیسا ہے؟ —— اس کی عمر کیا ہے؟ —— اس کے چہرے کے خدوخال کیسے ہیں؟ —— تم نے کبھی اسے قریب سے دیکھا ہے؟ —— کبھی اس کے ساتھ بات کی ہے؟ —— اور جب میں یہ کہتا تھا کہ میں ٹیپو کو اس وقت سے جانتا ہُوں جب انھوں نے میسور کی فوج میں اپنا پہلا عُہدہ سنبھالا تھا اور میں ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں جنھیں ہر مہینے دو چار مرتبہ اُن سے مُصافحہ کرنے اور ہمکلام ہونے کا موقع ملتا تھا اور وہ مجھ سے فرانس کی تاریخ اور فرانس کے جغرافیہ کے متعلق بے شمار سوال پوچھا کرتے تھے، تو

سننے والوں کو میری باتوں کا یقین نہ آتا تھا۔ مجھے بہت جلد واپس جانا ہے ورنہ میں سلطان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ آج گورنر کے ساتھ گفتگو کے دوران میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ مرہٹے اور نظام میسور کے خلاف متحد ہو رہے ہیں اور اگر سلطان اُن کے ساتھ اُلجھ گیا تو انگریز بھی میدان میں آجائیں گے۔ اس صورت میں سلطان کو کئی محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ صلح نامہ منگلور کے بعد بھی میسور کے خلاف انگریزوں کے جارحانہ عزائم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اپنی سابقہ شکستوں کا انتقام لینے کے لیے صرف موزوں وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔"

انور علی نے کہا: "ہمیں انگریزوں کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انھوں نے نظام اور مرہٹوں کی اعانت کی امید پر جنگ شروع کی تھی اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ معاہدۂ منگلور کے بعد میسور کے خلاف جتنی سازشیں ہوئی ہیں اُن سب میں انگریز، نظام اور مرہٹے برابر کے حصہ دار ہیں لیکن ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ اگر نظام اور مرہٹوں نے انگریزوں کی شہ پر جنگ شروع کی تو ہم انگریزوں کے میدان میں آنے سے پہلے ہی انھیں پیس کر رکھ دیں گے۔ انگریز منگلور اور بدنور کی جنگوں میں اس قدر مفلوج ہو چکے ہیں کہ انھیں دوبارہ میدان میں آنے کے لیے کافی عرصہ لگے گا اور ہم جنگ کو طول دے کر انھیں تیاری کا موقع دینے کی غلطی نہیں کریں گے۔ سرِدست سلطان معظم نظام اور مرہٹوں کو جنگ سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، لیکن اگر انھوں نے ہمارے لیے جنگ کے سوا کوئی راستہ باقی نہ چھوڑا تو آپ دیکھیں گے کہ نظام اور نانا فرنویس اُس دن کو اپنی تاریخ کا منحوس ترین دن خیال کریں گے۔ جب انھوں نے انگریزوں کی اعانت کی امید پر میسور سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہمیں صرف اس بات کا افسوس ہے کہ ہمارے فرانسیسی حلیفوں نے ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ اگر منگلور کی جنگ کے ایام میں فرانسیسی فوج ہم سے علیحدہ نہ ہو جاتی تو آج ہمیں ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔"

کپتان فرانسک نے کہا: "میں اس مسئلہ میں فرانس کی وکالت نہیں کروں گا۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی جس پر مستقبل کے مورخ ہمیں ہمیشہ ملامت کرتے رہیں گے۔"

انور علی نے کہا: "لیکن اب بھی فرانس اگر حقیقت پسندی کا ثبوت دے تو سابقہ غلطیوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔"

فرانسک نے جواب دیا: "کاش آپ کو فرانس کے حالات کا صحیح علم ہوتا۔ انگریزوں کے ساتھ ہماری صلح کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم ان کی امن پسندی کے قائل ہو گئے تھے، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ آج فرانس کے اندرونی حالات اس قابل نہیں کہ وہ اپنی خارجہ سیاست کے میدان میں کوئی حقیقت پسندانہ قدم اٹھا سکے۔ اگر میں سلطان ٹیپو کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تو میں غیر مبہم الفاظ میں اپنی موجودہ حکومت کی ان کمزوریوں کا اعتراف کرتا جن کے باعث ہم اپنے حلیفوں کو کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ فرانس کا ہر باشعور آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ مشرق میں صرف میسور ایک ایسی قوت ہے جو انگریزوں کی جارحیت کا مقابلہ کر سکتی ہے لیکن کاش ایسے لوگوں کی آواز ہمارے حکمرانوں کو متاثر کر سکتی! میں موجودہ حالات میں فرانس کے مستقبل سے مایوس ہو چکا ہوں لیکن میسور کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوا۔ میرے ہم خیال لوگ اپنی بساط کے مطابق اس بات کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ فرانس ہندوستان میں سلطان ٹیپو کا پورا پورا ساتھ دے لیکن کاش وہاں بھی کوئی حیدر علی یا ٹیپو ہوتا!"

انور علی مسکرایا: "آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ایک بڑا آدمی ایک بڑی احتیاج کی پیداوار ہوتا ہے۔"

کپتان فرانسک کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "خدا کرے کہ فرانس کو سلطان ٹیپو جیسا رہنما مل جائے اور جب میں دوسری بار یہاں آؤں تو آپ کو یہ خوش خبری دے سکوں کہ میرے پیچھے ایک عظیم ترین جنگی بیڑا آ رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں چند بیکار آدمی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ آپ کو یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔"

انور علی نے جواب دیا: "میں سلطان ٹیپو کا سپاہی ہوں اور مایوسی میرے نزدیک ایک گناہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان آدمیوں کو کارآمد بنا سکیں گے۔"

"لیکن میں حیران ہوں کہ اس کام کے لیے آپ کو کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ آپ کو کوئی اہم ذمہ داری سونپی جانی چاہیے تھی اور پھر آپ کے لیے پانڈی چری کی بجائے مغربی ساحل کی کسی بندرگاہ سے اسلحہ اور سپاہی حاصل کرنا آسان ہے۔"

"ہم باہر سے جو اسلحہ منگواتے ہیں وہ تو عام طور پر منگلور کی بندرگاہ پر ہی اترتا ہے۔ میں درحقیقت پانڈی چری میں اپنی حکومت کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ یہاں پہنچ کر مجھے چند ایسے یورپین مل گئے جو روزگار کی تلاش میں بھٹک رہے تھے اور میں نے انھیں چند دن فوجی تربیت دے کر میسور بھیج دیا۔ اس کے بعد مجھے حکم آیا کہ میں باقاعدہ بھرتی کا ایک دفتر کھول دوں۔ اور میں اس بات پر خوش ہوں کہ مجھے بیکاری کے دن گزارنے کے لیے ایک مشغلہ مل گیا ہے۔ مجھے کورگ کے محاذ سے یہاں بھیجا گیا تھا اور ذاتی طور پر میں اس بات پر خوش نہ تھا لیکن میرے یہاں بھیجے جانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں فرانسیسی زبان جانتا ہوں اور دوسری یہ کہ کورگ کی چند جنگوں میں میں نے بے احتیاطی یا ضرورت سے زیادہ جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک دن سپہ سالار برہان الدین نے مجھے بلا کر کہا کہ کورگ کی جنگ اب قریباً ختم ہو چکی ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ تم اس سے زیادہ اہم معرکوں میں حصہ لینے کے لیے زندہ رہو۔ سلطان کسی ذہین آدمی کو پانڈی چری بھیجنا چاہتے ہیں اور میں نے تمھارا نام پیش کر دیا ہے — مجھے یہاں آکر بہت مایوسی ہوئی ہے۔ پانڈی چری کے گورنر سے لے کر معمولی افسر تک یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انگریزوں کے عزائم کے متعلق ہمارے خدشات صحیح ہیں اور جب جنگ کے لیے ان کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو معاہدۂ وارسیلز کی حیثیت ردّی کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ لیکن جب فرانس اور میسور کے درمیان عملی تعاون کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے تو ان سب کا یہی جواب ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ہم بے بس ہیں۔ جب تک انگریزوں کی طرف سے پہل نہیں ہوتی، فرانس کی حکومت معاہدۂ وارسیلز کی خلاف ورزی پسند نہیں کرے گی۔"

فرانسسک نے کہا "مجھے ڈر ہے کہ فرانس کی حکومت انگریزوں کی طرف سے پہل کے بعد

بھی 'دیکھو اور انتظار کرو' کی پالیسی پر کاربند رہے گی۔ میں نے آج گورنر کے ساتھ باتوں میں اندازہ لگایا ہے کہ وہ سلطان ٹیپو کے ساتھ تعاون کے پُرزور حامی ہیں لیکن فرانس کے اندرونی حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ آپ کو وہاں سے کسی امداد کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔"

انور علی اور کپتان فرانسسک قریباً دو گھنٹے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ بالآخر کپتان فرانسسک نے اٹھتے ہوئے کہا "اب بہت زیادہ دیر ہو گئی ہے مجھے اجازت دیجیے اگر فرصت ملی تو میں کل دوبارہ ملنے کی کوشش کروں گا۔"

انور علی اٹھ کر کپتان فرانسسک کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا اور لیگرانڈ بھی ایک ثانیہ توقف کے بعد اُن کے پیچھے ہو لیا۔ خیمے سے باہر نکل کر کپتان فرانسسک نے کہا، "آپ آرام کیجیے۔"

انور علی نے کہا "میں بندرگاہ تک آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

"نہیں نہیں اس تکلف کی ضرورت نہیں، آپ آرام کریں۔"

دو پہرے دار چند قدم دور کھڑے تھے۔ انور علی نے ان میں سے ایک کو کپتان فرانسسک کے ساتھ بندرگاہ تک جانے کا حکم دیا۔

فرانسسک نے یکے بعد دیگرے انور علی اور لیگرانڈ سے مصافحہ کیا اور پہرے دار کے ساتھ چل دیا۔

"آیئے!" انور علی نے لیگرانڈ کا بازو پکڑتے ہوئے کہا

جب وہ واپس خیمے میں داخل ہوئے تو انور علی نے کہا: "دیکھیے اس وقت آپ کے لیے علیحدہ خیمہ نصب کرنے میں دیر لگے گی اس لیے آج رات آپ کو میرے ساتھ گزارہ کرنا پڑے گا۔"

لیگرانڈ نے جواب دیا "مجھے علیحدہ خیمے کی ضرورت نہیں اور میں آپ کو بھی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ میں آپ کے کسی نوکر کے ساتھ گزارہ کر سکتا ہوں۔"

"نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

انور علی نے دلاور خاں کو ایک اور بستر لانے کو کہا اور تھوڑی دیر بعد یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب لیٹ گئے۔ انور علی کو لیگرانڈ کے ساتھ پہلی ملاقات میں جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ اس کی کرب انگیز خاموشی تھی۔ اس نے کہا "موسیو! مجھے یہ معلوم نہیں کہ پیرس میں آپ پر کیا بیتی ہے لیکن میں آپ کو یہ اطمینان دلا سکتا ہوں کہ یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ اب آپ اطمینان سے سو جائیں مجھے یقین ہے کہ پانڈی چری کی حکومت عام حالات میں آپ پر کوئی خاص توجہ نہیں دے گی۔ لیکن اگر کوئی فوری خطرہ پیش آیا تو میں آپ کو یہاں سے کسی محفوظ جگہ پہنچا دوں گا۔"

تشکر اور احسان مندی کے جذبات لیگرانڈ کے سینے میں مچل کر رہ گئے۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا "موسیو! آپ بہت رحم دل ہیں۔"

○

تیسرے دن کپتان فرانسس کا جہاز روانہ ہو چکا تھا۔ لیگرانڈ کی شخصیت انور علی کے لیے ایک معمے سے کم نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اتنا کم گو نوجوان نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ باتیں کرنے کی کوشش کرتا لیکن لیگرانڈ اس کے ہر سوال کا مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ اس کی مغموم صورت دیکھ کر انور علی کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے مگر اسے زیادہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

ایک دن آدھی رات کے قریب انور علی اپنے خیمے میں شور سن کر گہری نیند سے بیدار ہوا۔ لیگرانڈ خواب کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔ "یہ مر چکا ہے —— میں بے قصور ہوں —— میں نے کوئی جرم نہیں کیا —— تم ظالم ہو —— خدا کے لیے مجھے میرے اسکول لے چلو —— جین جلدی کرو۔ ہم یہاں سے نکل چلیں —— وہ آرہے ہیں ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے جلدی

کرو! بھاگو! بھاگو!!"

دلاور خاں مشعل ہاتھ میں لیے خیمے میں داخل ہوا۔ انور علی نے لیگرانڈ کی طرف دیکھا اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا اور اس کی حرکات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خوفناک عفریت کی گرفت سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ انور علی جلدی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور لیگرانڈ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔ لیگرانڈ نے آنکھیں کھولیں اور ٹکٹکی باندھ کر انور علی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بڑی تیزی سے سانس لے رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" انور علی نے کہا "تم ٹھیک ہو نا؟" پھر وہ دلاور خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ "دلاور خاں تم بھاگ کر فرانسیسی فوج کے کمانڈر کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ مجھے ایک تجربہ کار ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

لیگرانڈ نے کہا "نہیں نہیں موسیو! میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ میں ایک بھیانک سپنا دیکھ رہا تھا۔ مجھے صرف پانی منگوا دیجیے۔"

انور علی نے دلاور خاں کو پانی لانے کے لیے کہا اور اس نے خیمے کے اندر پڑی ہوئی ایک صراحی سے کٹورا بھر کر لیگرانڈ کو پیش کر دیا۔ لیگرانڈ نے ہانپتے کانپتے پانی کا کٹورا حلق میں انڈیل لیا اور انور علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا "موسیو میں بہت شرمسار ہوں، میں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہے۔"

انور علی نے کہا "مجھے صرف اس بات کا ملال ہے کہ میں تمہاری تکلیف میں حصہ دار نہیں بن سکتا۔ میں نے عمداً تمہارا رازدار بننے کی کوشش نہیں کی لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمہیں کسی ایسے دوست کی ضرورت ہے جو تمہارے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ جین کون ہے؟"

لیگرانڈ نے جواب دیا "موسیو! اگر میں نے آپ سے اپنا کوئی راز چھپانے کی کوشش کی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے آپ پر اعتماد نہ تھا۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے آپ

کو پریشان کرنا گوارا نہ تھا۔ اب آپ اطمینان سے اپنے بستر پر لیٹ جائیے میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔"

انور علی نے دلاور خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "دلاور خاں جاؤ تم آرام کرو۔"

دلاور خاں چلا گیا اور انور علی اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر خیمے کے اندر خاموشی طاری رہی۔ بالآخر لیگرانڈ نے اپنی سرگزشت شروع کی: "موسیو انور علی! قدرت نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے۔ میں آپ کو اپنی سرگزشت سناتا ہوں۔ میرا اصلی نام لیبرٹ ہے۔ میں مارسیلز اور پیرس کے درمیان ایک چھوٹے سے شہر میں پیدا ہوا تھا۔ میرا باپ فرانس کی بحریہ کے ایک جہاز کا کپتان تھا۔ جب میں دس سال کا ہوا تو میرے باپ کو ایک مہم کے ساتھ ہندوستان آنا پڑا۔ والد کے آنے سے قریباً ایک سال بعد میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ گھر میں اب صرف میری ایک بہن تھی جو مجھ سے آٹھ سال بڑی تھی۔ ابا جان اڑھائی سال کے بعد واپس آئے۔ ہندوستان میں کسی جنگ میں زخمی ہونے کے باعث ان کا ایک بازو بیکار ہو چکا تھا۔ واپس آتے ہی انھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور جو روپیہ انھوں نے ملازمت کے زمانے میں جمع کیا تھا، اس سے ایک سرائے خرید لی۔ مارسیلز اور پیرس کے درمیان آنے جانے والے مسافروں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور ہمارے لیے سرائے کا کاروبار کافی سود مند ثابت ہوا۔ چند سال بعد میرے ابا شہر کے امیر آدمیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ سرائے کے اندر مسافروں کے لیے چند نئے کمروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میری بہن کی شادی فوج کے ایک لیفٹیننٹ کے ساتھ ہو چکی تھی اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ ماریشس جا چکی تھی۔ میں پیرس کے نزدیک ایک فوجی اسکول میں داخل ہو چکا تھا۔ میرے ابا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں فرانس کی فوج میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کروں اور میں بھی اپنے مستقبل کے متعلق کم پُرامید نہ تھا لیکن آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایک انسان سپنے دیکھ سکتا ہے مگر سپنوں کی تعبیر اس کے اختیار میں نہیں ہوتی۔

میں موسمِ سرما کی تعطیلات میں گھر آیا ہوا تھا۔ گھر پر فرصت کے وقت میں سرائے کے کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ میری چھٹی میں کوئی دس باقی تھے کہ ایک صبح ایک بگھی سرائے کے دروازے پر رکی۔ ابا جان ابھی گھر سے نہیں آئے تھے اور میں ان کی جگہ مسافروں کو خوش آمدید کہنے کے لیے باہر نکلا۔ ایک عمر رسیدہ آدمی ایک نوجوان لڑکی کا سہارا لے کر بگھی سے اتر رہا تھا۔ میں نے بھاگ کر عمر رسیدہ آدمی کا بازو تھام لیا۔ لڑکی نے کہا: "میرے ابا کو راستے میں تکلیف ہو گئی ہے۔ آپ فوراً کسی ڈاکٹر کو بلوائیں۔"

میں نے اپنے ایک نوکر کو شہر کے بہترین ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا اور مسافر کو سرائے کے ایک کمرے میں لٹا دیا۔ اس مسافر کا نام موسیو اینٹن تھا اور وہ پیرس کا ایک خوش حال تاجر تھا۔ لڑکی کا نام جین تھا۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھی: "ڈاکٹر کا گھر کتنی دور ہے —— اس نے اتنی دیر کیوں لگائی —— اگر اس کا گھر زیادہ دور تھا تو آپ نے اپنے نوکر کو پیدل بھگانے کی بجائے ہماری بگھی کیوں نہ بھیج دی؟" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر کا گھر بالکل قریب ہے وہ آ ہی رہا ہو گا۔

اچانک موسیو اینٹن اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے کہا: "بیٹی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میرے لیے یہ بیماری نئی نہیں دیکھو اب میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔"

لڑکی چلائی: "نہیں نہیں ابا جان آپ آرام سے لیٹے رہیں!" اور موسیو اینٹن مسکراتا ہوا دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر بھی پہنچ گیا۔ اس نے مریض کا معائنہ کرنے اور اس سے چند سوالات پوچھنے کے بعد بتایا کہ انھیں دل کی بیماری ہے اور اب بظاہر کوئی خطرہ نہیں لیکن ایسی حالت میں انھیں سفر نہیں کرنا چاہیے۔ جین نے ڈاکٹر کی تائید کی اور موسیو اینٹن کو سفر کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا لیکن کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ پیرس کے اس تاجر اور اس کی بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی سے یہ ملاقات میری زندگی کا رخ بدل دے گی۔

موسیو اینٹن اور اس کی لڑکی مارسیلز میں اپنے کسی رشتہ دار کی شادی میں شرکت کے بعد

واپس جا رہے تھے۔ جب انھیں یہ پتہ چلا کہ میں پیرس میں تعلیم پاتا ہوں اور میری چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں تو انھوں نے مجھے اپنی بگھی پر سفر کرنے کی دعوت دی اور میری خاطر ایک دن اور رُک گئے۔ چنانچہ تیسرے دن میں ان کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

پیرس سے کوئی دس میل دُور موسیو اینٹن کو ایک بار پھر دل کا دورہ پڑا اور ہمیں دو دن کے لیے راستے کی ایک سرائے میں اور قیام کرنا پڑا۔ عام حالات میں پیرس کے اُونچے طبقے کی ایک لڑکی شاید مجھے قابلِ توجہ نہ سمجھتی لیکن موسیو اینٹن کی علالت کے باعث میں اس کے لیے ایک بہت بڑا سہارا بن چکا تھا۔

سرائے میں دوسری رات موسیو اینٹن کی طبیعت ذرا زیادہ خراب تھی اور ہمیں کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھ کر جاگنا پڑا۔ پچھلے پہر اسے نیند آگئی اور جین بھی اپنی کُرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ صبح کے وقت موسیو اینٹن نے آنکھیں کھولتے ہی میری طرف دیکھا اور کہا "مجھے افسوس ہے کہ آج آپ کو ساری رات جاگنا پڑا۔"

مَیں نے پُوچھا "اب آپ کا کیا حال ہے؟"

موسیو اینٹن نے جواب دیا "میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اب میرا ارادہ ہے کہ میں فوراً پیرس پہنچ کر کسی قابل ڈاکٹر سے علاج کراؤں۔"

مَیں نے کہا "ابھی آپ کے لیے سفر کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں پیرس جا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو یہاں لے آؤں۔"

موسیو اینٹن نے جواب دیا "اس بوسیدہ سرائے میں اگر دنیا کے تمام بہترین ڈاکٹر جمع ہو جائیں تو بھی مجھے آرام نہیں آئے گا۔ مَیں اب کسی تاخیر کے بغیر پیرس پہنچنا چاہتا ہوں۔"

ہماری باتیں سُن کر جین بھی جاگ اُٹھی اور اس نے بھی اپنے باپ کو سفر کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن موسیو اینٹن کا فیصلہ اٹل تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ بگھی پر سوار ہو گئے۔ باقی سفر کے متعلق مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نیند کی حالت میں کبھی ایک طرف اور کبھی

دُوسری طرف لڑھک رہا تھا۔ پھر جب میں گہری نیند سے بیدار ہُوا تو بگھی ایک کشادہ مکان کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ جین مجھے سہارا دیے ہُوئے تھی اور موسیو اینٹن مُسکرا رہا تھا۔

"معاف کیجیے!" مَیں نے جلدی سے ایک طرف ہٹ کر کہا۔

بگھی رُکی تو ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور موسیو اینٹن نے کہا "یہ میرا بیٹا ڈینس ہے۔"

موسیو اینٹن کے مکان میں داخل ہوتے وقت مجھے اس کی امارت کا صحیح اندازہ ہُوا۔ مَیں نے کھانا کھانے کے بعد اُن سے اجازت لینے کی کوشش کی، لیکن وہ سب میرا اسکول کھُلنے تک مجھے اپنے ہاں ٹھہرنے پر مُصر تھے اور مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

جین کا بھائی ڈینس ایک ذہین اور کم گو نوجوان تھا اور پیرس میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ان لوگوں سے مختلف تھا جو کسی اجنبی کے ساتھ فوراً گھُل مِل جاتے ہیں۔ چار دن بعد میں نے اپنے میزبانوں سے اجازت لی اور موسیو اینٹن سے وعدہ کیا کہ میں چھُٹی کے دن ان کے ہاں آیا کروں گا۔ اس کے بعد اسکول کے باہر میری سب سے بڑی دل چسپی موسیو اینٹن کا گھر تھا۔ ہمارا اسکول پیرس سے چند میل دُور تھا۔ میں ہر مہینے ایک دو مرتبہ ہفتے کی شام اُن کے ہاں جاتا اور اتوار کے دن واپس آ جاتا اور جب کبھی مجھے ہفتے کی شام پیرس جانے کا موقع نہ مِلتا میں اتوار کی صبح وہاں پہنچ جاتا اور سارا دن وہاں گزارتا۔ ڈینس عام طور پر گھر سے غیر حاضر رہتا تھا اور گھر میں کسی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اپنے کالج سے باہر اس کی مصروفیات کیا ہیں۔ مجھے یہ ماننے سے انکار نہیں کہ اس خاندان کے ساتھ میری وابستگی کی ایک بڑی وجہ جین تھی۔ لیکن مجھے اس بات کا پورا احساس تھا کہ زندگی میں ہمارے راستے کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ بے شک وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جنھیں ایک بار دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن اگر میں اسے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا تو یہ ایک پرلے درجے کی خود فریبی ہوتی۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے

پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آجایا کرتی ہے اور صرف یہ مسکراہٹ دیکھنے کے لیے ہی مَیں بڑی بے تابی کے ساتھ چھٹی کے دن کا انتظار کیا کرتا تھا۔

ایک دن مَیں نے موسیو اینٹن کے ہاں چند گھنٹے گزار کر رخصت کی اجازت طلب کی تو انھوں نے اِصرار کیا کہ تم رات کا کھانا کھا کر جاؤ۔ میرا نوکر تمھیں بگھی پر چھوڑ آئے گا۔ شام سے کچھ دیر پہلے ڈینس اپنے کسی دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے باہر نکل گیا۔ رات کے وقت ہم کھانے کے لیے اس کا انتظار کرتے رہے لیکن جب نو بج گئے تو ہم مایوس ہو کر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ موسیو اینٹن بے حد خفا تھا لیکن جین اپنے بھائی کی وکالت کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد موسیو اینٹن کی خفگی دُور ہو چکی تھی اور وہ اپنی عادت کے مطابق بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے اجازت مانگی تو اس نے کہا "تھوڑی دیر اور بیٹھو۔ میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اگلے مہینے کی دسویں تاریخ کو جین کی منگنی کے سلسلے میں بڑی ہال دعوت ہے۔ اس میں تمھاری شرکت ضروری ہے۔"

میں نے جین کی طرف دیکھا، لیکن میرے لیے اس کے چہرے سے اُس کے احساسات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا۔ مَیں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میری آواز میرے قابو میں نہ تھی۔ اچانک باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ ڈینس اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے دباتے لڑکھڑاتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا اور مُنہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر ڈینس کو سہارا دینے کی کوشش کی۔ اس کا لباس خون سے تر تھا۔ جین سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ موسیو اینٹن اپنی کرسی سے اُٹھا، چند ثانیے اپنا دل دونوں ہاتھوں سے دباتے کھڑا رہا اور پھر اچانک منہ کے بل گر پڑا۔ میں ڈینس کو وہیں چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا اور اُسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کے دل کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ میں دوبارہ ڈینس کی طرف متوجہ ہُوا اور اسے اٹھانے کی کوشش کی، لیکن اُس نے کہا "موسیو تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ پولیس میرا پیچھا کر رہی ہے۔ تمھارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔" دو نوکر انتہائی بدحواسی کی حالت میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ مَیں نے انھیں ڈاکٹر کو بُلانے کے لیے کہا۔ جین پہلے اپنے باپ کی لاش کے ساتھ لپٹ کر چیخیں مارتی رہی اور پھر اپنے بھائی کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ میرے لیے یہ ایک بھیانک خواب تھا اور یہ خواب میں کئی بار دیکھ چکا ہُوں۔ سوتے جاگتے یہ دل خراش منظر میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

ڈینس بار بار مجھے یہ کہہ رہا تھا "تم بھاگ جاؤ۔ تمھارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں تم بے گناہ پکڑے جاؤ گے" اچانک پولیس کا ایک انسپکٹر اور چند سپاہی کمرے میں داخل ہُوئے۔ انسپکٹر نے ڈینس کے سر کے بال پکڑ کر اُسے انتہائی بے دردی سے جھنجھوڑتے ہُوئے کہا "بتاؤ تمھارے ساتھی کون تھے؟"

جین نے انسپکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن ایک سپاہی نے اُسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ مَیں نے ایک مُکا سپاہی کے منہ پر رسید کیا اور اس کے بعد انسپکٹر کا گلا دبوچ لیا۔ باقی سپاہی مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مَیں اُن کی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ انسپکٹر پھر ایک بار ڈینس کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ پوچھ رہا تھا "بتاؤ تمھارے ساتھی کون ہیں؟" لیکن ڈینس کے پاس ایک حقارت آمیز مُسکراہٹ کے سوا اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا اور یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اس وقت بھی کھیل رہی تھی جب کہ وہ اپنا سفرِ حیات ختم کر چکا تھا۔

انسپکٹر نے میری طرف دیکھا اور کہا "یہ مر چکا ہے لیکن تم زندہ ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم ہمارے ہر سوال کا جواب دے سکو گے۔"

مَیں نے کہا "مجھے معلوم نہیں کہ اس نے کیا جرم کیا ہے۔ لیکن تمھیں ایک زخمی کے ساتھ اس وحشیانہ سلوک کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

جین کی چیخیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ سپاہیوں کو میری طرف متوجہ پا کر بھاگتی ہوئی عقب کے کمرے میں چلی گئی۔

انسپکٹر کے حکم سے میرا کوٹ اُتار دیا گیا اور مجھے دروازے کے سامنے برآمدے کے ایک

ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ پھر ایک سپاہی مجھ پر کوڑے برسا رہا تھا اور انسپکٹر بار بار ڈینس کے دوسرے ساتھیوں کے متعلق مجھ سے سوال کر رہا تھا۔ میں نے اسے ہر ممکن طرح سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے ڈینس کے کسی ساتھی کا علم نہیں اور میں فوجی اسکول میں تعلیم حاصل کرتا ہوں اور اس وقت میرا اس مکان میں موجود ہونا محض ایک اتفاق تھا۔ لیکن انسپکٹر میری کسی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اچانک جین اپنے ہاتھ میں پستول لیے نمودار ہوئی اور اس نے کسی توقف کے بغیر انسپکٹر پر گولی چلا دی۔ گولی انسپکٹر کے بازو پر لگی اور سپاہیوں نے جین کو گرفتار کر لیا۔ اب سپاہیوں کی توجہ میری بجائے انسپکٹر پر مرکوز ہو چکی تھی۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا کوٹ اتارا اور ایک سپاہی کو بازو پر پٹی باندھنے کے لیے کہا۔ اچانک دس بارہ آدمی مکان کے پائیں باغ سے نمودار ہوئے اور وہ پولیس پر ٹوٹ پڑے۔ آن کی آن میں انھوں نے دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور باقی چار آدمیوں کو غیر مسلح کر کے حراست میں لے لیا۔ حملہ آوروں کے چہروں پر نقاب تھے اور میرے لیے یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کون ہیں۔ مجھے آزاد کرنے کے بعد انھوں نے ڈینس کے متعلق پوچھا اور میں نے انھیں بتایا کہ ڈینس اور اس کے والد کی لاشیں اندر پڑی ہوئی ہیں۔ انھوں نے انسپکٹر اور اس کے باقی ساتھیوں کو رسیوں میں جکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ پھر ایک آدمی نے جین سے کہا۔ ڈینس کی بہن ہم سب کی بہن ہے۔ آج ایک غدار نے پولیس کو ہمارے خفیہ اجلاس کے متعلق خبردار کر دیا تھا اب آپ کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے آپ ہمارے ساتھ چلیں۔"

جین نے جواب دیا۔ "نہیں میں اپنے باپ اور بھائی کی لاشیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ پولیس میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔"

نقاب پوش نے کہا۔ "میری بہن! ڈینس نے ایک بڑے مقصد کے لیے جان دی ہے اگر آپ نے یہاں ٹھہرنے پر ضد کی تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ ہم

اپنے ایک ساتھی کی بہن کی عزت بچانے کے لیے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں ہمیں اپنی جان کا خوف نہیں لیکن ہم اس مقصد کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں جو ڈینس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ خدا کے لیے آپ وقت ضائع نہ کیجیے۔ اب باتوں کا وقت نہیں۔ چلیے۔ آپ شاید ایک عرصہ کے لیے دوبارہ اس گھر میں نہ آ سکیں اس لیے گھر میں جو نقدی یا زیور ہے وہ نکال لیجیے۔"

جین اضطراب اور تذبذب کی حالت میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ نقاب پوش نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "موسیو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ایک غلط اتفاق نے ہماری صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ چلیے اب آپ کے لیے پیرس میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "مجھے ڈینس کی موت کا افسوس ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے آپ لوگوں کے مقاصد کے ساتھ کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کسی خطرناک جماعت سے تعلق رکھتے ہیں تو ہمارے راستے مختلف ہیں۔ میں نے اگر کوئی جرم کیا ہے تو وہ صرف یہ کہ میں نے ایک زخمی کے ساتھ پولیس کے وحشیانہ سلوک سے متاثر ہو کر انسپکٹر پر ہاتھ اُٹھایا ہے اور میں پیرس کی ہر عدالت کے سامنے اس جرم کا اقبال کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

نقاب پوش نے کہا۔ "ہم تمھیں اپنے ساتھ شریک ہونے کی دعوت نہیں دیتے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اب تم پیرس کی پولیس کو کبھی اس بات کا یقین نہیں دلا سکو گے کہ تم فرانس کے ایک امن پسند شہری ہو۔ ہم صرف تمھاری جان بچانا چاہتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جین کو کسی محفوظ جگہ پہنچانے کے لیے ہمیں تمھاری اعانت کی ضرورت ہے۔"

میں نے جلدی سے اپنا کوٹ پہنا اور جین سے کہا۔ "جین! میں تمھارے ساتھ ہوں۔ ہمارے لیے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اب وقت ضائع نہ کرو۔"

جین کی قوت فیصلہ جواب دے چکی تھی تاہم میرے اور اپنے بھائی کے دوستوں کے

سمجھانے پر وہ گھر چھوڑنے پر آمادہ ہو گئی۔ ہم نے گھر سے نقد روپیہ اور زیورات کے علاوہ جین کے چند ضروری کپڑے نکال کر ایک بکس میں رکھ لیے۔ اتنی دیر میں دو آدمی بگھی تیار کر چکے تھے۔ ایک نوجوان نے کوچوان کی جگہ سنبھال لی اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ پیرس کے بازاروں اور گلیوں میں ابھی تک رونق تھی اور ہمیں شہر سے باہر نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ایک جگہ ہمیں پہرے داروں نے روکا لیکن میری وردی دیکھ کر انھوں نے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ صبح تک ہم پیرس سے کئی میل دور آ چکے تھے۔

ایک شہر کے قریب پہنچ کر ہمارے کوچوان نے بگھی روکی اور مجھے کہا "اب گھوڑے بہت تھک گئے ہیں اور یوں بھی اس بگھی پر تمھارا سفر کرنا خطرناک ہوگا۔ میرے ساتھی صبح ہوتے ہی مکان چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے۔ اس وقت تک شاید پولیس اپنے آدمیوں کا حال معلوم کر چکی ہو۔ انھیں موسیو ڈونیس کے نوکروں سے تمھارا پتہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ پھر وہ فوجی اسکول سے باسانی تمھارے گھر کا پتہ معلوم کر لیں گے اور دوپہر سے پہلے پہلے اس سڑک پر تمھاری تلاش شروع ہو جائے گی۔ میں تمھیں اس شہر کی سرائے میں پہنچا کر واپس آ جاؤں گا اور پولیس کو دھوکا دینے کے لیے اس بگھی کو کسی دوسری سڑک پر چھوڑ دوں گا۔"

یہ نوجوان جو ایک کوچوان کی حیثیت سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔ انقلابی جماعت کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ اس سے چند سوالات پوچھنے پر مجھے یہ معلوم ہوا کہ ڈونیس ان سرپھروں کا لیڈر تھا اور گزشتہ شب جب ایک مکان میں ان لوگوں کا جلسہ ہو رہا تھا۔ کسی غدار نے پولیس کو خبردار کر دیا تھا۔ بیشتر انقلابی مسلح ہو کر آئے تھے۔ پولیس آس پاس کی گلیوں کی ناکہ بندی کے لیے جمع ہو رہی تھی کہ انقلابیوں کو پتہ چل گیا اور وہ بھاگ نکلے۔ ایک گلی میں پولیس کے چند آدمیوں کے ساتھ ان کا تصادم ہوا اور دو نوجوان ہلاک ہو گئے۔ ڈونیس اس تصادم میں

زخمی ہو کر بھاگا لیکن تھوڑی دور جا کر گر پڑا۔ اس کے دو ساتھیوں نے اُسے سہارا دیا اور اسے گھر کے دروازے تک پہنچا گئے۔ جب وہ واپس آ رہے تھے تو انھیں پولیس کے سپاہیوں کی ایک ٹولی دکھائی دی۔ وہ پاس ہی ایک تنگ گلی کے اندر ایک اور انقلابی کے مکان میں چھپ گئے اور جب پولیس آگے نکل گئی تو اُن میں سے ایک نوجوان صورتِ حالات کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکلا۔ تھوڑی بعد اس نے آ کر یہ بتایا کہ پولیس کے سپاہی ڈونیس کے مکان میں داخل ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں نے چند منٹ کے اندر اندر اپنے دوسرے ساتھیوں کو جمع کیا اور ہماری مدد کو پہنچ گئے۔

جین بے حس و حرکت بیٹھی ہماری باتیں سُن رہی تھی۔ بگھی دوبارہ روانہ ہوئی اور تھوڑی دیر بعد ہم شہر کی سرائے میں پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم نے دوسری بگھی کرائے پر لی اور اپنے دوسرے ساتھی کو خدا حافظ کہا۔ باقی راستہ ہم نے بہت کم آرام کیا۔

جین اپنے ساتھ کافی روپیہ لائی تھی اور ہمیں ہر منزل پر تازہ دم گھوڑے حاصل کرنے میں کوئی وقت پیش نہ آئی۔ تیسری رات دو بجے کے قریب میں اپنے گھر پہنچ گیا۔ بگھی کو میں نے احتیاطاً مکان سے دور سڑک پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہمارا نوکر سو رہا تھا اور میں نے اُسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ میرے باپ نے انتہائی رنج اور اضطراب کی حالت میں ہماری سرگزشت سُنی۔ انھیں یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ ہمیں فوراً فرانس کی حدود سے باہر نکل جانا چاہیے۔ انھوں نے جلدی سے ضروری سامان باندھا اور کہا "ہم مارسیلز جا رہے ہیں۔ میں ابھی سرائے سے بگھی لے کر آتا ہوں، تم اپنے سکول کی وردی اتار کر دوسرا لباس پہن لو اور سڑک پر پہنچ کر میرا انتظار کرو!"

تھوڑی دیر بعد ہم مارسیلز کا رُخ کر رہے تھے۔ مارسیلز پہنچ کر ہم امریکہ جانا چاہتے تھے، لیکن بدقسمتی سے امریکہ جانے والا ایک جہاز ہمارے پہنچنے سے دو دن قبل روانہ ہو چکا تھا اور دوسرا جہاز دو ہفتے بعد چھوٹنے والا تھا۔ ہمارے لیے ایک ایک لمحہ تشویشناک تھا۔ اتفاق سے میرے والد کو کپتان فرانسسک مل گئے۔ یہ کسی زمانے میں میرے والد کے ماتحت رہ چکے تھے۔

ان کا جہاز اگلی صبح چند سپاہی اور اسلحہ لے کر ماریشس کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ کپتان فرانسک نے رات کے وقت ہمیں اپنے پاس ٹھہرایا اور پچھلے پہر باقی سواریوں سے کچھ دیر پہلے ہمیں اپنے جہاز پر پہنچا دیا۔ بندر کا محافظ افسر بھی میرے والد کا دیرینہ دوست نکلا اور اس کی مدد سے ہم جانچ پڑتال سے بچ گئے۔ مارسیلز پہنچنے سے قبل میرے والد کا یہ خیال تھا کہ وہ ہمیں امریکہ جانے والے کسی جہاز پر سوار کرکے واپس چلے جائیں گے لیکن جب کپتان فرانسک نے انھیں یہ سمجھایا کہ اب فرانس میں آپ کا رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں تو وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے ان کی آمادگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ جہاز ماریشس جا رہا تھا اور وہاں میری بہن رہتی تھی۔ کپتان فرانسک نے ہمیں جہاز کے ملاحوں کی وردیاں مہیا کردیں اور جین کے متعلق انھوں نے یہ مشہور کر دیا کہ اس کا شوہر ماریشس کی فوج میں ملازم ہے اور یہ اس کے پاس جا رہی ہے۔

بحری سفر کے دوران میں مجھے اگر کوئی پریشانی تھی تو وہ جین اور اپنے باپ کے متعلق تھی۔ جین ہر وقت حزن و غم کی تصویر بنی رہتی تھی۔ زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے اس کے چہرے کی دل فریب مسکراہٹیں چھین لی تھیں۔ جب میں کوئی بات کرتا وہ کھوئی کھوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی اور مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتی۔ اپنے باپ کے متعلق میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں انھیں آرام کی ضرورت تھی اور میری وجہ سے وہ مصیبت میں پھنس گئے ہیں لیکن ابا جان کو اپنے مقدر کے متعلق کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ ہر حالت میں مسکرانے کے عادی تھے۔ جہاز پر انھوں نے کپتان کے حصے کا بہت سا کام سنبھال رکھا تھا۔

پھر ہماری بدنصیبی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ماریشس سے چند دن کے فاصلے پر ہمارے جہاز میں زرد بخار کی وبا پھوٹ نکلی اور تین دن کے اندر اندر آٹھ آدمی مر گئے۔ پانچویں دن میرا باپ بھی چل بسا۔ ہم سب زندگی سے مایوس ہو چکے تھے لیکن جین پر اس کا جو اثر ہوا وہ ہم سب کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ دن رات تمام بیماروں کی تیمارداری میں مصروف رہتی تھی۔ دوسرے لوگ یہاں تک کہ جہاز کا ڈاکٹر بھی مریضوں کے پاس بیٹھنے سے گھبراتا تھا۔ لیکن جین ہر مریض

کی تیمارداری اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اسے اپنی بھوک پیاس اور تھکاوٹ تک کا احساس نہ تھا۔

بیماری پھیلتی گئی اور کپتان نے جزیرہ بوربون کے ساحل پر رکنے کا فیصلہ کیا لیکن ابھی ہم وہاں سے دو دن کے راستے پر تھے کہ ہمیں ایک شدید طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم رات بھر زندگی اور موت کے درمیان لٹکتے رہے۔ اگلے دن طوفان تھم گیا اور ہمیں بوربون کا ساحل نظر آنے لگا۔ زرد بخار کی وبا کے باعث تین آدمی ہلاک ہو چکے تھے۔ بوربون کی بندرگاہ پر اترنے کے بعد جہاز کے کسی آدمی کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی، چنانچہ جہاز سے پرے سمندر کے کنارے کیمپ لگا دیا گیا۔ کپتان فرانسک نے یہاں بھی ہماری مدد کی اور ہمیں رات کے وقت کیمپ سے نکال کر ماریشس جانے والے ایک عرب تاجر کے جہاز پر سوار کرا دیا۔ رخصت کے وقت انھوں نے ہمیں یہ بتایا کہ مجھے اپنے جہاز کی مرمت کے لیے کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ تمھارے لیے کسی بندرگاہ پر اترنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس لیے عرب تاجر تمھیں بندرگاہ سے کچھ دور ساحل پر اتار دے گا۔ میں جہاز کی مرمت کے بعد جلد از جلد ماریشس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ پھر وہاں سے تمھیں ہندوستان پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔ تمھیں ماریشس میں کسی پر اپنا صحیح نام ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ پیرس کی پولیس تمھارے متعلق معلومات حاصل کرتے ہی ماریشس میں تم کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گی۔

پھر کپتان فرانسک نے مجھے ایک خط دیتے ہوئے کہا ماریشس کی پولیس کا ایک افسر میرا دوست ہے اور میں نے یہ خط اس کے نام لکھا ہے۔ اگر تمھیں کبھی ضرورت پڑے تو یہ خط اس کے پاس لے جانا وہ تمھاری ہر ممکن اعانت کرے گا۔"

عرب تاجر ان لوگوں میں سے تھا جو ہر مصیبت زدہ انسان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ ہماری زبان نہیں سمجھتا تھا لیکن ہماری صورتیں دیکھ کر اس کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہ تھا کہ ہم مصیبت زدہ ہیں۔ ایک شام اس نے ہمیں ماریشس کی بندرگاہ سے چند میل دور اتار دیا اور جہاز کا ایک ملاح ہمارے ساتھ روانہ کر دیا۔ آدھی رات تک ہم ایک خوفناک جنگل میں

چلتے رہے۔ بالآخر ملاح نے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے رُکتے ہوئے کہا "اب شہر یہاں سے بالکل قریب ہے لیکن اس وقت آپ کا شہر میں داخل ہونا ٹھیک نہیں ہوگا۔ پہریدار یقیناً آپ سے کئی سوال پوچھیں گے۔"

جین تھکاوٹ سے نڈھال تھی وہ ندی کے کنارے لیٹتے ہی سو گئی اور میں باقی رات ملاح کے ساتھ اس کے قریب بیٹھا رہا۔ علی الصباح میں نے جین کو جگایا اور ہم شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد میں اپنے بہنوئی کے مکان پر دستک دے رہا تھا۔ ملاح ہمیں چھوڑ کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ میرا بہنوئی اب میجر بن چکا تھا اور مریشس کی حکومت اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے دوست تھے۔ تاہم میری سرگزشت سننے کے بعد اس نے کہا "اگر پیرس کی پولیس کا کوئی ادنیٰ افسر بھی یہاں پہنچ گیا تو مریشس کا گورنر بھی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم گھر سے باہر پاؤں نہ رکھو۔ اگر پیرس سے پولیس کا کوئی آدمی یہاں پہنچ گیا تو میں تمہیں کسی دوست کے ہاں پہنچا دوں گا۔ مقامی پولیس کے تمام افسر میرے دوست ہیں اور وہ وقت آنے پر مجھے خبردار کر دیں گے۔"

ہم بیس دن اپنے بہنوئی کے گھر چھپے رہے۔ پھر ایک شام ہمیں پتہ چلا کہ مارسیلز سے ایک جہاز آیا ہے اور فرانس کی پولیس کا ایک انسپکٹر اس سے اُترتے ہی سیدھا مقامی پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں گیا ہے۔ میرے بہنوئی نے یہ خبر سنتے ہی ہمیں اپنی رجمنٹ کے ایک کپتان کے گھر پہنچا دیا۔ اگلے دن کپتان کی بیوی میری بہن کے پاس گئی اور یہ خبر لائی کہ ہمارے وہاں سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ایک پولیس انسپکٹر اُن کے گھر آیا تھا اور میرے بہنوئی سے چند سوالات پوچھنے کے بعد وہ گھر کی تلاشی لیے بغیر واپس چلا گیا تھا۔ پھر رات کے وقت میرا بہنوئی مجھ سے ملا اور اس نے یہ بتایا "یہ وہی انسپکٹر ہے جس پر جین نے گولی چلائی تھی۔ اس کا نام برنارڈ ہے اور اس کی ہوشیاری اور شقاوتِ قلبی فرانس بھر میں مشہور ہے۔ میں نے بظاہر اسے مطمئن کر دیا ہے لیکن جب تک وہ یہاں موجود ہے مجھے تمہارے متعلق اطمینان نہیں ہو سکتا۔ یہاں کوئی ایسا آدمی نہیں جسے پیرس کی پولیس کے کسی افسر کے ساتھ ہمدردی ہو لیکن اگر اسے تمہارا سراغ مل گیا تو تم یہ دیکھو گے کہ یہاں کوئی کھلے بندوں تمہاری حمایت نہیں کرے گا۔ اب چند دن تک ہمارا ایک دوسرے سے دُور رہنا ضروری ہے۔ اس لیے اگر میں تمہارے پاس نہ آسکوں تو تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔"

اگلی صبح جین اپنے بستر سے اٹھی تو اس نے یہ شکایت کی کہ میرا جسم ٹوٹ رہا ہے اور شام تک اسے سخت بخار ہو چکا تھا۔ جہاز پر زرد بخار کی وبا کے پیشِ نظر مجھے بے حد تشویش ہوئی لیکن رات کے وقت کپتان اپنے فوجی ڈاکٹر کو لایا اور اس نے تسلی دی کہ یہ صرف موسمی بخار ہے۔ جین دس دن بستر پر پڑی رہی۔ گیارھویں دن اسے ذرا ہوش آیا۔ اس عرصہ میں کپتان کی بیوی کی وساطت سے ہمیں یہ پتہ چلتا رہا کہ انسپکٹر برنارڈ ہماری تلاش میں بدستور سرگرداں ہے۔ بارھویں دن جین کا بخار بہت کم ہو گیا لیکن وہ بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ صبح سات بجے کسی نے ہمارے میزبان کے دروازے پر دستک دی۔ ہم فوراً ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں چھپ گئے۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے اور میں دبی آواز میں یہ کہہ رہا تھا "جین ہم تقدیر سے نہیں بھاگ سکتے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے متعلق تمہارے خیالات کیا ہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنی زندگی کا آخری سہارا سمجھتا ہوں۔ اگر میں تمہارے ساتھ کسی چھوٹے سے غیر آباد جزیرے میں اپنی باقی تمام زندگی کے دن گزار سکتا تو مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی فرانس چھوڑنے کا ملال نہ ہوتا۔"

جین نے مغموم نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور اپنا کانپتا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میرا خیال تھا کہ ابھی پولیس دھکا دے کر ہماری کوٹھڑی کا دروازہ کھولے گی اور ہمیں انسپکٹر برنارڈ کی منحوس صورت دکھائی دے گی لیکن اچانک ہمیں ملاقات کے کمرے میں چند مانوس آوازیں اور قہقہے سنائی دیے۔ پھر ہمارے میزبان نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا "میرے دوست آجاؤ اب کوئی خطرہ نہیں۔"

میں جین کو سہارا دیے کوٹھڑی سے باہر نکلا۔ ملاقات کے کمرے میں میری بہن، میرا بہنوئی

اور کپتان فرانسک کھڑے تھے۔ نقاہت کے باعث جین کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ میں
نے اُسے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ میری بہن آگے بڑھ کر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ کپتان فرانسک
نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "بھئی قسم خدا کی میں نے اس سے بڑا گدھا
اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس کی ذہانت فرانس بھر میں مشہور ہے لیکن وہ خوب اُلّو بنا"
میں پریشانی کی حالت میں فرانسک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری بہن نے اس سے مخاطب
ہو کر کہا "کپتان صاحب! میرا بھائی ابھی تک پریشان ہے اسے تسلی دیجیے"۔ اور کپتان فرانسک
نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا "بیٹا اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے انسپکٹر برنارڈ کو ایک غلط
راستے پر ڈال دیا ہے۔ میرا جہاز کل شام یہاں پہنچا تو وہ بندرگاہ پر کھڑا تھا۔ اُترنے والے مسافروں
کو دیکھنے کے بعد اس نے جہاز کے اندر بھی تلاشی لی۔ میں نے اُس سے کہا کہ اگر آپ مجھے یہ
بتا سکیں کہ آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں تو ممکن ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔ اُس نے
مجھ سے تمہارے متعلق پوچھا اور میں نے اُسے بتایا کہ مارسیلز سے میرے جہاز پر ایک بوڑھا آدمی،
ایک نوجوان اور ایک لڑکی سوار ہوئے تھے"۔
میں نے بدحواس ہو کر کہا "آپ نے اسے ہمارے متعلق بتا دیا ہے؟"
"ہاں! میں نے اُسے تمہارا حلیہ تک بتا دیا تھا کیونکہ اسے بیوقوف بنانے کا بہترین طریقہ
یہی تھا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ اسے کسی نہ کسی دن اس بات کا پتہ ضرور چل جائے
گا کہ میرے جہاز پر ایک لڑکی سوار تھی اور سچی بات بعض اوقات بہت سودمند ثابت ہوتی ہے
میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ بیماری کے باعث جہاز کے تمام مسافر بوربون اُتار دیے
گئے تھے۔ چند آدمی میرے ساتھ آ گئے ہیں لیکن باقی ابھی تک وہیں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے
اُسے تمہارے والد کی وفات کے متعلق بھی بتا دیا تھا اور میں نے اسے تمہارے نام بھی صحیح بتا
دیے تھے۔ میری ان باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ دیکھتے دیکھتے وہ بوربون جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا
اب میں کل شام تک یہاں سے پانڈی چری روانہ ہو جاؤں گا اور تم میرے ساتھ چلو گے"۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے راستے سے اب مصائب کے پہاڑ ہٹ چکے ہیں لیکن
جین کی حالت سفر کے قابل نہ تھی۔ ہم نے رات کے وقت ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اس نے بڑی
شدت کے ساتھ جین کو سفر کرنے سے منع کیا۔ میرا بہنوئی یوں بھی ہمارے ایک ساتھ سفر
کرنے کے حق میں نہ تھا۔ اس نے یہ مشورہ دیا کہ تم ہندوستان جا کر اپنے لیے کوئی جائے پناہ
تلاش کرو۔ ہم جین کو بعد میں وہاں پہنچانے کا انتظام کر دیں گے۔ یہاں کوئی فرانسیسی ایسا نہیں
جو جین جیسی لڑکی کو پیرس کی پولیس کے تشدد کے خلاف پناہ دینے سے انکار کرے گا"۔
اگلی شام غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے کپتان فرانسک کا جہاز روانہ ہو چکا تھا اور
میں عرشے پر کھڑا مریشس کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا۔ پانڈی چری پہنچنے کے بعد میری داستان
کا ایک باب ختم ہوتا ہے۔ اس سے آگے مجھے ایک وسیع خلا دکھائی دیتا ہے"۔
ریگنالڈ کی سرگزشت سننے کے بعد انور علی کچھ دیر اپنے بستر پر بے حرکت پڑا رہا۔ بالآخر
اس نے کہا "میرے دوست میں تمہاری مدد کروں گا"۔

تیسرا باب

لیگرانڈ کو انور علی کے ساتھ رہتے ہوئے ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ اس عرصہ میں اسے جین کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی پانڈی چری میں جب کوئی نیا جہاز آتا تو اس کے سینے میں اُمیدوں اور آرزوؤں کے چراغ جگمگا اٹھتے۔ بندرگاہ پر جاتے ہوئے جین کے تصور سے اس کی دُنیا مسکراہٹوں اور نغموں سے لبریز ہو جاتی۔ پھر جب اُسے جہاز سے اُترنے والے مُسافروں میں جین نظر نہ آتی تو وہ اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دینے کی کوشش کرتا "شاید جین ابھی تک جہاز کے اندر چھپی ہُوئی ہو اور کپتان نے اس کا دُوسرے لوگوں کی موجودگی میں بندرگاہ پر اُترنا مناسب خیال نہ کیا ہو" جب بندرگاہ خالی ہو جاتی تو وہ ذرا جُرأت سے کام لے کر جہاز کے کپتان کے پاس جاتا اور یہ تسلی کرنے کے بعد کہ جہاز پر کوئی اور مُسافر نہیں، وہ اس سے اس قسم کے سوالات پوچھتا "آپ کے جہاز پر کوئی ایسا مُسافر تو نہیں تھا جسے آپ بیماری کی وجہ سے راستے میں چھوڑ آئے ہوں ــــــ میں میسُور کی فوج میں مُلازم ہُوں اور مجھے اپنے ایک دوست کا انتظار ہے۔ گزشتہ چند ہفتوں میں مرِیشس سے آنے والے کسی جہاز کو کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا؟"

ایک دن آسمان پر بادل چھائے ہُوئے تھے۔ فضا میں حبس تھا اور انور علی اپنے خیمے سے باہر ایک کُرسی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اچانک لیگرانڈ بھاگتا ہُوا اس کے قریب پہنچا۔ انور علی کو اُس کی پریشان صورت یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ کوئی متوقع حادثہ پیش آنے والا ہے۔

"خیر تو ہے؟" اس نے لیگرانڈ کی طرف دیکھتے ہُوئے سوال کیا۔

لیگرانڈ نے مغموم لہجے میں جواب دیا "موسیو! انسپکٹر برنارڈ پانڈی چری پہنچ گیا ہے۔ میں نے اسے جہاز سے اُترتے دیکھا ہے۔ میں یہ معلوم نہیں کر سکا کہ یہ جہاز کہاں سے آیا ہے لیکن اگر یہ جہاز مریشس سے ہو کر آیا ہے تو ہو سکتا ہے جین بھی اس پر سوار ہو۔ میں نے انسپکٹر کو دیکھنے کے بعد بندرگاہ پر ٹھہرنا مناسب خیال نہیں کیا۔"

انور علی نے پُوچھا "اس نے آپ کو دیکھ تو نہیں لیا؟"

"نہیں۔ جہاز سے اُترتے ہی پانڈی چری کے چند افسر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اور میں وہاں سے کھسک آیا تھا۔"

انور علی نے کُرسی سے اُٹھ کر اپنے سپاہیوں میں سے ایک نوجوان کو آواز دے کر بُلایا اور اسے چند ہدایات دینے کے بعد لیگرانڈ کی طرف متوجہ ہو کر کہا "آپ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ میں نے اپنے آدمی کو سمجھا دیا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ یہاں سے چند میل دور ایک جگہ پر پہنچ کر میرا انتظار کرے۔ میں شام تک بندرگاہ سے تمام معلومات حاصل کر کے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اگر جین اس جہاز پر آئی ہے تو میں اسے اپنے ساتھ لانے کی کوشش کروں گا۔ بصورتِ دیگر آپ کو ضروری ہدایات مل جائیں گی۔ اگر جین اس جہاز پر نہ آئی تو بھی آپ انسپکٹر برنارڈ کی موجودگی میں یہاں ٹھہر کر اس کا انتظار نہیں کر سکتے۔ آپ کے لیے یہی بہتر ہو گا کہ آپ پانڈی چری کی حدود سے نکل جائیں۔ اس کے بعد اگر جین یہاں پہنچ گئی تو اُسے آپ کے پاس پہنچانا میرا ذمہ ہے۔"

لیگرانڈ نے کہا "مجھے ڈر ہے کہ جین شاید آپ پر اعتماد نہ کرے۔ لیکن جب آپ اسے جین کی بجائے مادام لیگرانڈ کہہ کر مخاطب کریں گے تو وہ بہت کچھ سمجھ جائے گی۔ جہاز پر وہ اسی نام سے سفر کر رہی ہو گی۔"

"آپ تسلی رکھیں، جین خواہ کسی نام سے سفر کر رہی ہو مجھے تلاش کرنے میں کوئی دِقّت نہیں پیش آئے گی۔" یہ کہہ کر انور علی، دلاور خاں کی طرف متوجّہ ہُوا اور اسے دو گھوڑے تیّار رکھنے کا حکم دے کر بندرگاہ کی طرف چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد لیگرانڈ اور انور علی کا ایک ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر مغرب کا رُخ کر رہے تھے۔ پانڈی چری سے کوئی پندرہ میل دُور ایک چھوٹی سی ندی کے پُل کے قریب پہنچ کر لیگرانڈ کے رہنما نے اپنا گھوڑا روکا اور کہا "جناب انھوں نے ہمیں یہاں رُکنے کا حکم دیا تھا۔"

لیگرانڈ نے اپنا گھوڑا روکتے ہُوئے کہا "تمھیں یقین ہے کہ انھوں نے ہمیں اسی جگہ پہنچنے کے لیے کہا تھا؟"

"جی ہاں! کرشناگری کی طرف یہی راستہ جاتا ہے اور میں کم از کم آٹھ مرتبہ یہاں سے گزر چکا ہُوں۔" یہ کہہ کر نوجوان گھوڑے سے اُتر پڑا اور لیگرانڈ نے اس کی تقلید کی۔ انھوں نے اپنے گھوڑے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیے اور ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔ لیگرانڈ کے لیے انتظار کے لمحات انتہائی صبر آزما تھے۔ وہ کبھی اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیتا۔ کبھی اپنا خنجر نکال کر درخت کی شاخیں تراشنے لگتا۔ کبھی نڈھال ہو کر ندی کے کنارے بیٹھ جاتا اور سنگریزے اُٹھا اُٹھا کر پانی میں پھینکنا شروع کر دیتا۔ جب اس پاس کوئی آہٹ یا آواز سنائی دیتی تو وہ بھاگ کر پُل پر پہنچتا لیکن سوار اور پیدل گزر جاتے اور وہ کفِ افسوس مل کر رہ جاتا۔

○

شام کے چار بجے کے قریب بارش شروع ہو گئی اور وہ ایک تناور درخت کے نیچے سمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور لیگرانڈ کے ساتھی نے کہا "لیجیے وہ آ گئے!"

لیگرانڈ بھاگ کر پگڈنڈی کی طرف بڑھا۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا لیکن انور علی کو تنہا دیکھ کر لیگرانڈ کے پاؤں زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ انور علی نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی باگ کھینچی اور نیچے اُترتے ہُوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے کوئی خوش خبری نہیں لایا۔ جین اس جہاز پر نہیں آئی۔ یہ جہاز بوربن سے یہاں پہنچا ہے۔ میں کپتان سے مل کر آیا ہُوں۔ انسپکٹر برنارڈ کے متعلق ابھی تک صرف اِتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اس کا بھتیجا پانڈی چری کی فوج میں مُلازم ہے اور وہ اس کے پاس ٹھہرا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ صرف ایک بھتیجے سے ملنے کا شوق اُسے یہاں تک آنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ ہمیں اب یہ دُعا کرنی چاہیے کہ جین اس کی موجودگی میں یہاں نہ پہنچے۔ میں کوشش کروں گا کہ ماریشس میں آپ کے بہنوئی کو اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کر دُوں لیکن اگر جین وہاں سے روانہ ہو چکی ہے تو آپ پانڈی چری میں رہ کر اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

اس کے بعد انور علی نے اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھا ہُوا سفری تھیلا اُتارا اور لیگرانڈ کے ہاتھ میں دیتے ہُوئے کہا "اس تھیلے میں آپ کے لیے رات کا کھانا، کچھ رُوپے اور تین تعارفی خط ہیں۔ ایک خط میں نے کرشناگری کے فوجدار کے نام لکھا ہے وہ آپ کو سرنگاپٹم پہنچانے کا بندوبست کر دے گا۔ دوسرا خط موسیو لالی کے نام ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی ہر ممکن اعانت کرے گا۔ تیسرا خط میں نے اپنے بھائی کے نام لکھا ہے، سرنگاپٹم میں آپ اسے اپنا بہترین دوست پائیں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو میرا بھائی آپ کے لیے سرنگاپٹم کے بڑے سے بڑے آدمی کی اعانت حاصل کر سکے گا۔ میرا یہ آدمی آپ کو کرشناگری پہنچا کر واپس آ جائے گا۔ آپ وہاں پہنچتے ہی میرے نام اس مضمون کا ایک خط لکھ کر اس کے حوالے کر دیں کہ آپ سلطان کی فوج میں ملازم ہیں اور اگر آپ کی بیوی پانڈی چری پہنچے تو میں اسے آپ کے پاس پہنچانے کا بندوبست کر دوں۔ جین اگر آپ کے ہاتھ کی تحریر پہچانتی ہے تو وہ مطمئن ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر وہ انسپکٹر برنارڈ کی موجودگی میں یہاں پہنچی تو یہ خط میرے کام آئے گا۔ اب میں فوراً واپس جانا چاہتا ہوں۔ جین کی غیر متوقع آمد کے پیشِ نظر میرا ہر وقت وہاں موجود ہونا ضروری ہے

ممکن ہے کہ آج رات ہی مارشش کا کوئی جہاز وہاں پہنچ جائے۔ میں بندرگاہ پر اس بات کا انتظام کرآیا ہوں کہ جب کوئی نیا جہاز آئے مجھے خبردار کر دیا جائے۔"

انور علی نے کسی توقف کے بغیر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اور لیگرانڈ نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "موسیو آپ بہت رحم دل ہیں۔"

○

تین ہفتے بعد انور علی طلوعِ آفتاب سے ایک گھنٹے بعد ایک جہاز کی آمد کی اطلاع پا کر بندرگاہ پر پہنچا تو وہاں انسپکٹر برنارڈ اور پانڈی چری کی پولیس کے دو افسر موجود تھے۔ انور علی کے لیے یہ ملاقات غیر متوقع نہ تھی۔ انسپکٹر برنارڈ اس سے پہلے بھی ہر نئے جہاز کی آمد کے وقت بندرگاہ پر موجود ہوتا تھا۔ پانڈی چری پہنچنے سے دو دن بعد اس نے انور علی کے کیمپ سے فرانسس کے ان آدمیوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو میسور کی فوج میں بھرتی ہو کر جا چکے تھے۔ اور انور علی نے اُسے صرف وہ کاغذات دکھا کر مطمئن کر دیا تھا جن میں لیگرانڈ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ برنارڈ انور علی کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ میں ایک نہایت خطرناک انقلابی کی تلاش میں ہوں جو پیرس سے ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ فرار ہو چکا ہے۔

جہاز بندرگاہ سے ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔ انور علی کچھ دیر تذبذب اور پریشانی کی حالت میں انسپکٹر اور اس کے ساتھیوں سے چند قدم دُور کھڑا رہا۔ بالآخر ایک پولیس افسر نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ انسپکٹر برنارڈ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "موسیو! میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ آج آپ کیوں نہیں آئے؟"

انور علی مسکرایا۔ "میرا خیال ہے کہ میں وقت پر پہنچ گیا ہوں۔"

مقامی پولیس کے ایک افسر نے کہا: "موسیو انور علی بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہر جہاز دیکھتے ہیں۔"

انور علی نے جواب دیا۔ "اب یہاں آپ کے جہاز دیکھنے کے سوا مجھے اور کام ہی کیا ہے؛ خدا کا شکر ہے کہ مجھے واپس بُلا لیا گیا ہے۔ ورنہ میں یہاں بیکاری سے اُکتا گیا تھا۔"

"آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"کب؟"

"بہت جلد۔ میں صرف اپنی جگہ کسی نئے آدمی کا انتظار کر رہا ہوں۔" انور علی یہ کہہ کر انسپکٹر برنارڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ "کہیے آپ کو اپنی مہم میں کوئی کامیابی ہوئی؟"

برنارڈ نے جواب دیا۔ "مجھے اپنی کامیابی کے متعلق کوئی بے چینی نہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہیں تو ایک نہ ایک دن ضرور گرفتار ہو جائیں گے۔"

جہاز بندرگاہ کے بہت قریب پہنچ چکا تھا اور اب عرشے پر چند عورتیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ پانڈی چری کے چند فوجی اور سول حکام بھی بندرگاہ پر موجود تھے اور انتہائی اشتیاق کی حالت میں جہاز کی طرف دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جہاز بندرگاہ پر آلگا اور مسافر نیچے اُترنے لگے۔ فرانسیسی افسر اپنے بال بچوں اور رخصت سے واپس آنے والے دوستوں کا استقبال کر رہے تھے۔ انسپکٹر برنارڈ جہاز سے اُترنے والے ہر نوجوان مرد اور عورت کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ایک نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی نحیف اور لاغر لڑکی ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بکس اُٹھائے جہاز سے اُتری اور ہجوم سے ایک طرف کھڑی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ انور علی لپک کر اس کے قریب پہنچا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ لیگرانڈ کو تلاش کر رہی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا اصلی نام لیمبرٹ ہے اور آپ مادام لیگرانڈ کے نام سے سفر کر رہی ہیں۔ میری بات غور سے سُنیے! انسپکٹر برنارڈ جس پر آپ نے گولی چلائی تھی یہاں موجود ہے۔ وہ اسی طرف آ رہا ہے۔ آپ اس کی طرف نہ دیکھیں۔ میں لیگرانڈ کا دوست ہوں، وہ یہاں آپ کا انتظار کر رہا تھا لیکن انسپکٹر

برنارڈ کی آمد پر میں نے اسے سرنگاپٹم بھیج دیا ہے۔ آپ انسپکٹر پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ آپ کا شوہر گزشتہ دو سال سے میسور میں فوج میں ملازم ہے۔ اپنے حواس پر قابو رکھیے۔ اگر انسپکٹر کو ذرا شبہ ہو گیا تو آپ مصیبت میں پھنس جائیں گی۔"

اتنی دیر میں انسپکٹر برنارڈ اُن کے قریب آ چکا تھا۔ انور علی نے اس کی طرف توجّہ کیے بغیر جلدی سے لڑکی کا بکس لیا اور اپنا لہجہ بدلتے ہوئے ذرا بلند آواز سے کہا۔ "مادام پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ایک سپاہی کی بیوی کو اس قسم کی تلخیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ آپ کے شوہر ایک مہم پر روانہ ہو چکے ہیں اس لیے آپ کو سرنگاپٹم پہنچانے کی ذمّہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔ موجودہ حالات میں ہماری فوج کے کسی سپاہی کو چھٹی نہیں مل سکتی مجھے یقین ہے کہ ان کا خط پڑھ کر آپ کو تسلی ہو جائے گی۔"

انور علی نے یہ کہہ کر اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا۔ لڑکی نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے خط پکڑ لیا اور کھول کر پڑھنے لگی۔

"کیا بات ہے موسیو؟" انسپکٹر برنارڈ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

انور علی نے جواب دیا۔ "یہ ہماری فوج کے یورپین دستے کے ایک افسر کی بیوی ہیں اور اس بات پر خفا ہیں کہ اُن کے شوہر ان کے استقبال کے لیے کیوں نہیں آئے۔ انھیں سرنگاپٹم پہنچانے کی ذمّہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔"

انسپکٹر برنارڈ پورے انہماک سے لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی توجہ سے بچنے کے لیے اپنی نگاہیں کاغذ پر مرکوز کیے ہوئے تھی۔

برنارڈ نے کہا۔ "مادام میں یہ خط دیکھ سکتا ہوں؟"

انور علی نے فوراً مداخلت کی۔ "موسیو مجھے معلوم ہے کہ آپ پیرس کی پولیس کے ایک افسر ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اپنی بیوی کے نام میسور کی فوج کے افسر کا خط پڑھنا آپ کے فرائض میں داخل نہیں۔"

برنارڈ نے جواب دیا۔ "مجھے اپنے فرائض کے حدود اچھی طرح معلوم ہیں۔ اگر آپ انھیں سرنگاپٹم پہنچانے کی ذمّہ داری قبول کر چکے ہیں تو مجھ پر بھی ان کے متعلق بعض ذمّہ داریاں عاید ہوتی ہیں مجھے یقین ہے کہ انھیں یہ خط دکھانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

لڑکی نے خط انسپکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ خوشی سے یہ دیکھ سکتے ہیں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

برنارڈ خط پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ انور علی کا ایک سپاہی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔ "جناب اس جہاز پر صرف آٹھ آدمی آئے ہیں ان میں سے صرف تین یورپین اور باقی مرشیس کے باشندے ہیں۔"

انور علی نے جواب دیا۔ "انھیں کیمپ میں لے چلو، میں ابھی آتا ہوں۔ یہ بکس اپنے ساتھ لیتے جاؤ اور مادام کے لیے ایک خیمہ لگا دو۔"

سپاہی نے چھوٹے کا بکس اٹھا لیا اور انور علی نے لڑکی کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ "مادام آپ کا کوئی اور سامان جہاز پر تو نہیں؟"

"جی نہیں، مجھے میرے خاوند نے لکھا تھا کہ مجھے خشکی کے راستے ایک لمبا سفر کرنا پڑیگا۔ اس لیے مجھے اپنے ساتھ چند ضروری کپڑوں کے سوا کچھ نہیں لانا چاہیے۔"

برنارڈ نے خط پڑھنے کے بعد انور علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مادام کی صحت بہت خراب معلوم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں انھیں سرنگاپٹم کا سفر کرنے سے پہلے چند دن یہاں آرام کرنا چاہیے اور آپ کو ان کے لیے خیمہ خالی کرانے کی ضرورت نہیں، مَیں گورنر کے مہمان خانے میں ان کے قیام کا انتظام کر سکتا ہوں۔"

انور علی نے جواب دیا۔ "ذاتی طور پر مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میرے خیال میں آپ کو یہ مسئلہ میری بجائے مادام کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔"

برنارڈ مسکرایا۔ "مجھے یقین ہے کہ انھیں گورنر کا مہمان بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

اس عرصہ میں جین اپنی پریشانی پر قابو پا چکی تھی اور اس کی مدافعانہ قوتیں پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا "میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کروں گی۔ لائیے میرا خط!"

برنارڈ نے کہا "یہ خط آپ کو کل تک نہیں مل سکتا۔"

"اس خط میں کوئی خاص بات ہے موسیو!" انور علی نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں لیکن ایک پولیس افسر کو ہر بات کی جانچ پڑتال کرنی پڑتی ہے۔"

چند فرانسیسی افسران ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ایک فوجی افسر نے انسپکٹر برنارڈ سے مخاطب ہو کر کہا "موسیو کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں" اس نے رکھے پن سے جواب دیا۔

انور علی نے جین سے کہا "مادام آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اگر آپ گھوڑے پر سواری کر سکیں تو میں دو دن تک آپ کے سفر کا بندوبست کر دوں گا بصورت دیگر مجھے بہلی کا انتظام کرنا پڑے گا۔"

لڑکی نے جواب دیا "میں گھوڑے پر سفر کر سکتی ہوں۔"

برنارڈ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مادام! اگر آپ کو میری باتوں سے کوئی کوفت ہوئی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں صرف اس بات کی تسلی چاہتا تھا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اگر فرصت ملی تو میں کل آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

"آئیے مادام!" انور علی نے کہا اور جین اس کے ساتھ چل پڑی۔

بندرگاہ کے احاطے سے نکلتے وقت انور علی نے مڑ کر دیکھا تو انسپکٹر برنارڈ مقامی پولیس کے آدمیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس نے جین سے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ آپ کو پہچان نہیں سکا لیکن اس کے شبہات پوری طرح دور نہیں ہوئے۔"

جین نے کہا "مجھے یقین ہے کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا ہوگا۔ بیماری کے باعث میری حالت یہ ہو چکی ہے کہ میں خود آئینے میں اپنی صورت نہیں پہچان سکتی۔ پھر انسپکٹر برنارڈ نے مجھے جن حالات میں دیکھا تھا وہ ایسے نہ تھے کہ اس کے ذہن پر میرا کوئی دیرپا تصور رہ گیا ہو۔"

انور علی نے کہا "پھر بھی مجھے اندیشہ ہے کہ انسپکٹر آپ کے متعلق پورا اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ ممکن ہے کہ تھوڑی دیر تک وہ پانڈی چری کی پولیس کے آدمیوں کو میرے کیمپ کی نگرانی کے لیے بھیج دے۔ مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ کل اگر وہ آپ سے ملا تو وہ پوری طرح سے تیار ہو کر آئے گا۔ لیگرانڈ کے خط پر اس نے بلاوجہ قبضہ نہیں کیا۔ آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آپ فوراً پانڈی چری کی حدود سے باہر نکل جائیں۔ اگر آپ گھوڑے پر سفر کر سکتی ہیں تو ہمیں ابھی روانہ ہو جانا چاہیے۔"

جین نے کہا "میں تیار ہوں لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم تھا کہ میں اس جہاز پر آ رہی ہوں؟"

انور علی نے جواب دیا "اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ لیگرانڈ کو روانہ کرنے کے بعد میں یہاں آنے والا ہر جہاز دیکھا کرتا تھا۔"

جین کچھ دیر خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی رہی۔ بالآخر اس نے کہا "موسیو مجھے معلوم نہیں کہ آپ کون ہیں لیکن میرے لیے آپ پر اعتماد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"مجھے آپ اعتماد کے قابل پائیں گی۔" انور علی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پڑاؤ میں داخل ہوئے۔ سپاہی خیمہ نصب کر رہے تھے۔ انور علی نے انھیں فوراً تین گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیا اور دلاور خان سے مخاطب ہو کر کہا "دلاور خان تم ہمارے ساتھ جا رہے ہو۔ میں نے بندرگاہ سے جو بکس بھیجا تھا وہ میرے گھوڑے کی زین کے پیچھے باندھ دو! جلدی کرو!"

پھر وہ اپنے نائب کی طرف متوجہ ہوا "سردار خاں! شام تک اس بات کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے کہ میں یہاں سے غیر حاضر ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ انسپکٹر جو اس دن میرے پاس آیا تھا یا پانڈی چری کی پولیس کا کوئی آدمی ہمارے متعلق پوچھنے آئے تم اسے یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرنا کہ میں

آرام کر رہا ہوں۔ اگر کوئی مادام لیگرانڈ کے متعلق پُوچھے تو بھی تم یہی کہو کہ وہ اپنے خیمے میں سو رہی ہیں۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ آج تمھیں پریشان کرے گا لیکن کل علی الصباح وہ ضرور آئے گا اور تُم اسے یہ بتانا کہ مادام فوراً سرنگا پٹم پہنچنے پر بضد تھی اور اب تک وہ کئی میل طے کر چکے ہوں گے۔ آٹھ دس دن تک یہاں میری جگہ دوسرا آدمی پہنچ جائے گا۔ اُسے یہ بتا دینا کہ ایک خاص مجبوری کے باعث میں یہاں ٹھہر کر اس کا انتظار نہیں کر سکا۔"

○

کیمپ سے انور علی اور جین کی روانگی سے کوئی آدھ گھنٹہ بعد برنارڈ انتہائی غم و غصّے کی حالت میں پانڈی چری کے گورنر کے سامنے کھڑا یہ کہہ رہا تھا "جناب یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ اگر آپ کی پولیس میرے ساتھ تعاون کرتی تو ہم اس لڑکی کو پانڈی چری سے نکلتے ہی گرفتار کر سکتے تھے۔"

"آپ کو یہ کیسے معلوم ہُوا کہ انور علی اس لڑکی کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے؟"

"میں نے بندرگاہ سے واپس آتے وقت دو آدمی اس کے پڑاؤ کی نگرانی کے لیے روانہ کر دیے تھے۔ اور جب انھوں نے یہ اطلاع دی کہ انور علی، اُس کا ایک نوکر اور وہ لڑکی کیمپ میں پہنچتے ہی گھوڑوں پر سوار ہو کر کہیں روانہ ہو گئے ہیں تو میں نے فوراً پولیس کو ان کا تعاقب کرنے کے لیے کہا لیکن آپ کے افسروں نے یہ جواب دیا کہ ہم گورنر کے حکم کے بغیر اُن کا پیچھا نہیں کر سکتے۔"

"اگر آپ کو اس لڑکی کے مُجرم ہونے کے متعلق اتنا ہی یقین تھا تو آپ نے اُسے جہاز سے اُترتے ہی کیوں نہ گرفتار کر لیا؟"

"جنابِ والا! اس وقت میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اور مَیں اُس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اپنے شکوک رفع کرنا چاہتا تھا۔ مَیں نے اس خط پر قبضہ کر لیا تھا جو اس لڑکی کو انور علی نے بندرگاہ پر دیا تھا اور لیمبرٹ کے ہاتھ کی چند تحریریں جو پیرس کے فوجی اسکول سے میرے قبضے میں آئی تھیں میرے پاس تھیں۔ مَیں ان تحریروں سے اس خط کا موازنہ کرنے کے لیے فوراً اپنی قیام گاہ پر پہنچا۔ اب مَیں

یہ اچھی طرح دیکھ چکا ہُوں کہ لیمبرٹ کی تحریریں اس خط سے ملتی ہیں اور لیمبرٹ اور لیگرانڈ ایک ہی آدمی کے دو مختلف نام ہیں۔ ان کا فوراً یہاں سے بھاگ نکلنا بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ لڑکی مجھے دیکھنے کے بعد اپنے آپ کو یہاں محفوظ نہیں سمجھتی تھی۔ اب اگر انھیں گرفتار کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کی تمام ذمہ داری آپ کی پولیس پر عاید ہو گی۔"

گورنر نے کہا: "آپ کو معلوم ہے کہ پانڈی چری سے چند میل آگے انگریزوں کی چوکیاں اور اس کے بعد میسُور کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، اس لیے ہم زیادہ دُور ان کا تعاقب نہیں کر سکتے۔"

"جناب مجھے یقین ہے کہ وہ زیادہ دُور نہیں گئے ہوں گے ابھی وقت ہے۔"

"مَیں دو شرائط پر آپ کے ساتھ چند سوار بھیج سکتا ہوں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ آپ پانڈی چری کی حدود سے آگے ان کا پیچھا نہیں کریں گے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر آپ کو ناکامی ہُوئی تو آپ اپنی غفلت اور کوتاہی کی ذمہ داری میری پولیس پر نہیں ڈالیں گے۔"

"جناب مَیں نے اگر کوئی کوتاہی کی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ مَیں آپ کی پولیس کا تعاون حاصل نہیں کر سکا۔"

گورنر نے کہا "دیکھیے انور علی میسُور کی حکومت کا ایک ذمّہ دار افسر ہے اور پانڈی چری کے بڑے سے بڑے افسر کو یہ سکھایا گیا ہے کہ وہ میسور کے ہر آدمی کا احترام کرے۔ ہم یہاں رہ کر سُلطان ٹیپُو کی ناراضگی مول نہیں لے سکتے۔ اب بھی میں سختی کے ساتھ آپ کو اس بات کی ہدایت کرتا ہُوں کہ اگر وہ لڑکی گرفتار ہو جائے تو بھی انور علی کے ساتھ آپ کا برتاؤ انتہائی دوستانہ ہونا چاہیے۔ میں اپنا سیکرٹری آپ کے ساتھ بھیج دیتا ہُوں اور وہ پولیس کے چند سوار آپ کے ساتھ روانہ کر دے گا، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر انور علی صحیح حالات سے واقف ہونے کے باوجود اس لڑکی کو پناہ دے چکا ہے تو پانڈی چری کی ساری فوج اور پولیس اس کا کھوج لگانے میں کامیاب نہیں ہو گی۔"

"اس صورت میں آپ میسُور کی حکومت سے یہ مطالبہ نہیں کر سکیں گے کہ وہ ہمارے مجرم ہمارے حوالے کر دے؟"

"نہیں، میسور میں پناہ لینے کے بعد وہ ہماری دسترس سے باہر ہوں گے۔"

○

دوپہر کے وقت انور علی نے گھنے جنگل میں ایک ٹیلے کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور مُڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جین بُری طرح نڈھال ہو کر اپنے گھوڑے کی زین پر جھکی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"میں بہت تھک گئی ہوں۔" اس نے سراپا التجا بن کر کہا۔ "اگر یہاں کوئی خطرہ نہ ہو تو تھوڑی دیر ٹھہر جائیے۔"

انور علی نے کہا۔ "ابھی ہم خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے۔ تاہم آپ کی خاطر ہمیں کچھ دیر رُکنا پڑیگا۔ اس ٹیلے کے پار ایک نالہ ہے اور اس کے کنارے آپ تھوڑی دیر آرام کر سکیں گی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ چکے تھے اور سامنے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا نالہ دکھائی دے رہا تھا۔

انور علی نے کہا۔ "دلاور خاں تم یہیں ٹھہرو۔ اگر کوئی خطرہ پیش آئے تو ہمیں خبردار کر دینا۔"

جین نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے اب زین پر نہیں بیٹھا جاتا۔ میں پیدل چلوں گی۔"

انور علی نے جلدی سے نیچے اُتر کر دونوں گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں اور جین لڑکھڑاتی ہوئی اس کے ساتھ ٹیلے سے نیچے اترنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پُل سے چند قدم دُور ایک طرف ہٹ کر نالے کے کنارے رُکے۔ جین سرسبز گھاس پر بیٹھ گئی اور انور علی نے گھوڑوں کو پانی پلانے کے بعد ایک جھاڑی کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر اس نے خورجین سے ایک پیالہ نکالا اور نالے سے پانی بھر کر جین کو پیش کرتے ہوئے کہا "آپ پیاس محسوس کر رہی ہیں؟"

اُس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انور علی کے ہاتھ سے پانی کا پیالہ پکڑ لیا۔

انور علی نے کہا۔ "اور آپ کو بھوک بھی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں میں ایک مدت کے بعد پہلی بار بھوک محسوس کر رہی ہوں۔"

انور علی نے ایک درخت کے چند پتے توڑے اور نالے کے پانی سے دھونے کے بعد جین کے آگے بچھا دیے۔

جین بدحواس سی ہو کر بولی۔ "موسیو یہ ــــــ یہ کھانے کی چیز ہے؟"

"نہیں نہیں۔" انور علی نے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کے کھانے کے برتن ہیں۔" پھر وہ دوبارہ اپنے گھوڑے کے قریب پہنچا اور خورجین سے ایک روغنی روٹی نکال کر لے آیا اور پتوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ "لیجیے کھانا آگیا۔"

"آپ نہیں کھائیں گے؟"

"نہیں، میں کھا چکا ہوں۔"

جین نے چند نوالے کھانے کے بعد کہا۔ "یہ بہت لذیذ ہے لیکن کیمپ سے روانہ ہوتے وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کھانا بھی ساتھ لیے جا رہے ہیں۔"

"میں نے جہاز کی اطلاع پاتے ہی اپنے سفر کے لیے چند ضروری انتظامات کر لیے تھے۔"

"آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا تھا کہ میں اس جہاز پر آ رہی ہوں؟"

"میں ہر نئے جہاز کی آمد پر یہ اُمید لے کر بندرگاہ پر جاتا تھا کہ آپ آ رہی ہیں۔ پہلے تو میں اپنے گھوڑوں پر زینیں بھی ڈال رکھتا تھا۔ صرف اس دفعہ تھوڑی سی کوتاہی ہو گئی۔"

جین نے چند اور نوالے کھانے کے بعد کہا۔ "موسیو مجھے اس ملک کی رسُومات کا کوئی علم نہیں۔ یہ روٹی میری ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ اگر میں ساری نہ کھا سکوں تو آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟"

انور علی ہنس پڑا ــــــ وہ دونوں ہنس پڑے۔ پھر جین اچانک سنجیدہ ہو کر بولی۔ "موسیو،

میں بہت مدت کے بعد ہنس رہی ہُوں۔ یہاں کوئی خطرہ تو نہیں؟"

"یہاں کوئی خطرہ نہیں' آپ جی بھر کر ہنس سکتی ہیں۔"

جین نے کہا۔ "اگر انسپکٹر برنارڈ کو پتہ چل گیا تو وہ ضرور ہمارا پیچھا کرے گا۔"

"بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن اگر اس نے ہمارا پیچھا کیا تو بھی آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اطمینان سے آرام کریں۔ میرا نوکر ٹیلے پر پہرا دے رہا ہے۔"

جین نے ذرا پیچھے ہٹ کر ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں اور چند منٹ بعد وہ ایک بچے کی طرح سو رہی تھی۔

انور علی نے نالے کے کنارے بیٹھ کر وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے درخت کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کھولے اور ان کی باگیں پکڑ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ جین کو جگانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ٹیلے کی طرف سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دلاور خاں بڑی تیزی سے اُن کی طرف آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے دلاور خاں؟" انور علی نے بلند آواز میں کہا۔

دلاور خاں نے قریب آ کر گھوڑا روکا اور جواب دیا۔ "آٹھ دس سرپٹ سوار اس طرف آ رہے ہیں۔ مَیں نے انھیں ٹیلے سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر دیکھا ہے۔"

جین نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور پُوچھا "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں آپ اپنا گھوڑا سنبھال لیں۔"

جین نے بھاگ کر اپنے گھوڑے کی باگ پکڑلی اور انور علی نے دلاور خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم پل کے پار جا کر ان کا انتظار کرو اور وہ تمھیں دیکھ لیں تو ایک ہوائی فائر کرنے کے بعد بھاگ نکلو۔ ان میں سے کسی کا گھوڑا تمھارے گھوڑے کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ راستہ انگریزوں کی چوکی کی طرف جاتا ہے۔ اس پل سے دو تین میل آگے تم انھیں چکمہ دے کر دائیں ہاتھ مڑ جاؤ اور جنگل میں روپوش

ہو جاؤ۔ اگر وہ انگریزوں کی چوکی کے قریب پہنچ گئے تو انگریز ان سے نپٹ لیں گے۔ ہم اس نالے کے ساتھ ساتھ جنگل میں سفر کریں گے اور پھر یہاں سے کوئی دو میل دُور نالے کے دوسرے کنارے پہنچ کر تمھارا انتظار کریں گے۔"

دلاور خاں کو ہدایت دینے کے بعد انور علی جین کی طرف متوجہ ہُوا "چلیے!"

جین ان کی زبان سے ناواقفیت کے باوجود یہ اندازہ لگا چکی تھی کہ کوئی خطرہ درپیش ہے۔ اس نے کہا مجھے ڈر ہے کہ میں اب گھوڑے پر آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔"

"ابھی آپ کو گھوڑے پر سوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اطمینان سے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ کر میرے پیچھے چلتی رہیں۔"

جین اس کے پیچھے چل دی اور وہ جنگل میں روپوش ہو گئے۔ چند قدم دُور جا کر وہ رُک گئے۔ اور دم بخود ہو کر ٹیلے کی طرف گھوڑوں کی ٹاپ سُننے لگے۔ پھر انھیں بندوق کا دھماکا سنائی دیا اور اس کے بعد گھوڑوں کی آہٹ بتدریج کم ہونے لگی۔

انور علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "اب آپ کا خطرہ گزر چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اندھا دُھند انگریزوں کی چوکی کے قریب پہنچ جائیں گے اور وہاں سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ واپس آئیں گے۔"

"لیکن آپ کا ساتھی؟"

"اسے کوئی خطرہ نہیں' وہ تھوڑی دیر بعد جنگل میں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ چلیے اب ہمیں کچھ دُور اس جنگل میں چلنا پڑے گا۔ آپ کو تکلیف تو ہو گی۔ لیکن ابھی کچھ عرصہ ہمارے لیے کنارے سے دُور رہنا ضروری ہے۔ نالہ عبور کرنے کے بعد ہمارا سفر نسبتاً آسان ہو گا اور آپ آزادی سے گھوڑے پر سفر کر سکیں گی۔"

جین نے کہا "مجھے سواری کا قطعاً شوق نہیں۔ مَیں پیدل چلنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتی ہوں۔"

جنگل بہت گھنا تھا اور تناور درختوں کے نیچے پھیلی ہوئی جھاڑیوں اور طرح طرح کی بیلوں نے

اسے اور بھی دشوار گزار بنا دیا تھا۔ بعض مقامات پر انور علی کو اپنی تلوار سے ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھی ہوئی شاخوں کو کاٹ کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔ جین بڑی مشکل سے اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

قریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد اُن کے گھوڑوں نے اچانک کان کھڑے کر لیے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ انور علی نے جلدی سے اپنی تلوار نیام میں ڈالی اور کندھے سے بندوق اُتار کر سامنے جھاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" جین نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"خاموش!" انور علی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھے بغیر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

ایک ثانیہ بعد انھیں شیر کے غرّانے کی آواز سنائی دی۔ جین سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اچانک سامنے کی جھاڑی میں جنبش پیدا ہوئی اور شیر کے غرّانے کی آواز بند ہو گئی۔ انور علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جین کی طرف دیکھا اور کہا "آپ نے شیر دیکھا؟"

لیکن جین کی قوتِ گویائی جواب دے چکی تھی۔ انور علی مسکرایا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں وہ جا چکا ہے۔"

جین نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے کچھ نہیں دیکھا لیکن اُس کی آواز بہت خوفناک تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم پر حملہ نہیں کیا۔"

"وہ بھوکا نہیں تھا، میرا خیال ہے کہ ان جھاڑیوں کے پیچھے اس کا شکار پڑا ہوا ہے۔"

"آپ نے بندوق نہیں چلائی؟"

"اس کی ضرورت نہ تھی۔"

"آپ نے کبھی شیر مارا ہے؟"

"بہت دفعہ۔"

"یہ خوفناک جنگل کب ختم ہوگا؟"

"یہ جنگل بہت بڑا ہے لیکن اب تھوڑی دور آگے نالہ عبور کرنے کے بعد آپ کی مشکلات ختم

ہو جائیں گی۔"

چند منٹ بعد وہ جنگل سے نکل کر نالے کے کنارے نمودار ہوئے اور انور علی نے کہا۔ "اب آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ ہمیں یہاں سے نالہ عبور کرنا ہے۔"

"پانی زیادہ گہرا تو نہیں؟"

"نہیں۔" انور علی نے اپنے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنا گھوڑا میرے پیچھے رکھیں۔"

جین نے کچھ کہے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی اور وہ کمر برابر پانی میں سے گزر کر نالے کے پار پہنچ گئے۔ اس کے بعد کوئی آدھ میل دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد انور علی اپنا گھوڑا روک کر نیچے اُتر پڑا اور جین کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "اب ہمیں یہاں اپنے ساتھی کا انتظار کرنا پڑیگا۔"

جین نے کہا۔ "اُسے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ہم یہاں ہیں؟"

"میں نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم دو میل چلنے کے بعد اس کا انتظار کریں گے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ ہم نے ابھی تک صرف دو میل کا فاصلہ طے کیا ہے؟" جین نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس جنگل میں ہماری رفتار بہت سست تھی لیکن دلاور خاں کو اس وقت تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

جین گھوڑے سے اتر کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد انھیں جنگل میں گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ انور علی نے کہا۔ "لیجیے وہ آگیا۔" اور جین اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد دلاور خاں درختوں سے نمودار ہوا اور انور علی نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ "تم نے بہت دیر لگائی!"

"جناب خدا کا شکر ہے کہ آپ مل گئے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میرا رُخ کس طرف ہے۔ میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ واپس مُڑوں اور دوبارہ پُل کے قریب پہنچ کر نالے کے کنارے

کنارے اس طرف آؤں۔"

"ہمارا پیچھا کرنے والوں کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

"جناب وہ تو اب واپس پانڈی چری کے قریب پہنچ چکے ہوں گے۔ مَیں انھیں چکمہ دے کر انگریزوں کی چوکی کے بالکل قریب لے گیا تھا۔ اس کے بعد پگڈنڈی کے قریب جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر اپنی آنکھوں سے ان کی بدحواسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ بے تحاشا گھوڑے بھگاتے واپس آ رہے تھے اور انگریز سواروں کا ایک دستہ ان کے پیچھے تھا۔ جب وہ گزر گئے تو مَیں وہاں سے کھسک آیا۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ فرانس کی پولیس کا کوئی آدمی زخمی ہوا یا نہیں۔ بہرصورت انگریز ان پر بے تحاشا گولیاں برسا رہے تھے۔"

جین کے استفسار پر انور علی نے فرانسیسی زبان میں اسے اپنے نوکر کی کارگزاری سنا دی اور اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ اس نے کہا "موسیو مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے انسپکٹر برنارڈ کی پسپائی کا تماشا نہ دیکھ سکی۔"

انور علی نے کہا "چلیے اب دیر ہو رہی ہے۔"

وہ گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور انور علی نے کہا "دلاور خاں ہمیں شام سے پہلے کسی محفوظ جگہ پہنچنا ہے۔ اب تم ہماری رہنمائی کرو۔"

دلاور خاں نے کہا "اس جنگل میں تھوڑی دُور آگے ایک پگڈنڈی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ کرشنا گری کے راستے سے جا ملتی ہے۔"

"چلو!"

○

غروبِ آفتاب کے وقت چند میل اور طے کرنے کے بعد یہ لوگ ایک پہاڑی کے دامن میں رُکے اور انور علی نے جین کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اب رات ہونے کو ہے اور آگے چند میل تک جنگل زیادہ گھنا ہے اس لیے ہمیں صبح تک یہیں قیام کرنا پڑے گا۔"

وہ گھوڑوں سے اتر پڑے۔ جین ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور انور علی اور دلاور خاں گھوڑوں کو ایک جھاڑی کے ساتھ باندھنے اور ان کی زینیں اتارنے میں مصروف ہو گئے۔ پھر انھوں نے پاس ہی شفاف پانی کے ایک چھوٹے سے چشمے سے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو جین پتھر پر بیٹھنے کی بجائے نڈھال سی ہو کر زمین پر لیٹی ہوئی تھی۔ انور علی نے گھوڑوں کی زینوں کے دو نمدے نکال کر اس کے قریب بچھا دیے اور تیسرا نمدہ لپیٹ کر تکیے کی جگہ رکھتے ہوئے کہا "آپ شاید زمین پر سونے کی عادی نہ ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں آپ کے لیے اس سے بہتر بچھونے کا انتظام نہیں کر سکتا۔ آپ کچھ کھا لیں اور اطمینان سے سو جائیں۔"

جین نمدے پر بیٹھ گئی اور انور علی نے اپنا رومال اس کے سامنے بچھا دیا اور پھر خورجین سے ایک روغنی روٹی نکال کر رومال پر رکھتے ہوئے کہا "یہ وہی کھانا ہے جو آپ نے دوپہر کے وقت کھایا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم راستے میں آپ کے لیے کوئی شکار بھی تلاش نہیں کر سکے۔"

"یہ روٹی بہت لذیذ ہے۔" جین نے بے تکلفی سے نوالہ توڑتے ہوئے کہا "آپ نہیں کھائیں گے؟"

"ہم بھی کھا لیں گے، میرے تھیلے میں ابھی کافی روٹیاں پڑی ہیں۔"

جین نے چند لقمے کھانے کے بعد باقی روٹی رومال میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی، پھر اٹھ کر چشمے سے پانی پیا اور واپس آ کر بیٹھ گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے اچانک اٹھ کر بیٹھتے ہوئے انور علی کی طرف دیکھا اور کہا "موسیو میں موت سے نہیں ڈرتی لیکن نیند کی حالت میں موت کا تصور میرے لیے بہت بھیانک ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ رات کے وقت یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ـــــ میرا مطلب ہے کہ بے خبری کی حالت میں شیر، چیتے یا بھیڑیے تو ہم پر حملہ نہیں کر دیں گے؟"

انور علی نے جواب دیا "نہیں آپ اطمینان سے سو جائیں۔"

جین نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "آپ کا ساتھی کہاں گیا ہے؟"

"وہ آگ جلانے کے لیے خشک لکڑیاں جمع کر رہا ہے۔"

"ہاں موسیو آگ ضرور جلا دیجیے مجھے اس تاریکی سے بہت خوف آتا ہے۔"

یہ کہ کر جین لیٹ گئی اور تھوڑی دیر بعد وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو رہی تھی۔ چند گھنٹے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اُسے قریب ہی آگ کا ایک الاؤ دکھائی دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ انور علی چند قدم دُور اپنے ہاتھ میں بندوق تھامے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ آگ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جین دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ گزشتہ واقعات اسے ایک خواب معلوم ہوتے تھے۔ یہ نوجوان جو چند گھنٹے قبل اس کے لیے اجنبی تھا اب برسوں کا ساتھی معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ کس قدر ممنون ہے لیکن تشکر اور احسان مندی کے سینکڑوں الفاظ اس کی زبان تک آ آ کر رک گئے۔ وہ دبی زبان میں موسیو سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

انور علی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور اُس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ جین نے کہا،

"موسیو اب کیا وقت ہوگا؟"

انور علی نے جواب دیا: "آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے۔"

"آپ کا ساتھی کہاں ہے؟"

انور علی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ سو رہا ہے۔"

جین نے کہا: "میں بڑی مدت کے بعد اتنی گہری نیند سوئی ہوں۔ مجھے وقت کا احساس تک نہیں رہا۔ آپ شاید بالکل نہیں سوئے؟"

"میں پہرہ دے رہا تھا۔ اب دلاور خاں کی باری ہے۔"

"موسیو مجھے پیاس محسوس ہوتی ہے۔"

"میں ابھی پانی لاتا ہوں۔" انور علی نے یہ کہہ کر ایک پیالہ اٹھایا اور چشمے سے بھر لایا۔ جین نے پانی پینے کے بعد کہا: "یہ جنگل کب ختم ہوں گے؟"

انور علی مسکرایا: "آپ جنگل سے بہت ڈرتی ہیں؟"

"نہیں موسیو! اب آپ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مجھے ڈر محسوس نہیں ہوگا۔"

انور علی نے کہا: "میرے لیے یہ تکلیف دہ راستہ اختیار کرنا ایک مجبوری تھی۔ ارکاٹ کی حدود میں جگہ جگہ انگریزوں کی چوکیاں ہیں۔ اگر ہم دوسرا راستہ اختیار کرتے تو ممکن تھا آپ کو کسی چوکی پر روک لیا جاتا اور پھر ان سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ وہ آپ کے متعلق پانڈی چری کی پولیس سے استفسار کرتے اور آپ کو ان کے حوالے کر دیتے لیکن آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ کل دوپہر یا شام تک ہم جنگل سے نکل کر ایک آباد علاقے میں پہنچ جائیں گے۔ آپ سو جائیں ہمیں علی الصباح یہاں سے کوچ کرنا ہے۔"

انور علی دلاور خاں کی طرف بڑھا اور اسے جگانے کے بعد جین سے چند قدم دُور ایک گھوڑے کی زین پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ جین کچھ دیر بیٹھی اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچتی رہی۔ رات کی ٹھنڈی ہَوا کے ہلکے ہلکے جھونکے نہایت خوشگوار تھے۔ آسمان صاف تھا اور ستارے معمول سے زیادہ بڑے اور چمکدار معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر گہری نیند سو رہی تھی۔

○

اگلے دن یہ لوگ چند چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں عبور کرنے کے بعد ایک وادی کے گنجان جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ اچانک انور علی اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور ساتھیوں کو رُکنے کا اشارہ کرکے ننگے پاؤں ایک طرف بڑھا اور گھنی جھاڑیوں میں رُوپوش ہو گیا۔ جین بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی لیکن دلاور خاں کے چہرے پر غایت درجے کا اطمینان تھا۔ اچانک جنگل میں بندوق کی آواز سنائی دی اور جین چلا چلا کر دلاور خاں سے کچھ پوچھنے لگی۔ دلاور خاں فرانسیسی زبان سے ناواقف تھا۔ اس نے چند بار شکار شکار کہہ کر جین کو تسلی دینے کی کوشش کی اور پھر اشاروں سے سمجھانے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اس نے پہلے اپنی دونوں کہنیاں کانوں کے ساتھ جوڑ کر ہاتھ فضا

میں بلند کر دیے۔ پھر گلے میں لٹکی ہوئی بندوق اُتار کر ایک طرف نشانہ باندھا اور بالآخر ایک چھوٹا سا خنجر نکال کر اپنی گردن پر پھیرتے ہوئے کہا "شکار شکار"۔ جین کے لیے اُس کی زبان کی طرح اُس کے اشارے بھی ایک معمّا تھے اور وہ انتہائی اضطراب اور بے بسی کی حالت میں اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد انور علی اپنے کندھے پر ایک ہرن اُٹھائے نمودار ہُوا اور جین کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔

کچھ دیر بعد وہ ایک ندی کے کنارے آگ جلا کر ہرن کا گوشت بھون رہے تھے۔ پاس ہی ایک درخت کی شاخوں پر چند بندر کُود رہے تھے۔ جین اپنی جگہ سے اٹھی اور درخت کے نیچے جا کر بندروں کی طرف دیکھنے لگی۔ اچانک اسے جنگل کی طرف جھاڑیوں میں کوئی آہٹ محسوس ہُوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور ایک ثانیے کے لیے مبہوت سی ہو کر رہ گئی۔ پھر چیخ مار کر وہاں سے بھاگی۔ انور علی اور دلاور خاں بندوقیں اٹھا کر اس کی طرف دوڑے۔ جین نے سراسیمگی کی حالت میں انور علی کا بازو پکڑ لیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ دہشت کے باعث اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ انور علی چند ثانیے جنگل کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک مسکراہٹ کے ساتھ جین کی طرف متوجہ ہو کر بولا "ارے یہ تو ہاتھی ہیں! آپ اس قدر ڈر گئیں!"

انور علی کی مسکراہٹ نے جین کا خوف کسی حد تک دُور کر دیا اور اس نے کہا "آپ ہاتھی کو خطرناک نہیں سمجھتے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر آپ کس چیز کو خطرناک سمجھتے ہیں؟"

انور علی مسکرایا "میں صرف آپ کا چیخیں مار کر بھاگنا خطرناک سمجھتا تھا۔ ایسی حالت میں جنگل کے جانور عام طور پر بدحواس ہو کر حملہ کر دیتے ہیں۔"

پانچ چھ ہاتھیوں کا ریوڑ چنگھاڑتا اور جھاڑیوں کو روندتا ایک طرف بھاگ رہا تھا۔ جین نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بلاوجہ پریشان کیا، لیکن جو ہاتھی میں نے دیکھا تھا وہ بہت ہی بڑا تھا۔"

انور علی نے کہا "جنگل میں ہر ہاتھی پہلی بار بہت بڑا نظر آتا ہے۔ چلیے آپ کا کھانا تیار ہے"۔

○

میسور کی حدود میں داخل ہونے کے بعد جین یہ محسوس کر رہی تھی کہ ماضی کے تاریک سائے اُس کا پیچھا چھوڑ چکے ہیں۔ اب اس کے آگے گھنے جنگلوں کے دشوار گزار راستوں کی بجائے کشادہ سڑکیں تھیں۔ میسور کی پہلی چوکی تک پہنچتے ہی انور علی نے اُس کے لیے ایک بیل گاڑی مہیا کر دی تھی اور کرشنا گری سے آگے وہ ایک آرام دہ پالکی میں سفر کر رہی تھی۔ وہ گھبراہٹ اور پریشانی جو اس نے پانڈی چری سے ایک اجنبی کے ساتھ روانہ ہوتے وقت محسوس کی تھی اب دُور ہو چکی تھی اور وہ ایسا محسوس کرتی تھی کہ انور علی کو وہ مدتوں سے جانتی ہے۔ ابتدائی منازل میں وہ بار بار اس سے اس قسم کے سوالات کیا کرتی تھی کہ اب سرنگاپٹم کتنی دُور ہے ——— ہم کتنے میل آ چکے ہیں اور کتنے میل باقی ہیں ——— ابھی ہمیں کتنی پہاڑیاں، کتنے دریا اور کتنے جنگل عبور کرنے ہیں ——— اب راستے میں ہمیں خطرناک درندوں کے حملے کا خطرہ تو نہیں؟ لیکن اب اس کے لیے صرف یہ جاننا کافی تھا کہ وہ سفر کر رہی ہے اور انور علی اس کا ساتھی ہے۔

پھر ایک دن دوپہر کے وقت وہ ایک بلند چوٹی سے چند قدم دُور رُکے۔ تھکے ہوئے کہاروں نے انور علی کا اشارہ پا کر جین کی پالکی زمین پر رکھ دی اور پگڈنڈی کے پاس درختوں کے سائے میں بیٹھ گئے۔

انور علی اپنے گھوڑے سے اُترا اور لگام دلاور خاں کے ہاتھ میں دے کر جین کی طرف متوجہ ہُوا "ہمارا سفر ختم ہونے والا ہے آپ اس ٹیلے کی چوٹی سے سرنگاپٹم کی پہلی جھلک دیکھ سکیں گی"۔

جین پالکی سے اُتری اور کسی توقف کے بغیر تیزی سے ٹیلے کی چوٹی کی طرف بڑھی۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے مُڑ کر انور علی کی طرف دیکھا اور کہا: "آپ نہیں آئیں گے؟"

"اچھا آتا ہوں۔" انور علی آگے بڑھا اور جین کے قریب پہنچ کر بولا: "سرنگا پٹم دیکھنے کے لیے مجھے اس ٹیلے کی چوٹی پر پہنچنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس شہر کے مناظر ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ٹیلے کی چوٹی پر کھڑے تھے اور جین دم بخود ہو کر سرنگا پٹم کے دلفریب مناظر دیکھ رہی تھی ــــــ ٹیلے سے نیچے کوئی دو میل دُور دریائے کاویری بہہ رہا تھا اور بلند فصیل کے بُرج، شاہی محل کے کنگرے اور مسجد کے گنبد اور مینار دکھائی دے رہے تھے۔

انور علی نے کہا: "سرنگا پٹم ایک جزیرہ ہے اور دریا کی ایک شاخ اس کی دوسری طرف ہے۔"

جین کے ہونٹوں پر ایک دل فریب تبسم تھا اور اس کی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن تھے۔ وہ کہ رہی تھی: "یہ میری آخری جائے پناہ ہے۔ یہ میرے سپنوں کی جنت ہے۔ آپ نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ میں ایک بات پر بہت نادم ہوں۔ مجھے اپنا کوئی راز آپ سے نہیں چھپانا چاہیے تھا لیکن میں نے آپ کو نہیں بتایا کہ لیرٹ .... میرا مطلب ہے لیگرانڈ سے میری شادی نہیں ہوئی۔"

انور علی مسکرایا: "آپ نے میری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ لیگرانڈ میرا دوست ہے اور وہ مجھے اپنی تمام سرگزشت سُنا چکا تھا۔"

جین نے کہا: "مسیو! آپ بُرا نہ مانیں۔ میں بچپن میں اس مُلک کے انسانوں کے متعلق عجیب و غریب باتیں سُنا کرتی تھی۔"

"آپ نے سُنا ہوگا کہ ہم وحشی ہیں اور ہم انسانیت کا کوئی احترام نہیں کرتے۔"

"ہاں اور یہ بھی کہ اس ملک کے لوگوں کی شکلیں بہت خوفناک ہوتی ہیں۔ پانڈی چری کی بندرگاہ پر آپ کو دیکھ کر مجھے اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ آپ اس ملک کے باشندے ہیں تاہم آپ کے ساتھ چلتے وقت مجھے خوف محسوس ہوتا تھا۔ اگر پولیس کا خوف نہ ہوتا تو میں کسی صورت آپ کے ساتھ سفر کرنے پر رضامند نہ ہوتی۔ پانڈی چری سے نکلتے وقت مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ آپ کسی جنگل یا صحرا میں پہنچ کر میرا گلا گھونٹ ڈالیں گے۔"

"اور اب؟"

جین مسکرائی: "اب تو میں دنیا کے آخری کونے تک آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔"

انور علی نے سرنگا پٹم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ میری دنیا کا آخری کونہ ہے اور میں یہ دعا کرتا ہوں کہ وہاں پہنچ کر آپ یہ دیکھیں کہ زندگی کی تمام راحتیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں ــــ میری والدہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی اور میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک آپ کی شادی نہیں ہوتی آپ ہمارے گھر میں رہیں۔ مجھے شاید وہاں پہنچتے ہی کسی محاذ پر بھیج دیا جائے گا اور میرا چھوٹا بھائی بھی شاید زیادہ عرصہ گھر نہ رہ سکے۔ ہماری غیر حاضری کے دوران میں آپ میری والدہ کی دل جوئی کر سکیں گی ــــ مجھے یقین ہے کہ لیگرانڈ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

جین کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اس نے کہا: "اگر میں آپ کی دعوت قبول نہ کروں تو یہ ناشکرگزاری ہوگی۔ اگر آپ دعوت نہ دیتے تو بھی سرنگا پٹم میں میرے لیے آپ کا سہارا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آپ کا گھر کس طرف ہے؟"

انور علی نے شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ ان درختوں کے پیچھے ہے لیکن آپ یہاں سے نہیں دیکھ سکیں گی۔ اب چلیے!" انور علی مُڑ کر پہاڑی سے نیچے اترنے لگا اور جین اُس کے پیچھے چل پڑی۔ چند منٹ بعد وہ اپنی پالکی پر سوار ہو رہی تھی۔

○

غروبِ آفتاب سے پہلے کچھ دیر پہلے فرحت اور مُراد علی مکان کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ منوّر خاں ایک صندوقچہ اٹھائے بھاگتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا اور

اس نے کہا:"بی بی جی! بی بی جی! انور علی صاحب آگئے ہیں۔ ولاور خان بھی آگیا ہے۔ وہ ایک میم کو بھی ساتھ لے آئے ہیں۔"

مُراد علی اپنی کُرسی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل کر زینے کی طرف بڑھا۔ نیچے اُتر کر صحن میں داخل ہوتے ہی اُسے انور علی اور جین دکھائی دیے اور وہ بھاگ کر بے اختیار اپنے بھائی سے لپٹ گیا۔

فرحت برآمدے میں نمُودار ہُوئی۔ انور علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کرنے کے بعد کہا:"امی جان، میرے ساتھ ایک مہمان ہے۔"

فرحت نے کہا:"آؤ بیٹی ہمیں تمھارا انتظار تھا۔"

انور علی نے فرانسیسی زبان میں کہا:"امی جان آپ کا خیر مقدم کرتی ہیں۔"

جین مغربی آداب کے مطابق جُھک گئی اور فرحت نے شفقت سے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیے۔

اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ جین کا تعارف کرانے کے بعد انور علی نے پوچھا"لیگرانڈ کہاں ہے؟"

مُراد علی نے جواب دیا:"بھائی جان وہ فوج میں بھرتی ہونے کے چند دن بعد اپنے کیمپ میں چلا گیا تھا۔ وہ ہر روز ان کے متعلق پوچھنے کے لیے آتا ہے اور جب سے اُسے یہ معلوم ہُوا ہے کہ مرسیر لالی کی رجمنٹ سرنگاپٹم سے کُوچ کرنے والی ہے وہ بہت زیادہ بے چین رہتا ہے۔ میں اسے ابھی اطلاع دیتا ہُوں۔"

"ٹھہرو! میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں، مجھے سپہ سالار کی خدمت میں حاضری دینی ہے۔ لیکن نہیں تم یہیں ٹھہرو۔ امی جان کو ان کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے ایک مترجم کی ضرورت پڑے گی۔ میں لیگرانڈ کو بھیج دوں گا۔"

ماں نے کہا:"بیٹا لباس تبدیل نہیں کرو گے؟"

"امی جان میں جو فالتو جوڑے ساتھ لایا تھا وہ اس سے زیادہ میلے ہو چکے ہیں۔ راستے میں

انھیں دُھلوانے کا موقع نہیں ملا۔"

ماں نے کہا:"تم جو کپڑے یہاں چھوڑ گئے تھے وہ سنبھال کر رکھے ہُوئے ہیں۔"

چند منٹ بعد انور علی فوجی مستقر کی طرف روانہ ہو چکا تھا اور فرحت ایک کمرے میں مُراد علی کو اپنا ترجمان بنا کر جین کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد جین اور لیگرانڈ انور علی کے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے تھے اور جین اسے مرِیشس سے لے کر سرنگاپٹم تک کے سفر کے واقعات سُنا رہی تھی۔

جین کی سرگزشت سننے کے بعد لیگرانڈ نے کہا:"جین مریشس سے روانہ ہونے کے بعد میری زندگی کا کوئی لمحہ تمھاری یاد سے خالی نہ تھا۔ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ میری نئی زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں میسور کی فوج میں بھرتی ہو چکا ہُوں ــــ اور چار دن بعد ہمارا دستہ یہاں سے کُوچ کر رہا ہے ــــ انور علی چاہتا ہے کہ تم ہماری شادی تک اس کی والدہ کے پاس رہو لیکن اگر تمھیں ان کے ہاں رہنا پسند نہ ہو تو یہاں تمھارے لیے کسی علیحدہ مکان کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

جین نے جواب دیا:"میں اُن کی دعوت قبول کر چکی ہوں۔ آپ کو میرے متعلق فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔"

"اگر جنگ نہ چھڑ گئی تو میں واپس آجاؤں گا اور پھر میری پہلی درخواست یہ ہو گی کہ ہمیں کسی تاخیر کے بغیر شادی کر لینی چاہیے۔"

جین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا:"لیگرانڈ ابھی مجھے اس مسئلہ کے متعلق سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ ہمیں کسی اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ انور اور مراد کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھا رہے تھے۔ جین کا سفر ان کی گفتگو کا موضوع تھا۔ کھانا کھانے کے بعد جین بظاہر ان باتوں میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہی تھی لیکن تھکاوٹ اور نیند کے باعث اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔

لیگرانڈ نے کہا:"تمھاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"میں کچھ تھکاوٹ محسوس کر رہی ہوں۔" اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"تو تمھیں آرام کرنا چاہیے۔"

جین اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور انور علی نے کہا "مراد، جاؤ انھیں امی جان کے پاس لے جاؤ۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گئے اور انور علی لیگرانڈ کی طرف متوجہ ہوا:

"تم نے اپنی شادی کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"ہم نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ہماری بٹالین چار دن بعد یہاں سے کوچ کر رہی ہے۔ ان حالات میں شادی کے متعلق ہم کیا سوچ سکتے ہیں؟"

"میں موسیو لالی سے کہوں گا کہ وہ تمھیں شادی کے لیے بہت جلد چھٹی دیدیں۔ تمھیں جین کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ امی جان تمھاری غیر حاضری میں اس کا خیال رکھیں گی۔ مجھے صرف ایک ہفتہ کے لیے یہاں ٹھہرنے کی چھٹی ملی ہے۔ اس کے بعد مجھے ملیبار یا شمالی سرحد کے کسی قلعے کی حفاظت پر متعین کر دیا جائے گا۔"

لیگرانڈ نے پوچھا: "آپ نے کہا تھا کہ آپ اپنی جگہ کسی دوسرے افسر کی آمد کا انتظار کیے بغیر پانڈی چری سے آ گئے ہیں۔ سپہ سالار اس بات پر خفا تو نہیں ہوتے؟"

وہ بہت خفا ہوتے تھے لیکن میں نے تمھاری اور جین کی سرگزشت سنا کر ان کا غصہ دور کر دیا تھا۔ مجھے رخصت کرتے وقت انھوں نے کہا تھا: "انور علی، میں تم سے بہت خفا ہوں۔ میں اپنے کسی افسر سے ایسی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر تم اس بڈھے ڈاکو کی مدد سے کوتاہی کرتے تو میں تم سے بہت زیادہ خفا ہوتا ——— تم نے ہندو سپاہیوں کی مدد کی ہے اور میں تمھیں شاباش کا مستحق سمجھتا ہوں۔"

لیگرانڈ نے کہا: "اب آپ کو بھی آرام کی ضرورت ہے، مجھے اجازت دیجیے۔ میں کل ملوں گا۔"

انور علی نے کہا "چلو، میں تم کو دروازے تک چھوڑ آؤں" ———

تھوڑی دیر بعد وہ ڈیوڑھی سے باہر کھڑے تھے۔ لیگرانڈ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "موسیو، میں آپ کا بہت شکرگزار رہوں گا۔"

انور علی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے چاند کی روشنی میں اس کی طرف دیکھا ——— لیگرانڈ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ بولا: "لیگرانڈ تم میرے دوست ہو ——— اور میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔"

چوتھا باب

بلقیس اپنی بیٹیوں اور گاؤں کی چند عورتوں کے ساتھ مکان کے ایک کشادہ کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ خادمہ نے چلمن اٹھا کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ "بی بی جی خاں صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔"

بلقیس اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلی اور خادمہ نے ڈیوڑھی کے پاس ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "خاں صاحب وہاں ہیں اور ان کے ساتھ ایک مہمان بھی ہے۔"

بلقیس کشادہ صحن عبور کرنے کے بعد کمرے کے دروازے کے قریب رُکی اور ایک ثانیہ اندر جھانکنے کے بعد پریشان سی ہو کر ایک طرف ہٹ گئی۔ کمرے سے اکبر خاں کی آواز سنائی دی۔ "بلقیس اندر آؤ، یہ مراد علی ہے۔"

بلقیس کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور وہ اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ مُراد علی "چچی جان، السلام علیکم!" کہہ کر اپنی کرسی سے اٹھا اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔ کوشش کے باوجود بلقیس اپنے مُنہ سے کچھ نہ کہہ سکی اور اس نے ایک لمحہ توقف کے بعد آگے بڑھ کر اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ مراد علی کے سر پر رکھ دیے۔ اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مُراد تم اکیلے ہو؟"

"ہاں چچی جان! بھائی جان انور علی گھر سے باہر تھے اور انھیں چھٹی نہیں مل سکی۔"

بلقیس نے کہا "میرا خیال تھا تمھاری امّی جان ضرور آئیں گی۔"

"چچی جان وہ آنے کے لیے تیار تھیں لیکن ان کی صحت اس قابل نہ تھی کہ وہ اتنا طویل سفر کر سکیں، وہ کہتی تھیں کہ جب شہباز کی شادی ہو گی تو میں ضرور آؤں گی۔"

اکبر خاں نے کہا بلقیس بیٹھ جاؤ اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ مراد علی بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک کمسن لڑکی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی لیکن اچانک مراد علی کو دیکھ کر جھجکتی ہوئی ایک طرف ہٹ گئی اور اکبر خاں کی کُرسی کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

اکبر خاں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ثمینہ! یہ تمھارے سرنگاپٹم والے بھیا مراد علی ہیں۔ وہ اتنی دُور سے تمھیں دیکھنے آئے ہیں اور تم نے انھیں سلام بھی نہیں کیا!"

ثمینہ کی آنکھیں مسرت سے چمک اُٹھیں اور وہ "بھائی جان السلام علیکم" کہہ کر پورے انہماک کے ساتھ مراد علی کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر وہ جھجکتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی اور باہر نکل کر پوری رفتار سے بھاگنے لگی۔ آن کی آن میں وہ صحن عبور کرنے کے بعد ایک اور کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کی بڑی بہن تنویر اپنی سہیلیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ ثمینہ ہانپتی ہوئی آگے بڑھی اور بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس نے اپنا مُنہ تنویر کے کان سے لگا دیا۔ تنویر نے اُسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ "پگلی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، انسانوں کی طرح بات کرو۔"

لیکن ثمینہ دوبارہ اس کے لپٹ گئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی "آپا جان، وہ آ گئے ہیں۔"

"کون آ گئے ہیں؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

دوسری بولی "ارے ثمینہ یہ کہہ رہی ہے کہ برات والے آ گئے ہیں۔"

کمرہ تنویر کی سہیلیوں کے قہقہوں سے گونج اٹھا اور وہ لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

ایک لڑکی نے ثمینہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "اری ثمینہ سچ بتاؤ کون آیا ہے؟"

لیکن ثمینہ نے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تنویر کی طرف متوجہ ہو کر پوری قوت سے چلائی۔

"آپا جان سرنگاپٹم والے بھائی جان مراد علی آ گئے ہیں۔"

تنویر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی اور اس نے ثمینہ کو بازو سے پکڑ کر قریب بٹھا لیا۔

دوسرے کمرے میں اکبر خاں اور بلقیس کچھ دیر مراد علی سے باتیں کرتے رہے۔ بالآخر اکبر خاں نے اٹھتے ہوئے کہا: "میں ذرا باہر مہمانوں کو دیکھوں۔"

بلقیس نے کہا: "آپ ماموں جان کو دیوان خانے میں بھیج دیں۔ وہ بڑی بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "ماموں جان کے ساتھ آتے ہی ان کی ملاقات ہو گئی تھی۔"

مراد علی نے کہا: "چچا جان! بھائی شہباز کہاں ہیں؟"

"وہ باہر خیمے نصب کروا رہا ہے۔ میں ابھی اُسے بھیجتا ہوں۔"

مراد علی نے اٹھتے ہوئے کہا: "چچا جان میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازے کے پاس پڑی ہوئی ریشمی کپڑے کی ایک گٹھڑی اٹھائی اور بلقیس کے قریب ایک کرسی پر رکھتے ہوئے کہا: "چچی جان، امی جان نے یہ کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔"

اکبر خان نے کہا: "دیکھو بیٹا یہ گٹھڑی تمھیں اسی طرح واپس لے جانی پڑے گی۔ میں نے بار بار ان سے تاکید کی تھی کہ وہ کوئی تکلیف نہ کریں۔"

مراد علی نے کہا: "انھوں نے آپ کے لیے کوئی تکلیف نہیں کی۔ چچا جان وہ یہ کہتی تھیں کہ تنویر اور ثمینہ مجھے اپنے بچوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ خدا نے آپ کو سب کچھ دے رکھا ہے لیکن آپ نے اپنی بچیوں کے لیے ان کے تحائف قبول نہ کیے تو انھیں بہت تکلیف ہو گی۔ آپ ہمیں یہ احساس نہ دلائیں کہ ابا جان کی وفات کے بعد ہم کسی قابل نہیں رہے۔"

مراد علی کے یہ الفاظ ایک نشتر کی طرح اکبر خاں کے دل میں اُتر گئے اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "بیٹا یہ نہ کہو، تمھاری طرف سے ایک چھیتڑا بھی میرے نزدیک دنیا بھر کے خزانوں سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔"

وہ باہر نکل گئے اور بلقیس نے قدرے تذبذب کے بعد گٹھڑی کھولی۔ گٹھڑی سے ریشم اور زرتار

کے چند جوڑوں کے علاوہ صندل کی ایک چھوٹی سی صندوقچی برآمد ہوئی۔ بلقیس نے صندوقچی کا ڈھکنا اٹھایا تو اس کے اندر موتیوں کے ہار، طلائی کنگن اور بالیاں جن میں ہیرے جڑے ہوئے جگمگا رہے تھے۔ صندوقچی میں زیورات کے علاوہ فرحت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رقعہ بھی تھا جس کا مضمون یہ تھا:

"میری پیاری بہن!

مجھے اُمید ہے کہ آپ معمولی تحائف قبول فرمائیں گی۔ زرتار کا جوڑا ننھی ثمینہ کے لیے ہے، باقی تمام تنویر کے لیے۔ خدا معلوم میں کب تک زندہ رہوں۔ اس لیے میں نے دونوں بہنوں کے لیے چند زیورات بھیجے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بذاتِ خود اس خوشی میں شریک نہیں ہو سکی۔ لیکن میری دعائیں ہر وقت آپ کے ساتھ ہیں۔"

تمھاری بہن

ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا: "امی جان وہ کہاں گئے؟"

بلقیس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "وہ باہر گئے ہیں بیٹی۔"

ثمینہ نے صندوقچی میں ہاتھ ڈال کر موتیوں کا ایک ہار نکالتے ہوئے پوچھا: "امی جان یہ آپا کے لیے ہے؟"

"ہاں بیٹی! یہ تمھارا سبز لنگاچم والا بھائی لایا ہے اور وہ تمھارے لیے بھی بہت سے زیورات لایا ہے، دیکھو ——!"

"اور میرے لیے کپڑے بھی لایا ہے؟"

"ہاں!"

"ہار بھی؟"

"ہاں! وہ تمھارے لیے کنگن، بالیاں اور انگوٹھی بھی لایا ہے۔"

ثمینہ نے شکایت کے لہجے میں کہا: "لیکن شہباز بھیا میرے لیے کبھی کوئی چیز نہیں لاتے۔"

الٹا مجھے ڈانٹا کرتے ہیں۔ اب اگر انھوں نے مجھے کچھ کہا تو میں یہاں نہیں رہوں گی۔"

"تم کہاں جاؤ گی؟" بلقیس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں سرنگا پٹم چلی جاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے ثمینہ نے موتیوں کا ہار اپنے گلے میں ڈال لیا۔

بلقیس نے کہا۔ "اگر سرنگا پٹم میں کسی نے ڈانٹ دیا تو؟"

"تو پھر میں وہاں بھی نہیں رہوں گی۔ میں ادھونی والی خالہ جان کے پاس چلی جاؤں گی۔"

بلقیس نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر انھوں نے نہ آنے دیا تو؟"

"واہ جی وہ کیسے نہیں آنے دیں گے۔ میں ان کے برتن توڑ ڈالوں گی۔ میں یہ کہوں گی کہ میں چھت پر چڑھ کر چھلانگ لگا دوں گی اور وہ ہاتھ جوڑ کر مجھے رخصت کریں گے۔"

○

اکبر خان کی بستی میں پہنچنے کے چند گھنٹے بعد مراد علی کے دل سے اجنبیت کا احساس دور ہو چکا تھا۔ وہاں ایسے لوگ موجود تھے۔ جن کے دل پر اس کے باپ کی یاد نقش تھی یہ لوگ اپنے بچوں کو اپنے ماضی کی جو داستانیں سنایا کرتے تھے۔ ان میں رہیلہ سورماؤں کے ساتھ معظم علی کا ذکر بھی آتا تھا۔ اس کی شکل وصورت اور اس کی جرأت و مردانگی ان لوگوں کی کہانیوں اور گیتوں کا مستقل موضوع بن چکی تھی۔ اور جب انھوں نے اکبر خان کی زبانی اس کی شہادت کی خبر سنی تھی تو انھوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ان کا ایک عزیز ترین دوست دُنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔

ان لوگوں کے لیے معظم علی کے بیٹے کی آمد کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جوان، بچے اور بوڑھے مُراد علی کے راستے میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ وہ گھر سے باہر نکلتا تو عقیدت مندوں کا ایک ہجوم اس کے گرد جمع ہو جاتا۔ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کے باپ کو دیکھا تھا وہ کہتے تھے اس کی صورت اس کی چال اس کی گفتگو اپنے باپ جیسی ہے۔

اکبر خاں کا بیٹا شہباز خان اس کے ساتھ پہلی ملاقات میں ہی بے تکلف ہو چکا تھا۔ وہ ایک

قوی ہیکل اور خوش وضع نوجوان تھا اور سردار کا بیٹا ہونے کے باعث اسے قبیلے کے لوگوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ آس پاس کی تمام بستیوں میں وہ ایک بہترین سوار اور نشانہ باز مانا جاتا تھا لیکن اس کی یہ خوبیاں مراد علی کو متاثر کرنے کے لیے کافی نہ تھیں۔ وہ پہلی ملاقات میں ہی اپنی ذہانت اور تعلیمی قابلیت کا اس پر کوئی اچھا اثر نہ ڈال سکا۔ اس نے مراد علی سے متعارف ہوتے ہی پہلے اُسے مکان کے مردانہ حصے میں وہ کمرہ دکھایا جہاں اس نے اپنے شکار کیے ہوئے شیروں اور چیتوں کی کھالیں جمع کر رکھی تھیں۔ پھر اچھی نسل کے گھوڑوں کے متعلق بات چل نکلی اور وہ اسے اپنے اصطبل میں لے گیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب گاؤں کے لوگ مراد علی کی طرف متوجہ ہونے لگے تو شہباز کا احساس برتری آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ اگلے دن مراد علی بستی کی ہر محفل کا موضوع بن چکا تھا۔ عام حالات میں شہباز خاں کو اپنے ایک مہمان کی آؤ بھگت پر خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اسے اپنی چھوٹی سی سلطنت میں کسی اور بادشاہ کی مداخلت پسند نہ تھی۔ ایک اچھا سوار، ایک بہترین نشانہ باز، ایک نڈر شکاری اور ایک کامیاب زمیندار ہونے کے علاوہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا اطمینان یہ تھا کہ قبیلے میں اپنے باپ کے بعد اُسے انتہائی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن اب وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ کمسن لڑکا اس بستی میں پاؤں رکھتے ہی ہر محفل کا چراغ بن چکا ہے۔ اُسے زیادہ اُلجھن اس وقت ہوئی جب مُراد علی شیخ فخر الدین کے ساتھ میسور، دکن، پونا اور کرناٹک کے سیاسی حالات پر بحث کر رہا تھا اور اس کا باپ بھی انتہائی انہماک سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

اس محفل کے برخاست ہونے کے بعد جب اسے تنہائی میں مُراد علی سے باتیں کرنے کا موقع ملا تو اُس نے کہا: "مُراد تم بہت خوش قسمت ہو کر اس عمر میں اتنا کچھ سیکھ چکے ہو مجھے افسوس ہے کہ میری تعلیم بالکل ادھوری رہ گئی۔ مجھے صرف گاؤں کے مولوی نے چند کتابیں پڑھائی تھیں۔ امی جان مجھے حیدر آباد بھیجنا چاہتی تھیں لیکن میں گھر چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ابا جان بھی اس پر خوش نہ تھے کہ میں حیدر آباد جاؤں۔ پھر جب میں بڑا ہُوا تو خالو جان نے یہاں آکر کئی بار اصرار کیا کہ میں

ادھونی کی فوج میں شامل ہو جاؤں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ میں بہت جلد ترقی کر جاؤں گا لیکن ابا جان ادھونی کی فوج کا نام تک سننا پسند نہیں کرتے۔ وہ الٹا خالو کو سمجھایا کرتے ہیں کہ تم اپنے لڑکے کو سپاہی بنانے کی بجائے کسی اچھے کام پر لگاؤ۔ اب میرے خالو کا لڑکا ہاشم بیگ دو سو سواروں کا سردار بن چکا ہے اور میں یہیں ہوں۔ خالو جان جب بھی آتے ہیں ابا جان سے یہ کہتے ہیں 'تم نے اپنے لڑکے پر ظلم کیا ہے اگر یہ فوج میں ہوتا تو ادھونی کے تمام نوجوانوں سے آگے نکل جاتا۔'"

مراد علی نے کہا: "آپ کو سپاہی بننے کا شوق ہے؟"

شہباز نے جواب دیا: "مجھے گھوڑا دوڑانے اور شکار کھیلنے کے سوا کسی چیز کا شوق نہیں لیکن ادھونی سے جب بھی ہمارا کوئی رشتہ دار آتا ہے تو وہ پہلا سوال یہی پوچھتا ہے کہ تم فوج میں بھرتی کیوں نہیں ہوئے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھے بزدلی کا طعنہ دے رہا ہے۔"

مراد علی مسکرایا: "ادھونی کی فوج میں بھرتی ہونے سے کوئی آدمی بہادر نہیں بن جاتا۔ بہادر صرف وہ ہوتے ہیں جو کسی مقصد کے لیے لڑتے ہیں۔ چچا جان برسوں سے ایک سپاہی کا لباس اتار چکے ہیں لیکن ادھونی یا حیدر آباد کا کوئی آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اُن سے زیادہ بہادر ہے۔"

شہباز خاں نے قدرے مطمئن ہو کر کہا: "میرا خیال تھا کہ میرے متعلق ہاشم بیگ کی طرح تمہاری رائے بھی شاید یہی ہو کہ میں اپنی کاہلی کی وجہ سے فوج میں شامل نہیں ہوا۔"

مراد علی نے جواب دیا: "نہیں بھائی جان! میں آپ کے متعلق کبھی بری رائے قائم نہیں کر سکتا اور اگر کبھی ہاشم بیگ نے یہ سوچا کہ اس نے کن مقاصد کے لیے تلوار اٹھائی ہے تو اسے آپ کی بستی کے ایک معمولی کسان کی زندگی بھی قابلِ رشک نظر آئے گی۔ اگر مجھ سے کوئی یہ کہے کہ تم ادھونی کی فوج کا سپہ سالار بننا چاہتے ہو یا میسور کی کسی بستی میں ایک گمنام کسان کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو میں کسان کی زندگی کو ترجیح دوں گا۔"

شہباز خاں کو مراد علی کی یہ بات پسند نہ آئی تاہم وہ اس بات پر ایک طرح کا اطمینان محسوس کر رہا تھا کہ معظم علی کا بیٹا اسے فوج کا کوئی بڑا عہدے دار نہ ہونے کے باوجود قابلِ احترام

سمجھتا ہے۔

مُراد علی تنویر کی برات کی آمد سے پانچ دن قبل وہاں پہنچا تھا اور یہ پانچ دن اس کے لیے زندگی کا ناقابلِ فراموش حصّہ بن چکے تھے۔ گھر میں ننھی ثمینہ سایے کی طرح اس کے ساتھ رہتی تھی۔ تنویر اس سے پردہ کرتی تھی لیکن بلقیس کو جب کبھی تھوڑی بہت فرصت ملتی، وہ اسے اپنے پاس بلا لیتی اور گزرے دنوں کی باتیں شروع کر دیتی۔

ایک صبح تنویر اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ تنویر نے ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا: "ثمینہ یہ کہتی ہیں کہ تمہارے سرنگاپٹم والے بھائی کی ناک چپٹی ہے۔"

"کون کہتی ہے؟" ثمینہ نے غضبناک ہو کر پوچھا۔

"میں کہتی ہوں۔" ثمینہ کی سہیلی نے جواب دیا "اور میں یہ بھی کہتی ہوں کہ وہ گنجا بھی ہے۔"

دوسری سہیلی نے کہا: "اری میں نے بھی اسے دیکھا ہے اس کا رنگ بالکل سیاہ ہے۔"

"تھڑدا" ثمینہ نے منہ بسورتے ہوئے چلمن اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ تنویر نے کہا۔ "اب یہ امی جان سے ہماری شکایت کرے گی۔"

چند منٹ بعد تنویر کی ایک سہیلی نے صحن کی طرف دیکھا اور بدحواس ہو کر کہا: "اری تنویر غضب خدا کا وہ چڑیل اسے اس طرف لا رہی ہے۔"

تنویر نے چلمن کی اوٹ سے صحن کی طرف دیکھا۔ ثمینہ مراد علی کا ہاتھ پکڑے دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی اور اُسے کہہ رہی تھی "بھائی جان میں نے جھوٹ بولا تھا۔ آپ کو امی جان نے نہیں بلایا تھا۔ آپ تھوڑی دیر یہاں ٹھہریں میں ابھی آتی ہوں۔"

مراد علی کو تذبذب اور پریشانی کی حالت میں چھوڑ کر وہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی "اب اچھی طرح دیکھ لو۔"

تنویر نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھتے ہوئے

کہا ثمینہ خدا کے لیے شرم کرو، جاؤ انھیں باہر لے جاؤ ورنہ میں بُری طرح پیٹوں گی۔"

تنویر کی سہیلی نے کہا "جاؤ ثمینہ ہم تو تمھیں چھیڑ رہی تھیں۔ تمھارا بھائی تو بہت ہی خوش شکل ہے۔"

ثمینہ تنویر کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہو کر بولی "آپ پھر تو نہیں کہیں گی کہ ان کی ناک چپٹی ہے؟"

"خدا کی قسم بالکل نہیں۔"

ثمینہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی اور مُراد علی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی "آئیے بھائی جان!"

"کیا بات تھی ثمینہ؟" اس نے صحن سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں بھائی جان، وہ مذاق کر رہی تھیں۔"

"کون مذاق کر رہی تھیں؟"

"آپا جان کی سہیلیاں۔"

"کس کے ساتھ؟"

"میرے ساتھ ______"

"لیکن تم نے مجھے یہ کیوں کہا تھا کہ آپ کو آپی جان بُلاتی ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ آپ کو اچھی طرح دیکھ لیں۔"

"کون؟"

"وہی جو یہ کہتی تھیں کہ آپ کی ناک چپٹی ہے۔"

"کون کہتی تھیں؟"

"آپا جان کی سہیلیاں۔"

مُراد علی نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اور تمھارا خیال کیا ہے کہ میری ناک چپٹی نہیں؟"

ثمینہ نے رُک کر غور سے اس کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے بولی "بالکل نہیں۔"

○

اکبر خاں کی تیاریوں سے معلوم ہوتا تھا کہ ادھونی کی برات بڑی دھوم دھام سے آنے والی ہے۔ مکان سے باہر ایک کھُلے میدان میں خیمے اور شامیانے نصب کیے جا رہے تھے۔ اکبر خاں اور شہباز دن بھر شادی کے انتظامات میں مصروف رہتے تھے۔ مراد علی کو بیکار بیٹھنا پسند نہ تھا۔ وہ ان کے کام میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا لیکن بستی کے لوگ فوراً مداخلت کرتے اور کہتے، "نہیں جی، آپ مہمان ہیں۔ ان کاموں کے لیے ہم جو موجود ہیں۔" اکبر خاں کو نمائشی کاموں سے نفرت تھی لیکن ادھونی سے اسے اس قسم کے پیغامات مل چکے تھے کہ برات دھوم دھام سے آئے گی اور اسے اپنی سادگی کے باوجود کسی کی زبانی یہ سُننا گوارا نہ تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کی شادی پر بخل سے کام لیا ہے۔ چنانچہ مہمانوں کی آؤ بھگت کے لیے وہ اپنے تمام وسائل جمع کرنے میں مصروف تھا۔

پانچویں روز اکبر خاں کے قبیلے کے لوگ گاؤں سے باہر جمع ہو کر حیرت و استعجاب کے عالم میں برات کے شاہانہ ٹھاٹھ دیکھ رہے تھے۔ تین ہاتھیوں پر دولہا اور اس کے خاندان کے علاوہ ادھونی کے بڑے بڑے امرا اور سلطنت کے اعلیٰ عہدے دار سوار تھے۔ ہاتھیوں کے پیچھے کوئی پانچ سو آدمی گھوڑوں پر سوار تھے اور ان کے پیچھے ساز و سامان کی لدی ہوئی بیس گاڑیوں کے ساتھ پیادہ سپاہیوں، نوکروں اور خیمہ برداروں کا ایک ہجوم چلا آ رہا تھا۔ برات کے ساتھ کئی طائفے شہنائیاں بجا رہے تھے اور آتش بازوں کا ایک گروہ گولے اور ہوائیاں چھوڑ رہا تھا۔

مہمانوں کی مجموعی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی لیکن اکبر خاں نے تقریباً دو ہزار مہمانوں کے قیام و طعام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ مراد علی کو یہ معلوم تھا کہ دولہا کا باپ ادھونی کے حکمران خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لیے برات کی شان و شوکت غیر متوقع نہ تھی۔ تاہم یہ بات اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی کہ مہمانوں کے ساتھ ادھونی کے چند باج گزار مرہٹہ سردار بھی تھے۔

اکبر خاں اس کے قریب کھڑا شیخ فخرالدین سے انتہائی غصّے کی حالت میں کہہ رہا تھا: "شیخ صاحب یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ میری لڑکی کی برات پر میری قوم کے بدترین دشمنوں کو لے کر آئیں گے۔ مرزا طاہر بیگ کو مرہٹوں کے متعلق میرے جذبات کا علم تھا لیکن اس کے باوجود اس نے یہ حماقت کی ہے۔" اور شیخ فخرالدین اسے سمجھا رہا تھا: "بیٹا! تم نے ادھونی کے شاہی خاندان سے رشتہ جوڑا ہے اور یہ لوگ ادھونی کے باج گزار ہیں! اگر تم طاہر بیگ کو پیغام بھیج دیتے تو وہ یقیناً تمہارے جذبات کا احترام کرتا لیکن اب تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہیے۔"

براتی اپنے گھوڑوں اور ہاتھیوں سے اُتر کر وسیع شامیانے کے نیچے جمع ہو رہے تھے اور گاؤں کے لوگ ان کے گھوڑے اور ہاتھی سنبھالنے میں مصروف تھے۔

رات کے وقت کھانا کھلانے کے بعد مہمانوں کو ان کی حیثیت کے مطابق مختلف خیموں میں جگہ دی گئی۔ دولہا اور اس کے خاندان کے بعض افراد اور ادھونی کے چند معززین کو مکان کے مردانہ حصّے میں ٹھہرایا گیا۔ مُراد علی دیر تک مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف رہا اور بالآخر شامیانے کے نیچے پڑی ہوئی ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ اچانک اسے شہباز خاں کی آواز سنائی دی "مُراد علی! مراد علی!!" اور اس نے جلدی سے اٹھ کر کہا: "بھائی جان میں یہاں ہوں کیا بات ہے؟"

شہباز نے اس کے قریب آکر کہا: "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ چلیے آپ کو ابا جان بلا رہے ہیں۔"

مراد علی اس کے ساتھ چل دیا اور تھوڑی دیر بعد مکان کے مردانہ حصّے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے اندر شیخ فخرالدین بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اکبر خاں اس کے قریب دوسری چارپائی پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مراد علی کو دیکھتے ہی کہا: "بیٹا تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"چچا جان میں باہر شامیانے کے نیچے لیٹ گیا تھا۔"

اکبر خاں نے کہا: "تمہارا خیال ہے کہ آج میرے گھر کے اندر تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

"نہیں چچا جان، میرا خیال تھا کہ یہاں صرف مہمانوں کو ٹھہرنا چاہیے۔"

"میرے نزدیک کوئی مہمان تم سے بہتر نہیں۔ تم یہاں آرام کرو۔"

مُراد علی کچھ کہے بغیر ایک بستر پر لیٹ گیا۔

○

اگلے روز اکبر خاں کے گاؤں میں ایک میلے کا سا سماں تھا۔ مہمانوں کا ایک گروہ شامیانے کے نیچے جمع ہو کر قوالی سُن رہا تھا۔ بعض مہمان اپنے خیموں کے اندر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ اور بعض کھلے میدان میں جمع ہو کر نیزہ بازی اور نشانہ بازی کے مقابلوں میں حصّہ لے رہے تھے۔ دُولہا اور اس کا باپ چند معززین کے ساتھ حویلی کی چار دیواری کے اندر ایک شامیانے کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔

ہاشم بیگ ایک خوش وضع نوجوان تھا اور دولہا کے لباس میں ایک شہزادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دائیں طرف شیخ فخرالدین اور اکبر خاں اور بائیں طرف طاہر بیگ اور اس کے خاندان کے چند عمر رسیدہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مُراد علی ہاشم بیگ کے پیچھے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ملک کے ماضی اور حال کے واقعات پر گفتگو ہو رہی تھی اور ادھونی کے سیاست دان اور فوجی افسر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ کسی نے سلطان ٹیپو کا ذکر چھیڑ دیا اور مراد علی اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں سُلطان ٹیپو کی ذات کئی زبانوں کے زہرآلود تیروں کا ہدف بن چکی تھی۔

ادھونی کے ایک سردار نے کہا: "ٹیپو اس ملک کا مغرور ترین آدمی ہے۔ وہ کسی کو اپنا ہم پلّہ نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے آپ کو حضور نظام الملک سے بھی بڑا سمجھتا ہے۔"

دُوسرا بولا: "ٹیپو اس ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ وہ ہماری تہذیب اور روایات کا بدترین دشمن ہے۔ وہ اُونچ اور نیچ کی تمیز مٹانا چاہتا ہے۔ اس کے دربار میں کورنش بجا لانے یا جُھک کر سلام کرنے کی ممانعت ہے۔ وہ اپنے سامنے کسی رذیل ترین آدمی کا بھی سر جھکا کر کھڑا ہونا

پسند نہیں کرتا۔ وہ اسلام کی آڑ لے کر اس ملک کے شرفا کو رذیلوں اور بھکاریوں کے ہاتھوں ذلیل کروانا چاہتا ہے۔ میسور میں ادنیٰ اور اعلیٰ کو ایک سطح پر لانے کا جو تجربہ اس نے شروع کیا ہے، اس کے نتائج اس ملک کے تمام حکمرانوں کے لیے بے حد خطرناک ہوں گے۔ اس نے اپنی رعایا کے ادنیٰ لوگوں میں ایک نیا احساس پیدا کر دیا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے عوام کسی نہ کسی دن میسور کے حالات سے ضرور متاثر ہوں گے۔ ہم یا تو انھیں اپنے مساوی درجہ دینے پر مجبور ہو جائیں گے یا ہمیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ان کے ساتھ ایک تباہ کن جنگ لڑنی پڑے گی۔"

ادھونی کے ایک فوجی افسر نے کہا: "ٹیپو جیسا بے تدبیر انسان ہمارے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اس نے ساری دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے اور وہ جس طوفان کو دعوت دے رہا ہے وہ بہت جلد میسور کی سرحدوں پر نمودار ہونے والا ہے۔ اس دفعہ ہم اور ہمارے انگریز اور مرہٹہ اتحادی پچھلی غلطیوں کا اعادہ نہیں کریں گے۔ اب ہماری پہلی منزل سرنگاپٹم ہوگی۔"

ایک مرہٹہ سردار بولا: "صاحبان ہمیں اس کی فوجی قوت سے کوئی خطرہ نہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر ہم نے متحد ہو کر اس کے خلاف فوراً کارروائی نہ کی تو چند سال بعد ہمیں پچھتانا پڑے گا۔ میسور کے وہ شرفا جو اپنی خاندانی عزت اور وقار بچانے کے لیے آج ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں ایک ایک کر کے مغلوب ہوتے جائیں گے۔ ٹیپو کو بعض لوگ ایک بے تدبیر انسان سمجھتے ہیں، اپنی رعایا کی محبت خریدنا جانتا ہے۔ اس نے عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہزاروں گھرانے سرکاری زمینوں پر آباد کر دیے ہیں۔ وہ بنجر علاقے جہاں اناج کا ایک دانہ پیدا نہیں ہوتا تھا اب لہلہاتے کھیتوں اور باغوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس نے لاکھوں انسانوں کو کنوئیں اور نہریں کھودنے اور سڑکیں بنانے کے کام پر لگا دیا ہے۔ اس لیے یہ لوگ اسے اپنا دیوتا سمجھتے ہیں۔ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہمیں میسور کی فوج اور میسور کے عوام کی متحدہ قوت کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔"

مرزا طاہر بیگ نے اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا: "جی، آپ اب بھی یہ سمجھتے

ہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ آپ ہماری تیاریوں سے بے خبر نہیں ہو سکتے، ہم لوگ صرف حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اکبر خاں بے چینی کی حالت میں کرسی پر بیٹھا بار بار پہلو بدل رہا تھا اور شیخ فخرالدین بار بار اس کے کان میں کہہ رہا تھا: "نہیں بیٹا، حوصلے سے کام لو۔ تمھیں اس معاملے میں زبان نہیں کھولنی چاہیے۔"

مراد علی کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اچانک اٹھ کر چلایا: "مرزا صاحب اگر حکم سے آپ کا مطلب انگریزوں کا حکم ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس محفل میں زبان کھول رہا ہوں۔ آپ اس شخص کے مہمان ہیں جسے میں اپنا باپ سمجھتا ہوں۔ لیکن آپ نے اس شخص کو موضوعِ بحث بنایا ہے جسے میں صرف میسور ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی عزت اور آزادی کا آخری محافظ سمجھتا ہوں۔"

محفل پر ایک سناٹا چھا گیا۔ ادھونی کے معزز امرا حیرت، پریشانی اور اضطراب کی حالت میں اس نوجوان کی طرف دیکھ رہے تھے جس کی مونچھوں کے بال ابھی تک سیاہ نہیں ہوئے تھے۔ مراد علی کی نگاہیں ساری محفل کو دعوتِ مبارزت دے رہی تھیں۔ اس نے کہا: "آپ کو اس بات پر اعتراض ہے کہ سلطان ٹیپو نے اپنے دربار میں کورنش بجا لانے کی رسم بند کر دی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے سلطان کو صرف ان چند لوگوں کی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جنھوں نے حکومت کی کرسیوں پر بیٹھ کر صرف اپنے ہم جنسوں کو ذلیل کرنا سیکھا ہے۔ سلطان ٹیپو ایک حکمران ہے لیکن حکمران سے کہیں زیادہ وہ اپنے آپ کو ایک انسان سمجھتا ہے اور اسے انسانیت کی تذلیل گوارا نہیں۔ اس نے زندگی کے آداب انسانیت کے اس عظیم ترین محسن سے سیکھے ہیں جس نے کالے اور گورے، ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق مٹایا تھا ____ جس نے ایک حبشی غلام کو خاندانِ قریش کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔

آپ کو یہ اعتراض ہے کہ سلطان ٹیپو ساری دنیا کے ساتھ قوت آزمائی کرنا چاہتے ہیں،

لیکن آپ اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ اس وقت بھی ان کے ایلچی پونا اور حیدر آباد کے حکمرانوں کو امن اور صلح کا پیغام دے رہے ہیں۔

آپ کو یہ شکوہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کے بھوکے اور ننگے انسانوں کو خوش حالی اور آسودگی کا راستہ دکھا کر ایسے معاشرے کی طرح ڈال رہے ہیں جو اس ملک سے اونچ اور نیچ کا امتیاز دور مٹا دے گا۔ اور یہ آپ کے خلاف ایک سازش ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہ انسانیت کے ان دشمنوں کی سازش کا جواب ہے جنھوں نے اس ملک کے کروڑوں انسانوں کو صدیوں تک ان کے پیدائشی حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔

آپ کو اپنی اور اپنے انگریز اور مرہٹہ ساتھیوں کی فوجی قوت پر ناز ہے لیکن میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ اب میسور ان لوگوں کی شکارگاہ نہیں رہا جنھوں نے بھوکے، نادار اور بے بس انسانوں کو پاؤں تلے روندنا سیکھا ہے۔ میسور ان لوگوں کا دفاعی حصار ہے جو عزت اور آزادی کی فضا میں سانس لینا سیکھ چکے ہیں، وہاں آپ کا مقابلہ کسی ایسے حکمران سے نہیں ہوگا جس نے اپنی رعایا کی ہڈیوں پر عشرت کدے تعمیر کیے ہوں بلکہ ایک ایسے حکمران سے ہوگا جو اپنے خون اور پسینے سے اپنی رعایا کی پرورش کر رہا ہے۔

میں اس ملک کے مستقبل کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ سلطان ٹیپو کی فتح انسانیت کی فتح ہوگی اور ان کی شکست حیدر آباد یا پونا کی افواج کی بجائے ان لٹیروں اور رہزنوں کی فتح ہوگی جو سات سمندر عبور کرنے کے بعد اس ملک کی عزت اور آزادی کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکے ہیں۔ آج آپ لوگ سلطان ٹیپو کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں لیکن خدانخواستہ اگر میسور میں ان کا پرچم سرنگوں ہوا تو وہ دن دور نہیں جب اس ملک کے تمام حکمران یہ کہیں گے کہ وہ مجاہد جس کا تاج اتار کر ہم نے انگریزوں کے قدموں میں ڈالا تھا، اس ملک کی آزادی کا آخری محافظ تھا۔"

مراد علی نے اپنی تقریر ختم کی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا شامیانے سے باہر نکل آیا۔

محفل کا سکوت ٹوٹ چکا تھا اور حاضرین ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے کے بعد آہستہ آہستہ بلند آواز میں احتجاج کر رہے تھے: "یہ کون تھا؟ ——— ٹیپو کا جاسوس یہاں کیسے آگیا؟ ——— اس کی زبان کھینچ ڈالنی چاہیے!"

اکبر خاں نے اپنی کرسی سے اٹھ کر کہا: "آپ لوگ اس محفل میں اگر ٹیپو کو موضوع بحث نہ بناتے تو یہ ناخوشگوار صورت پیدا نہ ہوتی۔ مراد علی ٹیپو کا سپاہی ہے۔ اس کے والد اور اس کے دو بھائی ٹیپو کے جھنڈے تلے انگریزوں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہو چکے ہیں۔ اس کے چچا اور اس کے دادا، اس کے ماموں اور اس کے نانا پلاسی کے میدان میں شہید ہوئے تھے۔ مجھے اس سے یہ توقع نہ تھی کہ کسی محفل کا خوف یا احترام اسے کوئی غلط بات سننے پر مجبور کر دے گا۔ مجھے سرنگاپٹم، پونا یا حیدر آباد کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں اور آپ حضرات سے میں یہ عرض کروں گا کہ آپ لوگ یہاں اپنی جنگی قابلیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک شادی کی تقریب پر جمع ہوئے ہیں۔"

ادھونی کے ایک سردار نے کہا: "لیکن اس نے ہماری توہین کی ہے۔ ہم کل کے بچے کی یہ زبان درازی برداشت نہیں کر سکتے۔"

ایک خوش پوش اور بارعب آدمی جو طاہر بیگ کے قریب بیٹھا ہوا تھا اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے کہا: "بھئی اس نے ہماری توہین نہیں کی۔ اس نے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ ہر محفل ہر بات کے لیے موزوں نہیں ہوتی۔ اگر وہ نوجوان ٹیپو کا سپاہی ہے تو ہمیں اس کی جرأت اور ہمت کی داد دینی چاہیے۔ اس نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور ادھونی کی فوج کے افسروں کے سامنے ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔ اب ہمیں کسی اور موضوع پر گفتگو کرنی چاہیے۔"

یہ میر نظام علی خاں کا بھتیجا امتیاز الدولہ تھا اور اس کے الفاظ حاضرین کے لیے ایک حکم کا درجہ رکھتے تھے۔

مراد علی انتہائی اضطراب اور پریشانی کی حالت میں ڈیوڑھی سے باہر کھڑا تھا۔ شہباز خاں باہر نکلا اور یہ کہہ کر اس کے قریب سے گزر گیا: "مراد تم نے اچھا نہیں کیا۔"

مراد علی نے اپنے دل پر ایک جھٹکا محسوس کیا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آپ نے آپا جان کی شادی کے خرمے نہیں کھائے؟"

مراد علی نے مڑ کر دیکھا اور ثمینہ نے اپنی جھولی کھول کر اس کے آگے کردی۔ "لیجیے!" اس نے کہا۔

مراد علی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک خرما اٹھا لیا۔

ثمینہ نے کہا۔ "نہیں اور لیجیے۔ یہ سب آپ کے لیے ہیں۔ کچھ کھا لیجیے اور باقی سرنگا پٹم لے جائیے۔"

مراد علی نے کہا۔ "ثمینہ تم انھیں اپنے پاس رکھو۔ جب میں یہاں سے جاؤں گا تو لے لوں گا۔"

اکبر خاں ڈیوڑھی سے نمودار ہوا اور مراد علی نے محسوس کیا کہ اب اسے شاید کسی انتہائی ناخوشگوار صورت حال سے دو چار ہونا پڑے لیکن اکبر خاں اس کی توقع کے خلاف مسکرا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مراد مجھے ڈر تھا کہ تم روٹھ گئے ہو گے۔ میں نے شہباز کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ اس نے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کی؟"

مراد علی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو امڈ آئے اور اس نے کہا "چچا جان میں بہت شرمسار ہوں۔ مجھے اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔"

اکبر خاں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا تم نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور مجھے تم پر فخر ہے۔"

"لیکن چچا جان وہ آپ کے مہمان تھے!"

"تم نے ان کے دماغ درست کر دیے ہیں۔ امتیاز الدولہ تمھاری باتوں سے بہت متاثر ہوا ہے۔ وہ نظام کا بھتیجا ہے اور اس نے تمھارے ساتھ علیٰحدگی میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ چلو تم اپنے کمرے میں بیٹھو۔ میں اسے وہاں لے آتا ہوں۔"

مراد علی اور اکبر خاں دوبارہ حویلی میں داخل ہوئے اور ثمینہ وہاں سے کھسک گئی۔ اکبر خاں شامیانے کی طرف چلا گیا اور مراد علی دیوان خانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ ادھوتی کے امرا کے سامنے اپنی تقریر کے بعد اسے نظام کے بھتیجے کے ساتھ ملاقات کے تصور سے ایک الجھن سی محسوس ہوتی تھی۔

چند منٹ بعد اکبر خاں اور امتیاز الدولہ کمرے میں داخل ہوئے اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ امتیاز الدولہ مصافحہ کرنے کے بعد اس کے قریب بیٹھ گیا اور اکبر خاں نے کہا: "اب آپ اطمینان سے باتیں کیجیے۔"

اکبر خاں باہر نکل گیا اور امتیاز الدولہ نے مراد علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تمھارا نام مراد علی ہے؟"

"جی ہاں!"

"سلطان کی فوج میں تمھارا عہدہ کیا ہے؟"

مراد علی نے جواب دیا "جناب! فوجی مکتب سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد میں ان دنوں رخصت پر ہوں۔ اس کے بعد مجھے چند مہینے کسی رسالے میں ایک ادنیٰ افسر کی حیثیت سے کام کرنا پڑے گا۔ پھر اگر مجھے کسی ذمہ داری کا اہل سمجھا گیا تو کسی دستے کی کمان دی جائے گی۔"

امتیاز الدولہ نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا "میں تمھاری باتوں سے بہت متاثر ہوا ہوں اور میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلطان ٹیپو کے متعلق دکن کے ہر آدمی کے وہ خیالات نہیں جو تم اس محفل میں سن چکے ہو۔ وہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو انھیں اپنا دوست سمجھتے ہیں اور جو دکن اور میسور کے موجودہ اختلافات کو اپنے مستقبل کے لیے اچھا شگون خیال نہیں کرتے اور میں ان میں سے ایک ہوں۔ مجھے نظام الملک اور سلطان ٹیپو کے درمیان کوئی ایسی خلیج نظر نہیں آتی جسے پاٹا نہ جا سکتا ہو۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ میسور اور دکن کے حقیقت پسند اور صحیح الخیال لوگ جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں کی اجتماعی بقا کے لیے دونوں حکومتوں کے اختلافات دور کرنے کی مخلصانہ کوشش جاری رکھیں۔"

مراد علی نے جواب دیا: "اگر آپ کے خیالات یہ ہیں تو میں آپ سے ملنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میسور کا ہر باشعور آدمی پانچوں وقت نماز کے بعد میسور اور دکن کے اتحاد کے لیے دعا کرتا ہے اور وہاں ایک شخص ایسا بھی ہے جس کے ہر سانس کے ساتھ صرف دکن اور میسور ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر مسلمان کے لیے دعائیں نکلتی ہیں اور وہ سلطان ٹیپو ہیں۔"

امتیاز الدولہ نے کہا: "کاش میں بھی تمہاری طرح پوری خود اعتمادی کے ساتھ نظام الملک کے متعلق کچھ کہہ سکتا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ حضور نظام الملک سلطان ٹیپو کو اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ تاہم میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کسی دن سلطان ٹیپو میرے جیسے بے بس انسانوں کی طرح حضور نظام کو بھی صحیح راستہ دکھا سکیں گے۔ قدرت نے انھیں جس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے وہ ضرور پورا ہو گا۔ جو دہشا تمہاری عمر کے نوجوانوں میں یہ جذبہ پیدا کر سکتا ہے اسے نظام الملک کو متاثر کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ میں صدقِ دل سے یہ دعا کرتا ہوں کہ سلطان کے ایلچی نظام الملک کو انگریزوں اور مرہٹوں سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔

جب تم اس محفل میں تقریر کر رہے تھے تو میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ دکن اور میسور کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو دکن کے لوگ مجھے نظام کے سپاہیوں کی اگلی صف میں دیکھیں گے۔ میں اس کے لیے لڑوں گا۔ میں اپنے سینے پر گولی کھاؤں گا۔ لیکن مرتے دم بھی سلطان ٹیپو کی شکست کے لیے دعا نہیں کر سکوں گا۔ میری آخری خواہش یہی ہو گی کہ دکن اور میسور کے درمیان ایک دائمی اتحاد کا معاہدہ میرے خون کی روشنائی سے لکھا جائے۔ میں بارہا سوچتا ہوں کہ آج تک جنوبی ہندوستان کی سرزمین پر اس ملک کے باشندوں کا جو خون گرا ہے وہ صرف فرنگی استبداد کی آبیاری کے کام آیا ہے۔"

مراد علی خاموشی سے امتیاز الدولہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی گفتگو سے اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی اور کی بجائے اپنے آپ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

شیخ فخر الدین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "میرا خیال تھا کہ آپ باہر قوالی سن رہے ہیں۔"

امتیاز الدولہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا: "شیخ صاحب! یہ ایام قوالی سننے کے لیے موزوں نہیں۔ میں اس نوجوان سے اپنی قوم کے حال اور مستقبل کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔"

شیخ فخر الدین نے واپس دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا: "تو مجھے اس محفل میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اپنے مستقبل کی منزل بہت قریب نظر آتی ہے اور میں ان دنوں صرف اپنے ماضی کے متعلق سوچا کرتا ہوں۔"

امتیاز الدولہ نے کہا: "نہیں شیخ صاحب تشریف رکھیے۔ شاید ماضی کے متعلق آپ کی باتیں سن کر ہم اپنے حال اور مستقبل کی تلخیوں کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیں۔"

شیخ فخر الدین ہنستا ہوا امتیاز الدولہ کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا "لیکن اگر میرے ماضی کی تلخیاں آپ کے حال اور مستقبل سے زیادہ ہوئیں تو؟"

امتیاز الدولہ مسکرایا: "تو ہم آپ کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

شیخ فخر الدین نے کہا: "جناب میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میرے پہلو میں دل ہی نہیں ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ معظم علی جیسے لوگ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں اور میں یہاں بھٹکتا پھروں؟"

"معظم علی کون تھا؟"

"معظم علی مراد کے والد تھے۔"

"آپ انھیں جانتے تھے؟"

"جی ہاں! اور میرے لیے اپنے مستقبل کے متعلق چند حسین امیدوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر خدا نے مجھے جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی اجازت دی تو میں کسی دن اس نوجوان کو دیکھوں گا جسے جاننا میری زندگی کی سب سے بڑی سعادت تھی۔

"آپ انھیں کب ملے تھے؟"

"ہماری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں اپنی بہن اور بھانجیوں کے ساتھ دلی سے حیدرآباد آرہا تھا اور راستے میں ڈاکوؤں نے ہمارے قافلے پر حملہ کر دیا تھا اُس وقت ہمیں چاروں طرف موت دکھائی دیتی تھی۔ پھر چند آدمی اچانک ہماری مدد کو پہنچ گئے۔ ان سے ایک معظم علی اور دوسرا اکبر خاں تھا۔ ڈاکو کئی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے اور میں معظم علی اور اکبر خاں کو دیکھ کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ خدا نے ہماری اعانت کے لیے دو فرشتے بھیج دیے ہیں۔"

اب معظم علی اور اکبر خاں کی شخصیتیں شیخ فخرالدین کی گفتگو کا موضوع بن چکی تھیں اور مراد اور امتیاز الدولہ اس کی باتوں میں ایک رنگین کہانی کی دلکشی محسوس کر رہے تھے۔

شہباز خاں کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا "جناب مہمان دسترخوان پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں چلیے!"

وہ اُٹھ کر باہر نکل آئے۔ مراد علی تذبذب کی حالت میں امتیاز الدولہ اور فخرالدین کے پیچھے آرہا تھا۔ شہباز خاں نے مراد علی کا بازو پکڑتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا "مراد میں اپنے طرزِ عمل پر بہت نادم ہوں۔ ابا جان مجھ پر بہت خفا ہوئے تھے۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

مراد علی کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور اس نے جواب دیا "آپ کو معذرت کی ضرورت نہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس محفل میں آپ کی خاطر مجھے اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔"

امتیاز الدولہ سے ملاقات کے بعد مراد علی کی ذہنی الجھن بہت حد تک دور ہو چکی تھی تاہم ادھونی کے باقی مہمانوں کے طرزِ عمل سے وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ ان کے دلوں پر ابھی تک اس کی تقریر کی تلخی باقی ہے۔ فوج کے عہدہ دار خاص طور پر اس کے ساتھ باتیں کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ اسے عام مہمانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن طاہر بیگ اور ہاشم بیگ کی بے اعتنائی اس کے لیے بے حد تکلیف دہ تھی۔ اس نے چند بار ان سے ہم کلام ہونے کی کوشش کی لیکن اُن کی نگاہیں بہت حوصلہ شکن ثابت ہوئیں۔

طاہر بیگ کے متعلق وہ یہ سوچ سکتا تھا کہ وہ ایک بڑی عمر کا آدمی ہے۔ اس کے علاوہ ادھونی کا ایک بہت بڑا جاگیردار اور فوج کا ایک اعلیٰ افسر ہونے کی وجہ سے بھی اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے لیکن ہاشم کو وہ شہباز خاں کی طرح اپنا بھائی سمجھتا تھا اور اسے اس بات کا رنج تھا کہ اسے اکبر خاں کی بیٹی کے شوہر کے سامنے اپنی محبت اور خلوص کے اظہار کا موقع نہیں ملا۔ وہ بار بار ہاشم بیگ کی طرف دیکھتا اور اپنے دل میں کہتا "میرے بھائی تم اکبر خاں کے داماد ہو یہ درست ہے کہ تم ادھونی میں پیدا ہوئے ہو اور میں نے سرنگا پٹم میں آنکھ کھولی ہے لیکن ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو سکتے۔"

اگلے دن بارات رخصت ہو چکی تھی۔ شیخ فخرالدین براتیوں کے ساتھ ادھونی جا چکے تھے۔ مراد علی نے بھی واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن اکبر خاں نے اصرار کر کے دو دن اور اسے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ تیسرے دن وہ رخصت ہوتے وقت یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ مدتوں اکبر خاں کے گھر میں رہ چکا ہے۔ وہ بچیوں کی دعائیں لینے کے بعد گھر سے نکلا۔ اکبر خاں، شہباز اور ثمینہ دروازے تک اس کے ساتھ آئے۔ ڈیوڑھی سے باہر گاؤں کے کئی آدمی اسے خدا حافظ کہنے کے لیے کھڑے تھے۔ اکبر خاں دو نوجوانوں کو میسور کی سرحد تک مراد علی کا ساتھ دینے کا حکم دے چکا تھا اور وہ اپنے گھوڑوں سمیت دروازے پر کھڑے تھے۔ جب وہ اکبر خاں اور شہباز سے بغل گیر ہونے اور گاؤں کے دوسرے آدمیوں سے مصافحہ کرنے کے بعد ثمینہ کی طرف متوجہ ہوا تو ثمینہ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے۔ اُس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "چچا جان تو یہ کہا کرتے ہیں کہ تم کبھی نہیں رویا کرتی۔"

ثمینہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ لیکن جب وہ گھوڑے پر سوار ہوا تو اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی رکاب پکڑتے ہوئے کہا "میں نے وہ چھوہارے آپ کی خورجین میں ڈال دیے تھے اور مٹھائی بھی۔"

پانچواں باب

ایک دن جین فرحت کے مکان کے اس کمرے کا جائزہ لے رہی تھی جس میں اس نے اپنے شوہر اور دو بڑے بیٹوں کی یادگاریں جمع کر رکھی تھیں۔ دیوار کے ساتھ کھونٹی پر ٹنگی ہوئی ایک تلوار کی خوب صورت نیام ذرا گرد آلود تھی۔ جین برابر کے کمرے سے ایک کپڑا اُٹھا لائی، اور اس نے تمام چیزوں کی صفائی شروع کر دی۔ تلوار، بندوقوں اور دوسرے ہتھیاروں کی گرد جھاڑنے کے بعد اس نے ایک الماری کھولی اور کتابوں کو صاف کرنا شروع کر دیا۔

فرحت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا: "بیٹی تم یہاں کیا کر رہی ہو اندر گرمی ہے۔ آؤ باہر بیٹھیں۔"

جین دو تین الفاظ سے زیادہ نہ سمجھ سکی اور اس نے ایک کتاب سے گرد جھاڑ کر الماری میں رکھتے ہوئے فرحت کو فرانسیسی زبان میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

فرحت نے کہا: "کاش میں تمھاری زبان سمجھ سکتی۔ یہ دیکھو انور علی کا خط آیا ہے سمجھتی ہو۔ انور علی کا خط!"

فرحت کے ہاتھ میں کاغذ دیکھنے اور انور علی کا نام سُننے کے بعد جین کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ وہ اس خط کے متعلق کچھ کہہ رہی ہے۔ اس نے کاغذ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا،

"انور علی —— ؟"

"انور علی کا خط" فرحت نے فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

جین "انور علی — کا — خط ...... انور علی کا خط" کہہ کر ہنس پڑی۔

فرحت نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا: "کاش میں تمھیں سمجھا سکتی کہ اس میں کیا لکھا ہے! چلو باہر بیٹھیں یہاں بہت گرمی ہے۔"

جین کچھ سمجھے بغیر اس کے ساتھ باہر نکل آئی اور وہ صحن میں ایک درخت کے نیچے مونڈھوں پر بیٹھ گئیں۔ مراد علی باہر کے دروازے سے نمودار ہوا۔ اور اس نے قریب آ کر کہا: "امی جان میں ایک اہم خبر لایا ہوں۔ ہماری فوج پرسوں یہاں سے روانہ ہو جائے گی ——" پھر وہ جین کی طرف متوجہ ہو کر فرانسیسی زبان میں بولا: "میں نے امی جان کو یہ خبر سنائی ہے کہ ہماری فوج پرسوں یہاں سے روانہ ہو جائے گی۔ اور میں آپ کے لیے بھی ایک خوش خبری لایا ہوں۔ موسیو لیگراند دیوان خانے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

جین نے حیران ہو کر کہا: "وہ آگیا ہے —— ؟ لیکن مجھے اس نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ پچھلے خط میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ وہ سرنگا پٹم آرہا ہے۔"

مراد علی نے جواب دیا: "ان کی فوج شمال کی طرف جا رہی ہے اور وہ ایک ہفتے کے لیے رخصت لے کر آئے ہیں۔ وہ مجھے راستے میں ملے تھے۔"

جین نے انور علی کا خط جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ مراد علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ تمھارے بھائی کا خط ہے۔"

مراد علی نے کاغذ پکڑتے ہوئے اپنی ماں سے پوچھا: "امی جان یہ کب آیا ہے؟"

"ابھی آیا ہے بیٹا۔ میری سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ میں تمھاری عدم موجودگی میں جین سے باتیں نہیں کر سکتی۔ تم اسے خط پڑھ کر سنا دو۔"

مراد علی نے خط کھول کر دیکھا۔ اور جین کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "آپ لیگراند سے مل آئیں۔ پھر

آپ کو بھائی جان کا خط پڑھ کر سنا دوں گا۔"

"نہیں میں ابھی سننا چاہتی ہوں۔"

مراد علی نے انور علی کے خط کا فرانسیسی ترجمہ سنانا شروع کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

"امی جان میں بخیریت ہوں۔ اُمید ہے کہ مراد چچا اکبر خان کے گاؤں سے واپس آ گیا ہوگا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جین آپ کے ساتھ خوش رہتی ہے اور اس کی صحت بہتر ہو رہی ہے۔ ہم آج اپنے مستقر سے شمالی سرحد کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔ جنگ کے خطرات بہت بڑھ گئے ہیں۔ اور مجھے ہر لحہ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

دلاور خان کی صحت اب خراب رہتی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ اسے گھر بھیج دیا جائے۔ اس عمر میں اسے آرام کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اُمید ہے کہ وہ اگلے مہینے آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ مجھے گزشتہ دو ماہ سے لیگرانڈ کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اگر جین کے پاس اس کا کوئی خط آیا ہو تو مجھے ضرور بتا دیں کہ وہ کس حال میں ہے ــــ والسلام آپ کی دعاؤں کا طالب

انور علی"

فرحت نے جین سے مخاطب ہو کر کہا: "بیٹی جاؤ وہ تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔"
مراد علی نے فرانسیسی زبان میں فرحت کی ترجمانی کر دی اور جین اٹھ کر مکان کے دروازے کی طرف چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لیگرانڈ کے سامنے کھڑی یہ کہہ رہی تھی "معاف کیجیے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ انور علی کا خط آیا تھا اور میں مراد علی سے اُس کا ترجمہ سن رہی تھی۔"

"وہ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔"

لیگرانڈ نے کہا: "جین بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

وہ بیٹھ گئی۔

لیگرانڈ بولا: "میرے ساتھی بنگلور سے شمال کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔ اور مجھے اس شرط پر ایک ہفتے کی چھٹی دی گئی ہے کہ میں سرنگا پٹم سے ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔ وہ پرسوں تک پہنچ جائیں گے۔ اور تین چار دن تک یہاں قیام کریں گے۔ موسیو لالی نے مجھے کہا تھا کہ جنگ کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمیں دیر تک سرنگا پٹم سے دور رہنا پڑے۔ ان حالات میں اگر تم شادی کرنا چاہو تو یہ موقع ہے۔ جین اگر تم پسند کرو تو چار دن بعد میرے تمام فرانسیسی دوست ہماری شادی میں شریک ہو سکیں گے۔ اور ہمارے دستے کا پادری ہماری شادی کی رسومات ادا کر دے گا۔ مجھے انور علی کی غیر حاضری کا افسوس ہوگا۔ لیکن تم سمجھ سکتی ہو کہ ہم کیسے حالات سے گزر رہے ہیں۔"

جین چند ثانیے گردن جھکائے سوچتی رہی اور لیگرانڈ اس کے چہرے کے آثار سے اس کے دل کی صحیح کیفیت کا اندازہ نہ لگا سکا۔ اس نے کہا:

"جین پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تمہیں اعتراض ہو تو ہم کسی بہتر وقت کا انتظار کر سکتے ہیں لیکن میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ میرے متعلق تمہارے خیالات کیا ہیں۔ ہماری رفاقت چند حادثات کا نتیجہ تھی۔ تاہم میں یہ فرض کر چکا ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ہیں، اور تمہارے بغیر میرے لیے یہ دنیا کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مریشس سے روانہ ہوتے وقت میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ دوبارہ ملنے کے بعد ہم ایک دن کے لیے بھی ایک دوسرے سے علیحدہ رہنا پسند کریں گے۔ لیکن اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے لیے میری رفاقت زندگی کا ایک مسئلہ تو ہو سکتی ہے لیکن زندگی کا اہم ترین مسئلہ نہیں بن سکتی۔"

جین نے کہا: "لیگرانڈ اگر تمہیں یہ شکایت ہے کہ میں یہاں کیوں ٹھہری ہوں تو میں اسی وقت تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

"نہیں جین تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ میں ان لوگوں سے متاثر ہونا اپنے لیے قدرت کا

سب سے بڑا انعام سمجھتا ہوں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم ایک دریا کے دو مختلف کناروں پر رہتے تھے۔ پھر قدرت نے اٹھا کر ہمیں منجدھار میں پھینک دیا اور ہم نے اضطراری حالت میں ایک دُوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب طوفان گزر چکا ہے اور ہم ساحل پر پہنچ چکے ہیں۔ اب تمھیں زندگی کی نئی منازل کی طرف قدم بڑھانے کے لیے میرا ہاتھ پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمھارے لیے سہارا نہیں بن سکتا۔ اب میں تمھیں یہ موقع دینا چاہتا ہُوں کہ تم ماضی کے تمام واقعات کو نظر انداز کر کے اپنے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کرو۔ اگر تمھارا یہ فیصلہ ہو کہ تم میری رفیقۂ حیات بن کر خوش رہ سکتی ہو تو میں اس غریب الوطنی میں بھی یہ محسوس کروں گا کہ دُنیا میرے قدموں میں ہے لیکن اگر تم محسوس کرو کہ میں اس قابل نہیں تو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

جین نے کہا "لیگرانڈ آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے تمھیں دُکھ پہنچا ہو۔"

"نہیں جین۔ تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ تم ایسی بات کر ہی نہیں سکتیں۔ تم بہت رحم دل ہو لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ تم صرف رحم اور مروّت کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا مستقبل ایک ایسے آدمی کو سونپ دو جس کی رفاقت سے تمھارے سینے میں زندگی کے تمام ولولے سرد ہو کر رہ جائیں۔"

جین مسکرائی "اگر میں یہ کہوں کہ میرے دل میں اب زندگی کی کوئی تڑپ یا ولولہ باقی ہی نہیں رہا تو تم کیا کہو گے؟"

لیگرانڈ نے جواب دیا "جین میری باتوں کو مذاق میں نہ ٹالو۔ میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ شادی کے متعلق تم اپنے کسی سابقہ فیصلے کی پابند نہیں ہو۔ اور تمھیں یہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ میں کہاں تک تمھاری توقعات پُوری کر سکتا ہُوں۔"

جین نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہُوئے کہا "لیگرانڈ آج تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ خُدا کے لیے یہ تو سوچو تمھارے سوا دنیا میں میرا ہے کون؟"

لیگرانڈ نے پریشان ہو کر کہا "مجھے معاف کر دو۔ جین مجھے معلوم نہیں میں کیا کہہ رہا ہُوں۔

میں زندگی کی ہر مُصیبت برداشت کر سکتا ہوں لیکن تمھاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔"

جین نے کہا "لیگرانڈ اگر میرے طرزِ عمل سے تمھیں کوئی دُکھ ہُوا ہے تو میں تم سے معافی مانگتی ہُوں۔ میری پریشانی کی بڑی وجہ کچھ اور تھی۔ ابھی مراد علی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ بھی پرسوں یہاں سے کوچ کر رہا ہے۔ اِن حالات میں کس مُنھ سے اس کی ماں کو یہ خبر سُنا سکتی ہوں کہ ہم نے اچانک شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انور علی، مراد علی اور ان کی والدہ سے زیادہ اس دنیا میں ہمارا کوئی دوست نہیں کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم شادی کے لیے اس دن کا انتظار کریں جب وہ دونوں بھائی گھر پر موجود ہوں اور ان کی والدہ جنھیں اب میں بھی اپنی ماں سمجھتی ہُوں ہماری خوشی میں حصّہ لے سکیں۔"

لیگرانڈ کے چہرے سے رنج و ملال کے بادل چھٹ چکے تھے وہ مسکرایا "جین ——— پیاری جین مجھے معاف کر دو۔ میں قیامت تک ایسے دن کا انتظار کر سکتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہُوں کہ جب تک بہتر حالات پیدا نہیں ہوتے میں اس مسئلہ پر کوئی گفتگو نہیں کروں گا۔"

○

۱۷۸۵ء کی گرمیوں میں گنیش پنت کی کمان میں مرہٹوں کا ایک لشکر دریائے کرشنا کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ پیشوا اور نانا فرنویس کی کوششوں سے مرہٹوں میں پھر ایک بار وہ ولولہ بیدار ہو چکا تھا جو پچیس برس قبل انھیں پونا سے پانی پت کے میدان تک لایا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے مرہٹہ سردار اپنی اپنی افواج کے ساتھ پیشوا کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے۔ ناگپور سے مدھوجی بھونسلے بارہ ہزار آزمودہ کار سپاہیوں کے ساتھ جنگ میں شرکت کا وعدہ کر چکا تھا۔ اندور سے تکوجی ہلکر اپنے توپ خانے کے علاوہ بیس ہزار پنڈارہ فوج کے ساتھ میسور پر چڑھائی کے لیے تیار تھا۔ پرس رام بھاؤ اور رگھوناتھ راؤ کی افواج بھی میسور پر یلغار کرنے کے لیے نانا فرنویس کے حکم کا انتظار کر رہی تھیں

ان عظیم تیاریوں کے بعد نانا فرنویس کے ایلچی میر نظام علی پر ڈورے ڈال رہے تھے۔ میر نظام علی ٹیپو کے بدترین حاسدوں اور بدخواہوں میں تھا تاہم میسور کے خلاف جنگ کی صورت میں اپنے نقصانات کا اندازہ کرتے ہوئے اسے سخت الجھن محسوس ہوتی تھی۔ اسے اپنی قوت پر ناز تھا لیکن ماضی کے تجربات اسے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے میسور کی سرزمین موزوں نہیں۔ وہ کچھ عرصہ نانا کے وکیل کو ٹالتا رہا لیکن جب اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ مرہٹے میسور پر حملہ کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں اور وہ تنہا اپنی قوت سے سلطنت خداداد پر ضرب کاری لگا سکتے ہیں تو وہ جنگ میں شرکت کے لیے تیار ہو گیا۔ متحدہ افواج کے ابتدائی مستقر کے لیے اودگیر کا مقام منتخب کیا تھا اور اس نے نومبر کے آخر میں پینتیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ وہاں کا رُخ کیا۔

نظام کے اودگیر پہنچنے کے چند دن بعد ملک کے طول و عرض سے مرہٹوں کی ایک لاتعداد فوج وہاں جمع ہو چکی تھی۔ مرہٹوں کا پڑاؤ میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مرہٹہ سپاہیوں کے حوصلے بڑھانے کے لیے وہ پروہت، جوگی اور سادھو بھی وہاں پہنچ چکے تھے، جو سلطان ٹیپو کی شخصیت کو جنوبی ہندوستان میں ہندو غلبہ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اس فوج میں وہ رہزن اور لٹیرے بھی شامل ہو گئے تھے جنھیں صرف میسور کی دولت کے ساتھ دلچسپی تھی۔

نظام کا اس جنگ میں شریک ہونا خالصتاً ایک سیاسی مسئلہ تھا تاہم درباری گویّے شاعر اور خوشامدی اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اپنے دور کا سب سے بڑا غازی ہے۔ فتح کی اُمید پر فتح کے جشن شروع ہو چکے تھے۔ میر نظام علی رقص و سُرود کی محفلوں میں مرہٹہ راجوں اور چیدہ چیدہ سرداروں کے درمیان میرِ مجلس کی حیثیت سے بیٹھتا تھا۔ شراب کے دور چلتے تھے۔ رقاصاؤں، گویّوں اور سازندوں پر سونے چاندی کے سکّوں کی بارش ہوتی تھی اور پھر جب یہ محفلیں برخاست ہوتی تھیں اور بڑے لوگ کسی خیمے میں جمع ہو کر جنگ کی تجاویز پر غور کرتے تھے تو سب سے زیادہ بحث اس بات پر ہوتی تھی کہ فتح کے بعد میسور کی زمین اور خزانے کس طرح تقسیم

ہونے چاہییں۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ کی بحث و تمحیص کے بعد میر نظام علی اور مرہٹہ حکمرانوں کے مابین جنگ کی تفصیلات اور مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق سمجھوتہ ہو چکا تھا اور پڑاؤ میں ایک نئے جوش و خروش کے ساتھ خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ حیدرآباد اور پونا کے ایک عام سپاہی سے لے کر بڑے سے بڑے افسر تک ہر شخص کی آواز یہ تھی کہ اب کی سلطان ٹیپو کے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

چند دن بعد اودگیر سے مسلح افواج کا یہ سیلابِ عظیم جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ مرہٹوں کا لشکر اسّی ہزار سواروں اور چالیس ہزار پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھا اور میر نظام علی کے جھنڈے تلے چالیس ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادہ سپاہی تھے۔ نانا فرنویس میر نظام علی کی طرح انگریزوں کو بھی اس جنگ میں شامل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر چکا تھا لیکن انگریزوں کے پرانے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے تھے اور وہ ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ تاہم نانا فرنویس اور میر نظام علی کو اس بات کا یقین تھا کہ جب انگریزوں کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ سلطان ٹیپو ان کی لاتعداد فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو وہ میسور کی تقسیم میں حصہ دار بننے کے لیے بلا توقف میدان میں کود پڑیں گے۔ پونا اور حیدرآباد میں انگریزوں کے ایجنٹ انھیں اس بات کا یقین دلا چکے تھے کہ کمپنی سلطان ٹیپو کے ساتھ اپنے سابقہ معاہدوں کا صرف اس وقت تک احترام کرے گی جب تک کہ میسور کی دفاعی قوت باقی ہے۔

میر نظام علی خاں اپنی فوج کی کمان تہوّر جنگ کو سونپ کر حیدرآباد واپس چلا گیا۔ نانا فرنویس کو بھی زیادہ عرصہ کے لیے پونا سے غیر حاضر رہنا پسند نہ تھا۔ پیشوا کے دربار میں اس کے کئی حریف موجود تھے۔ لیکن مرہٹہ لشکر میں بددلی پھیل جانے کے ڈر سے اس نے کچھ عرصہ کے لیے پونا جانے کا ارادہ بدل دیا۔

○

شہباز خاں تسخیر کرانے کے لیے ادھونی گیا ہوا تھا اور اس کے والدین گزشتہ آٹھ دس روز سے سخت پریشانی کی حالت میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک دن شہباز خاں کا پتہ کرنے

کے لیے اکبر خاں نے گاؤں سے دو سوار روانہ کیے لیکن چند گھنٹوں کے بعد ایک سوار واپس آ گیا اور اس نے یہ کہا کہ شہباز خاں اور تنویر ہمیں راستے میں مل گئے تھے اور تھوڑی دیر میں گھر پہنچ جائیں گے۔

سہ پہر کے وقت شہباز خاں ایک مختصر سے قافلے کے ساتھ پہنچ گیا۔ کہار تنویر کی ڈولی رہائشی مکان کے صحن میں لے گئے۔ جہاں گاؤں کی عورتوں کا ایک ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ تنویر لجاتی، شرماتی اور سمٹتی ہوئی ڈولی سے اُتری اور گاؤں کی عورتیں آگے بڑھ بڑھ کے اس سے گلے ملنے لگیں۔

شہباز خاں کچھ دیر مکان کے مردانہ حصے میں اپنے باپ سے باتیں کرتا رہا اور جب گاؤں کی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو وہ اپنی ماں کو سلام کرنے کے لیے رہائشی مکان میں داخل ہوا۔ بلقیس، تنویر اور ثمینہ ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بلقیس نے اسے دیکھتے ہی شکایت کے لہجے میں کہا: "بیٹا تم نے ہمیں بہت ہی پریشان کیا! اگر اودھونی میں تمہارا اتنا ہی جی لگ گیا تھا تو ہمیں کم از کم خط ہی بھیج دیا ہوتا۔"

شہباز نے ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا: "امی جان تنویر سے پوچھ لیجیے میں بے قصور ہوں۔ یہ ایک مجبوری تھی ورنہ میرا تین دن سے زیادہ وہاں ٹھہرنے کا ارادہ نہ تھا"

"کیا مجبوری تھی؟" ماں نے پوچھا۔

شہباز خاں نے جواب دینے کی بجائے ثمینہ کی طرف دیکھا اور کہا: "ثمینہ تم باہر جاؤ۔ میں امی سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

ثمینہ سراپا احتجاج بن کر اٹھی اور منہ بسورتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

شہباز خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا: "امی جان آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ مجھ سے خفا نہیں ہوں گی۔"

بلقیس نے کہا: "بیٹا مجھے یقین ہے کہ تم نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہو گی جس سے تمہارے والدین کو شرمسار ہونا پڑے۔ تم پریشان کیوں ہو؟"

شہباز نے جواب دیا: "امی جان مجھے صرف یہ ڈر ہے کہ جب ابا جان کو پتا چلے گا تو وہ بہت خفا ہوں گے۔ میں ...... میں اودھونی کی فوج میں شامل ہو چکا ہوں۔"

بلقیس کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے حلق میں آواز نہ تھی۔

شہباز خاں نے کہا: "امی جان خدا کے لیے میری طرف اس طرح نہ دیکھیے۔ میرے لیے ان کے طعنے ناقابلِ برداشت تھے۔ میں یہ نہیں سن سکتا تھا کہ میرے ابا جان جنگ سے ڈرتے ہیں۔ میں خالو جان اور ان کے رشتہ داروں کی باتوں سے یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ہمیں بزدل سمجھتے ہیں۔"

بلقیس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے کہا: "شہباز! حیدر آباد اور اودھونی کی کسی ماں کا لال تمہارے ابا کو بزدلی کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ وہ لوگ ابھی تک زندہ ہیں جنھوں نے پانی پت کے میدان میں ان کی جرأت اور مردانگی دیکھی ہے۔ بتاؤ تمہارے خالو نے کیا کہا تھا؟"

"خالو جان نے کچھ نہیں کہا امی جان، وہ صرف اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ ابا جان جنھیں کسی بڑی فوج کا سپہ سالار ہونا چاہیے تھا۔ اب صرف ایک کسان کی زندگی پر قناعت کر چکے ہیں۔"

"تمہارے ابا جان بیس سال کی عمر میں اودھونی کے سپہ سالار سے زیادہ جانتے تھے۔"

"امی جان، جہاں تک میرے فوج میں بھرتی ہونے کا تعلق ہے، خالو جان اس معاملے میں بے قصور ہیں۔ یہ میرا اپنا فیصلہ تھا۔ ان کے خاندان کا ہر نوجوان فوج میں ملازم تھا۔ کئی ایسے تھے جو عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے۔ جب میں ان سے ملتا تھا تو ان کا سوال یہی ہوتا تھا کہ تم فوج میں بھرتی کیوں نہیں ہوتے۔ تنویر سے پوچھ لیجیے، ان کے خاندان کی لڑکیاں تک مجھ سے مذاق کرتی تھیں۔"

بلقیس نے کہا: "اور تمہاری غیرت جوش میں آ گئی۔ مگر تم یہ بھول گئے کہ تمہارے باپ کے لیے تمہاری یہ حرکت کتنی تکلیف دہ ہو گی۔"

تنویر نے کہا: "امی جان، بھائی اس معاملے میں بے قصور ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی

ہوں کہ فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کرنے سے پہلے دو تین راتیں وہ سو نہیں سکے۔

فوج کی ملازمت کے متعلق تمھاری خالہ جان کو تمھارے ابا کے خیالات معلوم تھے
ان کا یہ فرض تھا کہ وہ اسے سمجھاتیں۔"

"امی جان انھوں نے سمجھایا تھا۔ انھوں نے بہت مخالفت کی تھی لیکن ان کے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ بھائی جان کی جگہ اگر میں ہوتی تو مجھے بھی یہی فیصلہ کرنا پڑتا۔ ابا جان جب یہاں ہجرت کرکے آئے تھے تو حالات اور تھے لیکن اب ادھونی کے کسی بڑے خاندان کے لڑکے کے لیے فوجی ملازمت سے انکار کرنا ممکن نہیں۔"

بلقیس نے کہا "اب اس مسئلے پر بحث کی ضرورت نہیں۔ شہباز تم ایک غلطی کر چکے ہو اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس غلطی کا کفارہ کیا ہو سکتا ہے۔ تمھارے ابا جان کے لیے یقیناً یہ بات ناقابلِ برداشت ہوگی۔ وہ تمھیں کسی صورت فوج میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

شہباز نے کہا "امی جان میں بھرتی ہو چکا ہوں! اب شامل نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ مجھے گرفتار کرکے لے جائیں گے۔ خدا کے لیے ابا جان کو سمجھانے کی کوشش کیجیے اور اگر آپ یہ محسوس کرتی ہیں کہ آپ اس مسئلے میں کچھ نہیں کر سکیں تو خاموش رہیے۔ میں ادھونی جا کر ان کی خدمت میں خط لکھ دوں گا۔ پھر جب تک ان کا غصہ فرو نہیں ہوگا میں گھر نہیں آؤں گا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب ادھونی کا ہر نوجوان فوج میں شامل ہو چکا ہے خالو جان اور ہاشم بیگ بھی فوج میں ملازم ہیں تو میرے فوج میں شامل ہو جانے سے کون سی قیامت آ جائے گی۔ ابا جان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہم حیدر آباد کی رعایا ہیں اور انھیں ادھونی کی حفاظت کے لیے فوج کی ضرورت ہے۔"

بلقیس نے جواب دیا "شہباز! بیٹا میرے سمجھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے اس مسئلے میں صرف ایک ماں کا فرض ادا کرنا ہے۔ میں اب یہ کوشش کروں گی کہ میرے بیٹے اور میرے شوہر کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ ہو جائے۔ لیکن جب تک میں تمھارے باپ سے بات

نہ کر لوں تمھیں یہ بات کسی پر ظاہر نہیں کرنی چاہیے۔"

○

اگلے روز صبح کی نماز کے تھوڑی دیر بعد اکبر خان دیوان خانے کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ شہباز خاں جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور چند ثانیے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے کہا "ابا جان آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

اکبر خاں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ!"

شہباز بیٹھ گیا۔ باپ کے تیور دیکھ کر وہ اپنے دل میں انتہائی ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ اکبر خان نے اچانک گردن اٹھائی اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا "شہباز! روہیل کھنڈ میں ہمارے قبائل کا یہ رواج تھا کہ جب کسی سردار کا بیٹا اپنی مہم سے کامیاب ہو کر لوٹتا تھا تو اس کے قبیلے کے تمام لوگ خوشیاں مناتے تھے۔ تم اپنے خیال کے مطابق ادھونی میں ایک بہت بڑا کارنامہ سر انجام دے کر آئے ہو اور میرے قبیلے کے لوگوں کو خبر تک نہیں ہوئی۔ میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ اپنی غریب الوطنی کے باوجود مجھے اپنا سردار سمجھتے ہیں اور میری خوشی اور غم میں شریک ہونا اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ جب انھیں یہ پتا چلے گا کہ میرے بیٹے نے انھیں اپنی زندگی کی پہلی کامیابی کی خوشی میں شامل ہونے کے قابل نہیں سمجھا تو انھیں کتنا افسوس ہوگا۔"

اکبر خاں کا یہ اندازِ گفتگو شہباز کے لیے نیا تھا اور وہ اس تمہید کو ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ سمجھ رہا تھا۔ اکبر خاں نے اچانک اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا "تمھیں ادھونی کی فوج کے عہدہ داروں کی قسمت پر رشک آتا ہوگا اور اب شاید تم یہ سمجھتے ہو گے کہ تم شیروں کی صف میں کھڑے ہو گئے ہو۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ تم ان گیدڑوں کے ساتھ جا ملے ہو جنھیں پیٹ بھرنے کے لیے ہمیشہ کسی لاش کی تلاش ہوتی ہے۔ روہیل کھنڈ سے ہجرت کرنے کے

بعد میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ہمارے قبیلے کے لوگوں کو ایک ایسی جائے پناہ مل جائے جہاں یہ محنت مشقت کر کے اپنا پیٹ پال سکیں۔ معظم علی نے ہمیں میسور میں آباد ہونے کی دعوت دی تھی لیکن انگریزوں، مرہٹوں اور میر نظام علی کے جارحانہ عزائم کے باعث میسور کا مستقبل اس وقت مجھے غیر یقینی نظر آتا تھا اور میں روہیل کھنڈ کی تباہی دیکھنے کے بعد ان لوگوں کو جنگ کی آگ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ میں یہاں اس شرط پر آباد ہوا تھا کہ مجھے حیدر آباد یا ادھونی کی فوج کے لیے کرائے کے سپاہی مہیا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن تم نے اب بڑھاپے میں مجھے یہ احساس دلایا ہے کہ میرا فیصلہ غلط تھا اور اس ملک میں سلامتی کا راستہ وہی تھا جو معظم علی نے اختیار کیا تھا۔ اُن کے پاس اتنا کچھ تھا کہ وہ کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر خوش حالی اور فارغ البالی کے دن بسر کر سکتے تھے لیکن وہ سرنگا پٹم گئے اور حیدر علی کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ یہ جانتے ہوئے کہ میسور کی آزادی کے ہر سانس کے بدلے انھیں اپنی زندگی کی لاتعداد راحتیں قربان کرنی پڑیں گی۔ جب میں نے ان کی اور ان کے دو بیٹوں کی شہادت کی خبر سُنی تھی تو میں یہ محسوس کرتا تھا کہ کاش وہ سرنگا پٹم جانے کی غلطی نہ کرتے۔ لیکن آج میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ جان کنی کے وقت بھی ایسی تکلیف محسوس نہیں کرتے رہے ہوں گے جو اس وقت مجھے محسوس ہو رہی ہے۔ وہ جس موت کی تمنا کرتے تھے وہ میری زندگی سے ہزار گنا بہتر تھی۔ اس وقت ان کی رُوح کو یہ تسکین ہو گی کہ ان کے باقی دو بیٹوں نے بھی وہی راستہ اختیار کیا ہے جو انھیں عزیز تھا۔ تم اگر ادھونی کی فوج کے سپہ سالار بن جاؤ تو بھی میں مرتے وقت یہی محسوس کروں گا کہ میں اس دُنیا میں کوئی قابلِ فخر یادگار نہیں چھوڑ سکا۔ میں اپنی جو پونجی خدا کی راہ میں نہیں لٹا سکا، وہ مجھ سے چوروں اور ڈاکوؤں نے چھین لی ہے۔ تم اپنے خالو اور ہاشم بیگ کو دیکھ کر سپاہی بننے کے لیے بے تاب تھے اور میری زندگی کی دوسری غلطی یہ تھی کہ میں نے ایک ایسے خاندان میں تمھارا رشتہ کر دیا جس کا اوّلین فرض اس ملک میں اسلام کے بدترین دشمنوں کے لیے کرائے کے سپاہی

مہیا کرنا ہے ـــــــ

لیکن اب بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم جو قدم اُٹھا چکے ہو وہ واپس نہیں لے سکتے۔ میں یہ گوارا نہیں کروں گا کہ اب تمھیں لوگ بُزدلی کا طعنہ دیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ تم نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس کی آخری منزل کیا ہو گی۔ لیکن کاش تم اس باپ کی بے بسی کا اندازہ لگا سکتے جس کا بیٹا میدانِ جنگ میں لڑ رہا ہو اور وہ اس کی فتح کے لیے ہاتھ اُٹھا کر دعا بھی نہ کر سکتا ہو۔ آج تمھاری ماں میرے پاس سفارش لے کر آئی تھی اور اس نے مجھ سے یہ التجا کی تھی کہ میں تم پر خفا ہونے کی بجائے تمھاری کامیابی کے لیے دُعا کروں۔ لیکن جب میں نے اسے یہ جواب دیا کہ شہباز ادھونی کی فوج کا ملازم ہے اور ادھونی کی فتح ان مقاصد کی شکست ہو گی جن کے لیے معظم علی اور اس کے بیٹوں نے جان دی تھی۔ کیا تم یہ دُعا کر سکتی ہو کہ کسی دن تمھارے بیٹے کے ہاتھ انور اور مُراد کے خون میں رنگے جائیں تو اس کے پاس میری بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ صرف یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ دکن اور میسور میں جنگ نہیں ہو گی۔ میں یہ نہیں سوچ سکتی کہ میر نظام علی مرہٹوں اور انگریزوں کے اکسانے پر میسور پر چڑھائی کر دے گا۔"

شہباز خاں کے جسم پر کپکپی طاری ہو چکی تھی۔ اس نے ملتجی آواز میں کہا "ابا جان جب میں بھرتی ہوا تھا تو میرے ذہن میں اس قسم کے سوالات نہیں تھے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں معظم علی کے بیٹوں کے خلاف ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔"

اکبر خاں چلّایا "خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ تم فوج میں بھرتی ہوتے وقت صلابت جنگ اور نظام کی وفاداری کا حلف اٹھا چکے ہو اور میں تمھیں غدّاری کی ترغیب نہیں دے سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے صرف کسی کے طعنوں سے تنگ آ کر فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ تمھیں ایک مدت سے اس بات کا شوق تھا۔ تم طاہر بیگ کے خاندان کے لوگوں کی نظروں میں اُونچا بننے کے لیے کسی لڑائی میں حصہ لینے سے دریغ نہیں کرو گے۔ تم آج سے

ادھونی کی فوج کے سپاہی ہو اور میں آیندہ تمھیں کبھی یہ سوچنے کی دعوت نہیں دوں گا کہ تم میرے بیٹے ہو۔ آج سے ہمارے راستے مختلف ہیں۔"

ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ شہباز کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کے لیے صورتِ حالات کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اکبر خاں کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "ابّا جان چلیے کھانا تیار ہے۔"

جب اکبر خاں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا، "ابّا جان! بھائی جان نے کیا قصور کیا ہے؟"

"کچھ نہیں جاؤ، تم باہر کھیلو!"

ثمینہ آب دیدہ ہو کر شہباز کی طرف متوجہ ہوئی "بھائی جان آپ باہر چلے جائیں۔ ابّا جان آج بہت خفا ہیں۔"

پھر وہ چند ثانیے اکبر خاں کی طرف دیکھنے کے بعد بولی "چلیے ابّا جان کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور امّی جان آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

اکبر خاں نے اُسے بازو سے پکڑتے ہوئے اپنی گود میں بٹھا لیا اور اس نے اپنے ننھے بازو اس کے گلے میں ڈال دیے۔

شہباز خاں اپنے باپ کے چہرے پر ایک ہلکا سا سکون دیکھ کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب طوفان گزر چکا ہے۔

چھٹا باب

نظام اور مرہٹوں کی افواج میسور کی طرف بڑھیں اور انھوں نے شمالی سرحد کی بستیوں کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد بادامی کا محاصرہ کر لیا۔ بادامی کی حفاظت کے لیے تین ہزار سپاہی متعین تھے۔ اتحادیوں کی فوج تقریباً تین ہفتے شہرِ پناہ پر گولہ باری کرتی رہی لیکن اسے فصیل توڑنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر انھوں نے ۲۰ مئی ۱۷۸۶ء کے دن یلغار کر کے فصیل پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب چاروں طرف سے ہزاروں آدمی خندق عبور کر کے سیڑھیوں کی مدد سے فصیل پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے تو انھیں ایک غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ میسور کی فوج نے خندق کے آس پاس جگہ جگہ بارود کی سرنگیں بچھا رکھی تھیں۔ اچانک ایک سمت سے بارود کے دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور آن کی آن میں چاروں اطراف سے حملہ آور فوج کو گرد و غبار اور دھوئیں کے بادلوں نے اپنے آغوش میں لے لیا۔ حملہ آور سینکڑوں لاشوں اور زخمیوں کو فصیل کے آس پاس چھوڑ کر سراسیمگی کی حالت میں پیچھے ہٹے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ فصیل پر یلغار کر رہے تھے۔ شہر کے محافظوں نے بڑی ہمت سے مقابلہ کیا۔ لیکن حملہ آوروں کے سیلاب کے آگے اُن کی پیش نہ گئی۔ وہ اپنی بندوقوں، سنگینوں، نیزوں اور تلواروں سے فصیل پر چڑھنے والوں کا راستہ روک رہے تھے لیکن جہاں دشمن کا

ایک آدمی زخمی ہو کر گرتا وہاں دس اور اُس کی جگہ لینے کے لیے یہ موجود تھے۔ تھوڑی دیر میں شہر پناہ کے کئی حصوں پر دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا اور میسور کے جانباز گلیوں میں لڑتے ہوئے قلعے کی طرف ہٹ رہے تھے۔ جب یہ لوگ قلعے میں داخل ہو رہے تھے تو دشمن نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کر کے دروازے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن قلعے کی فصیل سے شدید گولہ باری کے باعث ان کی پیش نہ گئی۔ حملہ آوروں نے پے در پے یلغار کر کے قلعے کی فصیل پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن میسور کے جانبازوں نے اُن کے حوصلے خاک میں ملا دیے۔ نظام اور پیشوا کے لشکر کو قریباً سولہ سو لاشیں چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا۔ یہ قلعے کے محافظوں کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ لیکن دشمن کی تعداد کے پیش نظر اُن کے کماندار کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ زیادہ دیر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قلعے کی فوج جس تالاب سے پانی حاصل کرتی تھی، وہ شہر میں تھا اور دشمن نے شہر پر قبضہ کرتے ہی پانی بند کر دیا تھا۔ جب پانی کی قلت کے باعث کئی آدمی ہلاک ہو گئے اور کماندار کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ آیندہ چند دن میں باہر سے کوئی کمک نہیں مل سکتی تو اُس نے اپنے سپاہیوں کی جان بخشی کی شرط پر قلعہ دشمن کے حوالے کر دیا۔

بادامی کی فتح کے بعد نانا فرنویس نے مرہٹہ افواج کی قیادت ہری پنت کے سپرد کی اور خود پونا چلا گیا۔ ہری پنت نے گجیندرہ گڑھ کے قلعے پر حملہ کیا۔ یہ قلعہ کافی مضبوط تھا لیکن میسور کے ایک نمک حرام افسر نے دشمن سے رشوت لے کر قلعہ کے دروازے کھول دیے۔

اس سے قبل مرہٹوں کا ایک اور لشکر گنیش پنت کی قیادت میں کھٹور کے قلعے پر حملہ کر چکا تھا۔ لیکن یہاں ان کا مقابلہ ٹیپو کے نامور سپہ سالار برہان الدین کے ساتھ تھا۔ برہان الدین نے مرہٹوں کو پے در پے شکستیں دیں۔ پونا کی حکومت نے تکوجی ہلکر کو ایک لشکر جرار کے ساتھ گنیش پنت کی مدد کے لیے پیش قدمی کا حکم دیا۔ ہلکر نے براہ راست کھٹور کے قلعے پر حملہ کرنے کی بجائے آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ اس

اثنا میں شاہنور کا نواب عبدالحکیم خاں[1] سلطان کے ساتھ غداری کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گیا اور ہلکر اور گنیش پنت کی افواج کھٹور کا محاصرہ چھوڑ کر اپنے نئے اتحادی کو مدد دینے کی نیت سے شاہنور کی طرف بڑھیں۔ برہان الدین نے مرہٹوں کا پیچھا کیا اور شاہنور کے قریب ان پر حملہ کر دیا لیکن نواب شاہنور اور مرہٹوں کی متحدہ طاقت کے سامنے اس کی پیش نہ گئی اور اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کے بعد مرہٹوں نے کھٹور اور لکشمیشور کے اضلاع کے چند قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ برہان الدین کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ وہ کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ کر سکتا۔ وہ کمک پہنچنے تک مدافعانہ طرز جنگ سے دشمن کو مختلف محاذوں پر زیادہ سے زیادہ دیر الجھانے کے لیے کوشاں رہا۔

انھی ایام میں نظام اور مرہٹوں کی شہ پا کر کورگ کے جنگجو نائر دوبارہ بغاوت کر چکے تھے اور سلطان ٹیپو کو شمالی محاذ کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ان کی طرف توجہ دینی پڑی۔ کورگ کی بغاوت فرو کرنے کے بعد سلطان بنگلور پہنچا اور وہاں سے اس نے شمال کی طرف پیش قدمی کی۔ بنگلور سے روانہ ہوتے وقت اس کے ساتھ وہ چالیس ہزار جانباز تھے جو کئی میدانوں میں مردانگی کے جوہر دکھا چکے تھے۔ راستے میں مختلف مقامات پر باج گزار سرداروں اور پالیگاروں کے دستے اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ برسات کا موسم شروع ہونے والا تھا اور سلطان ٹیپو مرہٹوں کی

---

[1] حیدر علی نے ۱۷۷۸ء میں عبدالحکیم خاں کو مرہٹوں کے ساتھ سازباز کرنے کے جرم کی سزا دینے کے لیے شاہنور پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اس کے بعد عبدالحکیم سے اطاعت کا وعدہ لے کر اسے چار لاکھ سالانہ خراج کے عوض شاہنور کی سلطنت واپس دے دی۔ اس کے بعد نواب حیدر علی نے عبدالحکیم کے ساتھ اپنے تعلقات زیادہ مضبوط بنانے کے لیے اپنی صاحبزادی کی شادی اس کے بڑے بیٹے کے ساتھ کر دی تھی اور اپنے بڑے بیٹے کریم صاحب کا رشتہ نواب شاہنور کی بیٹی کے ساتھ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ حیدر علی نے شاہنور کی سلطنت کا وہ حصہ بھی جو مرہٹوں نے چھین لیا تھا فتح کر کے نواب عبدالحکیم کے حوالے کر دیا لیکن نواب شاہنور نے ان احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ جب اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب میسور پر نظام اور مرہٹوں کے لشکر کی فتح یقینی ہے تو اس نے سلطان ٹیپو کے خلاف بغاوت کر دی۔

کی رسد اور کمک کے راستے مسدود کرنے کے لیے ندیوں، نالوں اور دریاؤں کی طغیانیوں سے پورا فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

حیدر آباد اور پونا کی افواج کے سپہ سالاروں کو یہ یقین تھا کہ سلطان کا اولین مقصد برہان الدین کی اعانت ہے لیکن ایک دن پونا اور دکن کے حکمران حیرت و استعجاب کے عالم میں یہ خبر سُن رہے تھے کہ شیرِ میسور کی افواج ادھونی کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ ادھونی کا گورنر مہابت جنگ نظام کا بھتیجا بھی تھا اور داماد بھی۔ اور سلطان ٹیپو جیسے جہاں دیدہ سپاہی کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ میر نظام علی تنگھدرہ کے جنوب میں اپنا مضبوط ترین قلعہ بچانے کے لیے فوراً اس طرف متوجہ ہوگا۔ جب سلطان کی افواج ادھونی کے قلعہ پر گولہ باری کر رہی تھیں تو مہابت جنگ کے ایلچی نظام اور پیشوا کے دربار میں یہ فریاد کر رہے تھے کہ ادھونی کی حفاظت کا مسئلہ دکن کے حکمران خاندان کی عزت اور وقار کا مسئلہ ہے۔

مہابت جنگ نے تباہی سر پر دیکھی تو ایک خطیر رقم پیش کر کے سلطان کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن سلطان ٹیپو نے اس کے ایلچی کو جواب دیا کہ اگر مہابت جنگ میری دوستی کا طلب گار ہے تو اسے خود میرے پاس آنا چاہیے۔ اگر وہ مرہٹوں کا ساتھ چھوڑ دے تو میری اس کے ساتھ کوئی عداوت نہیں۔

لیکن مہابت جنگ کو نظام اور مرہٹوں سے اعانت کی پوری اُمید تھی اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ سلطان کو چند دن کے لیے جنگ ملتوی کرنے پر آمادہ کیا جائے سلطان ٹیپو کو بھی اس بات کا پُورا یقین تھا کہ نظام اور مرہٹے ادھونی کو خطرے میں دیکھ کر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ اس لیے وہ مہابت جنگ کو کمک پہنچنے سے پہلے پہلے ادھونی پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا ❖

○

طاہر بیگ کی بیوی عطیہ اور اس کی بہو تنویر اپنے عالیشان مکان کی دوسری منزل کے ایک

کمرے میں دریچے کے سامنے کھڑی تھیں۔ شہر میں چاروں اطراف سے توپوں اور بندوقوں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے اور فضا میں دُھوئیں کے بادل چھائے ہُوئے تھے۔ زینے پر کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی اور وہ دم بخود ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔

ہاشم بیگ ہانپتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے کہا۔ "ابا جان کا حکم ہے کہ میں آپ کو قلعے کے اندر پہنچا دُوں۔ شہر پر دشمن کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں نوکر سامان لے کر آجائیں گے۔"

عطیہ نے کہا۔ "لیکن تمھارے ابا جان تو کہتے تھے کہ شہر پناہ ہفتوں تک کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔"

ہاشم بیگ نے کہا۔ "امی جان آپ جلدی کریں۔ آپ کا وہاں جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ شہباز خان زخمی ہو گیا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے کسی اچھے طبیب کی ضرورت تھی۔ اس لیے ہم نے اسے گھر لانے کی بجائے قلعے کے اندر پہنچا دیا ہے۔"

عطیہ اور تنویر کچھ دیر سکتے کے عالم میں ہاشم بیگ کی طرف دیکھتی رہیں۔ بالآخر تنویر چلّائی۔ "امی جان آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ خدا کے لیے جلدی کیجیے۔" پھر اس نے ہاشم بیگ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ "بھائی جان کب زخمی ہُوئے؟ ــــــ ان کی حالت اب کیسی ہے؟ ــــــ خدا کے لیے سچ سچ بتائیے وہ زندہ ہیں نا؟"

ہاشم نے جواب دیا۔ "ابھی دشمن کی گولہ باری کے باعث شہر کی فصیل کا ایک بُرج گر پڑا تھا اور وہ نیچے آ گئے تھے۔ ہم نے انھیں اینٹوں کے ڈھیر سے نکالا تو ان کے سر اور ماتھے سے خون بہ رہا تھا۔ اب وہ ہوش میں ہیں۔ جرّاح کا خیال ہے کہ اُن کے زخم زیادہ شدید نہیں اور وہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد عطیہ اور تنویر قلعے کے ایک کمرے میں شہباز کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ شہباز خان بستر پر لیٹا ہُوا تھا اور اس کے سر پر پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ خون بند نہ ہونے کے باعث اس کے ماتھے پر پٹی کا کچھ حصّہ سُرخ ہو چکا تھا۔ شہباز کا چہرہ ایک ناقابلِ برداشت جسمانی اذیّت کا آئینہ دار تھا۔ تاہم وہ بار بار یہ کہ رہا تھا۔ "تنویر میں ٹھیک ہُوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمھیں

پریشان نہیں ہونا چاہیے۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے پانی مانگا۔ تنویر جلدی سے اٹھ کر پانی کا کٹورا لے آئی۔ عطیہ نے اسے اٹھنے کے لیے سہارا دیا۔ شہباز نے ہاتھ بڑھا کر کٹورا پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھ سیدھا کٹورے کی طرف جانے کی بجائے اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ تنویر نے اپنی خالہ کی طرف دیکھا اور بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے پانی اس کے منہ سے لگا دیا۔ پانی پلانے کے بعد عطیہ نے اس کا سر تکیے پر رکھ دیا۔ تنویر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لے آئی اور پھر اپنے بھائی کے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

شہباز نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "خالہ جان اسے سمجھائیے۔ دیکھیے میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

تنویر نے کہا "بھائی جان! آپ مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ میں آپ کی بہن ہوں۔ مجھے اُسی وقت معلوم ہو گیا تھا جب میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔"

"کیا معلوم ہو گیا تھا؟" شہباز نے برہم ہو کر کہا۔

"بھائی جان آپ کی آنکھیں!"

شہباز نے چند ثانیے کوئی بات نہ کی۔ بالآخر اس نے کہا "تنویر سر کے زخم کے باعث کبھی کبھی میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا جاتی ہے۔ لیکن طبیب کہتا تھا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ دیکھو اب میں کمرے کی ہر چیز دیکھ سکتا ہوں۔ اٹھ کر میرے سامنے بیٹھو اور میرا امتحان لے لو۔"

عطیہ نے کہا "بیٹی سر پر زخم آنے سے کبھی کبھی ایسی حالت ہو جاتی ہے۔ تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہیے۔"

شہباز نے کہا "تنویر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم آپا جان کو میرے زخمی ہونے کی خبر نہیں دو گی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے اس حالت میں دیکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ طبیب نے مجھے بہت تسلی دی ہے۔"

شام کے قریب طاہر اور ہاشم بیگ کمرے میں داخل ہوئے۔ شہباز نے ان کے قدموں کی آہٹ پا کر آنکھیں کھولیں اور کہا "خالہ جان اب میری آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ دیکھیے میں خالو جان اور ہاشم بیگ کو دیکھ سکتا ہوں۔"

طاہر بیگ نے آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "شہباز میں تمہارے لیے بہت اچھی خبر لایا ہوں۔ تہور جنگ اور ہری پنت چالیس ہزار سواروں کے ساتھ یہاں پہنچنے والے ہیں، اس کے علاوہ حضور نظام نے حیدر آباد سے مغل علی خاں کو پچیس ہزار سواروں کے ساتھ روانہ کر دیا ہے۔ میسور کی فوج بہت جلد محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو جائے گی۔"

لیکن شہباز کے لیے اس خبر کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس نے سراپا احتجاج بن کر کہا "خالو جان طبیب کو بلائیے میری آنکھوں کے سامنے پھر اندھیرا چھا رہا ہے۔"

○

سلطان ٹیپو نے تہور جنگ، ہری پنت اور مغل علی خاں کی افواج کی آمد کی خبر سنی تو اس نے ادھونی پر فوراً قبضہ کرنے کے لیے چند شدید حملے کیے۔ لیکن ادھونی کے دفاعی استحکامات کے باعث اسے کامیابی نہ ہوئی۔ پھر جب پینسٹھ ہزار سواروں کا لشکر ادھونی کے قریب پہنچ گیا تو سلطان نے شہر پر قبضہ کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔

نظام اور مرہٹوں کی فوری مداخلت نے اگرچہ سلطان ٹیپو کو ادھونی کے قلعے پر فیصلہ کن ضرب لگانے کا موقع نہ دیا لیکن اس کی ایک بہت بڑی جنگی چال کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے دشمن کے لیے ایک نیا محاذ کھول کر اس کی بیشتر افواج کو عین اس وقت دریائے تنگبھدرہ عبور کر کے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا تھا جب کہ برسات شروع ہونے کو تھی۔ اتحادی اگر اپنے جنگی پلان پر عمل کرتے تو وہ دریائے تنگبھدرہ کے پار رسد اور بارود کے ذخیرے جمع کرتے اور اپنے فوجی اڈے قائم کرنے سے پہلے جنوب کی طرف نہ بڑھتے لیکن اب وہ ضروری انتظامات کیے بغیر آگے آ چکے تھے۔ برسات کی

آمد آمد تھی اور چکھدرہ اور کرشنا کے درمیان بیشتر علاقہ جہاں سے انھیں طغیانی کے دنوں میں رسد ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔ ابھی تک سلطان کی افواج کے قبضہ میں تھا۔ ہری پنت اور مشل علی خاں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ برسات کی طغیانیوں کے باعث ان کے لیے رسد اور کمک کے راستے بالکل مسدود ہو جائیں گے، مہابت جنگ کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو ادھونی سے نکال کر رائچور پہنچ جائے۔ مہابت جنگ نے ادھونی کے اُمرا سے مشورہ کرنے کے بعد ہری پنت کی ہدایات پر عمل کیا۔ چنانچہ ایک دن ادھونی کے قلعے کے دروازے پر ہاتھیوں، گھوڑوں، پالکیوں اور بیل گاڑیوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ مہابت جنگ اور دوسرے رؤسا اپنے بال بچوں سمیت ان پر سوار ہو رہے تھے۔ بعض خواتین ڈولیوں میں سوار ہو کر قلعے سے باہر نکل رہی تھیں۔ قلعے کے اندر ایک مکان کے کشادہ کمرے میں طاہر بیگ کے خاندان کے چند افراد جمع تھے۔ شہباز خاں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور تنویر سراپا التجا بن کر طاہر بیگ، عطیہ اور خاندان کی دوسری عورتوں سے کہہ رہی تھی: "خدا کے لیے بھائی جان کو سفر پر مجبور نہ کیجیے۔ طبیب نے آپ کے سامنے یہ کہا تھا کہ اگر انھوں نے چند ہفتے چلنے پھرنے سے پرہیز نہ کیا تو یہ ہمیشہ کے لیے بینائی سے محروم ہو جائیں گے۔"

طاہر بیگ نے کہا: "بیٹی فکر نہ کرو۔ اس بات کی پوری احتیاط کی جائے گی کہ انھیں راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ میرے نوکر انھیں بستر سمیت یہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے۔"

تنویر نے کہا: "خالو جان خدا کے لیے اس بات پر اصرار نہ کیجیے۔ مجھے معلوم ہے کہ راستے میں دشمن حملہ ضرور کرے گا اور آپ کے لیے ان کی حفاظت ایک مسئلہ بن جائے گی۔ انھیں یہیں رہنے دیجیے۔"

طاہر بیگ نے کہا: "لیکن جب میسور کی فوج شہر میں داخل ہو جائے گی تو ان کا کیا بنے گا؟"

"میں میسور کے سپاہیوں کو جانتی ہوں وہ ایک زخمی اور بے بس انسان پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔"

ایک عمر رسیدہ عورت نے کہا "مرزا صاحب آپ کی بہو کا خیال درست ہے۔ شہباز کے لیے اس حالت میں سفر کرنا یقیناً تکلیف دہ ہوگا اور اگر ان کی بینائی چھن جانے کا خطرہ ہے تو آپ اصرار نہ کیجیے۔ پھر اگر آپ یہاں ہیں تو ان کے ٹھہرنے میں کیا حرج ہے؟"

طاہر بیگ نے کہا: "اچھا بیٹی اگر تمھارا یہی خیال ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تم جلدی کرو، قافلہ تیار کھڑا ہے۔"

تنویر نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا: "آپ خالہ جان کو بھیج دیجیے۔ میں یہیں رہوں گی۔ میں بھائی جان کو اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتی۔ انھیں میری ضرورت ہے۔"

شہباز جو انتہائی سکون کے ساتھ یہ بحث سن رہا تھا، اُٹھ کر بیٹھ گیا اور چلایا: "تنویر! مجھے تمھاری قطعاً ضرورت نہیں۔ خدا کے لیے تم فوراً خالہ جان کے ساتھ چلی جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی شہباز نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔ تنویر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُسے بستر پر لٹاتے ہوئے کہا: "بھائی جان خدا کے لیے آپ لیٹے رہیے!"

شہباز خاں نے کہا: "تنویر اگر تم پانچ منٹ کے اندر اندر یہاں سے نہ نکل گئیں تو میں پیدل قافلے کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤں گا۔ خالہ جان اسے لے جائیے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا!"

عطیہ نے کہا: "بیٹی تنویر اب ضد نہ کرو۔ تمھیں معلوم ہے کہ جب دشمن شہر پر قبضہ کرے گا تو تمھارا یہاں ٹھہرنا تمھارے بھائی کے لیے کتنا تکلیف دہ ہوگا لیکن اگر تم نہیں مانتی تو میں بھی یہیں رہوں گی۔"

خاندان کی عمر رسیدہ عورتوں کے سمجھانے اور شہباز سے مزید ڈانٹ ڈپٹ سُننے کے بعد تنویر بادلِ ناخواستہ اپنی خالہ اور باقی عورتوں کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئی۔ لیکن کمرے سے باہر نکلتے وقت اس کی آنکھوں کا سیلاب پھوٹ پڑا۔

○

قافلے کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد طاہر اور ہاشم بیگ اپنے اپنے مورچے سنبھال چکے تھے
شہباز نیم خوابی کی حالت میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور ایک نوکر جسے طاہر بیگ اس کی
تیمارداری کے لیے چھوڑ گیا تھا، اس کے بستر سے چند قدم دور فرش پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔
دوپہر کے وقت شہباز کو پیاس محسوس ہوئی لہٰذا اس نے نوکر کو آواز دی۔ لیکن جواب میں
اسے نوکر کے خراٹے بے حد ناگوار محسوس ہوئے۔ پانی کی صراحی اس کے بستر سے چند قدم دور
پڑی ہوئی تھی۔ وہ بستر سے اٹھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا صراحی کی طرف بڑھا لیکن تین چار قدم
اٹھانے کے بعد اس نے سر میں درد کی ٹیسیں محسوس کیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں
کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ تاہم اس نے اس بے بسی کی حالت میں نوکر کو دوبارہ آواز دینا گوارا
نہ کیا۔

قدرے توقف کے بعد وہ سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور پھر فرش پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں
سے صراحی ٹٹولنے لگا۔ اچانک اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

"کون ہے؟" اس نے کرب انگیز لہجے میں سوال کیا۔

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ کوئی دبے پاؤں اس کے قریب آ رہا ہے۔
اس کے بعد اسے صراحی سے پانی نکلنے کی آواز سنائی دی اور پھر کسی نے بھرا ہوا پیالہ اس کے منہ
کو لگا دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پیالہ اور دوسرے ہاتھ سے پانی پلانے والے کا ہاتھ پکڑ کر
کہا "خدا کے لیے بتاؤ، تم کون ہو؟"

جواب میں اسے دبی دبی سسکیاں سنائی دیں اور وہ پانی کا پیالہ فرش پر رکھ کر بلند آواز سے
چلایا "تنویر، تنویر، تم! ـــــ تم یہاں کیسے آ گئیں؟ تمہیں اس وقت یہاں سے کوسوں
دور ہونا چاہیے تھا!"

تنویر نے دوبارہ پیالہ اس کے منہ سے لگاتے ہوئے کہا "بھائی جان! آپ پہلے پانی پی لیں۔"
شہباز پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تنویر اسے بازو سے پکڑ کر بستر پر
لے گئی۔ شہباز بار بار یہ پوچھ رہا تھا "تنویر خدا کے لیے بتاؤ تم کہاں چھپ گئی تھیں۔ تم گئی کیوں نہیں۔
اگر خدانخواستہ دشمن کے سپاہی یہاں پہنچ گئے ہوتے تو کیا ہوتا؟"

تنویر نے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "بھائی جان آپ نے
مجھے قافلے کے ساتھ جانے کا حکم دیا تھا لیکن یہ حکم نہیں دیا تھا کہ مجھے قافلے کو راستے میں چھوڑ کر
واپس نہیں آنا چاہیے۔ میں شہر سے نکلتے ہی بہلی سے اتر کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گئی تھی۔
شہر سے چند میل دور جا کر میں نے خالہ جان سے کہہ دیا تھا کہ میں واپس جا رہی ہوں۔ دو نوکروں نے
تھوڑی دور میرا پیچھا کیا تھا۔ لیکن میں نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بھیج دیا۔"

شہباز نے کہا "تنویر مجھے معلوم نہیں تمہاری اس غلطی کا انجام کیا ہو گا لیکن میرا یہ کہنا غلط تھا کہ
مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ کاش تم یہاں ہوتیں۔ میں اپنی جرأت اور مردانگی
کا ثبوت دینے کے لیے ادھونی کی فوج میں بھرتی ہوا تھا لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ میں بہادر نہیں
ہوں۔ ابھی تمہارے آنے سے چند ثانیے قبل میں ایک بچے کی طرح چلا چلا کر رونا چاہتا تھا۔
طبیب نے مجھے بالکل جھوٹی تسلیاں دی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں بہت جلد ہمیشہ کے لیے بینائی
سے محروم ہو جاؤں گا۔"

"بھائی جان! مجھے یقین ہے کہ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ مجھے
دیکھ کر بہت خفا ہوں گے۔"

"میں تم سے خفا نہیں ہوں لیکن خالہ جان اور ہاشم کیا کہیں گے۔"

"مجھے ان کے متعلق کوئی پریشانی نہیں۔ میں انہیں یہ جواب دے سکوں گی کہ میں شہباز کی
بہن ہوں۔"

مہابت جنگ کے ادھونی سے نکلنے کے بعد مغل علی خاں اور تہور جنگ نے دریائے تنگبھدرہ
کے جنوب میں سلطان ٹیپو کے ساتھ جنگ کا خطرہ مول لینا غیر ضروری خیال کیا۔ چنانچہ شہزادہ
مغل علی خاں واپس حیدر آباد چلا گیا اور تہور جنگ کے تحت مغل اور مرہٹہ افواج نے کنچن گڑھ کا

رُخ کیا۔ جہاں ہری پنت کا بیشتر لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔

سلطان ٹیپو نے کسی تاخیر کے بغیر دوبارہ ادھونی کا رُخ کیا۔ ادھونی کی فوج کے افسر اور سپاہی مہابت جنگ کے فرار ہو جانے اور مغل علی خاں اور تہوّر جنگ کے لشکر کی پسپائی کے باعث بددل ہو چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کسی قابلِ ذکر مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔

اس صُورتِ حال کو ادھونی کا حکمران طبقہ اپنی تاریخ کا بدترین سانحہ سمجھتا تھا لیکن عوام کے جذبات ان سے مختلف تھے۔ وہ اگر کوئی خطرہ محسوس کرتے تھے تو وہ میسُور کے لشکر کی طرف سے نہ تھا بلکہ ان مرہٹہ اور حیدر آبادی سپاہیوں کی طرف سے تھا جنھیں ادھونی کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جب شہزادہ مغل علی خاں اور تہوّر جنگ کی فوج کے ساتھ ہزاروں مرہٹے ادھونی میں داخل ہوں گے تو ادھونی کے حکمران طبقے سے تعلق رکھنے والے چند خاندانوں کے سوا کسی کی جان و مال اور عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ سلطان کی فتح ان کے نزدیک انسانیت کی فتح تھی اور جب سلطان کا لشکر شہر میں داخل ہُوا تو وہ اپنے گھروں کی کوٹھڑیوں اور تہ خانوں میں چھپنے کی بجائے مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر اس کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ میسُور کے کسی سپاہی کی تلوار نیام سے باہر نہ تھی۔ کسی کے چہرے پر فتح کا غرور نہ تھا۔ خوشی کے نعروں اور مسرت کے قہقہوں کی بجائے اُن کی زبانوں پر خاموش دُعائیں تھیں۔ جو لوگ آئے دن دکن کے اُمرا کی خود پسندی اور رعونت کے مظاہرے دیکھنے کے عادی تھے، ان کے لیے میسُور کے حکمران کی سادگی اور انکساری ایک نئی بات تھی۔ رُعب و جلال کا یہ پیکرِ مجسم ایک خوب صُورت گھوڑے پر سوار تھا لیکن اس کی نگاہیں تماشائیوں کی طرف ایک فاتحانہ غرور سے دیکھنے کی بجائے زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ مسلمان اسے ایک درویش، ایک ولی اور ایک بزرگ سمجھتے تھے۔ ہندوؤں کی نگاہ میں وہ ایک دیوتا تھا اور ادھونی کی تمام بیٹیاں اسے اپنی عزت کا محافظ سمجھتی تھیں۔

○

شہباز گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اپنے بستر پر بیٹھا ہُوا تھا۔ تنویر ایک دریچے کے سامنے کھڑی قلعے کے کُشادہ صحن کی طرف جھانک رہی تھی جہاں میسُور کے سپاہی جمع ہو رہے تھے۔

شہباز نے کہا: "تنویر آؤ بیٹھ جاؤ۔ پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں جو ہونا ہے ہو رہے گا۔"

تنویر آگے بڑھ کر اس کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی اور قدرے توقف کے بعد بولی۔

"بھائی جان وہ ابھی تک نہیں آئے بہت دیر ہو گئی۔ خالو جان کہتے تھے کہ اگر ہمیں قیدی بنا لیا گیا تو بھی میں کوشش کروں گا کہ ہمیں اسی مکان میں رہنے دیا جائے۔"

شہباز نے جواب دیا: "فاتح لشکر اپنے قیدیوں سے مشورہ نہیں لیتا کہ تم کہاں رہنا چاہتے ہو اور ابھی تو انھیں قیدیوں کی چھان بین کرنے میں بھی کافی وقت لگے گا۔ تنویر میں بہت شرمسار ہوں۔ تم پر یہ مصیبت میری وجہ سے آئی ہے اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جب تک تمھارے لیے یہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع تھا، میرے لیے بستر سے سر اُٹھانا محال تھا اور آج میں دو گھنٹوں سے اسی طرح بیٹھا ہُوا ہوں اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ آج مجھے ایسا محسُوس ہوتا ہے کہ میری بینائی کبھی خراب نہیں تھی۔ اگر تم اجازت دو تو میں باہر جا کر ان کا پتا کروں؟"

تنویر نے کہا: "نہیں نہیں بھائی جان میں آپ کو بستر سے اُٹھنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ طبیب بار بار یہ تاکید کر چکا ہے کہ آپ کو صرف مکمل آرام خطرے سے بچا سکتا ہے۔"

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تنویر کا دل دھڑکنے لگا اور وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ہاشم بیگ کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے کہا: "دشمن نے عام سپاہیوں کو آزاد کر دیا ہے لیکن افسروں کے متعلق یہ فیصلہ ہُوا ہے کہ انھیں جنگ کے زمانہ میں قید رکھا جائے گا۔ ہمیں اس وقت قلعے سے باہر کسی کیمپ میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ مجھے صرف دو منٹ کے لیے آپ کے پاس آنے کی اجازت ملی ہے۔ میرے ساتھ دو سپاہی آئے ہیں اور وہ دروازے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں آپ کے ساتھ وہ کیا سلوک کریں گے۔ صرف یہ پتا چلا ہے کہ جو عورتیں اور بچے اس قلعے میں ہیں انھیں سرِدست شہر کے مکانات میں منتقل کر دیا جائے گا۔ مجھے قلعہ خالی کروانے

کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ بظاہر اس بات کے کوئی آثار نظر نہیں آتے کہ دشمن اسے اپنی فوج کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ سلطان ٹیپو قلعے کا معائنہ کرنے کے بعد فوراً اپنے پڑاؤ میں چلے گئے ہیں۔ وہ یہاں سے فوج کے صرف چند دستے لے گئے ہیں۔ دشمن قلعے کی بھاری توپیں بھی یہاں سے اُٹھوا کر باہر لے جا رہا ہے۔ ابا جان کو یقین ہے کہ سلطان کی فوج آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرے گی اور اگر انھیں سلطان یا ان کی فوج کے کسی بڑے افسر کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تو وہ ان سے یہ درخواست کریں گے کہ جب تک آپ تندرست نہیں ہو جاتے آپ کو یہیں رہنے دیا جائے۔ میں آپ کو ایک اور خبر سناتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں نے ابھی مُراد علی کو دیکھا ہے۔"

شہباز نے چونک کر کہا۔ "مُراد علی ۔۔۔۔۔ سرنگا پٹم والا مُراد علی؟ آپ نے اس کے ساتھ کوئی بات کی ہے؟"

"نہیں، اس کا دھیان دوسری طرف تھا اور مجھے اس حالت میں اس سے ملاقات کا گوارا بھی نہ تھا۔"

تنویر نے پوچھا۔ "آپ کو یقین ہے کہ وہ کوئی اور نہیں تھا؟"

"ہاں، میں نے اسے پانچ چھ قدم کے فاصلے سے دیکھا تھا اور میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔"

باہر سے کسی نے دروازے پر دستک دی اور ہاشم بیگ نے کہا۔ "سپاہی مجھے بلا رہے ہیں۔"

تنویر کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ہاشم بیگ ایک ثانیہ توقف کے بعد دروازے کی طرف بڑھا اور تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ شہباز اور تنویر دیر تک پریشانی اور اضطراب کی حالت میں بیٹھے رہے۔

○

کوئی ایک گھنٹہ بعد نوکر پریشان صورت بنائے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے شہباز سے

کہا۔ "حضور میسور کی فوج کا ایک افسر اور تین سپاہی دروازے پر کھڑے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دس منٹ کے اندر اندر یہ مکان خالی کر دینا چاہیے۔ قلعے کے تمام مکان خالی ہو رہے ہیں۔ میں نے انھیں بہت سمجھایا کہ اس مکان میں ایک پردہ نشین بی بی اپنے بھائی کے ساتھ رہتی ہیں۔ جن کے لیے دو قدم چلنا بھی مشکل ہے لیکن وہ افسر کہتا ہے کہ یہ مکان ہر حالت میں خالی کرنا پڑے گا۔ اگر اس میں کوئی ایسا آدمی ہے جو چل پھر نہیں سکتا تو میرے سپاہی اسے اٹھا کر لے جائیں گے۔"

"میں خود ان سے بات کرتی ہوں۔" تنویر یہ کہہ کر اپنا دوپٹہ درست کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"تنویر! تنویر! ٹھہرو، تم باہر مت جاؤ!" شہباز یہ کہہ کر بستر سے اُٹھا لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر وہ اچانک مُڑا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبا کر فرش پر بیٹھ گیا۔

نوکر جو تذبذب کی حالت میں دروازے کے سامنے کھڑا تھا، آگے بڑھا اس نے شہباز کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک مونڈھے پر بٹھا دیا۔

مکان سے باہر میسور کی فوج کا افسر تنویر سے کہہ رہا تھا: "محترمہ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ اس قلعے کو خالی کرنا کیوں ضروری ہے۔ میں صرف اپنے سپہ سالار کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ آپ کا بھائی اگر چلنے پھرنے کے قابل نہیں تو اسے اٹھا کر لے جانے کا انتظام کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے پاس اب گفتگو کے لیے زیادہ وقت نہیں۔"

تنویر نے کہا۔ "آپ مُراد علی کو جانتے ہیں وہ آپ کی فوج میں ہے؟"

"ہماری فوج میں اس نام کے کئی آدمی ہو سکتے ہیں۔ آپ کس مُراد علی کے متعلق پوچھ رہی ہیں؟"

"وہ سرنگا پٹم کے رہنے والے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی کا نام انور علی ہے۔ ان کے والد کا نام معظم علی تھا جو میسور کی فوج کے بہت بڑے افسر تھے۔ ان کے دو بھائی صدیق علی اور مسعود علی چند سال قبل انگریزوں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔"

"وہ مُراد علی اس وقت یہیں ہیں اور ان کے بھائی انور علی ہمارے افسر ہیں۔ لیکن آپ کا

ان کے ساتھ کیا تعلق؟

"وہ میرے بھائی ہیں۔"

افسر نے پریشان ہو کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا "اگر آپ مراد علی اور انور علی کی بہن ہیں تو مجھے بھی اپنا بھائی سمجھیے۔"

"آپ مراد علی کو میرا پیغام پہنچا دیں۔ انھیں یہ کہیں کہ اکبر خان کی بیٹی تنویر آپ کو بلاتی ہے۔ شہباز خاں بستر پر پڑا ہوا ہے اور طبیب نے اسے چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔"

افسر نے کہا "میں آپ کا پیغام لے جاتا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ آپ کو ہر صورت میں یہ مکان خالی کرنا پڑے گا۔"

تھوڑی دیر بعد افسر اور سپاہی چلے گئے اور تنویر واپس آ کر اپنے بھائی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ شہباز اپنا سر ہاتھوں میں دبائے مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ تنویر نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "بھائی جان آپ بستر پر لیٹ جائیں۔ ابھی آپ کو بیٹھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔"

شہباز اس کا سہارا لے کر آگے بڑھا اور بستر پر لیٹ گیا۔

تنویر نے اس کے چہرے سے اس کی تکلیف کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے بھائی جان آپ پھر درد محسوس کر رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" شہباز نے شکایت کے لہجے میں کہا "تنویر تمھیں باہر نہیں جانا چاہیے تھا۔ وہ کیا کہتے تھے؟"

"وہ کہتے تھے کہ ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔"

"اور تم نے مراد علی سے رحم کی درخواست کی ہوگی؟"

"بھائی جان آپ کو اس بات پر رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ مراد اور انور میسور کی فوج کے سپاہی ہونے کے باوجود میرے بھائی ہیں اور میں ان سے ایک بہن کا حق مانگ سکتی ہوں۔"

شہباز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "تنویر اب ان کے ساتھ ہمارے تمام رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں نے زخمی ہونے سے پہلے میسور کے چار سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی مراد یا انور نہ تھا۔ ورنہ میں بندوق چلاتے وقت یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا کہ میرا ان کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اب اگر تم نے انھیں کوئی پیغام بھیجا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ فوراً یہاں آئیں گے۔ ممکن ہے کہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ بھول جائیں کہ میں ان کے خلاف لڑ چکا ہوں۔ لیکن میں کس منہ سے یہ کہہ سکوں گا کہ میں ان کی طرف سے کسی انسانی سلوک کا حقدار ہوں۔ تنویر میں یہ برداشت نہیں کروں گا کہ تم ان سے میرے لیے رحم کی درخواست کرو۔ اگر تم ان حالات میں بھی انھیں اپنا بھائی سمجھتی ہو تو ان سے یہ کہو کہ وہ تمھیں آپا جان کے پاس پہنچا دیں لیکن میرے لیے رحم کی بھیک مانگ کر مجھے ان کے سامنے شرمسار نہ کرنا۔ کاش تم واپس نہ آتیں! ——

کاش وہ مجھے ملبے کے ڈھیر سے نہ نکالتے اور آج میں اپنی بہن کی بے بسی دیکھنے کے لیے زندہ نہ ہوتا —— مجھ پر قدرت کا شاید آخری احسان یہ ہے کہ اب مجھے مراد علی کے سامنے شرم و ندامت سے آنکھیں جھکانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اب اگر وہ آئے بھی تو میں تاریکی میں صرف ان کی باتیں سن سکوں گا۔ میں آج صبح سے اس بات پر خوش ہو رہا تھا کہ میری آنکھیں ٹھیک ہو رہی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے پاؤں سے چل کر قلعے کے باہر جا سکوں گا۔ لیکن میرے سر کے درد کا یہ دورہ معمول سے زیادہ طویل ہو گیا ہے اور اب مجھے وہ دھندلی سی روشنی بھی دکھائی نہیں دیتی۔"

تنویر نے کہا "بھائی جان آپ تھوڑی دیر لیٹے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

شہباز چند منٹ آنکھیں بند کیے خاموش پڑا رہا۔ بالآخر اس نے آنکھیں کھولیں اور کہا "تنویر اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے سے تاریکی کے بادل آہستہ

آہستہ چھٹ رہے ہیں۔ مجھے دریچے سے ہلکی ہلکی روشنی نظر آرہی ہے۔ میں تمھارا دھندلا سا عکس دیکھ سکتا ہوں لیکن اگر مُراد علی یہاں آجائے تو خدا کے لیے اسے میری آنکھوں کے متعلق کچھ نہ بتانا۔"

تنویر نے آبدیدہ ہوکر کہا: "بھائی جان اگر آپ کو طبّی امداد کی ضرورت نہ ہوتی تو میں ابا جان کے دوست کے بیٹوں کو اپنی بے بسی کا تماشا دیکھنے کی دعوت نہ دیتی۔ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ ہماری رگوں میں ایک ہی باپ کا خون ہے۔ ہم نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے لیکن آپ مجھے ایک بہن کا فرض ادا کرنے سے منع نہ کریں اور میں آپ کے متعلق ہی نہیں بلکہ امی جان، ابا جان اور ثمینہ کے متعلق بھی سوچتی ہوں۔"

"ثمینہ ــــ میری ننھی ثمینہ!" شہباز نے کرب انگیز لہجے میں کہا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ وہ تصور میں کوسوں دور اپنی بستی کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں ثمینہ کے قہقہے سُن رہا تھا۔

○

نوکر نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا: "حضور! میسُور کی فوج کے دو افسر اندر آنا چاہتے ہیں۔ ایک نے اپنا نام مُراد علی بتایا ہے۔"

تنویر نے کہا: "انھیں بُلا لاؤ!"

نوکر باہر نکل گیا۔

تنویر نے کرسی سے اُٹھ کر کہا: "بھائی جان میں دوسرے کمرے میں جاتی ہوں۔ لیکن آپ ان کے آنے پر اُٹھنے کی کوشش نہ کریں۔"

شہباز نے کوئی جواب نہ دیا۔ تنویر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی برابر کے کمرے میں چلی گئی اور نیم وا دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔

مُراد اور انور کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ "السلام علیکم" کہہ کر آگے بڑھے۔ شہباز صرف

ان کے دھندلے سے نقوش دیکھ سکتا تھا۔ اس نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنا دایاں ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "وعلیکم السلام ــــ معاف کیجیے میں سر میں تکلیف کے باعث اُٹھ نہیں سکتا۔"

مُراد علی نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "یہ بھائی جان انور علی ہیں۔"

انور علی نے شہباز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: "آپ کو دیکھنا میری زندگی کی ایک بہت بڑی خواہش تھی۔ لیکن مجھے یہ اُمید نہ تھی کہ ہماری ملاقات ان حالات میں ہوگی۔"

"آپ تشریف رکھیے۔" شہباز نے کہا۔

وہ بستر کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

مراد علی نے کہا: "مجھے بہن تنویر کا پیغام سُن کر بہت پریشانی ہوئی تھی۔ آپ کی حالت کیسی ہے؟ آپ یہاں کب آئے تھے؟ اور آپ نے سر پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟ ہاشم اور اُس کے والد کہاں ہیں؟"

"ہاشم اور اُن کے والد آپ کی قید میں ہیں۔ میرے سر پر ایک معمولی سا زخم آگیا تھا۔ زخم قریباً مندمل ہوچکا ہے۔ لیکن مجھے سر میں اکثر تکلیف رہتی ہے۔ طبیب کا حکم ہے کہ میں تکیے سے سر اُٹھانے کی کوشش نہ کروں۔"

انور علی نے کہا: "سر کا زخم مندمل ہوجانے کے باوجود اگر آپ تکلیف محسوس کرتے ہیں تو آپ کو بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ آپ کے علاج کے لیے ہم اپنی فوج کے بہترین طبیبوں اور جراحوں کی خدمات حاصل کرسکتے ہیں۔"

شہباز نے کہا: "لیکن قبل اس کے کہ آپ میرے لیے کوئی تکلیف اُٹھائیں میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ادھونی کی فوج کا سپاہی ہوں اور آپ کی فوج کے ساتھ لڑائی میں زخمی ہوا تھا۔"

انور علی نے جواب دیا: "میسور کے طبیب علاج کرتے وقت دوست اور دشمن کے درمیان امتیاز نہیں کرتے۔ ادھونی کی فتح کے بعد آپ کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ ہمارے سامنے پہلا مسئلہ

یہ ہے کہ آپ کو کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا جائے۔ ہاشم اور اس کے والد اگر گرفتار ہو چکے ہیں تو وہ دوسرے قیدیوں کے ساتھ شہر سے باہر ایک کیمپ میں بھیجے جا چکے ہیں۔ وہاں آپ کے لیے ایک علیحدہ خیمہ نصب کیا جا سکتا ہے اور علاج کے لیے بھی آپ کو تمام سہولتیں مہیا ہوں گی۔"

شہباز نے پوچھا "قیدیوں کا کیمپ یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"کیمپ یہاں سے صرف پانچ میل دُور ہے لیکن آپ کے لیے بیل گاڑی کا انتظام ہو سکتا ہے اور اگر آپ بیل گاڑی پر سفر کرنا پسند نہ کریں تو ہمارے آدمی آپ کو کھاٹ پر اٹھا کر وہاں لے جائیں گے۔"

شہباز نے پُوچھا "آپ ہمیں یہ مکان خالی کرنے کے لیے کتنا وقت دیں گے؟"

انور علی نے جواب دیا "مجھے افسوس ہے کہ ہم آپ کو پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں دے سکتے۔"

برابر کے کمرے کا دروازہ کھُلا اور تنویر اپنے سر پر ایک سفید چادر لیے نمودار ہوئی آنکھوں کے سوا اُس کا تمام چہرہ چادر میں چھُپا ہُوا تھا۔ انور اور مُراد احتراماً کھڑے ہو گئے۔

تنویر نے کہا "بھائی جان نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ اُن کے لیے سفر کرنا بہت خطرناک ہے۔"

شہباز نے مضطرب ہو کر کہا "تنویر خدا کے لیے تم خاموش رہو۔"

لیکن تنویر پر اس کی خفگی کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ اس نے کہا "مجھے معلوم نہیں کہ قلعہ خالی کروانے میں آپ کی کیا مصلحت ہے لیکن اگر یہ سلطان کا حکم ہے تو آپ اُن سے کہیں کہ یہاں ایک بے بس زخمی آپ کی فوج کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا۔"

انور علی نے پریشان سا ہو کر کہا "میری جانب سے آپ کو یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ ہم آپ کو کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔"

اگر کسی معمولی تکلیف سے بچنے کا سوال ہوتا تو میں آپ سے کوئی التجا نہ کرتی لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ کہیں ہمیشہ کے لیے بینائی سے محروم نہ ہو جائیں۔ بھائی جان اس وقت بھی آپ کو

اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے۔"

انور اور مُراد چند ثانیے سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔ بالآخر انور علی نے کہا "شہباز، یہ قلعہ بارود سے اُڑا دیا جائے گا۔ ہم اس معاملے میں بے بس ہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو یہاں سے لے جانے میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا جائے گا۔"

تنویر نے کہا "اگر یہ ضروری ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ ہمیں قیدیوں کے کیمپ میں بھیجنے کی بجائے شہر میں اپنے مکان کے اندر ٹھہرنے کی اجازت دے دیں؟"

انور علی نے جواب دیا "اگر شہر میں آپ کا مکان تھا تو اس قدر پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ فوراً تیار ہو جائیں میں ابھی چند آدمی بُلوا لیتا ہُوں۔"

شہباز نے کہا "میں آپ کو ایک بات بتا دینا ضروری سمجھتا ہُوں۔ اگر اکبر خان کے بیٹے کی حیثیت میں میرا آپ پر کوئی حق تھا تو وہ اس دن ختم ہو گیا تھا جس دن میں آدھونی کی فوج میں بھرتی ہُوا تھا۔ میں کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کروں گا کہ آپ میری خاطر اپنی ذات کے لیے کوئی خطرہ مول لیں۔ میں عام جنگی قیدیوں سے بہتر سلوک کا مستحق نہیں ہوں۔ اس لیے اگر یہ قلعہ خالی کرنا ضروری ہے تو میری پرواہ نہ کیجیے۔ میں قیدیوں کے کیمپ میں جانے کے لیے تیار ہُوں۔"

انور علی نے جواب دیا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو صرف اتنی ہی رعایت دی جا رہی ہے جو ہر زخمی کے ساتھ برتی جاتی ہے۔ اگر آپ شہر میں رہ سکتے ہیں تو آپ کو قیدیوں کے کیمپ میں بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ سُلطان معظّم آپ کی خاطر ہاشم اور ان کے والد کو بھی شہر میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ انھیں صرف اس بات کی ضمانت دینی ہوگی کہ وہ جنگ کے دوران میں فرار ہو کر دوبارہ دکن کی فوج میں شامل ہونے کی کوشش نہیں کریں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ میسُور اور دکن کی حکومتوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے اور سلطان معظّم تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم صادر فرما دیں۔ لیکن اب باتوں کا وقت نہیں مراد تم چند آدمی بلاؤ اور انھیں انکے گھر پہنچانے کا انتظام کرو۔ میں ان کے علاج کے لیے کسی قابل طبیب کی

خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

ایک گھنٹہ بعد شہباز اور تنویر شہر کے ایک خوب صورت مکان میں منتقل ہو چکے تھے۔ شہباز کو کھاٹ پر ڈال کر لایا گیا تھا اور میسور کی فوج کا ایک قابل ترین طبیب اس کی آنکھوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ مراد علی اور انور اس کے بستر کے قریب کھڑے تھے اور تنویر برابر کے کمرے میں ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جب طبیب انور علی سے سرگوشی کے انداز میں چند باتیں کرنے کے بعد باہر نکلا تو تنویر نے نیم وا دروازے کی آڑ سے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا:

"بھائی جان! طبیب کیا کہتا تھا؟"

انور علی نے مذبذب سا ہو کر جواب دیا: "وہ یہ کہتا تھا کہ انھیں چند ہفتوں کے لیے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔"

"بھائی جان کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی نا؟"

انور علی نے قدرے توقف کے بعد مغموم لہجے میں جواب دیا: "میں طبیب کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہو گی۔"

"آپ کو یہ اطمینان ہے کہ وہ اس کے علاج سے ٹھیک ہو جائیں گے؟"

"اس نے پورے وثوق سے کوئی بات نہیں کہی اور ایسی حالت میں بعض طبیبوں کی قابلیت سے زیادہ خدا کی رحمت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔"

مراد علی نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ وہ اچھے ہو جائیں گے۔"

انور اور مراد کچھ دیر شہباز کے پاس بیٹھے رہے۔ بالآخر انھوں نے اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے رخصت لی اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

چند منٹ بعد تنویر اپنے بھائی کے پاس بیٹھی قلعے کی سمت سے مہیب دھماکے سن رہی تھی۔

شہباز نے کہا: "تنویر! جنگ شروع ہونے سے پہلے میں ادھونی کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے اپنے مستقبل کے متعلق کئی سپنے دیکھا کرتا تھا۔ میرے ذہن میں اس قسم کے خیالات بھی آیا کرتے تھے کہ کسی میدان میں زخمی ہونے کے بعد میری لاش دشمن کے گھوڑوں کے سُموں تلے روندی جا رہی ہے، یا مجھے کسی جنگ میں گرفتار کر لیا گیا ہے اور میں ایک طویل عرصہ دشمن کی قید میں رہنے کے بعد رہا ہو کر اپنے گھر جاتا ہوں اور ابا جان کو میری بے بسی پر رحم آ جاتا ہے اور وہ ماضی کی تمام تلخیاں بھول کر مجھے گلے لگا لیتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ مجھے اس بے بسی کی حالت میں مراد اور اس کے بھائی کا احسان مند ہونا پڑے گا اور میری وجہ سے تمھیں بھی یہ تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ قدرت کا مجھ پر آخری انعام یہ تھا کہ بینائی سے محروم ہونے کے بعد میں انور اور مراد کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹیں نہیں دیکھ سکا اور مجھے ان کے سامنے شرم و خجالت سے سر جھکانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔"

تنویر نے کہا: "بھائی جان! میں نے اُن کے چہروں پر فتح اور کامرانی کی مسکراہٹیں نہیں دیکھیں بلکہ اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جب سلطان ٹیپو نے شہر میں داخل ہوتے وقت اپنے راستے میں ادھونی کے سپاہیوں کی لاشیں دیکھی ہوں گی تو ان کی بھی یہی حالت ہوئی ہو گی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ نظام نے ایک ایسے آدمی کو اپنا دشمن سمجھ لیا ہے جو صرف میسور ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کی امیدوں کا آخری سہارا ہے۔ موجودہ حالات میں ہم صرف یہی دُعا کر سکتے ہیں کہ خدا نظام الملک کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق دے یا ہمیں اتنی جرأت اور ہمت دے کہ ہم ایک غلط راستے پر اس کا ساتھ دینے سے انکار کر سکیں۔"

شہباز نے کہا: "تنویر میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ میں نے زخمی ہونے سے پہلے میسور کے چار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے بہتر مسلمان تھے اور اب اگر میں میسور کی فوج کے کسی آدمی کا احسان مند ہوتے وقت ندامت محسوس نہ کروں تو تم مجھے قابلِ نفرت نہیں سمجھو گی؟"

تنویر نے آبدیدہ ہو کر کہا: "میں صرف یہ جانتی ہوں کہ آپ میرے بھائی ہیں۔"

"میں تمھارا بھائی ہُوں اور تم میری خاطر یہاں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ میری بہن ہونے کے باعث تم میری کسی غلطی یا کوتاہی کو قابلِ سزا نہیں سمجھو گی۔ میرے متعلق تمھیں اب یہ اطمینان ہوسکتا ہے کہ ایک سپاہی کی حیثیت میں میری زندگی ختم ہو چکی ہے۔ قدرت اب مجھے سُلطان ٹیپو کے خلاف تلوار اٹھانے کا موقع نہیں دے گی لیکن ہاشم تمھارا شوہر ہے اور تمھیں اس کے ساتھ ساری زندگی گزارنی ہے۔ اس کا خاندان ادھونی کی شکست کا انتقام لینے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرے گا۔ میں ہاشم کو اچھی طرح جانتا ہُوں سُلطان ٹیپو کا حُسنِ سلوک اس کی ذہنیت نہیں بدل سکے گا۔ تمھارا ضمیر بار بار یہ احتجاج کرے گا کہ وہ ایک غلط محاذ پر لڑ رہا ہے لیکن ایک بیوی کی حیثیت میں اس کی کوتاہیاں اور غلطیاں تمھیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ تمھیں اپنی سسرال کے خاندان کی عزت اور وقار کا خیال آئے گا تو تم نظام اور اس کے اتحادیوں کی فتح کے لیے دُعائیں مانگو گی لیکن جب تمھیں یہ خیال آئے گا کہ سلطان ٹیپو اسلام اور انسانیت کا بول بالا چاہتا ہے اور اس کے دائیں بائیں انور اور مُراد جیسے لوگ کھڑے ہیں تو تمھارے لیے اس قسم کی دُعائیں کتنی تکلیف دہ ہوں گی؟"

تنویر نے کہا: "بھائی جان میں نے شادی سے پہلے کبھی اپنے مستقبل کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ میں صرف یہ جانتی تھی کہ اپنی خالہ کے گھر جا رہی ہوں۔ جب آپ ابّا جان کی مرضی کے خلاف ادھونی کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے تو میں یہ سمجھتی تھی کہ آپ کو خالو خان کے خاندان کے لوگوں کے طعنوں نے متاثر کیا ہے اور میں یہ دُعا کیا کرتی تھی کہ آپ ایک سپاہی کی حیثیت میں اتنا نام پیدا کریں کہ ادھونی کا بڑے سے بڑا آدمی آپ پر رشک کرے لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں نہ تھی کہ جب سپاہیانہ جوہر دکھانے کا وقت آئے گا تو میرے بھائی اور میرے خاوند کو ایک غلط محاذ پر لڑنا پڑے گا۔ اب میرے پاس دُعاؤں کے سوا کچھ نہیں۔ اور میری دُعائیں صرف یہی ہوں گی کہ خدا میرے شوہر کو باطل کی بجائے حق کا ساتھ دینے کی جرأت دے۔"

مراد اور انور بلاناغہ شہباز کی تیمارداری کے لیے آتے تھے۔ شہباز اُن کی محبت اور خلوص سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بیچارگی اور ندامت کے احساس کی تلخی کی جگہ وہ تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ میسور کی فوج کے قابل ترین طبیبوں کے علاج سے اس کے سر کے درد کی شدت میں کچھ کمی آ چکی تھی لیکن اپنی بینائی میں وہ صرف یہ فرق محسوس کرتا تھا کہ تاریکی اور روشنی کی وہ آنکھ مچولی جو اُسے کبھی انتہائی پُر امید اور کبھی انتہائی مایوس بنا دیا کرتی تھی ختم ہو چکی تھی اور اب اس کی نگاہوں کے سامنے قریباً مستقل طور پر ایک دھندلکا چھایا رہتا تھا اور اس دھندلکے میں وہ صرف چند قدم تک اپنے گرد و پیش کا ایک مبہم سا منظر دیکھ سکتا تھا۔

انور اور مُراد کبھی چند منٹ کے لیے آتے تھے اور کبھی دو دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ تنویر جو پہلی ملاقات کے وقت اضطراری حالت میں سامنے آگئی تھی اب ساتھ والے کمرے کے دروازے کی آڑ میں بیٹھ کر اُن کی باتیں سُنا کرتی تھی۔ جب مُراد علی تنہا آتا تھا تو وہ کافی آزادی سے اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی لیکن انور علی کی موجودگی میں اُسے ایک آدھ فقرے سے زیادہ بولنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اُن کی باتیں عام طور پر جنگی یا سیاسی حالات کی بجائے اپنے گھریلو معاملات کے متعلق ہوتیں۔ شہباز انھیں کبھی اپنے سیر و شکار کے واقعات سُناتا اور کبھی ثمینہ کی معصوم شرارتوں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ انور اور مُراد اُسے اپنے بچپن کے واقعات سُناتے۔ ایک دن چین کا ذکر آ گیا اور انور علی نے شہباز کے استفسار پر اس کی سرگزشت بیان کر دی۔ ہر ملاقات کے اختتام پر انور اور مُراد شہباز اور اس کی بہن پر یہ تاثر چھوڑ جاتے کہ معظم علی اور اکبر خاں کی اولاد کے تعلقات پر زمانے کے انقلابات اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

ایک دن انور اور مُراد خلافِ معمول شہباز کی عیادت کو نہ آئے۔ لیکن عشاء کی نماز کے بعد نوکر نے اطلاع دی کہ انور علی چند منٹ کے لیے حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔

تنویر اپنے بستر سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور شہباز نے انور علی کو اندر بُلا لیا۔

انور نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کسی تمہید کے بغیر کہا: "بھائی میں آج بہت مصروف تھا۔ اس لیے آپ کی عیادت کو نہ آسکا، مُراد علی علی الصباح ایک مہم پر روانہ ہوگیا ہے اور میں بھی رات کے پچھلے پہر یہاں سے جا رہا ہُوں۔ ہمارے سپہ سالار نے ادھونی کے قلعہ دار کو بڑی سختی کے ساتھ ہدایت کی ہے کہ وہ ہر طرح آپ کا خیال رکھے۔ آج آپ کے خالو اور ہاشم بیگ کو قیدیوں کے کیمپ سے یہاں منتقل کرنے کے احکامات بھیج دیے گئے ہیں، اس سلسلے میں آپ کے ساتھ کوئی خاص رعایت نہیں کی گئی ہے۔ قلعہ دار نے اُن تمام قیدیوں کو جن کے بال بچے یہاں ہیں شہر میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ باقی قیدیوں کو کسی اور قلعے میں بھیج دیا جائے گا۔ اگر آپ چاہیں تو اپنی خالہ جان اور دُوسرے رشتہ داروں کو یہاں بُلا سکتے ہیں۔ مَیں نے آپ سے مشورہ کیے بغیر آپ کے ابا جان کو خط لکھ دیا ہے۔ اور شہر کے ایک تاجر نے یہ خط اُن کے پاس پہنچانے کا ذمہ لیا ہے۔ اگر آپ سفر کرنے کے قابل ہونے کے بعد اُن کے پاس جانا چاہیں تو قلعہ دار کی طرف سے آپ کو اجازت مل جائیگی۔"

شہباز نے کہا: "لیکن میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ آپ ابھی ابا جان کو میرے متعلق کوئی خبر نہ دیں۔"

انور علی نے جواب دیا: "آپ کے ابا جان کے ساتھ میرا بھی کوئی تعلق ہے۔ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد انھیں خط لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

تنویر نے دروازے کی آڑ سے کہا: "بھائی جان! آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اب جنگ ختم ہو چکی ہے۔"

"جنگ ختم نہیں ہُوئی لیکن نظام کے متعلق ہمیں یہ اطمینان ہو چکا ہے کہ وہ اب ہمارے

لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں ہوگا۔ اب صرف مرہٹوں کو ایک عبرتناک شکست دینے کی ضرورت اور ہے۔ اس کے بعد نظام علی خاں کو ہماری مصالحانہ باتیں اس قدر ناگوار محسوس نہیں ہوں گی۔"

پھر وہ شہباز کی طرف متوجہ ہُوا: "بھائی مجھے اب دیر ہو رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔ چچا جان اور چچی صاحبہ کو میرا سلام کہیے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات نہیں ہوگی۔"

شہباز بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور انور علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: "خدا حافظ! کاش میں آپ کو اچھی طرح دیکھ سکتا۔"

"خدا حافظ!" انور نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہُوئے کہا۔

دروازے کی طرف دو تین قدم اُٹھانے کے بعد وہ کچھ سوچ کر رُکا اور بولا: "تنویر بہن خدا حافظ! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو ان حالات میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

"خدا حافظ بھائی جان! ـــــــ خدا آپ کو ـــــــ"

تنویر اپنا فقرہ پُورا نہ کر سکی اور انور علی کمرے سے باہر نکل گیا۔

شہباز نے کہا: "تنویر تم رُک کیوں گئی۔ تمھیں بلند آواز سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ خدا آپ کو فتح دے۔"

ـــــــــــــــ

ساتواں باب

ایک تجربہ کار سالار قطب الدین کو سونپ کر سلطان نے پرس
ادھونی کی حفاظت اپنے
سے ان پالیگاروں کی طرف توجہ کی جو جنگ میں نظام اور مرہٹوں کی فوج کی کامیابی یقینی سمجھ
کر غداری کر چکے تھے۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد چند دنوں میں سلطان کی افواج دریائے
تنگبھدرہ کے قریب پہنچ گئیں۔ یہ اگست کا مہینہ تھا اور دریا کی طغیانی اپنے پورے شباب
پر تھی۔ اتحادی افواج برسات کے موسم میں جنوب کی طرف پیش قدمی کا ارادہ ترک کر کے تنگبھدرہ
اور کرشنا کے درمیان جمع ہو رہی تھیں۔ ہری پنت کو یقین تھا کہ سلطان برسات میں تنگبھدرہ
عبور کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گا اور اس کی ساری توجہ دھاڑواڑ کے تمام علاقوں کو
مسخر کرنے پر مبذول تھی۔ لیکن جب وہ بہادر بندہ کے قلعے کا محاصرہ کیے پڑے تھے انہیں یہ
ناقابلِ یقین اطلاع موصول ہوئی کہ سلطان کے ہراول دستے دریا عبور کر چکے ہیں۔ اس خبر
سے اتحادیوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور ہری پنت نے سلطان کا راستہ روکنے کے لیے باجی پنت
کی قیادت میں بیس ہزار تیز رفتار سواروں کی فوج روانہ کر دی لیکن اس لشکر کے پہنچنے سے پہلے
سلطان کی پوری فوج دریا کے پار اُتر چکی تھی۔
ہری پنت نے سلطان ٹیپو کے کیمپ سے آٹھ میل دور پڑاؤ ڈال دیا۔ چند دن فریقین

کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ اس عرصہ میں تکوجی ہلکر اور رگھوناتھ راؤ پٹوردھن
کی افواج ہری پنت سے آملیں اور اس کے جھنڈے تلے ایک لاکھ مرہٹہ فوج جمع ہو گئی۔
برسات کے موسم میں اتنی بڑی فوج کے لیے رسد کا سامان مہیا کرنا ایک پریشان کن مسئلہ تھا۔
دریائے تنگبھدرہ اور ایک ناقابلِ عبور برساتی نالے کے درمیان سلطان ٹیپو کا کیمپ دشمن کے
پڑاؤ کی نسبت کہیں زیادہ محفوظ تھا۔ جنوب میں اس کی رسد اور کمک کے راستے کھلے تھے اور اس
کی پنڈارا فوج کے سوار مرہٹوں سے باقاعدہ جنگ لڑنے کی بجائے اُن کے رسد و کمک کا
نظام درہم برہم کرنے میں مصروف تھے۔ مرہٹے سلطان کے پڑاؤ پر ایک فیصلہ کن حملہ کر کے
یہ صورتِ حال بدل سکتے تھے لیکن برساتی نالہ عبور کرتے وقت انہیں میسور کے توپ خانے
کی گولہ باری کا سامنا کرنا پڑتا۔

ہری پنت نے اپنے کیمپ میں قحط اور بیماری کے آثار دیکھ کر شاہنور کا رخ کیا۔ سلطان
نے اُس کا پیچھا کیا اور شاہنور سے پانچ میل دور پڑاؤ ڈال دیے۔ یہاں پر سلطان کے ساتھ
برہان الدین اور بدرالزماں خان کی افواج شامل ہو گئیں اور اس کے ساتھ ہی بدنور سے سلطان
کے لشکر کے لیے سامانِ رسد کے لیے سینکڑوں بیل گاڑیاں پہنچ گئیں۔ مرہٹے شاہنور کے پاس
پڑاؤ ڈالے میسور کی افواج کی پیش قدمی کا انتظار کر رہے تھے۔ تہور جنگ اور نواب شاہنور کی
افواج ان کے ساتھ شامل ہو چکی تھیں۔ اور ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ وہ میسور کے
ہر سپاہی کے بدلے پانچ آدمی میدان میں لا سکتے تھے۔ لیکن اپنی عددی برتری کے باوجود یہ
عظیم لشکر میسور کی منظم متحد اور تربیت یافتہ فوج کے سامنے ایک میلے کی بھیڑ کی حیثیت رکھتا
تھا۔ ان میں فکر و عمل کی وحدت مفقود تھی۔ مرہٹے نظام کی افواج کو جنگ کے میدان میں آگے
دیکھنا چاہتے تھے اور نظام کا لشکر ہر آزمائش میں مرہٹوں سے چند قدم پیچھے رہنا پسند کرتا تھا۔
پھر ہر فوج کی اپنی حالت یہ تھی کہ ان کا کوئی راجہ یا سردار اپنے باقی ساتھیوں کی نسبت
زیادہ نقصان اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا۔

اس کے علاوہ اپنی سرحد کے قریب ہونے کے باعث رسد اور کمک حاصل کرنے میں میسور کی افواج کو جو سہولتیں حاصل تھیں وہ نظام اور مرہٹوں کی افواج کو حاصل نہ تھیں۔ سلطان ٹیپو اپنے توپ خانے اور اپنی پیادہ فوج کو جنگ کے لیے ایک فیصلہ کن عنصر سمجھتا تھا اور وہ اپنے سواروں کو میدان میں لانے کی بجائے ان سے دشمن کی ناکہ بندی کا کام لینا زیادہ فائدہ مند سمجھتا تھا۔ اس کے برعکس نظام اور مرہٹوں کی بیشتر فوج سواروں پر مشتمل تھی اور انھیں اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ دور دراز کے علاقوں سے غلّہ اور چارا مہیا کرنے میں مصروف رکھنا پڑتا تھا۔ پھر توپوں اور بندوقوں کی جنگ میں ایسے سواروں کے مقابلے میں جو صرف بھاگتے ہوئے دشمن پر یلغار کرنے کے عادی تھے، ڈٹ کر لڑنے والے پیادہ سپاہیوں کا پلّہ ہمیشہ بھاری رہتا تھا۔

پونا اور حیدر آباد کی افواج حسبِ معمول خدمت گاروں، خیمہ برداروں، سازندوں، رقاصوں اور گویّوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ لائی تھیں۔ بڑے بڑے راجاؤں اور سرداروں کی بیویاں ان کے ساتھ تھیں۔ شاہنور میں غلّے اور چارے کے گودام خالی ہو چکے تھے۔ آس پاس کسانوں کی کھیتیاں تباہ ہو چکی تھیں —— یہ تمام حالات سلطان ٹیپو کے حق میں انتہائی سازگار تھے۔

○

ایک رات شدید بارش ہو رہی تھی۔ دکن اور مہاراشٹر کے رؤسا کے خیموں میں رقص و سرود کی محفلیں گرم تھیں۔ سلطان ٹیپو نے اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد دشمن کے پڑاؤ کی طرف پیش قدمی کی۔ لیکن رات کی تاریکی اور بارش کی شدت کے باعث برہان الدین مہا مرزا خاں اور میر معین الدین کی قیادت میں اس کی فوج کے تین قشون راستہ بھول کر ادھر اُدھر نکل گئے۔ سلطان نے دشمن کے پڑاؤ کے قریب پہنچ کر اپنے سالاروں کو سگنل دینے کے لیے ایک فائر کیا۔ لیکن اسے معلوم ہوا کہ اس کی اپنی کمان کے دستوں کے سوا باقی تمام

فوج پیچھے رہ گئی ہے۔ سلطان نے کچھ دیر انتظار کیا۔ اور پھر طلوعِ سحر کے ساتھ دشمن کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس عرصہ میں مرہٹے فرار ہو کر آس پاس کے جنگلوں اور پہاڑوں پر پناہ لے چکے تھے۔

صبح کی روشنی میں جب مرہٹوں نے سلطان کے ساتھ مٹھی بھر آدمی دیکھے تو انھوں نے پلٹ کر پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد سلطان کا باقی لشکر بھی پہنچ گیا اور انھوں نے چند گھنٹوں کی شدید لڑائی کے بعد دشمن کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ چار دن بعد سلطان نے ایک اور حملہ کیا اور دشمن کے سینکڑوں سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیے۔

ہری پنت نے ایک طرف میسور کی فوج کے پے در پے حملوں سے شدید نقصان اٹھانے اور دوسری طرف رسد اور چارے کی مشکلات کے باعث شاہنور کو خیرباد کہہ کر مشرق کا رُخ کیا۔ اس کے میدان سے بھاگتے ہی نواب عبدالحکیم خاں شاہنور کو اپنے بیٹے کے حوالے کر کے فرار ہو گیا اور اپنے لشکر سمیت اتحادیوں سے جا ملا۔[1]

جب سلطان کی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں تو عوام جو مرہٹوں کی لوٹ مار سے تنگ آ چکے تھے مسرت کے نعروں سے اُن کا استقبال کر رہے تھے۔

شاہنور کی فتح کے بعد جنگ کا پانسا پلٹ چکا تھا۔ اور سلطان کی افواج مرہٹوں کے لیے نئے نئے محاذ کھول رہی تھیں۔ ایک قشون میر معین الدین کی قیادت میں حیدر آباد کے سرحدی علاقوں کا رُخ کر رہا تھا۔ دوسرا قشون جس کی کمان سلطان کے بہترین جرنیل برہان الدین کے ہاتھ میں تھی بنکاپور اور مصری کوٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک اور لشکر مہا مرزا خاں کی قیادت میں رائچور اور کشور کا رُخ کر رہا تھا۔ اور حسین علی خاں کی رہنمائی میں ایک لشکر پٹن کے گرد و نواح کے اضلاع میں پیشوا اور نظام کے پالیگاروں کی سرکوبی پر مامور تھا اور باقی لشکر سلطان کی قیادت میں مرہٹوں

[1] اس موقع پر نواب عبدالحکیم خاں کے متعلق شاہنور کے کسی زندہ دل گویّے کا یہ مصرعہ زبان زدِ خلائق ہو چکا تھا کہ "حکیم خاں میاں سب کو چھوڑ کے آپ بھاگا"

کے نئے پڑاؤ کی طرف یلغار کر رہا تھا۔

ہری پنت نے سلطان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی تہوّر جنگ، بھونسلے اور حیدرآباد اور پونا کی افواج کے چیدہ چیدہ سرداروں کا اجلاس طلب کیا اور اُن سے مشورہ کرنے کے بعد کانکیری کی طرف ہٹنے کا فیصلہ کیا۔ سلطان کی فوج ابھی کوسوں دُور تھی اور اتحادی بڑے اطمینان سے کانکیری کے راستے کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ اچانک انھیں یہ اطلاع ملی کہ سلطان کے ہراول دستے غیر معمولی رفتار سے ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔

یہ خبر سنتے ہی لشکر کے ساتھ سفر کرنے والے گرّیوں، سازندوں، بھانڈوں اور رقاصاؤں میں سراسیمگی پھیل گئی اور انھوں نے اپنے سرپرستوں کو خیرباد کہہ کر اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیا۔ ہری پنت نے مرہٹہ راجوں اور سرداروں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیویوں کو بھی واپس بھیج دیں۔ بعض لوگوں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا لیکن چند راجے اور سردار اپنی بیویوں سے جُدا ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہری پنت کو اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ بیکار نوکروں اور خدمتگاروں کی ایک بہت بڑی تعداد اور عیش و آرام کے غیر ضروری سامانوں سے لدے ہوئے اُونٹ اور گاڑیاں اُس کی رفتار میں زبردست رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں۔ لیکن یہ لوگ جنگ کو ایک تفریح سمجھتے تھے اور ان میں سے کوئی اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایک طرف میسور کے سپاہیوں کی یہ حالت تھی کہ جب انھیں بھوک پیاس محسوس ہوتی تھی تو وہ گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے اپنے تھیلوں سے خشک روٹی یا اُبلے ہوئے چاول کے چند نوالے نکال کر کھا لیتے تھے اور دوسری طرف پُونا اور حیدرآباد کے امراء کی حالت یہ تھی کہ وہ صرف حجامت بنوانے میں کئی کئی گھنٹے ضائع کر دیتے تھے۔

○

ایک دن مُوسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ انور علی میسور کے پندرہ سپاہیوں کے ساتھ

ایک ٹیلے کی چوٹی پر اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ ایک سپاہی نے نیچے وادی کے گنجان جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیجیے وہ آگئے!“

انور علی نے وادی کی طرف دیکھا اور اُسے ہراول فوج کے چند دستے دکھائی دیے۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو گھوڑوں پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ ٹیلے سے نیچے اُترتے وقت گھوڑوں کی سست رفتار اور ان کی جھکی ہوئی گردنیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ ان سے بہت زیادہ کام لیا جا چکا ہے۔ ہراول فوج کے دستے انور علی اور اس کے سپاہیوں کو دیکھ کر وادی کے درمیان رُک گئے۔

تھوڑی دیر بعد انور علی ہراول فوج کے سالار سید غفار کے سامنے کھڑا تھا اور فوج کے چیدہ چیدہ افسر اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

سید غفار نے کہا۔ ”کہو کیا خبر لائے ہو؟“

انور علی نے اپنے ہاتھ سے ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس ٹیلے سے آگے دو میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی ہے اور اس پہاڑی سے چار میل دُور ایک کھلے میدان میں دشمن کا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ کل انھوں نے خلافِ معمول دو منزلیں طے کی تھیں لیکن آج وہ آرام کر رہے ہیں۔“

سید غفار نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔ ”پھر ہمیں آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہیں قیام کریں گے۔ سلطان معظم رات تک یہاں پہنچ جائیں گے اور اگر ہماری توپیں بروقت پہنچ گئیں تو ہم پچھلے پہر حملہ کر سکیں گے۔ اب مجھے ایک نہایت خطرناک مہم کے لیے تین نہایت ہوشیار اور بہادر آدمیوں کی ضرورت ہے۔ یہ مہم جس قدر اہم ہے اسی قدر خطرناک ہے اور اس کی نوعیت ایسی ہے کہ میں اپنے کسی سپاہی کو حکم نہیں دے سکتا۔ مجھے صرف رضاکار چاہئیں۔“

انور علی نے کسی توقف کے بغیر ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنا نام پیش کرتا ہوں۔“

اور اس کے بعد تمام افسروں نے اپنے ہاتھ بلند کر دیئے۔

سید غفار نے کہا: "انور علی میں شکریے کے ساتھ تمہاری پیش کش قبول کرتا ہوں اور باقی دو آدمیوں کا انتخاب تم پر چھوڑتا ہوں۔ جن رضاکاروں نے ہاتھ بلند کیے ہیں وہ ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔"

تمام افسر جو وہاں موجود تھے ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ انور علی نے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک نظر دوڑائی اور اچانک اس کی نگاہیں ایک نوجوان پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ یہ اس کا اپنا بھائی مراد علی تھا۔

انور علی چند ثانیے متذبذب اور پریشانی کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "مراد تم کہاں تھے؟ میں نے تمہیں ہاتھ کھڑا کرتے نہیں دیکھا۔"

مُراد علی نے جواب دیا: "میں آپ کے پیچھے کھڑا تھا اور آپ ان سب سے اس بات کی گواہی لے سکتے ہیں کہ آپ کے بعد دوسرا ہاتھ میرا تھا۔"

انور علی نے صف کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگانے کے بعد واپس مُڑتے ہوئے ایک نوجوان کو اشارہ کیا اور وہ صف سے نکل کر الگ کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد انور علی کچھ دیر باقی رضاکاروں کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اپنے دل پر ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس کرتے ہوئے بولا: "مُراد تم بھی آجاؤ!"

مُراد مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور دوسرے رضاکار کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑا ہو گیا۔

سید غفار نے آگے بڑھ کر کہا: "نہیں انور علی تم زیادتی کر رہے ہو۔ میں دو بھائیوں کو ایک خطرناک مہم پر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

سید غفار نے ایک اور افسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "شمشیر خاں تم آجاؤ!"

نے مُراد علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "مُراد! معظم علی کے بیٹوں کو میرے سامنے اس بات کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ بہادر ہیں۔ تم فوراً سلطان معظم کے پاس جاؤ اور ان کی

میں یہ عرض کرو کہ ہم اس جگہ ان کے احکامات کا انتظار کریں گے۔ اگر وہ رات کے وقت چند ہلکی توپیں یہاں پہنچا سکیں تو ہم پچھلے پہر دشمن پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اپنے دستے کے پانچ سوار ساتھ لے جاؤ!"

مراد علی متذبذب کی حالت میں سید غفار کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "جناب اگر آپ اسے گستاخی نہ سمجھیں تو میں روانہ ہونے سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بھائی جان کس مہم پر جا رہے ہیں؟"

سید غفار نے جواب دیا: "یہ ایک مرہٹہ سپاہی کے بھیس میں دشمن کے پڑاؤ کا جائزہ لینے جا رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد انور علی اور اس کے ساتھی مرہٹہ سپاہیوں کے لباس میں سید غفار کے سامنے کھڑے تھے۔ اور سید غفار اُن سے کہہ رہا تھا: "ہم رات ہوتے ہی اس ٹیلے سے اگلی پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر تمہاری ہدایات کا انتظار کریں گے۔ آدھی رات تک تمہارا واپس پہنچ جانا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت تک سُلطانِ معظم بھی پہنچ جائیں گے۔ تمہیں شام ہوتے ہی دشمن کے پڑاؤ میں داخل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دشمن کافی چوکس ہوگا اور تمہیں پُوری احتیاط سے کام لینا چاہیے لیکن ایک بار دشمن کے پڑاؤ میں داخل ہونے کے بعد تمہارے لیے تمام ضروری معلومات حاصل کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ پڑاؤ میں دشمن کی توپوں اور بارُود کے متعلق تمہاری معلومات جس قدر مکمل ہوں گی۔ اُسی قدر ہمارا کام آسان ہوگا۔

میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ تمہارے لیے دشمن کے پڑاؤ میں داخل ہونے کی آسان ترین صُورت کیا ہوگی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ پڑاؤ سے باہر پہرے داروں کی ٹولیاں گشت کر رہی ہوں گی اور تمہارے لیے ان کے ساتھ شامل ہونا مشکل نہیں ہوگا۔ اگر تم یہ محسوس کرو کہ تمہارے لیے رات کے وقت دشمن کے پڑاؤ سے باہر نکلنا مشکل ہے تو تمہیں رات کے

اڑھائی بجے بندوق چلا کر ہمیں خبردار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس وقت تک ہماری فوج کا ایک حصہ پڑاؤ کے قریب تمہارے اشارے کا انتظار کر رہا ہوگا۔"

انور علی نے جواب دیا "ایسی صورت میں میں صرف بندوق چلانے پر اکتفا نہیں کروں گا۔ بلکہ میں بارود کے کسی ذخیرے کو آگ لگانے کی کوشش کروں گا۔"

سید غفار نے کہا "لیکن میں تم سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم بلاوجہ اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اگر تم آدھی رات تک واپس آکر سلطان کی خدمت میں پڑاؤ کا نقشہ پیش کر سکو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم آدھی جنگ جیت چکے ہیں۔"

انور علی مسکرایا "تو میں پورے گیارہ بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

○

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ سید غفار، غازی خاں، ولی محمد، سید حمید، رضا خان اور چند اور بڑے بڑے افسر ایک خیمے کے اندر جمع ہو کر انور علی اور اس کے ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک پہریدار خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا "جوق دار[1] انور علی پہنچ گئے ہیں۔"

غازی خاں نے کہا "اسے فوراً حاضر کرو!"

پہریدار چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد انور علی پانی اور کیچڑ میں لت پت خیمے میں داخل ہوا۔

سید غفار نے پوچھا "تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟"

انور علی نے جواب دیا "میں انہیں دشمن کے پڑاؤ میں چھوڑ آیا ہوں۔ وہ اس وقت پڑاؤ کے عین درمیان بارود کے ایک بہت بڑے ذخیرے کے ارد گرد چکر لگا رہے ہوں گے۔ اور ٹھیک تین بجے وہ بارود کو آگ لگانے کی کوشش کریں گے۔"

غازی خاں نے کہا "انور علی تمہیں سلطان معظم کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرنے کے

[1] جوق: کمپنی کا افسر اعلیٰ۔

لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ وہ پہنچنے ہی والے ہیں۔"

انور علی نے کہا "جناب میں دس منٹ کے اندر اندر دشمن کے پڑاؤ کا پورا نقشہ تیار کر سکتا ہوں۔"

غازی خاں کے اشارے پر ایک افسر نے خیمے کے کونے میں پڑا ہوا لکڑی کا ایک صندوق کھولا اور ایک کاغذ اور مختلف رنگوں کی کئی ڈلیاں نکال کر انور علی کو پیش کر دیں اور انور علی وہیں فرش پر بیٹھ کر نقشہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد خیمے سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور فوج کے افسروں کی نگاہیں خیمے کے دروازے پر مرکوز ہو گئیں۔

سلطان ٹیپو موسیو لالی اور اپنی فوج کے دوسرے افسروں کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کسی توقف کے بغیر پوچھا "دشمن کے پڑاؤ کے متعلق کوئی اطلاع آئی ہے؟"

سید غفار نے جواب دیا "حضور انور علی آگیا ہے۔"

اور انور علی جو انتہائی انہماک سے نقشہ بنانے میں مصروف تھا، چونک کر اٹھا اور اس نے آگے بڑھ کر سلطان کو نقشہ پیش کرتے ہوئے کہا "عالیجاہ میں یہ نقشہ مکمل نہیں کر سکا۔"

سلطان مشعل کے قریب فرش پر بیٹھ گیا اور ایک منٹ نقشہ پر نظر دوڑانے کے بعد بولا "تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور میرے سوالات کا جواب دو۔"

انور علی سلطان کے سامنے بیٹھ گیا اور سلطان نے اپنے ہاتھ کی انگلی سے ایک سرخ نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہاں کیا ہے؟"

انور علی نے جواب دیا "عالیجاہ یہاں ہری پنت کی فوج ہے۔"

"حیدر علی کی فوج کہاں ہے؟"

انور علی نے جلدی سے نقشے پر چند نشان لگانے کے بعد کہا "عالیجاہ! ان کی فوج یہاں ہے۔ اس جگہ ان کا توپ خانہ ہے۔ یہاں نہور جنگ کا خیمہ ہے۔ اس جگہ ان کی

رسد اور بارود کی گاڑیاں کھڑی ہیں۔ اس جگہ اُن کے سوار ہیں ــــ اور اس جگہ اُن کے پیادہ دستے ہیں۔ اگر مجھے چند منٹ اور مل جاتے تو میں آپ کی خدمت میں مکمل نقشہ پیش کر سکتا تھا۔"

سُلطان نے کہا۔ "نقشہ مکمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب تم صرف میرے سوالات کا جواب دیتے جاؤ ــــ ہلکر کی فوج کہاں ہے؟"

"عالیجاہ! وہ اس جگہ ہے ــــ پڑاؤ کے بالکل درمیان۔ اس کے دائیں جانب اس جگہ بھونسلے کی فوج ہے ــــ اس جگہ نواب شاہنواز کے چند دستے ہیں۔ یہ سیاہ رنگ کے تمام نشان دشمن کے توپ خانے ہیں۔ یہ پیلے نشانات دوسرے مرہٹہ سرداروں اور راجوں کی افواج ہیں۔ باہر کے نشانات پڑاؤ کے محافظ دستوں کی بیرونی چوکیاں ہیں۔"

سُلطان نے کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد ہے اس پڑاؤ کے آس پاس ایک برساتی نالہ ہونا چاہیے۔"

انور علی نے جلدی سے ایک نیلے رنگ کی ڈلی کے ساتھ ایک لکیر کھینچتے ہوئے کہا۔

"عالیجاہ وہ نالہ یہ ہے؟"

"اور ہری پنت کی فوج اس نالے کے پار ہے؟"

"جی ہاں۔"

"ہری پنت یقیناً ان سب سے ہوشیار ہے۔ کم از کم اتنا علم ضرور رکھتا ہے کہ اگر رات کی تاریکی میں بھاگنا پڑا تو اسے کون سا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔"

انور علی نے نقشے پر ایک نشان لگاتے ہوئے کہا۔ "عالیجاہ! اگر ہم اپنی چند توپیں اس جگہ پہنچا سکیں تو ہری پنت کی فوج کو بھی کافی نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔"

"توپوں کی ہمیں دوسرے مقامات پر زیادہ ضرورت ہے اور ہری پنت کو روکنے کی بجائے اُسے بھاگنے کا موقع دینا ہمارے لیے زیادہ سود مند ہوگا ــــ مجھے فوج کے کسی اور افسر سے اس کارگزاری کی اُمید نہ تھی۔ آج سے کئی سال قبل جب میری عمر بہت چھوٹی تھی

تو ایک نامور مجاہد جو پانی پت کی جنگ میں حصہ لے چکا تھا سرنگا پٹم آیا تھا اور میں نے اس سے پانی پت کے میدان کا نقشہ تیار کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ اولوالعزم مجاہد تمہارا باپ تھا اور اس نے جو نقشہ بنایا تھا وہ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔"

یہ کہہ کر سلطان اٹھا اور فوج کے افسروں کو ہدایات دینے میں مصروف ہو گیا۔ انور علی یہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے نقشے کی ہر تفصیل سلطان کے دماغ میں نقش ہو چکی ہے۔

سوار اور پیادہ فوج کے افسروں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد سُلطان، موسیو لالی کی طرف متوجہ ہوا۔ "رات کے ٹھیک اڑھائی بجے دشمن کے دائیں بازو پر تمہارے توپخانے کی گولہ باری شروع ہو جانی چاہیے۔ انور علی تمہاری رہنمائی کرے گا۔ بائیں بازو سے سید حمید کی توپیں گولہ باری کریں گی۔"

انور علی نے کہا۔ "عالیجاہ! گستاخی معاف، لیکن ہم تین بجے سے پہلے حملہ نہیں کر سکتے۔"

"اور وہ کیوں؟"

"عالیجاہ! میرے دو ساتھی دشمن کے پڑاؤ میں ہیں اور وہ ٹھیک تین بجے دشمن کے سب سے بڑے بارود کے ذخیرے کو آگ لگانے کی کوشش کریں گے۔"

سُلطان مُسکرایا۔ "تم انعام کے مستحق ہو۔ جاؤ اپنے کپڑے تبدیل کرو، مرہٹہ سپاہی کا لباس تمھیں زیب نہیں دیتا۔"

پھر سُلطان نے موسیو لالی اور توپ خانے کے دوسرے افسروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اب میں اپنے احکام میں ایک تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ توپخانوں کی گولہ باری بارود کے ذخیرے کے دھماکے سے پندرہ منٹ بعد شروع ہونی چاہیے۔ اگر ہمارے آدمی ذخیرے کو آگ لگانے میں کامیاب نہ ہوں تو بھی ہمیں سوا تین بجے حملہ کر دینا چاہیے۔"

چند منٹ بعد انور علی ایک چھوٹے سے خیمے میں اپنا لباس تبدیل کر رہا تھا۔

باہر سے مُراد علی نے آواز دی "بھائی جان میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"آجاؤ!"

مراد علی اور لیگرانڈ خیمے میں داخل ہوئے۔

انور علی نے اپنی تلوار کمر سے باندھتے ہوئے کہا: "مراد! میں جانتا ہوں کہ تم میرے متعلق بہت پریشان تھے۔ لیکن اب باتوں کا وقت نہیں۔ مجھے دشمن کے پڑاؤ میں کوئی خطرہ پیش نہیں آیا۔ وہاں کسی نے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ تم کس راجے یا سردار کی فوج سے تعلق رکھتے ہو۔ لوگ صرف بارش کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ میرا سفر بہت دلچسپ تھا۔ ایک خیمے کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے طبلے اور سارنگی کے ساتھ ایک رقاصہ کی پائل کی جھنکار سنائی دی اور وہ ایک دلچسپ گیت گا رہی تھی لیکن مجھے صرف چند الفاظ یاد رہ گئے ہیں۔"

مراد علی نے ہنستے ہوئے کہا: "بھائی جان وہ ضرور سنائیے!"

"وہ گا رہی تھی۔ "آئی ہے برسات، بالم آئی ہے برسات" ــــ اور آگے مجھے یاد نہیں رہا۔ اب چلو!"

انور علی نے لیگرانڈ کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرانسیسی زبان میں کہا: "ہمیں راستے میں باتیں کرنے کے لیے کافی وقت ملے گا۔"

○

اڑھائی بجے کے قریب بارش کی شدت میں کچھ کمی آ چکی تھی۔ اور انور علی فرانسیسی توپخانے کے کمانڈر موسیو لالی سے کہہ رہا تھا: "اب دشمن کے پڑاؤ کی بیرونی چوکیاں یہاں سے بہت قریب ہیں۔ ہمیں اور آگے بڑھنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ آپ کی توپوں کا رخ میرے دائیں طرف ہونا چاہیے۔ تین بجے تک آپ کی یہی کوشش ہونی چاہیے کہ دشمن آپ کے متعلق خبردار نہ ہو۔ اگر پڑاؤ آپ کی توپوں کی زد سے باہر ہو تو بھی آپ کو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کا اولین مقصد پڑاؤ میں سراسیمگی پھیلانا ہے۔ توپ خانے کو اس جگہ سے آگے

لے جانے کے لیے آپ کو مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔ اب مجھے اجازت دیجیے، میں حملہ شروع ہونے سے پہلے اپنے رسالے کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

موسیو لالی نے کہا: "بہت اچھا آپ جا سکتے ہیں۔"

چند سپاہی جو انور علی کے ساتھ آئے تھے تھوڑی دور گھوڑوں کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ انور علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔

اچانک ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور آہستہ سے کہا: "موسیو انور علی ٹھہریے میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کون ـــ لیگرانڈ؟" انور علی نے رکتے ہوئے کہا۔

لیگرانڈ نے کہا: "مجھے راستے میں آپ سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

"لیکن یہ باتوں کا وقت نہیں۔"

"میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"بہت اچھا کہیے۔"

لیگرانڈ نے کہا: "میں آپ سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ اگر مجھے اس جنگ میں کوئی حادثہ پیش آ جائے تو آپ جین کو یہ محسوس نہیں ہونے دیں گے کہ وہ اس دنیا میں بے سہارا ہے۔"

چند ثانیے انور علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے لیگرانڈ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "میرے دوست تمہیں جین کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس لڑائی میں آنچ نہیں آئے گی اور تم بہت جلد سرنگاپٹم جا سکو گے۔"

لیگرانڈ نے کہا: "مجھے اپنی زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر مجھے اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ آپ اسے سہارا دے سکیں گے تو موت کا چہرہ میرے لیے اس قدر بھیانک نہیں ہو گا۔"

انور علی نے کہا: "یہ وقت اور یہ مقام اس قسم کی شاعری کے لیے موزوں نہیں تمہاری

ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گزشتہ حادثات نے تمھیں اذیت پسند بنا دیا ہے۔ اب میں اس بات کی پوری کوشش کروں گا کہ تم جنگ ختم ہوتے ہی شادی کر لو۔"

لیگرانڈ نے کہا "انور علی مجھے یہ معلوم نہیں کہ میرے متعلق جین کے خیالات کیا ہیں لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو آپ اس کے لیے زندگی کا آخری سہارا بن سکتے ہیں اور آپ اُسے وہ سب کچھ دے سکتے ہیں جو میں نہیں دے سکتا۔ میں آپ کی زبان سے صرف یہ سننا چاہتا ہوں کہ اگر مستقبل کے حالات یہ ثابت کر دیں کہ جین کو میری نسبت آپ کی زیادہ ضرورت ہے تو آپ اس کو مایوس نہیں کریں گے۔"

لیگرانڈ نے ایک دوست کے منھ پر تھپڑ مارنے کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔ میں جس جین کو جانتا ہوں وہ تمھاری ہے اور صرف تمھاری رہ کر ہی وہ میری نگاہوں میں کوئی عزت حاصل کر سکتی ہے۔ میں اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر انور علی آگے بڑھا اور اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ پکڑ کر سوار ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اور اس کے ساتھی رات کی تاریکی میں غائب ہو چکے تھے اور لیگرانڈ اپنے دل میں کہہ رہا تھا "جین مجھے اپنی کم مائگی کا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہمیں صرف حوادث کے سیلاب کی موجوں نے ایک دوسرے کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ ہمارے راستے مختلف تھے۔ یہ میری خود فریبی ہے کہ میں نے تمھیں اپنی اُمیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنا لیا ہے لیکن اگر تم اپنے مستقبل کے متعلق انور علی سے کوئی توقع وابستہ کر چکی ہو تو تم مجھ سے زیادہ ناداں ہو۔"

○

رات کے تین بجے دشمن کے پڑاؤ کے درمیان آگ کا ایک مہیب شعلہ بلند ہوا۔ اور سپاہی

ایک خوفناک دھماکے کی آواز سُن کر افراتفری کی حالت میں اپنے خیموں سے باہر نکلنے لگے۔ پھر چند منٹ بعد ایک طرف سے لاتعداد گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور ٹیپو کے برق رفتار سوار دھاڑ کرتے ہوئے آن کی آن میں پڑاؤ کے عقب میں جا پہنچے۔ اس کے بعد دو اطراف سے توپوں کی دھنا دھن اور تیسری سمت سے بندوقوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ہری پنت جو اپنے ساتھیوں کی نسبت زیادہ جوکس تھا معمولی نقصان اٹھانے کے بعد راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔ لیکن باقی لشکر کی یہ حالت تھی کہ سپاہی اپنے افسروں اور افسر اپنے سپاہیوں سے بے خبر تھے۔ ہر نواب، ہر راجہ اور ہر سردار اپنے کیمپ کی بجائے اپنے ساتھیوں کے کیمپ زیادہ محفوظ سمجھتا تھا۔ جو افواج مشرق کی طرف تھیں وہ مغرب کا رُخ کر رہی تھیں اور جو مغرب کی طرف تھیں وہ مشرق کو اپنے لیے زیادہ محفوظ سمجھتی تھیں۔ ایک لشکر شمال سے جنوب کی طرف بھاگ رہا تھا تو دوسرا جنوب سے شمال کا رُخ کر رہا تھا۔

اس افراتفری کے عالم میں دوست دشمن کی کوئی تمیز نہ تھی۔ ایک مرہٹہ فوج دوسری مرہٹہ فوج کے ساتھ اور ایک حیدر آبادی دستہ دوسرے حیدر آبادی دستے کے ساتھ گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ جو سپاہی ذرا ہوش و حواس اور ہمت سے کام لے کر اپنے مورچوں میں بیٹھ گئے تھے، انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان توپوں اور بندوقوں کا رُخ کس طرف ہونا چاہیے۔ پو پھٹنے تک سینکڑوں مرہٹہ اور حیدر آبادی سپاہی زخمی اور ہلاک ہو چکے تھے۔ دائیں اور بائیں بازو سے ٹیپو کے توپ خانے اس قدر قریب آ چکے تھے کہ پڑاؤ کا کوئی حصہ ان کی گولہ باری سے محفوظ نہ تھا اور پڑاؤ کے باہر میلوں تک اتحادی لشکر کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

تہوّر جنگ، بھونسلے، پھلکر اور دوسرے مرہٹہ اور مغل سردار جو انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں رات کی تاریکی میں فرار ہوئے تھے، دن کی روشنی میں چند کوس دور دریا کے کنارے اپنے پریشان حال ساتھیوں کو جمع کر رہے تھے۔ انھیں جس قدر اپنی شکست اور تباہی کا افسوس تھا اسی قدر اس بات کا افسوس تھا کہ ہری پنت اپنی بیشتر فوج اور سامانِ جنگ بچا کر میدان

سے نکل چکا ہے۔

صبح کے آٹھ بجے تک پڑاؤ کے اندر مرہٹہ اور حیدرآبادی سپاہیوں کی رہی سہی مزاحمت بھی ختم ہو چکی تھی اور رفاتح لشکر دشمن کے خالی گھوڑوں اور رسد اور بارود سے لدی ہوئی بیل گاڑیوں اور اونٹوں کو جمع کر رہا تھا۔ سلطان کے طوفانی دستے کئی میل تک بھاگتے ہوئے دشمن کا پیچھا کرنے کے بعد واپس آرہے تھے۔ میسور کے سپاہیوں کے لیے، جو ایامِ جنگ میں زمین کے فرش پر سونے کے عادی تھے، دشمن کے کشادہ اور بیش قیمت سازوسامان سے آراستہ خیمے عجائب گھروں سے کم نہ تھے۔

آٹھواں باب

دن کے دس بجے کے قریب سلطان ٹیپو مغل علی خاں کے خالی خیمے میں رونق افروز تھا۔ یہ خیمہ مخمل کے پردوں اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ تھا۔ سلطان کے سامنے میز پر ایک کشادہ نقشہ کھلا ہوا تھا اور چند آزمودہ کار جرنیل اس کے گرد کھڑے تھے۔ سلطان نے اپنے قلم سے نقشے پر چند نشان لگانے اور چند لکیریں کھینچنے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "اب ہمیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ دشمن کا نیا پڑاؤ کہاں ہوگا۔ اب وہ کسی میدان میں ہمارے سامنے آنا پسند نہیں کرے گا۔ ہماری اگلی منزل کوپال اور بہادر بندہ کے قلعے ہیں اور انھیں کھو بیٹھنے کے بعد دشمن کی رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ جائے گی۔"

انور علی خیمے میں داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا: "عالیجاہ! مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ قیدی عورتوں میں ہنگر کی اہلیہ بھی ہے۔ چند اور عورتیں بھی بڑے بڑے خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔"

سلطان نے کہا: "ایسی اطلاع مجھے فوراً ملنی چاہیے تھی اور میں نے یہ حکم دیا تھا کہ خواتین کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ تم نے ان کے آرام کے لیے کیا بندوبست کیا ہے؟"

انور علی نے جواب دیا: "عالیجاہ! میں انھیں اس پڑاؤ کے بہترین خیموں میں ٹھہرانے کی

کوشش کر چکا ہوں۔ لیکن وہ کہتی ہیں کہ جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا ہم باقی قیدیوں کے ساتھ رہنا پسند کریں گی۔"

سلطان نے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "تم میرے ساتھ آؤ!"

تھوڑی دیر بعد سلطان اپنے چند افسروں کے ساتھ قیدی عورتوں کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ عورتیں اپنے سروں کے بال کھولے اپنے بچھڑے ہوئے شوہروں اور رشتہ داروں کا ماتم کر رہی تھیں۔ سلطان کے رعب و جلال نے ان پر تھوڑی دیر کے لیے سکوت طاری کر دیا۔

سلطان نے کہا "آپ میں سے ہلکر کی اہلیہ کون ہے؟"

قیدی عورتیں چند ثانیے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ بالآخر ایک ادھیڑ عمر کی باوقار عورت آگے بڑھی اور اُس نے کہا "میں ہلکر کی بیوی ہوں اور اگر آپ سلطان ٹیپو ہیں تو میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے ہمارے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

سلطان نے جواب دیا "ایک بھائی اپنی بہنوں کے ساتھ کیا سلوک کر سکتا ہے۔ آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ آپ ہماری قیدی ہیں۔ آپ خیموں کے اندر آرام کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو بہت جلد آپ کے ورثا کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔"

سلطان نے اپنی کمر سے سبز رنگ کا ریشمی پٹکا کھولا اور ہلکر کی بیوی کے سر پر ڈالتے ہوئے کہا "ہلکر کی بیوی کو میرے سامنے ننگے سر نہیں کھڑے ہونا چاہیے۔ میں اس ملک کی کسی عورت کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔"

پھر سلطان نے مڑ کر انور علی کی طرف دیکھا اور کہا "انور علی تم ایک قابلِ عزت باپ کے بیٹے ہو اور میں تمہیں ایک نہایت اہم ذمہ داری سونپ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان کے آرام کا پورا خیال رکھو گے۔"

انور علی نے جواب دیا "عالیجاہ! میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔"

سلطان کچھ اور کہے بغیر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ ہلکر کی بیوی کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو

چھلک رہے تھے۔ اس نے ایک مرہٹہ سردار کی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے ایک سپنا دیکھا ہے۔ وہ انسان نہیں ایک دیوتا ہے اور اس کے ساتھ جنگ کرنا پاپ ہے۔"

تھوڑی دیر بعد فوج کا ایک افسر سلطان کی طرف سے ہر قیدی عورت کو ایک ایک چادر اور دو دو مہریں تقسیم کر رہا تھا۔

O

اگلے دن سلطان ٹیپو اپنے گورنروں اور مختلف محاذوں پر پھیلی ہوئی افواج کے سپہ سالاروں کے خطوط پڑھنے اور ان کے جواب لکھوانے میں مصروف تھا۔ دو کاتب قالین پر بیٹھے اس سے ہدایات لے رہے تھے۔ سلطان کرسی پر بیٹھنے کی بجائے خیمے کے اندر آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ میر منشی ایک کشادہ میز کے قریب اور سلطان ٹیپو کے باڈی گارڈ دستے کا ایک افسر خیمے کے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

سلطان ٹہلتے ٹہلتے ایک خط کا جواب لکھوانے کے بعد میر منشی کی طرف متوجہ ہوتا اور وہ میز سے دوسرا خط اٹھا کر پیش کر دیتا۔ ان خطوط میں حکومت کے ہر محکمے کے بڑے اور چھوٹے مسائل زیرِ بحث آئے تھے۔ سلطان ہر خط کو صرف ایک نظر دیکھتا اور کسی توقف کے بغیر جواب لکھوانا شروع کر دیتا۔ لیکن اس کے خیالات اور الفاظ کے تسلسل کا یہ عالم تھا کہ کاتب بڑی مشکل سے اس کی رفتار کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ کبھی اپنے کسی سالار کو کسی اہم چوکی یا قلعے پر حملہ کرنے کی ہدایت لکھواتا، کبھی کسی مظلوم آدمی کی درخواست پڑھ کر مقامی حاکم کو اس کی دادرسی کی ہدایت کرتا۔ کبھی کسی عدالت کے غلط فیصلے پر اسے سرزنش کرتا اور کبھی کسی نئے صنعتی یا زرعی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے احکام صادر کرتا۔

سلطان ٹہلتے ٹہلتے خیمے کے ایک دریچے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ باہر سے انور علی خیمے

خیمے کے دروازے پر نمودار ہوا لیکن سلطان کے باڈی گارڈ کا اشارہ پا کر رُک گیا۔ سلطان چند خط لکھوانے کے بعد اپنے میر منشی کی طرف متوجہ ہوا تو باڈی گارڈ نے کہا "عالی جاہ! جوق دار انور علی حاضر ہے۔"

سلطان نے دروازے کی طرف دیکھا اور انور علی نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔

سلطان نے اپنے ہونٹوں پر ایک شفقت آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "انور علی جوق دار نہیں رسالدار[1] ہے۔"

انور علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں اور تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی نظریں جھکاتے ہوئے کہا "عالیجاہ! اگر اجازت ہو تو میں اپنے دو ساتھیوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

سلطان نے کہا "مجھے ان کی کارگزاریوں کا اعتراف ہے اور میں نے انھیں ترقی دے دی ہے۔ سید غفار نے جن افسروں کے متعلق سفارش کی تھی ان میں تمھارا بھائی بھی ہے اور اسے تمھاری جگہ مل گئی ہے۔ اب میں تمھیں ایک اہم مہم پر بھیجنا چاہتا ہوں۔ قیدی عورتوں کو دشمن کے پڑاؤ میں پہنچانے کے لیے کسی ہوشیار اور فرض شناس آدمی کی ضرورت تھی اور میں نے تمھیں اس کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ تم کل علی الصباح ان کے ساتھ روانہ ہو جاؤ۔ اپنے ساتھ بیس سوار لیتے جاؤ۔ ان کے لیے پالکیاں مہیا کی جا رہی ہیں اور پالکیاں اٹھانے کے لیے دشمن کے چند قیدیوں کو رہا کر دو۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ راستے میں انھیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔"

"عالیجاہ! میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہو گی۔"

"بہت اچھا تم جا سکتے ہو۔"

انور علی نے سلام کیا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔

[1] رسالدار کا عہدہ کرنل کے برابر تھا۔

○

پونا اور دکن کی شکست خوردہ افواج تنگبھدرہ کے آس پاس تمام علاقے اپنے لیے غیر محفوظ سمجھتے ہوئے دریائے کرشنا کے قریب جمع ہو رہی تھیں۔

ایک دن لشکر کے سردار ایک خیمے میں جمع ہو کر تازہ صورتِ حالات پر بحث کر رہے تھے۔ تہور جنگ، ہلکر، بھونسلے اور دوسرے راجے اور سردار یکے بعد دیگرے متحدہ افواج کے سپہ سالار ہری پنت پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ اس بحث میں وہ لوگ زیادہ تلخی کا مظاہرہ کر رہے تھے جو اپنی بیویاں میدانِ جنگ میں چھوڑ آئے تھے۔

ہری پنت غصے سے کانپتا ہوا اٹھا اور بلند آواز میں چلایا "آپ میں کوئی ایسا نہیں جو مجھے بزدلی کا طعنہ دے سکے۔ میں نے بار بار آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ہم سیر و تفریح کے لیے نہیں آئے۔ بلکہ جنگ کے لیے آئے ہیں اور ہماری جنگ ایک ایسے دشمن کے ساتھ ہے جو کئی میدانوں میں انگریزی فوج کے بہترین جرنیلوں کے دانت کھٹے کر چکا ہے۔ اس لیے ہمیں عورتوں کو ساتھ نہیں رکھنا چاہیے۔ میں نے آپ کو بارہا خبردار کیا تھا کہ عیش و آرام کے جو لوازمات آپ لوگ ساتھ لائے ہیں، اس کے باعث ہمارے لیے نقل و حرکت میں بہت سی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ آپ کے لیے نوکروں اور خدمت گاروں کی دیکھ بھال اور حفاظت ایک مسئلہ بن چکی تھی۔ ہمارا مقابلہ ایک ایسے شخص کے ساتھ تھا جس کے سپاہی جنگ کے ایام میں اپنے تھیلوں میں پڑی ہوئی دو سوکھی روٹیوں یا مٹھی بھر اُبلے ہوئے چاولوں کو دو وقت کی ضرورت کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ کے ہمراہ ہزاروں اُونٹ اور سینکڑوں بیل گاڑیاں غیر ضروری ساز و سامان سے لدی ہوئی تھیں۔ ہم انتہائی ضرورت کے وقت جتنا سفر ہفتوں میں کرتے تھے میسور کے سپاہی اتنا سفر دنوں میں کر لیتے تھے۔ میں نے دشمن کے حملے سے دو دن قبل آپ کو یہ ہدایت کی تھی کہ غیر ضروری سامان سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں

اور اُونٹ اور لاتعداد خدمت گاروں کو واپس بھیج دیا جاتے۔ لیکن آپ اپنی عورتوں کو بھی ساتھ رکھنے پر مُصر تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ جس رفتار سے ہم سفر کر رہے تھے اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ دشمن اپنے بھاری توپ خانے سمیت آگے بڑھ رہا تھا۔

پھر میں نے کالکیری کی طرف پیش قدمی کرتے وقت یہ کوشش کی تھی کہ ہمارا پورا لشکر ایک ساتھ آگے بڑھنے کی بجائے چھ حصوں میں تقسیم ہو کر سفر کرے۔ لیکن آپ کے لیے میرا مشورہ قابلِ قبول نہ تھا۔ رات کے وقت جب بارش ہو رہی تھی تو میں نے یہ کہا تھا کہ دشمن صرف چند میل دور ہے اور ہمیں آرام کرنے کی بجائے اس کے مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے لیکن آپ لمبی تان کر سو گئے۔ اور جن سپاہیوں کو آپ نے پڑاؤ کی حفاظت سونپی تھی وہ نمک حرام ثابت ہُوئے۔

میرا قصور صرف یہ ہے کہ دشمن کے اچانک حملے کے وقت میں بیدار تھا اور میرے سپاہی آپ کے سپاہیوں کی نسبت زیادہ چوکس تھے اس لیے مجھے اپنی فوج کو بچا کر نکلنے کا موقع مل گیا۔ اگر آپ میں سے کوئی ڈٹ کر لڑتا تو وہ مجھے طعنہ دے سکتا تھا۔ لیکن آپ میں سے کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ میدان میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس وقت ہم سب کے سامنے صرف اپنی جانیں بچانے کا مسئلہ تھا۔ فرق صرف یہ ہُوا کہ میں نے اپنی فوج اس وقت نکال لی تھی جب کہ پڑاؤ کے گرد دشمن کا گھیرا ابھی مکمل نہیں ہُوا تھا اور آپ اس وقت اپنے بستروں سے اٹھے جب دشمن پُوری شدت کے ساتھ چاروں اطراف سے حملہ کر چکا تھا۔

دن کے وقت دشمن کا حملہ کتنا ہی اچانک کیوں نہ ہوتا ہمارے لیے یہ صورتِ حالات پیدا نہ ہوتی۔ ہم پڑاؤ سے آگے بڑھ کر اس کا مقابلہ کرتے لیکن رات کی تاریکی میں اس قدر غیر متوقع حملے کے بعد ہمارے لیے فوج کو منظم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اب ہمیں ماضی کے متعلق سوچنے اور آپس میں جھگڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا

ہوں کہ ہمیں شکست ہوئی ہے لیکن اس وقت ہم یہ سوچنے کے لیے جمع ہُوئے ہیں کہ ہم نے اس شکست سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔

میرے دوستو! ہم نے ایک لڑائی میں شکست کھائی ہے لیکن جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے پاس اب بھی اتنی فوج ہے کہ اگر ہم ہمت سے کام لیں تو چند ہفتوں میں سرنگا پٹم پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ چند دنوں تک ہمیں پونا اور حیدر آباد سے مزید کمک پہنچ جائے گی اور ہم اس شکست کا بدلہ لے سکیں گے۔"

ایک مرہٹہ سردار نے اٹھ کر کہا: "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ہماری ان عورتوں کے متعلق کیا سوچا ہے جو اس وقت دشمن کی قید میں ہیں؟"

ہری پنت نے جواب دیا: "میرے دوست یہ صرف آپ کی عزت کا مسئلہ نہیں ہم سب کی عزت کا مسئلہ ہے۔ اپنی عورتوں کو قید سے چھڑانے کے لیے ہم دشمن کو شکست دیں گے۔"

سردار نے کہا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم دشمن کو شکست نہ دے سکیں تو ہماری عورتیں ان کے قبضے میں رہیں گی؟"

ایک اور سردار نے اٹھ کر کہا: "اس وقت یہ بحث فضول ہے مجھے یقین ہے کہ اگر ہم سلطان ٹیپو کے ساتھ مصالحانہ گفتگو سے ان عورتوں کو آزاد کرا لیں تو بھی کوئی باغیرت مرہٹہ انھیں دوبارہ اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گا۔"

ہلکر نے اٹھ کر غصے سے کانپتے ہوئے کہا: "اگر تم میں سے کسی نے ان عورتوں کے متعلق کوئی بدکلامی کی تو میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔ میری بیوی بھی مسلمانوں کی قید میں ہے اور میں تم سب کے سامنے یہ اعلان کرتا ہوں کہ کوئی مرہٹہ عورت اس سے زیادہ قابلِ عزت نہیں۔"

اس پر چند مرہٹہ راجوں اور سرداروں کو طیش آگیا اور وہ ہلکر کے ساتھ بدکلامی پر اُتر آئے۔

اچانک ایک مرہٹہ نوجوان خیمے کے اندر داخل ہُوا اور اس نے آگے بڑھ کر ہلکر کو پرنام کرتے ہوئے کہا: "مہاراج! رانی صاحبہ دوسری قیدی عورتوں کے ساتھ پچھلی چوکی پر پہنچ گئی

ہیں۔ میسُور کی فوج کا ایک افسر اور بیس مسلح سپاہی ان کے ساتھ ہیں۔ رانی صاحبہ ہماری چوکی پر رُک گئی ہیں اور ان کے ساتھ آنے والی تمام عورتیں یہ کہتی ہیں کہ جب تک ہمارے آدمی ہمیں لینے کے لیے یہاں نہیں آئیں گے، ہم آگے نہیں بڑھیں گی۔"

ایک مرہٹہ سردار نے کہا "جاؤ انھیں کہ دو کہ یہاں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

ہلکر نے تلملا کر کہا: "تم اُن کے متعلق کچھ کہنے والے کون ہو؟"

سردار نے جواب دیا: "آپ مجھے اپنی بیوی کے متعلق کچھ کہنے سے منع نہیں کر سکتے۔"

ہلکر نے لاجواب ہو کر حاضرینِ مجلس کی طرف دیکھا اور کہا: "میں ان کے استقبال کے لیے جا رہا ہوں۔ آپ میں سے کون ہے جو میرے ساتھ آنا چاہتا ہے؟"

خیمے کے اندر تھوڑی دیر کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔ پھر چھ مرہٹہ سردار یکے بعد دیگرے اٹھ کر آگے بڑھے اور ہلکر کے ساتھ خیمے سے باہر نکل آئے۔

نوجوان ایلچی جو عورتوں کے متعلق پیغام لایا تھا کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "دشمن نے تمام عورتوں کو بھیج دیا ہے۔"

بھونسلے نے اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "بھاگ جاؤ یہاں سے تمام مرہٹے بے غیرت نہیں ہو سکتے۔"

نوجوان بددل سا ہو کر خیمے سے باہر نکل آیا اور بھاگتا ہوا ہلکر اور اس کے ساتھیوں سے جا ملا۔ خیمے سے تھوڑی دُور ہلکر نے اس کی طرف مُتوجّہ ہو کر سوال کیا: "عورتیں پیدل آئی ہیں؟"

"نہیں مہاراج۔ دشمن نے انھیں پالکیوں پر سوار کرا کے بھیجا ہے اور وہ لوگ جو ان کی پالکیاں اٹھا کر لائے ہیں ہماری اپنی فوج کے آدمی ہیں جنھیں دشمن نے رہا کر دیا ہے۔"

○

مرہٹہ عورتیں پالکیوں سے نکل کر درختوں کی چھاؤں میں بیٹھی اپنے آدمیوں کا انتظار کر رہی

تھیں۔ میسُور کے سوار اور وہ مرہٹہ قیدی جو اُن کے ساتھ آئے تھے، ان سے چند قدم دُور ان سے علیحدہ کھڑے تھے۔ کوئی ڈیڑھ سو سوار شمال کی طرف سے نمودار ہوئے اور تھوڑی دیر میں چوکی کے قریب پہنچ گئے۔

چوکی کے ایک سپاہی نے بلند آواز میں کہا: "مہاراج ہلکر خود تشریف لا رہے ہیں۔"

میسُور کے سپاہی اپنے نوجوان سالار کے حکم سے آگے بڑھ کر ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔

ہلکر نے اپنے ساتھیوں کو جن میں سے اکثر اس کی فوج کے بڑے بڑے افسر تھے چند قدم دُور ہاتھ کے اشارے سے رُکنے کا حکم دیا۔ پھر وہ اور چھ اور سردار اپنے گھوڑوں سے اُتر پڑے اور سیدھے عورتوں کی طرف بڑھے۔ اور چند ثانیہ بعد یہ لوگ مُجرموں کی طرح اپنی بیویوں کے سامنے کھڑے تھے۔

ہلکر کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا: "رانی میں شرمندہ ہوں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکا کہ رُسوائی کی زندگی میرے لیے موت سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔"

ہلکر کی بیوی نے فوراً گفتگو کا رُخ بدلنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس نے پُوچھا "باقی لوگ کیوں نہیں آئے؟"

ہلکر نے اصلی وجہ ظاہر کرنے کی بجائے جواب دیا: "ہم اُن کا انتظار نہیں کر سکتے۔ میں آپ سب کی سواری کے لیے ہاتھی لانا چاہتا تھا لیکن پھر خیال ہوا کہ ہاتھی تیار کرنے میں دیر ہو جائے گی۔"

وہ بولی "مہاراج! آپ کو ہم سے پہلے میسور کے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ اگر کسی بڑے انعام کے مستحق نہیں تو آپ کی طرف سے شکریہ کے حقدار ضرور ہیں۔"

ہلکر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا سپاہیوں کی طرف بڑھا۔ میسُور کے سپاہیوں نے اُسے سلامی دی اور

اس کے بعد اُن کا افسر آگے بڑھ کر ہلکر کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا۔

ہلکر نے پوچھا "تم ان کے افسر ہو؟"

"جی ہاں!"

"تمھارا نام؟"

"انور علی"

"میسور کی فوج میں تمھارا عہدہ کیا ہے؟"

"جی میں رسالدار ہوں"

"میرا نام ہلکر ہے اور میں آپ کا شکرگزار ہوں۔"

انور علی نے کہا "ہم نے صرف اپنا فرض پورا کیا ہے اور اب اگر آپ اجازت دیں تو ہم یہیں سے واپس جانا چاہتے ہیں"

"تمھیں کم از کم ایک دن میرے پاس ضرور ٹھہرنا چاہیے۔ ہمارا پڑاؤ زیادہ دور نہیں"

انور علی نے جواب دیا "جناب ہمیں فوراً واپس لوٹنے کا حکم ہے۔ ہمارا کام ختم ہو چکا ہے اور ہم صرف مہارانی صاحبہ کے حکم پر تھوڑی دیر کے لیے یہاں رُک گئے تھے"

ہلکر نے اپنے گلے سے موتیوں کی ایک مالا اور سونے کی کنٹھی جس میں بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے تھے اتاری اور انور علی کو پیش کرتے ہوئے کہا "میں آپ کو ٹھہرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔ لیجیے یہ مالا آپ کے سپاہیوں اور یہ کنٹھی آپ کا انعام ہے"

انور علی نے جواب دیا "شکریہ! لیکن میسور کے سپاہی صرف اپنے سلطان سے انعام لے سکتے ہیں۔ آپ ہمیں شرمسار نہ کریں"

ہلکر نے قدرے توقف کے بعد کہا "آپ سلطان ٹیپو کو میری طرف سے یہ پیغام دیں کہ انھوں نے میری گردن پر ایک پہاڑ رکھ دیا ہے اور وہ مجھے ناشکرا نہیں پائیں گے"

انور علی نے ہلکر کو سلام کیا اور اپنے سپاہیوں کو گھوڑوں پر سوار ہونے کا حکم دیا۔

جن عورتوں کے ورثا انھیں واپس لینے کے لیے تیار نہ تھے وہ ہلکر کی بیوی کے پاس ٹھہر گئیں۔ اگلے روز ہلکر کی لعنت ملامت کے باعث چند اور سردار اپنی بیویوں کو واپس لینے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن بعض کسی صورت یہ بھولنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ان کی عورتیں مسلمانوں کے قبضہ میں رہ چکی ہیں۔ مرہٹہ قیدی جوان عورتوں کے ساتھ آئے تھے، ان کی پاک دامنی کی قسمیں کھاتے تھے۔ لیکن مرہٹہ کیمپ میں ان متعصب برہمنوں کی ایک خاصی تعداد موجود تھی جو سلطان ٹیپو کے خلاف ایک جذباتی ہیجان پیدا کرنے کا کوئی موقع کھونے کے لیے تیار نہ تھے۔ اب وہ ان عورتوں سے چند من گھڑت داستانیں منسوب کر کے اس واقعہ کو پوری مرہٹہ قوم کی عزت کا مسئلہ بنانا چاہتے تھے۔

○

تین دن بعد میسور کے خلاف جوابی کارروائی کی تجاویز پر غور کرنے کے لیے حیدرآبادی اور مرہٹہ افواج کے راہنما ہری پنت کے خیمے میں جمع تھے۔ اس اجلاس میں ایک انگریز افسر سٹرلین بھی موجود تھا، جو دو دن قبل پونا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ سر چارلس میلٹ سے خاص ہدایات لے کر وہاں پہنچا تھا۔ ہلکر نے اس اجلاس کی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا اور حاضرینِ مجلس اس کی غیر حاضری بہت محسوس کر رہے تھے۔ ایک مرہٹہ سردار نے اٹھ کر یہ تجویز پیش کی کہ ہلکر کو منانے کے لیے ایک وفد بھیجا جائے۔

ابھی اس تجویز پر بحث ہو رہی تھی کہ اندور کی فوج کا ایک افسر خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا "ہلکر مہاراج تشریف لا رہے ہیں"

چند منٹ بعد ہلکر خیمے کے اندر داخل ہوا۔ حاضرینِ مجلس نے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی کرسیوں سے اٹھ کر اس کا خیرمقدم کیا۔ ہری پنت نے اسے اپنے دائیں جانب بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر چند قدم دور بیٹھ گیا۔

اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی اور ہری پنت نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

دوستو! اور بھائیو! ہم جن حالات کا سامنا کر رہے ہیں وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ہمیں فوراً کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے پیش قدمی میں مزید تاخیر سے کام لیا تو تنگبھدرہ اور کرشنا کے درمیان ہمارے کئی قلعے دشمن کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ ہم نے گزشتہ لڑائیوں میں جو نقصانات اٹھائے ہیں ان کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ برسات کے موسم میں ہمارا رسد اور کمک کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ لیکن اب ہمارے راستے میں وہ دشواریاں نہیں ہیں۔ اب اگر ہم دریائے تنگبھدرہ عبور کر کے جنوب کی طرف دشمن کے لیے محاذ کھول دیں تو اس کے لیے تنگبھدرہ کے اس پار ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔ برسات کے موسم میں دشمن کی کامیابیوں کا مدار اس کی پیادہ فوج پر تھا۔ لیکن اب پہل ہمارے سواروں کے ہاتھ ہو گی۔ اگر ہم نے آئندہ چند ماہ مدافعانہ کارروائی پر اکتفا کیا تو اگلے موسم برسات میں ہمارے لیے دریائے کرشنا کے پار ٹھہرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اگر ہم وقت ضائع نہ کریں تو جنگ کا فیصلہ اب بھی ہمارے ہاتھ ہے۔"

ہلکر نے اٹھ کر کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ آئندہ برسات تک اگر ہمیں صرف اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرنا پڑا تو دشمن کا لشکر پونا اور حیدر آباد کے دروازوں پر دستک دے رہا ہو گا۔"

بھونسلے نے اٹھ کر کہا: "ہلکر مہاراج آپ کو ایسی گفتگو زیب نہیں دیتی۔ اگر آپ کے پاس کوئی بہتر تجویز ہو تو ہم سننے کے لیے تیار ہیں۔"

ہلکر نے جواب دیا: "میں یہاں کوئی تجویز لے کر نہیں آیا ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ انگریز جن کی شہ پر ہم نے یہ جنگ شروع کی تھی اس وقت کیا سوچ رہے ہیں اور وہ ابھی تک میدان میں کیوں نہیں آئے۔ سر چارلس میلٹ نے آپ کے حوصلے بلند کرنے کے لیے اپنا ایلچی بھیجا ہے اور میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا پیغام لایا ہے؟"

حاضرینِ مجلس کی نگاہیں مسٹر یون پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ اٹھا اور ہلکر سے مخاطب ہو کر بولا

"یور ہائینس اگر ایسٹ انڈیا کمپنی نے کوئی وعدہ کیا ہے تو وہ ضرور پورا کیا جائے گا۔ لیکن آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آپ کے میدانِ جنگ میں آنے سے پہلے ہم ایک مدت تک تنہا دشمن کے ساتھ لڑ چکے ہیں۔ اب ہمیں دوبارہ میدان میں آنے سے پہلے تیاری کی ضرورت ہے۔"

ہلکر نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ "اور تمھاری تیاری اس وقت مکمل ہو گی جب ہماری رگوں سے خون کا آخری قطرہ بہہ چکا ہو گا۔ پھر تم صرف سلطان ٹیپو سے ہی نہیں بلکہ پونا اور حیدر آباد کی حکومتوں سے بھی اپنی شرائط منوا سکو گے۔ مسٹر میلٹ کئی بار ہمیں یہ تسلی دے چکے ہیں کہ لارڈ کارنوالس ایک مضبوط آدمی ہیں اور وہ گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالتے ہی میسور کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیں گے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہمیں کب تک لارڈ کارنوالس کی تیاریوں کا انتظار کرنا پڑے گا؟"

مسٹر یون نے کہا۔ "یور ہائینس! آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ لارڈ کارنوالس ایک مضبوط آدمی ہیں اور وہ سلطان ٹیپو سے نپٹنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ لیکن انگلینڈ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو صلحنامہ منگلور کی خلاف ورزی کر کے سلطان ٹیپو سے جنگ چھیڑنے کے مخالف ہیں۔ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے لارڈ کارنوالس ایسے حالات پیدا کرنے کی فکر میں ہیں کہ میسور کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جنگ ناگزیر ہو جائے۔"

ہلکر نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں صرف معاہدہ منگلور جنگ سے روکے ہوئے ہے اور لارڈ کارنوالس یہ معاہدہ توڑنے کے لیے کسی معقول بہانے کی تلاش میں ہیں۔"

مسٹر یون نے جواب دیا۔ "یور ہائینس بہانہ تلاش کرنا اتنا مشکل نہیں لیکن میں آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ ہمیں جنگ کی تیاری کے لیے وقت کی ضرورت ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک لارڈ کارنوالس جنگ کے لیے تیار نہیں ہوتے وہ

سلطان ٹیپو کو اپنی دوستی کا یقین دلاتے رہیں گے اور جب ان کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو وہ کسی نہ کسی بہانے میسور پر چڑھائی کر دیں گے۔ لیکن ہم یہ کیوں نہ سمجھیں کہ جو قوم آج سلطان ٹیپو کو دھوکا دے سکتی ہے وہ کل ہمیں بھی دھوکا دے گی اور جن بہانوں کا سہارا لے کر تم ٹیپو کے ساتھ صلح کے معاہدوں کی خلاف ورزی کرو گے وہ کسی دن ہمارے خلاف بھی تلاش کیے جائیں گے۔"

محفل پر ایک سکوت چھا گیا اور ہلکر نے قدرے توقف کے بعد اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا: "بھائیو! میری بات غور سے سنو! لارڈ کارنوالس ٹیپو کا دشمن ہے نہ ہمارا دوست۔ وہ امریکہ میں انگریزوں کی ایک بہت بڑی سلطنت کھو بیٹھنے کے بعد یہاں آیا ہے اور انگریزوں نے اسے یہاں اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ میسور کی سلطنت فتح کر کے ہمارے گلے ڈال دے۔ بلکہ اسے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ انگریزوں نے جو نقصانات امریکہ میں اٹھائے ہیں وہ ہندوستان سے پورے کیے جائیں اور صرف میسور کی سلطنت یہ نقصانات پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہو گی۔ آج اگر میسور کی باری ہے تو کل ہماری باری آئے گی۔

سلطان ٹیپو کے ساتھ انگریزوں کی دشمنی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسے اپنے راستے میں ایک بہت بڑی دیوار سمجھتے ہیں اور ہمیں ان کا راستہ صاف کرنے کے لیے اس دیوار کو گرانے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔ اس دنیا میں اگر کسی کو ایک شریف دوست نہ مل سکے تو اسے یہ تمنا کرنی چاہیے کہ اس کا دشمن شریف ہو۔ اور سلطان ٹیپو ایک شریف دشمن ہے۔ اس کی شرافت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہماری قوم کی جو بیٹیاں اس کی قید میں تھیں وہ اسے اپنا بھائی اور باپ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہیں اور جب انگریزوں نے میسور پر حملہ کیا تھا تو انھوں نے اننت پور کی فتح کی خوشی میں سینکڑوں بے بس عورتوں اور قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔"

ہری پنت نے کہا: "آپ کے خیالات میں یہ تبدیلی صرف اس لیے آئی ہے کہ ٹیپو نے

ہماری عورتوں کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا ہے لیکن آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ صرف اس کی ایک سیاسی چال تھی۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اگر ان عورتوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی گئی تو تمام مرہٹہ ریاستوں میں آگ لگ جائے گی اور ہم اس توہین کا بدلہ لینے کے لیے سرنگاپٹم پہنچنے کی ہمت رکھتے ہیں۔"

ایک نوجوان لڑکی خیمے میں داخل ہوئی اور اس نے بلند آواز میں کہا: "جو بہادر سرنگاپٹم پہنچنے کی ہمت رکھتے ہیں انھیں خطرے کے وقت اپنی بیویوں اور بہنوں کو چھوڑ کر بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔"

مجلس پر ایک سناٹا چھا گیا۔ چند اور عورتیں خیمے کے اندر داخل ہوئیں۔ نوجوان لڑکی نے آگے بڑھ کر ایک مرہٹہ سردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "میرا پتی یہاں موجود ہے اور میں اس سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں نے کیا پاپ کیا ہے؟ کیا میرا قصور یہ تھا کہ میں ایک عورت تھی اور بھاگتے وقت اس سے پیچھے رہ گئی تھی۔ میں اور میری بہنیں یہ سمجھتی تھیں کہ ہمارے پتی دشمن کے ساتھ لڑتے ہوئے مارے گئے ہیں اور ہم ننگے سر اُن کا ماتم کر رہی تھیں۔ سلطان ٹیپو ہمارا دشمن تھا لیکن اس نے ہمیں اپنے سر ڈھانپنے کے لیے چادریں دیں۔ ہم اس کی قید میں تھیں لیکن میسور کے کسی سپاہی کی مجال نہ تھی کہ وہ آنکھ اٹھا کر ہماری طرف دیکھ سکے۔ سلطان نے ہمیں عزت سے یہاں بھیجا۔ لیکن یہاں پہنچ کر ہم اپنے متعلق ایسی باتیں سن رہی ہیں جو ایک شریف آدمی کسی بازاری عورت کے متعلق بھی نہیں کر سکتا۔ میں پوچھتی ہوں کہ تمھاری غیرت اس وقت کہاں گئی تھی جب تم ہمیں دشمن کے قبضے میں چھوڑ کر بھاگ آئے تھے؟"

راجہ بھونسلے نے نوجوان لڑکی کے الفاظ سے متاثر ہو کر کہا: "بہنو! تمھیں یہاں آنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر کسی نے تمھارے متعلق کوئی بری بات کہی ہے تو اس نے بڑا پاپ کیا ہے اور میں اس لشکر کے ہر سپاہی کی طرف سے معافی مانگتا ہوں۔"

ایک ادھیڑ عمر عورت نے کہا: "مہاراج ہم اس وقت تک یہاں سے نہیں ہلیں گی جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے متعلق ہمارے خاوندوں نے کیا فیصلہ کیا ہے!"

"آپ اپنے آدمیوں کے خیموں میں چلی جائیں۔ اگر کسی کا پتی اعتراض کرے گا تو ہم اس سے نپٹ لیں گے۔ ہماری نظر میں تم سب دیویاں ہو۔" بھونسلے یہ کہہ کر آگے بڑھا اور ایک سردار کو ہاتھ سے پکڑ کر بولا: "تم کیا سوچ رہے ہو؟ اٹھو اپنی بیوی کو ساتھ لے جاؤ۔ ہم جنگ کے متعلق کل سوچیں گے۔"

بھونسلے کی تقلید میں باقی سردار اور راجے دوسری عورتوں کے خاوندوں کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا رہے تھے۔ اعتراض کرنے والوں کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد تمام عورتیں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ان کے خیموں میں جا چکی تھیں۔

نواں باب

پونا اور حیدرآباد کی افواج ابھی جوابی حملے کی تیاریاں کر رہی تھیں کہ سلطان نے دریائے تنگبھدرہ کے آس پاس چند چوکیوں اور قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد بہادر بندہ کا محاصرہ کر لیا۔ اپنے محل وقوع اور دفاعی استحکامات کے لحاظ سے بہادر بندہ کا قلعہ مرہٹوں کا عظیم ترین مستقر تھا اور سلطان نے اس قلعے پر اس وقت حملہ کیا تھا جب کہ اتحادیوں کی ایک لاکھ سے زیادہ فوج صرف چند میل دور پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ ۸ جنوری ۱۷۸۷ء کی صبح میسور کی فوج نے ایک شدید حملے کے بعد اس قلعے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، لیکن دشمن کی شدید مزاحمت کے باعث اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔

چند گھنٹے بعد سلطان کا لشکر دوسرے حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ اتحادی لشکر کے پڑاؤ سے ایک ایلچی سفید جھنڈا اٹھائے نمودار ہوا اور اس نے سلطان کے ساتھ صلح کی بات شروع کر دی۔ سلطان نے فوراً جنگ بند کرنے کا حکم دیا۔ لیکن چار دن تک اتحادیوں کے ساتھ صلح کی شرائط طے نہ ہو سکیں اور سلطان کو یہ اندازہ ہوا کہ صلح کی گفتگو شروع کرنے سے دشمن کا اصل مقصد صرف مزید تیاری کے لیے وقت حاصل کرنا ہے، چنانچہ ۱۲ جنوری کی صبح میسور کے لشکر نے بہادر بندہ کے قلعہ پر دوبارہ گولہ باری شروع کر دی۔ قلعے کا مرہٹہ کمانڈنٹ مارا

گیا اور سپاہیوں نے بیرونی اعانت سے مایوس ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔

بہادر بندہ کا قلعہ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اتحادی کیمپ میں بددلی پھیل چکی تھی۔ ایک راجہ دوسرے راجہ اور ایک سردار دوسرے سردار کو کوس رہا تھا۔ نظام کے سپاہی مرہٹوں کو اور مرہٹہ سپاہی نظام کے لشکر کو پل پل بے حیائی اور بزدلی کے طعنے دے رہے تھے۔ حیدر آباد اور پونا کے درباروں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے وکیل اتحادی لشکر کے پڑاؤ میں پہنچ چکے تھے اور انھیں یہ سمجھا رہے تھے کہ ابھی تمھارا کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اگر اب بھی تم آپس کے اختلافات دور کر کے متحد اور منظم ہو جاؤ تو جنگ کا پانسہ پلٹ سکتا ہے۔ میسور کی فوج اپنے محدود وسائل کے ساتھ چند ہفتوں یا چند مہینوں سے زیادہ تمھارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر تم کچھ عرصہ اور ہمت سے کام لو تو ایسٹ انڈیا کمپنی میدان میں آ جائے گی۔ لیکن فوج کے کیمپ میں ہلکر کی طرح کئی اور سردار بھی اب کھلے بندوں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر رہے تھے کہ انگریز ہمارے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم میسور کو ادھ مؤا کر کے ان کے آگے ڈال دیں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر اس جنگ نے طول کھینچا تو ہماری اپنی حالت میسور سے مختلف نہیں ہو گی۔ پھر انگریز کو اس بات کی پوری آزادی ہو گی کہ وہ ہمارا حلیف بن کر میسور کی سلطنت کا ایک بڑا حصہ چھین لے یا ٹیپو کا حلیف بن کر ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کر دے۔

سلطان ٹیپو کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ اگر جنگ کی طوالت کے باعث انگریز [illegible] کر تیاری کا موقع مل گیا تو اسے دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔ نظام اور پیشوا کو صلح پر آمادہ کرنے کی اب یہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ جنگ کو کسی تاخیر کے بغیر ختم کر دیا جائے۔ مرہٹہ کیمپ کے حالات اس سے پوشیدہ نہ تھے۔ اس کے جاسوس اسے پل پل کی خبریں دے رہے تھے۔ چنانچہ اس نے کسی توقف کے بغیر اتحادیوں کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ جس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا اسی قدر شدید تھا۔ ہلکر کے سوا جس نے جنگ شروع ہوتے ہی اپنے سپاہیوں کو میدان سے نکال لیا تھا باقی مرہٹہ افواج سخت تباہی کا سامنا کر رہی تھیں۔

چند گھنٹوں کے اندر اندر میدان صاف ہو چکا تھا اور سلطان کے طوفانی دستے بھاگتے ہوئے دشمن کا تعاقب کر رہے تھے۔ نظام کا لشکر جو اب تک صرف تماشائیوں کی حیثیت میں اپنے حلیفوں کی کارگزاری دیکھنے کا عادی تھا پہلی بار شیرِ میسور کی قوت کا صحیح اندازہ کر رہا تھا تو جنگ میدان سے بھاگنے میں سبقت کرنے کے باوجود یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا یومِ حساب شروع ہو چکا ہے اور میسور کی فوج جو اب تک اس کے ساتھ رعایت برتتی آئی تھی اب نظام کے تمام سابقہ گناہوں کا حساب چکانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ میسور کی افواج نے شام تک اس کا تعاقب جاری رکھا۔ اور رات کی تاریکی میں جب وہ میدانِ جنگ سے کوسوں دور اپنے بقیۃ السیف ساتھیوں کے درمیان کھڑا اپنے نقصانات کا جائزہ لے رہا تھا تو اسے یہ معلوم ہوا کہ توپوں کے علاوہ اس کے اسلحہ، بارود اور رسد کی بیشتر گاڑیاں دشمن کے قبضے میں جا چکی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب ایک جنگل میں بھونسلے اور ہری پنت کے ساتھ اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے انتہائی شکایت کے لہجے میں کہا "مجھے معلوم نہیں کہ مستقبل کے متعلق آپ کے کیا ارادے ہیں لیکن جہاں تک حیدر آباد کا تعلق ہے میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے لیے یہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔"

جسونت راؤ نے کہا "میرے دوست! ہلکر آپ سے زیادہ ہوشیار تھا وہ یہ بات کئی ہفتے پہلے سمجھ گیا تھا جو تم آج سمجھے ہو۔ اور ہم شاید چند دن یا چند ہفتے بعد سمجھ جائیں۔"

ہری پنت نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا "ہم اس حملے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگر ہلکر دشمن کے راستے سے اپنی فوج نہ ہٹاتا تو ہمیں اس صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اب دشمن جس قدر آگے بڑھے گا اسی قدر اس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ہم قدم قدم پر اس کا مقابلہ کریں گے۔"

اس فتح کے بعد سلطان نے تنگبھدرا اور کرشنا کے درمیان کسی جگہ دشمن کو دم لینے کا موقع نہ دیا۔ تہور جنگ ہر محاذ پر کوسوں دُور رہنا پسند کرتا تھا اور مرہٹہ سپاہی کسی ایک جگہ جمع ہونے کی بجائے منتشر ہو کر بھیڑوں کی طرح میسور کی فوج کے آگے بھاگ رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ لارڈ کارنوالس کو یہ پیغام بھیج رہے تھے کہ اب ہمارے دوست ہمت ہار چکے ہیں۔ پونا اور حیدر آباد کے درباروں میں ہری پنت اور تہور جنگ کے ایلچی یہ کہہ رہے تھے کہ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔ اب اگر سلطان کے ساتھ باعزت شرائط پر صلح ہو سکے تو ہمیں اسے بھی اپنی فتح سمجھنا چاہیے۔

اور شیرِ میسور اپنے کچھار سے بہت دُور آچکا تھا۔ حیدر آباد اور پونا کی طرف یلغار کے لیے اس کا راستہ کھلا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو نظام اور پیشوا کی قوت ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتا تھا لیکن جب انھوں نے صلح کے لیے ہاتھ بڑھائے تو سلطان نے کسی حُجت کے بغیر تلوار نیام میں ڈال لی ــــــ اس لیے نہیں کہ اب اسے ان کی طرف سے کسی شدید مزاحمت کی توقع نہ تھی۔ اس لیے بھی نہیں کہ وہ مستقبل میں ان کی صلح جوئی اور امن پسندی پر اعتماد کر سکتا تھا ــــــ بلکہ صرف اس لیے کہ اس کے نزدیک میسور کے اصل دشمن انگریز تھے اور وہ جنگ کو طول دے کر ایسے حالات پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے جارحانہ ارادوں کے لیے سازگار ہو سکتے تھے۔

یہ صلح ایک مجبوری تھی ــــــ ایک ایسے انسان کی مجبوری جسے گیدڑوں اور گدھوں کا پیچھا کرتے وقت اپنے عقب سے بھیڑیوں کے حملے کا خطرہ ہو۔ کئی برس قبل سلطان ٹیپو کے باپ نے اس وقت تلوار نیام میں ڈال لی تھی جب کہ اس کی افواج مدراس کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا عقب نظام اور مرہٹہ حکمرانوں کی سازشوں کے باعث غیر محفوظ تھا۔ پھر سلطان ٹیپو کی زندگی میں بھی ایک مرحلہ ایسا آیا تھا جب انگریز یہ محسوس کرتے تھے کہ اب جنوبی ہندوستان کا کوئی گوشہ ان کے لیے محفوظ نہیں

لیکن پیچھے سے نظام اور مرہٹوں کے حملے کے خدشہ نے اسے بھی انگریزوں کے ساتھ مصالحت پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اب جب کہ نظام کی ملت فروشی اور مرہٹوں کی وطن دشمنی کا حساب چکانے کا وقت آیا تھا تو اس کے لیے انگریز ایک بڑا خطرہ بن چکے تھے۔

جنگ کے بعد سلطان نے مصالحت کی خاطر جس وسیع القلبی کا ثبوت دیا وہ مرہٹوں کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ چنانچہ تنگبھدرا اور کرشنا کے درمیان بادامی، نرگنڈ اور کتھور کے علاقے مرہٹوں کو واپس کر دیے اور مرہٹے اس کے بدلے سلطان کے ساتھ ایک دفاعی اور جارحانہ معاہدہ کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اور نظام کی دوستی حاصل کرنے کے لیے سلطان نے ادھونی کا مفتوحہ علاقہ مہابت جنگ کو واپس کر دیا۔

○

فرحت عصر کی نماز کے بعد ایک کمرے میں قرآن کی تلاوت کر رہی تھی اور معین باہر صحن میں ایک درخت کے نیچے مونڈھے پر بیٹھی ہُوئی تھی۔ اچانک مکان کے بیرونی حصے میں گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ چند دن قبل سرنگاپٹم میں یہ خبر مشہور ہو چکی تھی کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ لیکن قریباً ایک مہینہ سے فرحت کے بیٹوں اور لیگرانڈ کی طرف سے کوئی خبر نہ آنے کے باعث وہ سخت مضطرب تھی۔ وہ ابھی دروازے سے چند قدم دور تھی کہ نوکر بھاگتا ہُوا صحن میں داخل ہُوا اور اس نے کہا: "میم صاحب وہ آگئے ہیں!"

معین جلدی سے آگے بڑھی اور دروازے سے باہر جھانکنے لگی۔

ڈیوڑھی کے قریب لیگرانڈ اپنا گھوڑا ایک نوکر کے سپرد کر رہا تھا۔ اور وہ چند ثانیے آگے بڑھنے یا پیچھے مُڑنے کا فیصلہ نہ کر سکی۔ پھر جب لیگرانڈ دیوان خانے کا رُخ کر رہا تھا تو وہ اچانک باہر نکل آئی۔ اب اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ وہ چلنے کی بجائے بھاگ رہی ہے۔ لیگرانڈ دیوان خانے کے اندر داخل ہوتے ہی اپنے پیچھے کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر مُڑا اور

اس نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ لیکن جین اس کی توقع کے خلاف دروازے میں رُک گئی۔

لیگرانڈ نے دل برداشتہ ہوکر کہا: "جین میں آگیا ہوں۔ مجھے فوج میں ترقی مل گئی ہے کیا بات ہے جین تم اس قدر بدحواس کیوں ہو؟ تم مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوئیں؟"

جین نے کرب انگیز لہجے میں کہا: "آپ اکیلے آئے وہ کیوں نہیں آئے؟"

"کون، انور اور مُراد؟ اُف مجھے معلوم نہ تھا کہ مجھے تنہا دیکھ کر تم اس قدر گھبرا جاؤ گی۔ وہ ایک ہفتہ تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ مجھے موسیو لالی نے جنگ ختم ہوتے ہی چھٹی دے دی تھی۔ تمھیں انور اور مُراد کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بیٹھ جاؤ میں تمھارے ساتھ سینکڑوں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

جین نے کہا: "میں ان کی والدہ کو تسلی دے آؤں۔ وہ بہت پریشان ہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

جین وہاں سے چل پڑی اور لیگرانڈ قدرے افسردہ سا ہوکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد جین دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

لیگرانڈ نے اپنی جیب سے ایک تھیلی نکال کر اسے پیش کرتے ہوئے کہا: "یہ لو جین فتح کی خوشی میں دو ماہ کی زائد تنخواہ ملی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے تین مہینے کی چھٹی ملی ہے۔ انور علی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آتے ہی ہمارے لیے علیحدہ مکان کا بندوبست کر دے گا۔"

جین نے کہا: "نہیں اسے اپنے پاس رکھیے۔ میرے پاس آپ کا بھیجا ہوا تمام روپیہ محفوظ پڑا ہے۔ انور علی کی والدہ اس بات پر خفا ہوئی تھیں کہ آپ اپنی پوری تنخواہ مجھے کیوں بھیج دیتے ہیں۔"

لیگرانڈ نے دل برداشتہ ہوکر کہا: "جین مجھے یہ احساس نہ دلاؤ کہ میں ایک غریب آدمی ہوں اور تمھیں کچھ نہیں دے سکتا۔"

جین نے معذرت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ سے تھیلی لیتے ہوئے کہا: "میرا مقصد تمھیں آزردہ کرنا نہ تھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی تھی کہ تم کو میری خاطر اتنی تنگی برداشت نہیں کرنی چاہیے۔ انور کی والدہ مجھے اپنے روپے سے ایک کوڑی بھی خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔"

لیگرانڈ نے کہا: "جین اگر پیرس میں مجھے کوئی یہ بتاتا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک اجنبی کو اپنی روٹی کے ہر نوالے میں حصہ دار بنا لیتے ہیں تو مجھے یقین نہ آتا۔ لیکن میں اب پر مزید بوجھ ڈالنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ہمیں بہت جلد ان سے اجازت لینی پڑے گی۔ اگر تمھارے لیے میری درخواست کوئی معنی رکھتی ہے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں انور اور مراد کے یہاں پہنچتے ہی شادی کر لینی چاہیے۔ میں ہر لڑائی سے پہلے یہ سوچا کرتا تھا کہ شاید میں تمھیں دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔ مجھے اپنی کم مائگی کا احساس ہے لیکن اس کے باوجود میں اس فریب میں مبتلا رہنے کی کوشش کرتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ہیں۔"

جین نے گردن جھکاتے ہوئے جواب دیا: "لیگرانڈ میں ناشکرگزار نہیں ہوں اور مجھے اپنے مستقبل کے متعلق تمھارا کوئی فیصلہ ناقابلِ قبول نہیں ہوگا۔"

اور لیگرانڈ کی حالت اس بچے کی سی تھی جس کے سامنے کھلونوں کے ڈھیر لگا دیے گئے ہوں۔

○

بیس دن بعد موسیو لالی کی قیام گاہ کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں، جو گزشتہ چند برس سے سلطان کی فوج کے یورپین اور دوسرے عیسائی سپاہیوں کے لیے گرجے کا کام دیتا تھا، لیگرانڈ اور جین کی شادی کی رسومات ادا ہو رہی تھیں۔ یورپین افسروں کے علاوہ انور، مُراد اور ان کے چند دوست اس موقع پر موجود تھے۔ نکاح کی رسم ایک فرانسیسی پادری نے ادا کی۔

جب دولہا اور دلھن مکان سے باہر نکل رہے تھے تو موسیو لالی نے لیگرانڈ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "لیگرانڈ تم بہت خوش قسمت ہو لیکن ایسی دلھن کے لیے تمھارا کرہ موزوں نہیں۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمھارے ہنی مون کے لیے اپنے مکان کا ایک حصہ خالی کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

لیگرانڈ نے جواب دیا۔ "شکریہ! لیکن انور علی نے ہمارے لیے ایک علیحدہ مکان کا بندوبست کر دیا ہے۔ اور اب ہم سیدھے وہاں جا رہے ہیں۔"

مکان کے باہر آٹھ کہار ایک کشادہ پالکی کے گرد کھڑے تھے۔ جین پالکی میں بیٹھ گئی۔

انور علی نے لیگرانڈ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ بھی تشریف رکھیں یہ پالکی آپ دونوں کے لیے ہے۔"

لیگرانڈ پیدل چلنا چاہتا تھا لیکن انور علی اور دوسرے دوستوں کے اصرار پر جین کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کہاروں نے پالکی اٹھائی اور انور اور مراد اُن کے ساتھ چل دیے۔ شہر کے کشادہ بازاروں میں کوئی آدھ میل فاصلہ طے کرنے کے بعد کہار ایک تنگ گلی کے سامنے رُکے اور انھوں نے پالکی نیچے رکھ دی۔

انور علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "یہ گلی بہت تنگ ہے۔ اب آپ کو چند قدم پیدل چلنا پڑے گا، مجھے افسوس ہے کہ میں کوشش کے باوجود آپ کے لیے کسی کشادہ سڑک پر مکان کا بندوبست نہیں کر سکا۔"

لیگرانڈ اور جین پالکی سے اُتر کر ان کے ساتھ چل دیے۔ جین دلھن کے سفید لباس میں ایک پری معلوم ہو رہی تھی۔ اور گلی سے گزرنے والے لوگ حیران ہو ہو کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

انور علی نے ایک موڑ کے قریب رُک کر بائیں ہاتھ سے ایک مکان کے کشادہ دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کا گھر ہے؟"

لیگرانڈ نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ "یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہوگی لیکن ہم اسے شادی کی رسم کا ایک اہم حصہ سمجھتے ہیں۔" پھر اس نے کسی توقف کے بغیر اچانک آگے جھک کر جین کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور مکان کے اندر داخل ہوا۔

جین نے کہا۔ "خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو اس ملک کے لوگ ایسی حرکات پسند نہیں کرتے۔"

صحن میں انور علی کا ایک نوکر موجود تھا اور اس کی بدحواسی اور پریشانی قابلِ دید تھی۔

جین نے کہا۔ "خدا کے لیے مجھے اتار دو۔ یہ لوگ ہمارا مذاق اُڑائیں گے۔"

"معاف کیجیے گا۔" پریشان حال نوکر یہ کہہ کر ایک کمرے کی طرف بھاگا اور پیچھے سے انور علی اور مراد کے قہقہے جین کو انتہائی ناخوشگوار محسوس ہوئے لیگرانڈ اب بھی اسے نیچے اتارنے پر آمادہ نہ تھا لیکن وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی۔

انور علی نے کہا۔ "جین تمھیں ہماری وجہ سے بدشگونی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں اب تک تم لوگوں کی تمام رسومات سے واقف ہو چکا ہوں۔"

لیگرانڈ نے خوب صورت دو منزلہ مکان کا سرسری جائزہ لینے کے بعد انور علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "یہ مکان ہماری ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کا کرایہ کہیں میری تنخواہ سے زیادہ نہ ہو۔ اگر آپ نے مجھے پہلے دکھا دیا ہوتا تو میں آپ کو یہ مکان لینے کا مشورہ نہ دیتا۔"

"یہ مکان خرید لیا گیا ہے اور آج سے آپ اس کے مالک ہیں۔ یہ ابّا جان کی طرف سے جین کو شادی کا تحفہ ہے۔"

لیگرانڈ نے کہا۔ "نہیں نہیں، یہ ایک زیادتی ہے۔ آپ ہماری گردن پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں۔"

انور علی نے کہا۔ "میرے دوست آپ کو اس بات پر ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے صرف آپ کی ضرورت کا احساس کیا ہے اور ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ ہم آپ کے لیے اس سے بہتر مکان حاصل نہیں کر سکے۔"

"انور علی میں ناراض نہیں ہوں۔" لیگرانڈ نے کہا۔ "لیکن یہ بہت زیادتی ہے۔"

انور علی نے جین کی طرف دیکھا اور کہا "جین یہ امّی جان کی خواہش تھی اور مجھے اُمید ہے کہ تم ان کی خواہش کا احترام کرو گی۔"

جین نے آبدیدہ ہو کر کہا "میں انھیں اپنی ماں سمجھتی ہوں۔ میں شکریے کے ساتھ ان کا یہ تحفہ قبول کرتی ہوں۔ میرے لیے اس مکان کی اینٹیں سونے سے زیادہ قیمتی ہیں۔"

انور علی نے کہا "اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ ہمیں اجازت دیجیے۔ سردار خاں اب آپ کی خدمت میں رہے گا۔ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف ہمارے ہاں پیغام بھیج دیجیے۔"

پھر اس نے بلند آواز میں کہا "سردار خاں! تم اندر کیا کر رہے ہو۔ باہر آؤ۔"

سردار خاں ہانپتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

انور علی نے کہا "تم گھر سے ان کا سارا سامان لے آئے ہو؟"

"جی ہاں۔ ان کے صندوق میں نے اوپر رکھوا دیے ہیں۔ ایک صندوق کی چابی میرے پاس ہے" یہ کہتے ہوئے سردار خاں نے اپنی جیب سے ایک چابی نکالی اور جین کو پیش کر دی۔

جین نے پریشان ہو کر کہا "میری چابی میرے پاس ہے۔"

سردار خاں نے کہا "جی یہ چابی مجھے بی بی جی نے دی تھی، وہ کہتی تھیں کہ یہ صندوق کی ہے۔"

جین نے اس کے ہاتھ سے چابی لے لی۔

انور علی نے سردار خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "آج سے ان کی خدمت تمھارے ذمے ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے آپ کو ایک اچھا نوکر ثابت کرو گے۔"

"جناب مجھ سے آئندہ کوئی غلطی نہیں ہو گی۔" سردار خاں نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔

مراد علی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ اس نے پوچھا "ذرا اس سے پہلے تم نے کیا غلطی کی ہے؟"

"کچھ نہیں جناب!" سردار خاں نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

انور اور مراد کو رخصت کرنے کے بعد جین اور لیگرانڈ مکان کے کمروں کا معائنہ کرنے

تھے۔ نچلی منزل کے پانچ کمرے ضروری ساز و سامان سے آراستہ تھے۔ بالائی منزل کے دونوں کمروں میں خوب صورت قالین اور پلنگ بچھے ہوئے تھے۔

ایک کمرہ دیکھنے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو جین نے ایک لکڑی کے صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ صندوق میرا نہیں۔ میرے خیال میں نوکر غلطی سے اٹھا لائے ہیں۔"

لیگرانڈ نے کہا "اتنا بڑا صندوق غلطی سے یہاں نہیں آ سکتا۔ میرے خیال میں اسی صندوق کی چابی تمھیں دی گئی ہے۔"

جین نے آگے بڑھ کر صندوق کا تالا کھولا اور لیگرانڈ نے اس کا بھاری ڈھکنا اوپر اٹھا دیا۔

صندوق ریشمی کپڑوں سے بھرا ہوا تھا۔

لیگرانڈ نے ایک جوڑا نکال کر پلنگ پر پھیلاتے ہوئے کہا "جین دیکھو یہ تو کسی فرانسیسی درزی کے ہاتھ کا سلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

جین نے جواب دیا "ان کے درزی کو میرے کپڑوں کا ناپ معلوم تھا لیکن مجھے ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کپڑے کس وقت تیار ہو کر آئے۔ اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ہمارے مکان کے لیے اتنے ساز و سامان کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی نوکر نے بھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ میرے لیے اتنے تحائف جمع کیے جا رہے ہیں۔ لیگرانڈ خدا کے لیے صندوق بند کر دو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اتنے بڑے احسان کی مستحق نہ تھی۔ کاش میں ان کی بیٹی ہوتی۔" جین کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا۔

لیگرانڈ نے پریشان ہو کر کہا "جین مجھے یقین ہے کہ انور اور مراد تمھیں اپنی بہن اور ان کی والدہ تمھیں اپنی بیٹی سے کم نہیں سمجھتیں۔"

"لیکن میرے لیے یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ کاش میرے ساتھ یہ لوگ وہی برتاؤ کرتے جو ایک اجنبی دوسرے اجنبی کے ساتھ کرتا ہے۔"

دسواں باب

نظام اور مرہٹوں کی متحدہ طاقت کے خلاف سلطان ٹیپو کی فتح کوئی معمولی کارنامہ نہ تھی۔ انگریزوں کی طرح پانڈی چری کی فرانسیسی حکومت کو بھی اس بات کی قطعاً امید نہ تھی کہ سلطان اس جنگ سے سرخرو ہو کر نکلے گا۔ سلطان کو اس جنگ میں فرانس سے عملی اعانت کی توقع تھی لیکن فرانسیسی نوآبادیات کی حکومت نے انگریزوں کے ساتھ معاہدہ وارسیلز کی آڑ لے کر اس جنگ میں ایک فریق بننے سے انکار کر دیا تھا۔

معاہدہ وارسیلز کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ انگریز اور فرانسیسی ہندوستان کے حکمرانوں کی جنگوں میں الگ تھلگ رہیں گے۔ لیکن فرانسیسیوں کی پہلو تہی کی اصل وجہ صرف یہ معاہدہ نہ تھا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ نظام اور مرہٹوں نے انگریزوں کی شہ پر جنگ شروع کی ہے اور جب وہ اس جنگ میں حصہ لینا اپنے لیے سود مند خیال کریں گے تو معاہدہ وارسیلز کی حیثیت اُن کے لیے کاغذ کے ایک پُرزے سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان کی پہلو تہی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سلطان ٹیپو کو اس جنگ میں ایک کمزور فریق سمجھتے تھے۔ اور انھیں اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ سلطان زیادہ دیر نظام اور مرہٹوں کی متحدہ طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اور اگر انگریز بھی میدان میں آگئے پھر تو وہ سلطان کے حلیف بن کر اپنے لیے کبھی کوئی اچھا نتیجہ پیدا نہیں کر سکیں

گے۔ چنانچہ پانڈی چری کے فرانسیسی گورنر موسیو کاسگنی کی پہلی کوشش یہ تھی کہ پُونا اور حیدرآباد کی حکومتوں کو سلطان کے خلاف جنگ شروع کرنے سے باز رکھا جائے اور جب یہ کوشش بار آور نہ ہوئی تو اس کی دوسری کوشش یہ تھی کہ فرانس سلطان ٹیپو کی بجائے مرہٹوں کے ساتھ اتحاد کرے کیونکہ مرہٹوں کو سُلطان کی نسبت وہ زیادہ طاقت وَر خیال کرتے تھے۔ اور انھیں ایک کمزور دوست کی حمایت کے لیے ایک طاقت وَر دشمن سے ٹکر لینا منظور نہ تھا۔

چنانچہ پانڈی چری کی حکومت کا ایک خاص نمائندہ مرہٹوں کے ساتھ دوستی کا پیغام لے کر جنگ کے آغاز سے چند ماہ بعد پیشوا کے پاس پہنچا لیکن پونا کے دربار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ سر چارلس میلٹ کے اثر و رسوخ کے باعث اُسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ فرانسیسیوں کی اس ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نانا فرنویس ان کی دوستی کی بجائے انگریزوں کی دوستی پر زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اور اسے اس بات کا یقین تھا کہ انگریز زود یا بدیر جنگ میں ضرور شامل ہو جائیں گے۔

پانڈی چری کی حکومت کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے جنگ کے دوران میں صرف اُن فرانسیسی اور دوسرے یورپین سپاہیوں نے سلطان کا ساتھ دیا تھا جو میسور کی فوج کی باقاعدہ ملازمت اختیار کر چکے تھے۔

مرہٹوں اور نظام کے خلاف ایک شاندار فتح حاصل کرنے کے باوجود سلطان ٹیپو میسور کے مستقبل کے متعلق مطمئن نہ تھا۔ ایک خطرناک آندھی گزر چکی تھی لیکن وہ ایک حقیقت پسند انسان کی طرح مستقبل کے اُفق پر نئی آندھی کے آثار دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میر نظام علی اور نانا فرنویس کی نکیل انگریز کے ہاتھ میں ہے اور وہ جب چاہیں گے انھیں دوبارہ میسور کے خلاف میدان میں لے آئیں گے۔ اور وہ یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ میسور تنہا اپنے وسائل سے ایک لامتناہی مدت کے لیے جنگ جاری نہیں رکھ سکتا اور انگریز مرہٹوں یا نظام کی طرح اسے بھی ایک ایسے طاقت ور حلیف کی ضرورت ہے جس کی دوستی پر اعتماد کیا جا سکے۔ انگریز نے

جنوبی ہند کے دفاعی حصار کا مرکزی ستون سمجھ کر اپنا دشمن نمبر ایک قرار دے چکے تھے۔ فرانسیسیوں کے متعلق بھی اسے کوئی غلط فہمی نہ تھی تاہم ہندوستان میں فرانس اور برطانیہ کے مفاد ایک دوسرے سے متصادم تھے اور سلطان آئندہ معرکوں میں انگریز کے خلاف فرانسیسیوں کے تعاون کے امکانات سے مایوس نہ تھا۔ چنانچہ گزشتہ جنگ کے آخری ایّام میں ہی وہ فرانسیسی حکومت کے ساتھ براہِ راست بات چیت کرنے کے لیے ایک سفارت پیرس روانہ کر چکا تھا۔

جنگ سے فارغ ہونے کے بعد سلطان ٹیپو کے لیے تعمیری اور اصلاحی کام کرنے کا پُرامن دور بہت مختصر تھا جب وہ مرہٹوں اور نظام کے ساتھ برسرِپیکار تھا، انگریزوں نے مالابار کے نائروں اور موپلوں کو بغاوت پر اکسا کر اس کے لیے ایک نیا محاذ کھولنے کی کوشش کی تھی۔ ٹراونکور کا راجہ انگریزوں کا آلۂ کار بن کر اُن باغیوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا لیکن انگریزوں کی توقع کے خلاف جنگ کے قبل از وقت ختم ہو جانے کے باعث یہ سازش نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی اور میسور کی فوج کے چند دستوں نے کسی دقت کا سامنا کیے بغیر باغیوں کو مغلوب کر لیا۔ باغیوں کے کچھ رہنما گرفتار کر لیے گئے اور کچھ ٹراونکور بھاگ گئے۔

سلطان نے ٹراونکور کے راجہ کو باغیوں کو پناہ دینے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے سے منع کیا لیکن راجہ نے انگریزوں کی اعانت کے بھروسے پر میسور کے خلاف اپنی معاندانہ سرگرمیاں پہلے سے زیادہ تیز کر دیں۔ ٹراونکور کا راجہ انگریزوں کا حلیف تھا اور سلطان ٹیپو کے خلاف اس کی جارحیت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ایسے سازگار حالات پیدا کر دیے جائیں کہ وہ معاہدہ منگلور کی خلاف ورزی کر کے سلطان کے خلاف ایک نئی جنگ کی ابتدا کر سکے۔

○

گزشتہ چند برس کے واقعات سے یہ تلخ حقیقت بار بار ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ ہم

سلطان ٹیپو کی قوتِ مدافعت کا خاتمہ کیے بغیر ہندوستان میں پاؤں نہیں پھیلا سکتے۔ حیدر علی اور ٹیپو کے ہاتھوں ہماری بدترین شکستیں اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ میسور اس ملک کا سب سے مضبوط قلعہ ہے۔ اب نظام اور مرہٹوں کی متحدہ طاقت کو روندنے کے بعد ٹیپو کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس کے سفیر پیرس اور قسطنطنیہ پہنچ چکے ہیں۔ نظام اور مرہٹہ حکمرانوں کی سلطنتوں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو چکے ہیں جو ٹیپو کو ہندوستان کی آزادی کا محافظ خیال کرتے ہیں۔ امریکی نوآبادیات کھو بیٹھنے کے بعد ہم اس ملک کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر کے اپنے نقصانات پورے کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے لیے یہاں بھی ایک اور جارج واشنگٹن پیدا ہو جائے تو ہمیں سلطان ٹیپو کو زیادہ مہلت نہیں دینی چاہیے۔ اگر ہم اسے شکست نہ دے سکے تو ہندوستان میں ہم نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یہاں ہمارے لیے تاجروں کی حیثیت میں بھی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ ٹیپو ہر میدان میں ہمارا حریف ہے۔ وہ صنعت و حرفت اور تجارت کی اہمیت جانتا ہے۔ ہندوستان کی منڈیوں میں میسور کی مصنوعات کی مانگ بڑھ رہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر سلطان ٹیپو کو چند برس امن سے کام کرنے کا موقع مل گیا تو میسور صنعت اور تجارت میں ہم سے آگے نکل جائے گا۔ اس وقت بھی یہ حالت ہے کہ یہاں کی بعض مصنوعات مثلاً کپڑا اور شیشے کے برتن یورپ کے بہترین کارخانوں کی مصنوعات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اب تک ہندوستان میں ہماری کامیابیوں کی بڑی وجہ ہماری بحری قوت تھی لیکن سلطان ٹیپو پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کی اس کمزوری کا صحیح احساس کیا ہے۔ اس وقت میسور کی مختلف گودیوں میں ہزاروں آدمی تجارتی اور جنگی جہاز بنانے میں مصروف ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ سلطان ٹیپو کو ایک ناقابلِ تسخیر بحری قوت کا مالک بننے میں زیادہ عرصہ نہیں لگے گا۔ جہاز بنانے کے لیے جس لکڑی کی ضرورت ہے وہ میسور کے جنگلات میں بکثرت موجود ہے اور میسور کا محنت کش طبقہ سلطان کے حکم پر جان دیتا ہے۔ میسور کے عوام کی خوشحالی اور ترقی نے ہندوستان کی دوسری

ریاستوں کے حوام کو سلطان ٹیپو کی طرف متوجہ کر دیا ہے اور اگر ہم چند سال جنگ سے پہلو تہی کرتے رہے تو اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ ہمیں سلطان ٹیپو کے جھنڈے تلے نہ صرف میسور بلکہ پورے ہندوستان کی قوتِ مدافعت کا سامنا کرے گا۔

ہمیں میسور کے حکمران کو وہ خلا پُر کرنے کا موقع نہیں دینا چاہیے جو سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے باعث پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے لیے اس وقت دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ امریکہ کی طرح ہندوستان سے بھی اپنے پاؤں نکال لیں۔ اور دوسرا یہ کہ ہم کسی تاخیر کے بغیر میسور پر چڑھائی کر دیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم تنہا اپنی قوت سے سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم نظام اور مرہٹوں کو اس بات کا یقین دلا دیں کہ اس مرتبہ ہم پیچھے نہیں رہیں گے تو وہ ہمارا ساتھ دیں گے۔ کمپنی جنگ کے اخراجات سے ڈرتی ہے لیکن میں کمپنی کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ صرف کالی کٹ، کنانور اور منگلور کی بندرگاہوں کی قیمت ہمارے جنگ کے اخراجات سے زیادہ ہوگی اور صرف مالابار سے گرم مسالے اور صندل اور ساگوان کی لکڑی کی تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے ہمیں اتنا نفع ہوگا کہ ہم امریکہ میں اپنے سابقہ نقصانات بھول جائیں گے۔

نظام اور مرہٹوں کے ساتھ گزشتہ جنگ میں شدید نقصانات کے باعث سلطان کی طاقت کافی کمزور ہو چکی ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ لوگ ٹیپو کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن ہماری دوستی اور اعانت سے مایوس ہونے کے بعد وہ یقیناً سلطان ٹیپو کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کریں گے اور جب سلطان ٹیپو اُن کی طرف سے مطمئن ہو جائے گا تو ہمیں اس ملک سے نکالنے کے لیے اسے جنگ لڑنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس لیے ہمیں ہندوستان میں انگریزوں کے مستقبل سے آنکھیں بند کرنے کے لیے معاہدۂ وارسیلز کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔"

یہ وہ دلائل تھے جن کی بدولت لارڈ کارنوالس ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومتِ برطانیہ کو اپنا ہم خیال بنانے کے بعد جنگ کی تیاریوں کی اجازت حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ ۱۷۸۹ء کے اواخر میں پونا، ناگپور، گوالیار اور حیدرآباد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفیروں کو لارڈ کارنوالس کی طرف سے یہ ہدایات موصول ہو چکی تھیں کہ ہم جنگ کے لیے تیار ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ نظام اور مرہٹہ حکمرانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ دفاعی اور جارحانہ معاہدے کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

○

نانا فرنویس اور مادھوجی بھونسلے کو لارڈ کارنوالس نے اپنے ذاتی خطوط میں یہ لکھا تھا کہ اب اگر سلطان ٹیپو سے اپنی سابقہ شکستوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی آپ کے ساتھ یہ معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہے کہ وہ اپنے اتحادیوں سے بالا بالا ٹیپو کے ساتھ صلح کرنے کی کوشش نہیں کرے گی اور دریائے کرشنا اور تنگبھدرہ کے درمیان مرہٹوں کے جو علاقے میسور نے چھین لیے ہیں وہ انھیں واپس دلائے جائیں گے۔"

لارڈ کارنوالس نے دوسرے مرہٹہ راجوں کی طرح ہلکر کو بھی یہ پیغام بھیجا تھا کہ آپ اپنے ہندو دھرم کی لاج رکھنے کے لیے دوسرے مرہٹہ حکمرانوں کا ساتھ دیں اور پونا کی حکومت کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ معاہدہ کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیں۔ لیکن ہلکر کا جواب بہت حوصلہ شکن تھا۔ اس نے نہ صرف سلطان کے خلاف کمپنی کا حلیف بننے سے انکار کر دیا، بلکہ نظام اور مرہٹہ راجوں کو بھی ٹیپو کے خلاف محاذ بنانے سے روکنے کی کوشش کی اور اُن پر زور دیا کہ اگر انھیں ہندوستان کی آزادی عزیز ہے تو وہ انگریزوں کی بجائے سلطان ٹیپو کا ساتھ دیں اور جب پونا اور حیدرآباد کی حکومتوں پر اس کی نصیحت بے اثر ثابت ہوئی تو اس نے یہ دھمکی دی کہ میں تمھاری بجائے سلطان ٹیپو کا ساتھ دوں گا۔

انگریزوں کی طرح نانا فرنویس اور میر نظام علی خاں بھی سلطنتِ میسور کو اپنے اقتدار کے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھتے تھے لیکن گزشتہ جنگ میں انگریزوں کی علیحدگی کے باعث انھوں نے جو نقصانات اٹھائے تھے ان کے پیشِ نظر وہ دوبارہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وعدوں پر اعتبار کر کے جنگ کی آگ میں کودنے سے ڈرتے تھے۔ اور پھر جب چند ماہ کی سرتوڑ کوششوں کے بعد پونا اور حیدرآباد میں ایسٹ انڈیا

کمپنی کے ایجنٹ ان کے خدشات دُور کر چکے تھے تو لارڈ کارنوالس ان کے ساتھ معاہدے کی شرائط طے کرنے میں سخت الجھنوں کا سامنا کر رہا تھا۔ میر نظام علی اور نانا فرنویس دونوں جنگ میں اپنے اشتراک کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے پر مُصر تھے اور لارڈ کارنوالس کسی ایک فریق کو خوش کرنے کے لیے دوسرے فریق کی ناراضی کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ نانا فرنویس نے اس سودا بازی میں اپنی قیمت بڑھانے کے لیے ایک طرف یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ اگر اس کے مطالبات نہ مانے گئے تو وہ انگریزوں کے خلاف سلطان ٹیپو کے ساتھ معاہدہ کرلے گا اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ اطمینان دلایا کہ معاہدے کی جو شرائط مرہٹوں کے لیے قابلِ قبول ہوں گی، وہ میر نظام علی کو بہرحال تسلیم کرنی پڑیں گی۔

○

میر نظام علی کے دربار میں معاہدے کی شرائط پر بحث ہو رہی تھی۔ نظام کا ایک ہوشیار وزیر میر عالم جسے دکن میں انگریزوں کا سب سے بڑا طرف دار سمجھا جاتا تھا۔ اسے یہ کہانے کے لیے اپنا پورا زورِ خطابت صرف کرچکا تھا کہ نانا فرنویس نے انگریزوں کے ساتھ معاہدے کی شرائط طے کرنے میں دکن کے مفاد کا پورا خیال رکھا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا: "عالیجاہ! اس جنگ میں ٹیپو کی شکست یقینی ہے۔ انگریز اسے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ اس مرتبہ وہ زبردست تیاریوں کے ساتھ میدان میں آرہے ہیں اور لارڈ کارنوالس نے جو افواج جمع کی ہیں وہ اس سے پہلے کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھی گئیں۔ مرہٹے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ تنہا ہلکر کی کنارہ کشی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمارے لیے اب صرف یہ مسئلہ قابلِ غور ہے کہ ٹیپو کی شکست کے بعد میسور کے مالِ غنیمت میں ہمارا حصّہ کیا ہوگا۔ ہم جنگ سے الگ رہ کر مرہٹوں اور انگریزوں کی ناراضگی مول نہیں لے سکتے اور ہمارے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم ٹیپو کے ساتھ شامل ہوجائیں۔ اگر حضور کو اس معاہدے کی کسی شرط پر اعتراض ہے تو اس میں ردّوبدل کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر کناوے نے

مجھے یہ اطمینان دلایا ہے کہ اگر حضور کے دل میں اس معاہدے کی بابت کوئی غلط فہمی پیدا ہوگئی ہو تو اسے دُور کرنے کی پُوری کوشش کی جائے گی۔

میں حضور کی اطلاع کے لیے یہ عرض کردینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جنگ میں ٹیپو کو صرف دکن، پُونا اور انگریز کی افواج کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، بلکہ جنگ شروع ہوتے ہی اس کے خلاف چاروں اطراف سے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ کرناٹک کا محمد علی والاجاہ، کورگ، ٹراونکور، کوچین کے ہندو راجے اور مالابار کے پالیگار لارڈ کارنوالس کا اشارہ پاتے ہی سُلطان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ پھر سلطان کی شکست کے آثار دیکھتے ہی میسور کی ہندو اکثریت وہاں کے سابق راجہ کے خاندان کو واپس لانے کی کوشش کرے گی۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ کبھی صُورت نہیں بھُولنا چاہیے کہ ہم جنگ سے الگ رہیں تو بھی ٹیپو کی شکست یقینی ہے۔"

میر عالم کی تقریر کے بعد حاضرین دربار کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر میر نظام علی کے محافظ دستوں کا سالار اور دکن کا ایک بہت بڑا جاگیردار نواب شمس الامراء اُٹھا اور اس نے کہا: "عالیجاہ! میر عالم گزشتہ جنگ میں بھی یہی کہتے تھے کہ ٹیپو کی شکست یقینی ہے اس لیے ہمیں مرہٹوں کا ساتھ ضرور دینا چاہیے۔ اور میں اس وقت بھی یہ کہتا تھا کہ ہمیں ایسے شخص کے ساتھ نہیں اُلجھنا چاہیے جسے ہم آسانی سے اپنا دوست بنا سکتے ہیں اور یہ حقیقت بار بار ثابت ہوچکی ہے کہ ہم نے جب بھی سلطان ٹیپو کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اس نے شرافت کا ثبوت دیا ہے لیکن اگر ہم اس اُمید پر اس جنگ میں شریک ہونا چاہتے ہیں کہ سلطان ٹیپو کو آسانی سے شکست دی جاسکتی ہے تو بھی اس معاہدے میں چند باتیں ایسی ہیں جن پر ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔

میرا پہلا اعتراض یہ ہے کہ ہم مرہٹوں کے اجیر نہیں اور نانا فرنویس کو ہماری طرف سے انگریزوں کے ساتھ معاہدے کی شرائط طے کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔

میرا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ معاہدہ صرف ٹیپو کے خلاف ہے اس معاہدے میں

ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم میسور کے خلاف جنگ میں انگریزوں اور مرہٹوں کا ساتھ دیں لیکن اس امر کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی کہ اگر جنگ کے اختتام پر اس معاہدے کا کوئی فریق ہم پر حملہ کر دے تو دوسرا فریق ہماری مدد کرے گا۔ بالخصوص مرہٹوں کا سابقہ کردار ایسا نہیں کہ ان کے کسی وعدے پر اعتماد کیا جا سکے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر وہ میسور سے نپٹنے کے بعد ہم پر حملہ کر دیں تو انگریز ہماری کیا مدد کریں گے۔ میں ٹیپو کے طرف دار کی حیثیت سے نہیں بلکہ سلطنتِ دکن کے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس معاہدے میں ہمارے تحفظ کی کیا ضمانت ہے؟

اس کے بعد ایک سوال اور ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب میسور کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کے لیے ہماری فوج مرہٹوں کے برابر ہو گی تو پھر کیا وجہ ہے کہ مرہٹے مالِ غنیمت میں میسور کے ایک تہائی حصہ کے علاوہ پچاس لاکھ روپیہ زیادہ وصول کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آج انگریز اس معاہدے کی شرائط طے کرتے وقت مرہٹوں کو ایک ترجیحی سلوک کا حق دار سمجھتے ہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جنگ کے اختتام پر وہ ہمیں کسی بہتر سلوک کا مستحق سمجھیں گے۔ نانا فرنویس کا سابقہ کردار ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں اور ذاتی طور پر مجھے انگریزوں کے متعلق بھی کوئی خوش فہمی نہیں۔ عالیجاہ! آپ میرے اس اندیشے کو بے بنیاد نہ سمجھیں کہ اگر میسور کو تقسیم کرنے کے بعد انگریزوں اور مرہٹوں نے اپنی سلطنتوں کو مزید وسعت دینے کے لیے دکن پر حملہ کر دیا تو ہم ٹیپو سے بھی زیادہ بے بس ہوں گے۔ آج ہمارے لیے یہ مفید ہے کہ ہم سلطان ٹیپو کو اپنا ایک طاقت ور حلیف بنا سکیں۔ وہ ہر وقت ہمارے ساتھ ایک آبرومندانہ سمجھوتے کے لیے تیار ہے۔ میں جب جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے اس کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا کہ ہم انگریزوں یا مرہٹوں کی بجائے سلطان ٹیپو کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کرنے کی کوشش کریں۔ وہ خوشی سے ہمارے ساتھ ایک ایسا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار ہو گا جس کی شرائط میسور اور دکن کے لیے یکساں تسلی بخش ہوں۔

عالی جاہ! آج دکن اور میسور کے اتحاد سے جنگ کے امکانات ختم ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ہم ایک مسلمان حکمران کا ساتھ نہیں دے سکتے تو بھی یہ ضروری نہیں کہ ہم انگریزوں یا مرہٹوں کا ساتھ دے کر جنوبی ہندوستان میں اس جنگ کے دروازے کھول دیں جو ہماری اپنی آزادی اور بقا کے لیے خطرہ پیدا کر سکتی ہے۔"

میر عالم نے کہا "عالیجاہ! میں شمس الامراء کے خلوص اور نیک نیتی پر حملہ نہیں کرتا مجھے ڈر ہے کہ وہ ٹیپو کے متعلق بہت زیادہ حسنِ ظن سے کام لے رہے ہیں۔ اگر ہم جنگ سے علیحدہ ہو جائیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ٹیپو ہمارے خلاف انگریزوں یا مرہٹوں کے ساتھ معاہدہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

نظام کا بھتیجا امتیاز الدولہ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے انتہائی غصے کی حالت میں کہا "عالی جاہ! کوئی دیانت دار آدمی سلطان ٹیپو کے متعلق اس قسم کے شبہات ظاہر نہیں کر سکتا۔ اگر وہ انگریزوں کے اتحاد کا روادار ہو سکتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس وقت جنوبی ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور میسور کے سوا کوئی تیسری طاقت بھی ہوتی۔ انگریز اسے صرف اس لیے مٹانا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ ہندوستان کی عزت اور آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہم میسور کے مستقبل سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں لیکن اپنے مستقبل سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ عالیجاہ! اگر آپ اجازت دیں تو میں سلطان ٹیپو کے ساتھ انتہائی آبرومندانہ شرائط طے کرنے کا ذمہ لیتا ہوں۔"

میر نظام علی نے کہا "ہم لارڈ کارنوالس اور نانا فرنویس کے دوست ہیں نہ سلطان ٹیپو کے دشمن۔ ٹیپو بہرحال ایک مسلمان ہے اور اگر تم اس کے ساتھ کوئی آبرومندانہ معاہدہ کر سکتے ہو تو ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

امتیاز الدولہ نے کہا "عالی جاہ! اگر اجازت ہو تو میں خود سرنگاپٹم جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"نہیں! ابھی تمہارا جانا ٹھیک نہیں۔"

شمس الامراء نے کہا "عالیجاہ! تو مجھے اجازت دیجیے!"

"نہیں، تمہارا یہ منصب نہیں کہ تم ایک ایلچی بن کر ٹیپو کے دربار میں جاؤ۔ ہم یہ مسئلہ حافظ فریدالدین کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر نظام اپنی مسند سے اٹھا اور عقب کے کمرے میں چلا گیا۔

اسی روز سہ پہر کے وقت محل کے ایک اور کمرے میں مُشیرالملک[1] اور میر عالم، نظام علی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ میر نظام علی کہہ رہا تھا "میر عالم تمہیں اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہیے، موجودہ حالات میں ہمارے لیے ٹیپو کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا ضروری ہے۔"

"عالی جاہ! اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس بات میں دکن کا فائدہ ہے تو میرے لیے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

میر نظام علی مسکرایا۔ "دکن کا فائدہ اس بات میں ہے کہ ہم انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ مساوی حیثیت میں معاہدہ کریں۔ مرہٹوں نے ٹیپو کے ساتھ تعاون کرنے کی دھمکی دے کر لارڈ کارنوالس کے سامنے اپنی قیمت بڑھائی ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب لارڈ کارنوالس کو یہ پتا چلے گا کہ حافظ فریدالدین سرنگاپٹم پہنچ چکا ہے تو ہم بھی اپنی پوری قیمت وصول کر سکیں گے۔"

مشیرالملک نے پریشان ہو کر کہا "تو عالیجاہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ٹیپو کے ساتھ معاہدہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ہیں؟"

"تم بالکل نادان ہو۔ میر عالم کل صبح کلکتے روانہ ہو جاؤ اور لارڈ کارنوالس کو یہ سمجھاؤ کہ معاملہ بگڑ رہا ہے۔"

میر عالم نے کہا "عالی جاہ! مجھے یقین ہے کہ لارڈ کارنوالس آپ کی تمام شرائط ماننے پر آمادہ ہو جائے گا۔ میں حضور کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے کیناوے سے ملا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر حضور ٹیپو کے ساتھ مصالحت کا ارادہ تبدیل کر دیں تو لارڈ کارنوالس آپ کے ساتھ ایک علیحدہ معاہدہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ کمپنی مال غنیمت سے مرہٹوں کو جو زائد رقم دینے کا وعدہ کر چکی ہے اُس کے بدلے حضور کو اپنے حصے سے ایک معقول رقم دینے کے لیے تیار ہو جائے۔"

نظام مسکرایا۔ "تم سفر کی تیاری کرو اور مجھے یقین ہے کہ جب تم کلکتے جاؤ گے تو کارنوالس کو کیناوے سے کم پریشان نہیں پاؤ گے۔"

○

حافظ فریدالدین سرنگاپٹم سے نہایت حوصلہ افزا پیغام لے کر واپس آیا۔ سلطان ٹیپو ایک مسلمان حکمران سے رواداری کا ثبوت دینے کے لیے نہ صرف میر نظام علی کے مفتوحہ علاقے واپس دینے پر آمادہ تھا بلکہ اس نے دکن اور میسور کے دوستانہ تعلقات مستحکم کرنے کے لیے میر نظام علی کی بیٹی اور اپنے بیٹے کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ دکن کے اسلام پسند حلقے انتہائی مسرت کے ساتھ ان مصالحانہ کوششوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ شمس الامراء امتیاز الدولہ اور اُن کے ہم خیال میر نظام علی پر زور ڈال رہے تھے کہ اُسے کسی تاخیر کے بغیر سلطان ٹیپو کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کر لینا چاہیے۔ دوسری طرف حیدر آباد میں پونا اور کمپنی کے سفیر نانا فرنویس اور لارڈ کارنوالس کی ہدایات کے مطابق مصالحت کی اِن کوششوں کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

حیدر آباد میں ان ابنائے وقت کی کمی نہ تھی جو اپنا مستقبل انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ وابستہ کر چکے تھے۔ سرجان کیناوے سونے اور جواہرات سے اُن کے ضمیر خرید چکا تھا۔ اور ان کے ساتھ اس قسم کے وعدے کیے جا رہے تھے کہ جب میسور فتح ہو گا تو انہیں وہاں بڑی بڑی جاگیریں عطا کی جائیں گی۔ ان ملت فروشوں کی بہو بیٹیوں کے ذریعے انگریزوں اور مرہٹوں کے ایجنٹ حکمران خاندان کی بعض بیگمات سے ربط پیدا کر چکے تھے۔ چنانچہ رشوتوں، نذرانوں اور تحفوں کے زہریلے اثرات میر نظام علی کے حرم تک پہنچ چکے تھے۔

---

[1] نظام کا وزیر اعظم

"ٹیپو ہم سے برابری کا دعویٰ کرتا ہے۔ ٹیپو نے نظام الملک اور اپنے خاندان کے درمیان رشتے کی تجویز پیش کر کے ہماری توہین کی ہے۔ دکن کی شہزادیاں اس کے بیٹوں کے ساتھ زندگی گزارنے کی بجائے زہر کھا کر مر جانے کو ترجیح دیں گی۔" اونچے طبقے کی خواتین کے منہ سے اس قسم کی باتیں ایک عام آدمی کو بھی مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھیں۔ لیکن میر نظام علی اپنی تمام برائیوں کے باوجود ایک جذباتی انسان نہ تھا۔ سیاست اس کے لیے ایک شطرنج کا کھیل تھا۔ اور وہ کسی مہرے پر ہاتھ رکھنے سے پہلے سو بار سوچنے کا عادی تھا۔ ٹیپو کے ساتھ اس کے سابقہ اختلافات کسی جذباتی ہیجان کا نتیجہ نہ تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے انگریزوں اور مرہٹوں کا ساتھ دینا بہتر سمجھتا تھا۔ اگر وہ ٹیپو کے ساتھ ناطہ جوڑنے میں اپنا مفاد دیکھتا تو اُسے تمام دنیا کے طعنوں کی پروا نہ ہوتی۔ لیکن وہ سلطان ٹیپو کا دوست بن کر اپنے چند کھوئے ہوئے علاقے واپس لینے کی بجائے انگریزوں اور مرہٹوں کا ساتھ دے کر میسور کی سلطنت کا تیسرا حصہ حاصل کرنا اپنے لیے زیادہ سود مند سمجھتا تھا۔

سلطان ٹیپو کے ساتھ دوستانہ بات چیت اس کے نزدیک لارڈ کارنوالس اور نانا فرنویس کی نظروں میں اپنی قیمت بڑھانے کے لیے ایک کامیاب چال تھی۔ ورنہ وہ ابتدا سے ہی انگریزوں اور مرہٹوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تاہم سلطان ٹیپو کو دو ٹوک جواب دینے کی بجائے وہ کلکتہ میں لارڈ کارنوالس کے ساتھ میر عالم کی بات چیت کا نتیجہ ظاہر ہونے تک سلطان کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے چند دن توقف کے بعد حافظ فرید الدین کو معاہدے کے لیے جوابی تجاویز دے کر سلطان کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ میر نظام کے اس اقدام پر حیدر آباد میں سلطان ٹیپو کے حامی جس قدر خوش تھے اسی قدر انگریزوں اور مرہٹوں کے حامی پریشان اور مغموم تھے۔

ایک صبح سپہ سالار برہان الدین اپنے دفتر میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ انور علی کمرے میں داخل ہوا اور سلام کرنے کے بعد اُس کی میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" برہان الدین نے سوال کیا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ نظام کا سفیر کل واپس جا رہا ہے اور سلطان معظم صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے علی رضا خاں اور قطب الدین کو اس کے ساتھ بھیج رہے ہیں۔"

برہان الدین نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ہاں۔ لیکن ان باتوں کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"جناب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ وفد کے ساتھ فوج کے جو آدمی بھیجنا چاہتے ہیں ان میں میرے بھائی کا نام بھی شامل کر دیں۔"

"لیکن میں اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا بھائی ایک ہونہار سپاہی ہے لیکن اس کام کے لیے سلطان معظم غالباً کسی تجربہ کار اور عمر رسیدہ افسر کو منتخب کریں گے۔"

"جناب ایسے معاملات میں کبھی کبھی ذاتی تعلقات بہت کام دیتے ہیں اور مراد علی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ امتیاز الدولہ کو جانتا ہے اور دکن اور میسور میں مصالحت کے متعلق ان کے درمیان کافی باتیں ہو چکی ہیں۔"

برہان الدین نے قدرے متعجب ہو کر کہا۔ "کون امتیاز الدولہ، نظام کا بھتیجا؟"

"جی ہاں۔ شاید آپ کو اس بات پر تعجب ہو لیکن مراد کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اس کا دوست ہے۔"

"وہ امتیاز الدولہ سے کب ملا تھا؟"

"جناب جنگ سے پہلے ابا جان کے ایک عزیز دوست کی صاحبزادی کی شادی ادھونی کے ایک با اثر خاندان میں ہوئی تھی۔ اور مراد وہاں گیا تھا۔ برات کے ساتھ ادھونی اور حیدر آباد کے بڑے بڑے امراء کے علاوہ امتیاز الدولہ بھی آئے ہوئے تھے۔ وہاں ایک مجلس میں سلطان معظم

کے متعلق بحث ہو رہی تھی اور مُراد نے کچھ ایسی باتیں کہی تھیں جن سے امتیاز الدولہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ مُراد علی کہتا ہے کہ سلطان کے متعلق امتیاز الدولہ کے خیالات بہت اچھے ہیں اور اگر اُسے حیدر آباد جانے کا موقع دیا جائے تو وہ اس مہم میں اس کا پورا تعاون حاصل کر سکے گا۔"

بُرہان الدین مُسکرایا۔ "امتیاز الدولہ کا تعاون ہمیں پہلے ہی حاصل ہے لیکن تمہارا بھائی اگر وہاں جا کر کوئی مفید کام کر سکتا ہے تو میں سلطانِ معظم کی خدمت میں اس کا نام پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ذاتی طور پر مجھے نظام علی سے کسی بھلائی کی توقع نہیں لیکن اگر تمہارا بھائی امتیاز الدولہ کا تعاون حاصل کر سکے تو ہمارے لیے اس کے صحیح خیالات معلوم کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔"

تیسرے دن سلطان کے سفیر میر نظام علی کے لیے بیش قیمت تحائف لے کر روانہ ہو چکے تھے اور مراد علی ان کے محافظ سپاہیوں کے سالار کی حیثیت میں اُن کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

گیارھواں باب

حیدر آباد کے ایک عالی شان مکان کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں تنویر اور ہاشم بیگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تنویر کی گود میں چند ماہ کا بچہ کھیل رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا "جناب ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"جناب مجھے معلوم نہیں نوکر نے اُسے دیوان خانے میں بٹھا دیا ہے۔"

ہاشم بیگ کمرے سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ جب وہ نیچے اتر کر دیوان خانے کے قریب پہنچا تو ایک نوکر نے آگے بڑھ کر کہا "حضور مہمان اندر بیٹھا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"حضور میں نے نام نہیں پوچھا۔ وہ کوئی اجنبی ہے۔"

ہاشم بیگ نے کہا "تم ہر اجنبی کو مہمان سمجھ لیتے ہو!"

"جناب اس کے لباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی معزز آدمی ہے۔"

ہاشم بیگ کمرے میں داخل ہُوا اور ایک خوش وضع نوجوان کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک ثانیہ کے لیے ہاشم بیگ کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ اور پھر اس نے آگے بڑھ کر نوجوان کو گلے لگاتے ہوئے کہا: "مراد علی آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"میں میسور کی سفارت کے ساتھ آیا ہوں اور چار دن سے یہاں ہوں۔ چچا اکبر خاں کے خط سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ ان دنوں حیدر آباد میں ہیں۔ میں نے یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے شیخ فخرالدین کا مکان تلاش کیا تھا لیکن وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ حج پر چلے گئے ہیں۔"

ہاشم نے کہا: "آپ کو سیدھا میرے پاس آنا چاہیے تھا۔"

"میں ایک سپاہی کی حیثیت سے سلطان کے سفیروں کے ساتھ آیا ہوں اور میرا ان کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔ آپ کے ابا جان کہاں ہیں؟"

"وہ واپس ادھونی چلے گئے تھے۔ لیکن میں حیدر آباد آتے ہی نظام کی محافظ فوج میں شامل ہو گیا تھا اور مجھے واپس جانے کی اجازت نہیں ملی۔"

"اور بہن تنویر کہاں ہیں؟"

"وہ یہیں ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تنویر آپ کے متعلق باتیں کر رہی تھی۔"

مراد علی نے کہا: "چند ہفتے قبل یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میں حیدر آباد آؤں گا اور یہاں آپ سے ملاقات ہوگی۔"

"تنویر آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔ آیئے وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔"

مراد علی اس کے ساتھ چل دیا۔

راستے میں ہاشم بیگ نے کہا: "اگر آپ دو مہینے پہلے آتے تو شہباز کے ساتھ آپ کی ملاقات ہو جاتی۔"

"وہ یہاں آئے تھے؟"

"میں خود جا کر علاج کے لیے یہاں لایا تھا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بینائی کھو چکا ہے۔"

مراد علی نے باقی راستہ کوئی بات نہ کی۔ تنویر کے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر ہاشم بیگ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور خود مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"تنویر!" اس نے کہا: "تمھارا بھائی آیا ہے!"

"میرا بھائی! نوکر کتنا بدتمیز ہے انھیں سیدھا اُوپر کیوں نہیں لایا۔"

تنویر یہ کہہ کر اٹھی اور بچے کو ہاشم بیگ کے حوالے کر کے بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی۔ مراد علی نے "السلام علیکم" کہہ کر آنکھیں جھکا لیں اور وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔

ہاشم نے کمرے سے باہر نکل کر بچے کو مراد علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اور یہ آپ کا بھانجا ہے۔"

مراد علی نے پیار سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا: "اس کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام نصرت بیگ ہے۔" ہاشم نے جواب دیا۔ "چلیے اندر بیٹھیں!"

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے کے اندر بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ شہباز ان کی گفتگو کا موضوع تھا اور مراد علی تنویر کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا: "بہن یہ مقدر کی بات ہے۔ اب صبر اور حوصلے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ شہباز کو آپ کے آنسوؤں سے زیادہ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

تنویر نے کہا: "بھائی جان آپ کو معلوم نہیں کہ ہم کس عذاب میں مبتلا ہیں۔ ابا جان اُس دن سے ہمارے ساتھ بات نہیں کرتے۔ امی جان کے لیے بھی یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ اکثر بیمار رہتی ہیں۔ ابا جان کی صحت بھی خراب ہو گئی ہے۔ ایک دن وہ بھائی جان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں سیر کے لیے باہر لے جا رہے تھے۔ اور میں نے پہلی بار اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ ابا جان میرے ساتھ بات نہیں کرتے لیکن ان کی خاموش نگاہیں ہمیشہ مجھے اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر میں چاہتی تو بھائی جان کو فوج میں شامل ہونے سے روک سکتی تھی۔ کاش میں انھیں اپنی آنکھیں دے سکتی۔"

مراد علی نے مغموم لہجے میں سوال کیا: "ثمینہ کیسی ہے؟"

"ثمینہ کا حوصلہ قابلِ داد ہے۔ آج تک اُسے کسی نے آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔ وہ سب کو تسلّی دینے کی کوشش کرتی ہے۔ ابّا جان اُسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا سہارا سمجھتے ہیں اور بھائی جان یہ کہا کرتے ہیں کہ ثمینہ میری آنکھوں کی روشنی ہے۔"

کم سن بچّہ جو اب تک خاموشی سے مراد علی کی گود میں پڑا ہُوا تھا اچانک بلکنے لگا۔ ہاشم بیگ نے جلدی سے اُسے اٹھالیا اور خادمہ کو آواز دی۔ خادمہ کمرے میں داخل ہُوئی اور بچّے کو اٹھا کر باہر لے گئی۔

"ہاشم نے کہا: مراد علی مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ہماری پہلی ملاقات زیادہ خوشگوار نہ تھی۔ اس وقت میرے خیالات کچھ اور تھے لیکن بعد کے حالات نے بہت سی باتوں میں مجھے آپ کا ہم خیال بنادیا ہے۔ اب ابّا جان بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ جنوبی ہند کے مسلمانوں کی بقا کے لیے نظام الملک اور سلطان ٹیپو کا اتحاد ضروری ہے۔ ہم نے انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر ذلّت کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب نظام الملک اور سلطان ٹیپو ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر آمادہ ہوگئے ہیں۔"

"سلطان ٹیپو ہمیشہ اس اتحاد کے خواہاں رہے ہیں۔ اور یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ وہ نظام الملک کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے۔"

"مجھے یقین ہے کہ اس مرتبہ مصالحت کی کوششیں بے نتیجہ ثابت نہیں ہوں گی۔ حیدر آباد کے اُمرا کا ایک بااثر گروہ انگریزوں یا مرہٹوں کی بجائے سلطان ٹیپو کا طرف دار بن چکا ہے۔ شمس الامرا اور امتیاز الدولہ تو پورے شدّومد کے ساتھ دکن اور میسور کے اتحاد کی حمایت کر رہے ہیں اور اس نیک کام میں دکن کے ہر راست باز مسلمان کی دُعائیں اُن کے ساتھ ہیں۔"

مراد علی نے کہا: "میں یہاں پہنچتے ہی امتیاز الدولہ کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ بڑے آدمی ہیں اور اتنی مدت کے بعد شاید مجھے نہ پہچان سکیں۔ لیکن انھوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ میں ان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ شمس الامرا بھی آگئے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں نے اگر بے تکلّف ہو کر کوئی بات کی تو شاید وہ بُرا مانیں۔ لیکن پانچ منٹ کے بعد میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں صحیح الخیال مسلمان ہیں اور اگر جنوبی ہند کے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے مقدّر میں انگریزوں کی غلامی نہیں تو ہمیں صدقِ دل سے ان کی مصالحانہ کوششوں کی کامیابی کے لیے دُعا کرنی چاہیے۔"

ہاشم بیگ نے کہا: "دکن کے امرا میں سے صرف شمس الامرا ایک ایسے آدمی ہیں جو بے خوف ہو کر نظام الملک کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ سکتے ہیں۔ اور نظام الملک نے ان کے اصرار پر ہی حافظ فریدالدین کو سلطان کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔"

مُراد علی نے کہا: "میں یہاں کے حالات سے زیادہ واقف نہیں ہُوں۔ شمس الامرا اور امتیاز الدولہ کی باتیں میرے لیے بہت حوصلہ افزا تھیں۔ لیکن اس کے باوجود میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ نظام کے دربار میں ایک بااثر گروہ انگریزوں اور مرہٹوں کا طرف دار ہے۔ کاش ہم لوگ یہ جان سکتے کہ اس وقت کلکتہ میں میر عالم اور لارڈ کارنوالس کے درمیان کیا باتیں ہو رہی ہیں اور نظام نے کس مقصد سے اُسے وہاں بھیجا ہے!"

ہاشم بیگ مسکرایا: "میرے دوست تمھیں میر عالم کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اب حیدر آباد کے کئی بااثر امرا مصالحت کے حق میں ہیں اور میر عالم نے اگر اس نیک کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی بھی تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

مُراد علی نے کہا: "اگر یہ رکاوٹ صرف میر عالم کی طرف سے ہو تو میرے لیے فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میر نظام علی حسبِ عادت اس مرتبہ بھی دوکشتیوں میں پاؤں رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ خدا کرے کہ میرا یہ اندیشہ غلط ہو۔ کل ہمارے سفیر نظام الملک سے ملاقات کر رہے ہیں اور ہم جس قدر دکن کی حکومت کے ساتھ دفاعی معاہدے کے لیے بے قرار ہیں اسی قدر یہ معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہیں کہ میسور کے متعلق میر نظام علی کے صحیح عزائم کیا ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمیں نظام کی نیت کا صحیح اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگے گی۔ اب مجھے اجازت

دیجیے۔ میں یہاں اپنے قیام کے دوران میں کبھی کبھی آپ سے ملتا رہوں گا۔"

تنویر نے کہا: "بھائی جان یہ بات غلط ہے۔ آپ کو ہمارے پاس رہنا چاہیے"

"اگر میں آزاد ہوتا تو یقیناً یہیں ٹھہرتا۔ لیکن میرے ذمے چند فرائض ہیں آپ اس مہم میں ہماری کامیابی کی دعا کیجیے۔ اس کے بعد میں بن بلائے یہاں چلا آؤں گا اور اگر آپ اصرار کریں گی تو پورا مہینہ یہاں قیام کروں گا۔" مراد علی یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

ہاشم نے اٹھتے ہوئے کہا: "بہت اچھا بھائی میں اصرار نہیں کرتا۔ لیکن کل شام ہمارے ہاں آپ کی دعوت ہے۔ میرے دوست آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ نواب شمس الامراء ہمارے سالارِ اعلیٰ ہیں اور میں انھیں بھی بلانے کی کوشش کروں گا۔"

مراد علی نے کہا: "ابھی چند دن دعوت کا انتظام نہ کیجیے میں بہت مصروف ہوں۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ موقع ملتے ہی یہاں حاضری دینے کی کوشش کیا کروں گا۔ ممکن ہے کہ میں کسی دن کھانے کے وقت بھی آسکوں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

یہ کہہ کر مراد علی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن ہاشم بیگ نے کہا: "نہیں میں دروازے تک آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

○

ایک دن تیسرے پہر شمس الامراء کی پالکی نظام کے دروازے پر رکی اور وہ پالکی سے اتر کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ بخار کے باعث اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ محل کے پہرے داروں نے اسے سلامی دی اور ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "جناب آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا۔"

شمس الامراء نے اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا: "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم حضورِ نظام کو اطلاع دو کہ میں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"عالیجاہ میں آپ کا پیغام اندر پہنچا دیتا ہوں۔ لیکن اس وقت مشیر الملک اور میر عالم حاضرِ خدمت ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے اور میں اسی لیے آیا ہوں۔ تم اطلاع بھیج دو۔"

پہرے داروں کا افسر سلام کرکے اندر چلا گیا۔ شمس الامراء لڑکھڑاتا ہوا ڈیوڑھی سے آگے ایک کمرے میں داخل ہوا اور نڈھال سا ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد نوجوان افسر واپس آگیا اور اس نے کہا: "میں نے اطلاع بھیج دی ہے اور میں نے یہ بھی کہلا بھیجا ہے کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ایک سپاہی آیا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا: "عالیجاہ تشریف لائیے!"

شمس الامراء اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں جگہ جگہ پہرے دار کھڑے تھے اور شمس الامراء ہاتھ کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسری ڈیوڑھی پر محل کے داروغہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور رسمی مزاج پرسی کے بعد اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ سنگِ مرمر کی پٹڑی پر ایک خوب صورت باغ میں سے گزرنے کے بعد ایک کشادہ برآمدے میں داخل ہوئے۔ داروغہ نے ہاتھ سے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا اور شمس الامراء کسی توقف کے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ میر نظام علی ایک سنہری کرسی پر جلوہ افروز تھا اور مشیر الملک اور میر عالم اس کے سامنے مؤدب کھڑے تھے۔ شمس الامراء کورنش بجا لانے کے بعد آگے بڑھا۔

نظام علی ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس نے کہا: "تمھیں اس حالت میں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تمھارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تمھاری طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

شمس الامراء نے کہا: "عالیجاہ اس بے جا مداخلت کے لیے میری معذرت قبول فرمائیے۔ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو میں تخلیہ میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میر نظام علی نے مشیر الملک اور میر عالم کی طرف دیکھا اور پھر شمس الامراء کی طرف متوجہ ہو کر

کہاٹیاں انگریزوں یا مرہٹوں کا کوئی آدمی نہیں۔ تم مُشیر الملک اور میر عالم کے سامنے بے تکلفی سے بات کر سکتے ہو؟"

"عالیجاہ! مجھے اندیشہ ہے کہ میری باتیں انھیں ناگوار محسوس ہوں گی۔ بہرحال میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔ ٹیپو کے وکیل آپ سے ملاقات کر چکے ہیں اور مجھے یہ معلوم ہُوا ہے کہ حضور نے ان کے ساتھ کوئی حوصلہ افزا بات نہیں کی اور وہ بہت مایوس ہیں۔"

"ان کے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ابھی تو ہماری گفتگو کی ابتدا ہُوئی ہے اور ایسے مسائل ایک دن کے اندر طے نہیں ہو جاتے۔"

"لیکن عالیجاہ میرا خیال تھا کہ سُلطان نے آپ کے تمام مطالبات مان لیے ہیں ہمیں ایک نیک کام میں بلا وجہ تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"لیکن میں تمھیں یہ خوش خبری دینا چاہتا ہُوں کہ لارڈ کارنوالس نے بھی ہمارے تمام مطالبات مان لیے ہیں۔ میر عالم کلکتہ سے جو پیغام لایا ہے وہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تک تمھارے ساتھ اس کی ملاقات نہیں ہُوئی ورنہ ایسی حالت میں تمھیں یہاں آنے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ تمھیں یہ اندیشہ تھا کہ اگر میسُور سے نپٹنے کے بعد مرہٹوں نے ہمارے ساتھ بد عہدی کی تو ہمیں ایک خطرناک صُورتِ حال کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ لیکن اب تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ میر عالم کارنوالس کے ساتھ ایسی شرائط طے کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن کے بعد یہ خدشہ باقی نہیں رہا کہ اگر مرہٹوں نے کسی جارحیت کا ثبوت دیا تو کمپنی ہماری مدد نہ کرے گی۔"

پنڈت نے شمس الامراء کے مُنھ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے کانپتی ہُوئی آواز میں کہا "عالیجاہ! میں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام آپ کے خاندان کی خدمت میں گزارے ہیں۔ میں آپ کا نمک خوار ہُوں اور میں اتنا حق ضرور رکھتا ہوں کہ آپ کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ سکوں۔ ہو سکتا ہے اس وقت میری باتیں آپ کو انتہائی ناگوار معلوم ہُوں۔ لیکن وقت یہ ثابت کر دے گا کہ میرے خدشات غلط نہ تھے۔ میں حضور کے سامنے میر عالم اور مشیر الملک سے یہ پُوچھنا

چاہتا ہوں کہ ٹیپو کے ساتھ انگریزوں اور مرہٹوں کی دشمنی کی وجہ کیا ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اس کی غیرت، اس کی ہمت، اس کی شجاعت اور اس کے جذبۂ حرّیت کو اپنے راستے کا سب سے بڑا پتھر سمجھتے ہیں اور اس کی نگاہیں کارنوالس اور فرنویس کی آستینوں میں چھپے ہُوئے خنجر دیکھ چکی ہیں۔ اُسے دھوکا دیا جا سکتا ہے نہ خریدا جا سکتا ہے؟

عالیجاہ! ٹیپو کے ساتھ انگریزوں اور مرہٹوں کی دشمنی کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ ایک ایسا حکمران ہے جس نے میسور میں اسلام کا بول بالا کیا ہے۔ وہ دلی کی عظیم سلطنت کے زوال کے بعد اس ملک کے کروڑوں مسلمانوں کی آخری اُمید ہے۔ وہ پُورے ہندوستان کی آزادی کی رُوح ہے اور جب یہ رُوح نکل جائے گی تو یہ ملک ایک لاش ہوگا جسے انگریز بھوکے گِدھوں کی طرح نوچ رہے ہوں گے۔ ان گِدھوں کی اشتہا بڑھتی جائے گی۔ آج میسُور کی باری ہے اور کل شاید ہماری یا مرہٹوں کی باری آجائے گی۔ اور جب ایسا وقت آئے گا تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ اس ملک کی عزت اور آزادی کے وہ دشمن جنھیں ہم اپنے کندھوں پر اٹھا کر کلکتہ اور مدراس سے سرنگاپٹم لے آئے ہیں، اب وہ دِلی کی طرف دیکھ رہے ہیں، اور پونا اور حیدر آباد اُن کے راستے کی منزلیں ہیں۔

انگریزی استبداد کا عفریت مرشد آباد سے اودھ پہنچ چکا ہے اور جنوبی ہندوستان میں صرف میسُور کی سلطنت ایک ایسی دیوار ہے جو گزشتہ تیس برس سے اس سیلاب کا راستہ روکے ہُوئے ہے۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہُوں کہ جب سُلطان ٹیپو کا پرچم سرنگوں ہو جائے گا تو ہندوستان کے باقی حکمرانوں کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوگا کہ وہ کرناٹک کے محمد علی والا جاہ کی طرح انگریزوں کے بے بس دُعا گو بن کر رہیں، ان کی سنگینوں کے سائے میں اپنے دربار لگائیں اور اپنی بے بس رعایا کا خون چُوس کر ان کا پیٹ بھریں۔"

میر عالم اور مشیر الملک نے سراپا احتجاج بن کر میر نظام علی کی طرف دیکھا اور اس نے تلملا کر کہا "تمھیں معلوم نہیں تم کہاں کھڑے ہو اور کیا کہہ رہے ہو۔ ہمیں تمھارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔"

میر عالم نے کہا "عالی جاہ ٹیپو کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کی سیاست کے زہریلے اثرات حضور کے دربار تک پہنچ چکے ہیں۔"

مشیر الملک نے کہا "اس کے وکیل ہمارے بازاروں سے گزرتے ہیں تو لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہماری مساجد میں اس کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ عوام اس قدر بے باک ہو گئے ہیں کہ وہ حضور پر نکتہ چینی سے بھی دریغ نہیں کرتے اور ہمیں انگریزوں کی کاسہ لیسی کا طعنہ دیتے ہیں۔"

میر عالم نے کہا "عالیجاہ یہاں پہنچتے ہی سرجان کینا وے اور پونا کے سفیر نے مجھ سے احتجاج کیا تھا کہ ٹیپو کے وکیلوں نے حیدر آباد میں سازشوں کا جال پھیلا رکھا ہے اور ان کے اشاروں پر یہاں کے عوام لارڈ کارنوالس اور نانا فرنویس کو برملا گالیاں دیتے ہیں۔"

شمس الامراء چلایا "میر عالم! ابھی تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ ابھی تم نے کچھ نہیں سنا۔ ٹیپو کے ساتھ عداوت نے تمہاری آنکھوں اور تمہارے کانوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔ لیکن اگر نظام الملک نے تمہارے پیچھے چلنے کی غلطی کی تو ایک دن ایسا آئے گا جب تمہارے اپنے بیٹے اور بیٹیاں سلطان ٹیپو کے لیے آنسو بہائیں گے۔ جب حیدر آباد کی آئندہ نسلیں چلا چلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے بزرگوں نے جن تلواروں سے شیرِ میسور کو مجروح کیا تھا وہ اب ہماری اپنی شہ رگ تک پہنچ چکی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جس قوم کے اکابر خودکشی پر آمادہ ہو چکے ہوں اُسے تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

شمس الامراء یہاں تک کہہ کر اچانک خاموش ہو گیا۔ وہ ہمت جو اُسے شدید بخار کی حالت میں یہاں لے آئی تھی اب جواب دے چکی تھی۔ چند ثانیے پھٹی پھٹی آنکھوں سے نظام الملک کی طرف دیکھنے کے بعد اُس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "عالیجاہ! مجھے معلوم نہیں مَیں کیا کہہ رہا ہوں۔ میری ہمت جواب دے چکی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے۔"

وہ کورنش بجا لانے کیلئے جھکا لیکن دروازے کی طرف تین چار قدم اٹھانے کے بعد اچانک

منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ میر نظام علی اپنی کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میر عالم اور مشیر الملک نے بھاگ کر اُسے اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ بے ہوش تھا اور اس کا جسم بخار سے پھُنک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد چند سپاہی اسے پلنگ پر ڈال کر محل سے باہر لے جا رہے تھے۔

دو دن بعد سرجان کینا وے لارڈ کارنوالس کو یہ خط لکھ رہا تھا کہ آج نظام الملک کی محافظ فوج کا سالارِ اعلیٰ اور حیدر آباد کا ایک بہت بااثر جاگیردار جو ہمارا بدترین دشمن اور دکن اور میسور کے اتحاد کا سب سے بڑا حامی تھا' وفات پا چکا ہے۔

شمس الامراء کے جنازے کے ساتھ حیدر آباد کے عوام کا ایک بے پناہ ہجوم تھا اور شہر کے عوام کی طرح میسور کی سفارت کے ارکان بھی باری باری اس کے جنازے کو کندھا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب اس کی لاش لحد میں اُتاری جا رہی تھی تو مُراد علی نے امتیاز الدولہ کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔

امتیاز الدولہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میرے دوست! میرا بازو ٹوٹ چکا ہے۔ ہم اپنے مقدر سے نہیں لڑ سکتے۔ شمس الامراء کی موت میرے نزدیک ان اُمیدوں اور آرزوؤں کی موت ہے جو ہم نے دکن اور میسور کے اتحاد کے ساتھ وابستہ کی تھیں۔"

"لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔" مراد علی نے قدرے ہمت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ تم سلطان ٹیپو کے سپاہی ہو۔ مایوسی صرف ان کے لیے ہے جنہیں راستہ دکھانے والا کوئی نہ ہو۔"

شمس الامراء کی موت کے بعد بھی میسور کے سفراء کے ساتھ میر نظام علی کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن ان ملاقاتوں کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی اور مرہٹوں کے ساتھ معاہدے کی شرائط کو اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ قریباً دو ماہ بعد اپنے اتحادیوں سے پُورا اطمینان حاصل کرنے کے بعد میر نظام علی نے سُلطان ٹیپو کے سفیروں کو رخصت کر دیا۔

حیدر آباد چھوڑنے سے تھوڑی دیر قبل مراد علی' ہاشم بیگ کے گھر گیا۔ ہاشم اور اس کی بیوی

مصالحت کی گفتگو کی ناکامی پر بہت پریشان تھے۔ مراد علی نے اُن کے ساتھ چند منٹ باتیں کرنے کے بعد رخصت لی۔ ہاشم بیگ گھر سے کچھ فاصلے تک اس کا ساتھ دینا چاہتا تھا۔ لیکن مراد علی ڈیوڑھی پر پہنچ کر رک گیا اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ یہیں رہیں!"

ہاشم بیگ نے اُس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مراد آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے! مجھے اب بھی یقین ہے کہ دکن اور میسور کی بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی اور ہمارے درمیان آگ اور خون کے دریا حائل نہیں ہوں گے۔ ہم ایک دوسرے پر گولی چلانے کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔"

مراد علی نے ایک کرب انگیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ شاہی مہمان خانے میں پہنچ چکا تھا۔ جہاں اس کے ساتھی سفر کے لیے تیار کھڑے تھے۔

○

سلطان کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے ہندوستان کی تمام عظیم ترین طاقتیں متحد ہو چکی تھیں۔ انگریزی سیاست کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ انھوں نے نظام اور مرہٹوں کو جنوبی ہندوستان کی وہ آخری دیوار مسمار کرنے پر آمادہ کر لیا تھا جو برسوں سے اجنبی اقتدار کے سیلاب کو روکے ہوئے تھی۔ جنگ ناگزیر ہو چکی تھی۔ شیرِ میسور پھر ایک بار اَن گنت بھیڑیوں، گیدڑوں اور گدھوں کے درمیان کھڑا تھا۔

باہر سے اُسے کسی اعانت کی اُمید نہ تھی۔ اس نے مغرب کی جارحیت کے خلاف عالمِ اسلام کو متحد کرنے کے لیے قسطنطنیہ میں سلطانِ ترکی کے پاس جو ایلچی بھیجے تھے وہ مایوس ہو کر واپس آ گئے تھے۔ دولتِ عثمانیہ اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہی تھی۔ روس کی ملکہ کیتھرین ثانی

اور آسٹریا کے شہنشاہ جوزف ثانی ترکی کے خلاف متحد ہو چکے تھے اور اُن کی طرف سے اس امر کا اعلان ہو چکا تھا کہ وہ عثمانی سلطنت کے مغربی ممالک پر قبضہ کر کے قسطنطنیہ کے تخت پر کیتھرین کے پوتے قسطنطین کو بٹھائیں گے۔

یورپ میں طاقت کا توازن قائم رکھنے کے لیے برطانیہ کا وزیر اعظم پٹ بگر فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان حالات میں عثمانی حکومت انگریزوں کی مرضی کے خلاف سلطان ٹیپو کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ سلطانِ ترکی کے ساتھ ٹیپو کے سفیروں کی ملاقات سے پہلے ہی قسطنطنیہ کے برطانوی سفیر سر رابرٹ اینسلی کو یہ ہدایات موصول ہو چکی تھیں کہ ترکی اور میسور کی حکومتوں کے درمیان معاہدہ کی بات چیت کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ چنانچہ برطانوی سفیر کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ترکی خلیفہ ٹیپو کو سلطان کے لقب، چند تحائف اور نیک دعاؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔

سلطان نے جو سفارت فرانس روانہ کی تھی اُس کی کارگزاری بھی حوصلہ شکن تھی۔ تولون کی بندرگاہ پر فرانس کی حکومت اور فرانس کے عوام نے سلطان کے سفیروں کا شاندار خیر مقدم کیا تھا اس کے بعد پیرس تک راستے کے ہر شہر میں فرانس کے عوام اور حکومت کے نمائندے ان کا پُرجوش استقبال کر رہے تھے۔ ان کے سفر کے لیے چھ گھوڑوں کی بگھی اور سواروں کا ایک حفاظتی دستہ مہیا کیا گیا تھا۔ راستے کے ہر بڑے شہر میں ان کے لیے آتش بازی کی نمائش کی جاتی تھی۔ لوگ کئی کئی میل سے انھیں دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ پیرس میں شاہ لوئس نے انتہائی گرمجوشی سے اُن کا خیر مقدم کیا لیکن جب دونوں سلطنتوں کے درمیان معاہدے کی بات چیت کی نوبت آئی تو اس نے یہ جواب دیا کہ ہم معاہدۂ مارسیلز کی خلاف ورزی کر کے انگریزوں کے ساتھ جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔

پیرس میں سلطان کی سفارت کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں فرانس خود انتہائی مخدوش حالات کا سامنا کر رہا تھا۔ حکومت کے ظلم و استبداد اور لوٹ کھسوٹ کے باعث عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا اور شہنشاہیت کے خلاف انقلابی طاقتیں حرکت میں آ چکی تھیں۔ حکومت کے بعض

بااثر ارکان انگریزوں کے خلاف سُلطان ٹیپو کے ساتھ معاہدہ کرنے کے حق میں تھے۔ لیکن اکثر مُلک کی اقتصادی بدحالی کے پیشِ نظر انگریزوں کے ساتھ جنگ کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ شاہِ فرانس کو یہ مشورہ دے چکے تھے کہ ہمیں اپنی افواج ہندوستان سے نکال کر ماریشس اور بوربون کے اڈوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ شاہِ فرانس نے سلطان کے سفیروں کا صرف ایک مُطالبہ خوشی سے منظور کیا اور وہ یہ کہ اس نے ایک تجربہ کار طبیب اور ایک جرّاح کے علاوہ رنگ سازوں، نجاروں، بافندوں، گھڑی سازوں اور دوسری صنعتوں کے ماہرین کی ایک جماعت کو اُن کے ساتھ میسُور جانے کی اجازت دے دی۔

○

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ٹیپو کے خلاف دفاعی اور جارحانہ معاہدہ کرنے کے باوجود نظام یا مرہٹے جنگ میں پہل کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ گزشتہ تجربات نے انھیں کافی محتاط بنا دیا تھا۔ اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اس مرتبہ جنگ کی ابتدا انگریزوں کی طرف سے ہو۔ انگریزوں کی افواج کیل کانٹے سے لیس ہوچکی تھیں۔ کورگ کے راجہ اور مالابار کے نائر پالیگاروں سے ان کے خفیہ معاہدے ہوچکے تھے۔ کرنول اور کڑپہ کے نواب جو میسور کے باج گزار تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ اطمینان دلا چکے تھے کہ جنگ شروع ہوتے ہی وہ سلطان کے خلاف بغاوت کا اعلان کردیں گے۔ اب معاہدہ منگلور کی دھجیاں اُڑانے کے لیے لارڈ کارنوالس کو صرف ایک بہانے کی ضرورت تھی اور وہ بہانہ پہلے سے موجود تھا۔ ٹراونکور کا راجہ راما ورما انگریزوں کی شہ پر ایک مدت سے سلطان کے خلاف مُعاندانہ سرگرمیوں میں مصروف تھا اور اس کے دستے میسُور کی سرحد پر کئی حملے کرچکے تھے۔ وہ کمپنی کا حلیف تھا اور انگریزوں نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنی فوج کی دو کمپنیاں اس کے حوالے کردی تھیں۔

سُلطان ٹیپو کو یہ معلوم تھا کہ ٹراونکور کے راجہ کے خلاف اس کی جوابی کارروائی انگریزوں کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت پیدا کرے گی۔ اس لیے وہ مصالحت کے لیے کوشاں تھا۔ لیکن راما ورما نے سلطان کی مصالحانہ کوششوں کے جواب میں اپنی جارحانہ سرگرمیاں تیز تر کردیں۔ سلطان نے انگریزوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے حلیف کو ان مُفسدانہ سرگرمیوں سے باز رکھیں۔ لیکن اس اپیل کا کوئی اثر نہ ہُوا۔

میر نظام اور نانا فرنویس کے ساتھ تسلی بخش معاہدے ہوتے ہی انگریزوں نے راما ورما کو تھپکی دی اور اس نے ٹراونکور کی دفاعی لائن کے سامنے ایک گھنا جنگل صاف کرنے کے بہانے ایک ہزار سپاہی میسور کی حُدود میں داخل کردیے۔ لیکن سرحد کے محافظ دستوں نے انھیں مار بھگایا۔ ایک مہینہ بعد ٹراونکور کے راجا نے دوسرا حملہ کیا لیکن اس کا بھی یہی حشر ہُوا۔ سلطان ٹیپو نے جنرل میڈوز گورنر مدراس کو اس صورتِ حال کی طرف متوجہ کیا اور اسے مصالحت کے لیے ایک مشن بھیجنے کی دعوت دی لیکن جنرل میڈوز ٹیپو کا پُرانا دشمن تھا اور اُسے لارڈ کارنوالس کی طرف سے بھی اس امر کی ہدایت موصول ہوچکی تھی کہ اب ہمارے لیے انتہائی سازگار حالات پیدا ہوچکے ہیں اور ہمیں کوئی ایسی کوشش نہیں کرنی چاہیے جو جنگ میں التوا کا باعث ہو۔ چنانچہ میڈوز نے صلح اور امن کے لیے سلطان کی اپیلوں کی طرف سے کان بند کرکے مزید تین بٹالین ٹراونکور کی سرحد پر بھیج دیں۔

راجہ ٹراونکور انگریزوں کی مالی امداد اور چرا کل، کالی کٹ، اکو کمشود اور مالابار کے نائر پالیگاروں کے تعاون سے میسُور کی سرحد پر ایک عظیم لشکر جمع کرچکا تھا۔ اور انگریز اس کی فوج کے آٹھ ہزار سپاہیوں کے لیے بہترین اسلحہ مہیا کرچکے تھے۔

ان حالات میں سُلطان ٹیپو کے لیے پھر ایک بار تلوار کا سہارا لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ شیرِ میسُور اپنے کچھار سے نکل کر میدان میں آگیا۔ ٹراونکور کی فوج میسُور کے طوفانی دستوں کے سامنے تنکوں کا انبار ثابت ہُوئی۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر ٹراونکور کی سرحدی چوکیوں اور قلعوں پر میسُور کے پرچم لہرا رہے تھے اور راجا کے سپاہی بھیڑوں اور بکریوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ کرنل ہارٹلے کی ماتحتی میں انگریزوں کی پانچ کمپنیاں اپنے بارُود اور اسلحہ کے ذخیرے چھوڑ کر نگور میں

پناہ لے رہی تھیں۔ ایک انگریز پرچہ نویس میدان جنگ سے بمبئی اور مدراس جنرل میڈوز کو لکھ رہا تھا: "میں نے کبھی ایسی شرمناک پسپائی نہیں دیکھی۔"

ٹراونکور کی دفاعی لائن کے پرخچے اڑانے کے بعد سلطان ٹیپو کرنگور کی طرف بڑھا۔ کرنل ہارٹلے نے وہاں بھی پسپائی اختیار کی اور سلطان نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلطان نے آئیکوٹہ اور چند اور قلعوں پر قبضہ کر لیا اب سارا ٹراونکور سلطان کے قدموں میں تھا۔ راما ورما کی فوج سے کسی میدان میں مزاحمت کی توقع نہ تھی۔ لیکن ویراپولی پہنچ کر سلطان کو یہ اطلاع ملی کہ لارڈ کارنوالس میسور کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکا ہے اور اس کے اتحادی کئی محاذوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ سلطان کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا:

بارھواں باب

مدراس گورنمنٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں کمپنی کے بڑے بڑے فوجی افسروں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ گورنر مدراس جنرل میڈوز جسے کمپنی کی افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا تھا۔ بمبئی اور کلکتہ کی انگریزی افواج کے نمائندوں کے مشورہ سے جنگ کا پلان تیار کر رہا تھا کمرے کے درمیان ایک کشادہ میز پر جنوبی ہندوستان کا نقشہ کھلا ہوا تھا اور جنرل میڈوز اور دوسرے فوجی افسر میز کے گرد کھڑے تھے۔

جنرل میڈوز نے کہا "میرا اولین مقصد کوئمبٹور اور پائین گھاٹ کے علاقوں پر قبضہ کرنا ہے میسور کے اہم شہروں اور قلعوں کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ہمیں ان زرخیز علاقوں سے رسد حاصل کرنا بہت آسان ہوگا۔ بمبئی کی فوج کی پیش قدمی مالابار کے ساحل سے شروع ہوگی اور وہ ساحل کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد مدراس کی فوج سے آملیں گی۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ٹیپو ہماری پیش قدمی روکنے کے لیے کرناٹک کو میدانِ جنگ بنانے کی کوشش کرے۔ اس لیے جنرل کیلی کارومنڈل کے وسط سے بارہ محل کی طرف پیش قدمی کریں گے تاکہ اگر کرناٹک کو خطرہ پیش آئے تو اُسے بروقت مدد دی جاسکے۔ مدراس سے کوچ کرنے کے بعد ہمارا پہلا مستقر ترچناپلی کے آس پاس ہوگا۔"

گورنر کا پرائیویٹ سیکرٹری کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے سلام کرنے کے بعد ایک مراسلہ پیش کیا۔ جنرل میڈوز نے خط کھول کر پڑھا اور نڈھال سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ فوج کے افسر تذبذب اور پریشانی کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

جنرل میڈوز نے قدرے توقف کے بعد کہا: "جنٹلمین! یہ راجا ٹراونکور کی کارگزاری کے متعلق ایک تازہ رپورٹ ہے۔ اس کی فوج ہر محاذ سے بھاگ رہی ہے۔ ہم نے جو اسلحہ اور بارود مہیا کیا تھا وہ دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے۔ کرنل ہارٹلے نے لکھا ہے اگر ٹیپو کی توجہ فوراً دوسرے محاذوں پر مبذول نہ کی گئی تو وہ کسی دقت کے بغیر سارے ٹراونکور پر قبضہ کر لے گا۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پسپائی کی دوڑ میں ہمارے سپاہی ٹراونکور کے سپاہیوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں کل صبح تک پیش قدمی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے!"

سیکرٹری نے کہا: "یور ایکسی لینسی! نواب محمد علی کو کیا جواب دیا جائے؟"

جنرل میڈوز نے تلملا کر کہا: "وہ ابھی تک بیٹھا ہُوا ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ آپ میٹنگ سے فارغ ہو کر اُس سے ملاقات کریں گے۔"

"لیکن وہ میرا وقت ضائع کرنے پر کیوں مُصر ہے۔ جب سے میں نے چارج لیا ہے وہ کئی بار ملاقات کر چکا ہے۔ جاؤ اُسے کہو میں اس وقت فارغ نہیں ہُوں۔ اگر وہ چند گھنٹے اور انتظار نہیں کر سکتا تو واپس چلا جائے۔"

سیکرٹری نے کہا: "یور ایکسیلینسی اُسے مایوس کرنا آسان نہیں۔ وہ شام تک آپ کے انتظار میں بیٹھا رہے گا۔ مدراس کے گورنر سے ہر تیسرے چوتھے روز ملاقات کرنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی ہے۔ وہ کمپنی کا پرانا وفادار ہے اور مدراس کے سابق گورنروں کی یہ ہدایات ہیں کہ اُسے بلاوجہ ناراض نہ کیا جائے۔"

جنرل میڈوز نے کرسی سے اُٹھ کر کہا: "جنٹلمین میں ابھی آتا ہُوں۔"

کرناٹک کا کٹھ پتلی نواب محمد علی والاجاہ ملاقات کے کمرے میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کے چہرے

پر پریشانی اور اضطراب کے آثار تھے۔ جنرل میڈوز کمرے میں داخل ہُوا اور اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر آگے بڑھا اور جنرل میڈوز نے ایک حقارت آمیز تبسم کے ساتھ سلام کہہ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

محمد علی نے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے ہُوئے کہا: "حضور کا اقبال بلند ہو اور حضور کے دشمن ذلیل و خوار ہوں!"

"تشریف رکھیے نواب صاحب! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو بہت انتظار کرنا پڑا۔ میں بہت مصروف تھا۔"

محمد علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "عید کا چاند دیکھ کر ماہ رمضان کی کلفتیں بھول جاتی ہیں۔"

"عید کب ہے؟" جنرل میڈوز نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"جناب آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ میرے لیے عید کا چاند ہیں۔ یعنی آپ کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔"

"اوہ میں سمجھا تھا کہ عید آگئی ہے۔"

"جناب حقیقی عید تو اُس دن آئے گی جب آپ کی فوجیں سرنگاپٹم پہنچ جائیں گی میں آپ کی فتح کی بشارت لے کر آیا ہُوں۔"

"نواب صاحب آپ فتح کی باتیں کر رہے ہیں ابھی تو جنگ بھی نہیں شروع ہُوئی۔"

"واہ جناب! آپ کا خیال ہے کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ اب تو خدا کے فضل سے ٹراونکور کا لشکر مالابار میں داخل ہو چکا ہوگا۔"

جنرل میڈوز نے جھنجھلا کر کہا: "ٹراونکور کا لشکر بھیڑوں اور بکریوں کی طرح بھاگ رہا ہے۔"

چند ثانیے محمد علی کے مُنھ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اس نے اچانک اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سونے کا تعویذ نکالا اور آگے بڑھ کر جنرل میڈوز کے گلے میں ڈال دیا۔

"یہ کیا ہے؟" جنرل میڈوز نے اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب یہ تعویذ ہے۔ آپ اسے گلے سے نہ اتاریں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی برکت سے ہر میدان میں آپ کو فتح ہو گی۔ یہ مجھے ایک بزرگ نے دیا ہے جس کی ہر بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ اب آپ خدا کا نام لے کر حملہ کر دیں۔ دنیا کی کوئی طاقت سرنگاپٹم تک آپ کا راستہ نہیں روک سکے گی۔ میں نے سنا ہے کہ فرانسیسی پانڈی چری خالی کر رہے ہیں۔ یہ آپ کی پہلی فتح ہے۔"

جنرل میڈوز نے انتہائی نفرت اور حقارت سے محمد علی کی طرف دیکھا اور کہا "نواب صاحب! ہمیں ڈر ہے کہ اس محاذ پر جنگ شروع ہوتے ہی کہیں ایسے حالات پیدا نہ ہو جائیں کہ آپ کو ارکاٹ خالی کرنا پڑے"۔

محمد علی چند ثانیے سکتے کے عالم میں جنرل میڈوز کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "گورنر صاحب! اگر ٹراونکور سے کوئی بری خبر آئی ہے تو آپ کو اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہیے سلطان ٹیپو اب اکیلا ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"میں بالکل پریشان نہیں ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنا قیمتی وقت باتوں میں ضائع کرنے کی بجائے جنگ کی تیاری کریں۔"

"جنرل صاحب میں یہی تو پوچھنے آیا تھا کہ میری فوج کو کوچ کا کب حکم ملے گا؟"

"آپ کی فوج کو کوچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اگر صرف کرناٹک کی حفاظت کر سکیں تو یہ بھی ہماری بہت بڑی مدد ہو گی۔ اب مجھے اجازت دیجیے میں بہت مصروف ہوں۔"

جنرل میڈوز یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نواب محمد علی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کرناٹک کی حفاظت کے مسئلے نے اس کے خیالات پریشان کر دیے تھے۔ وہ بادل ناخواستہ اٹھا اور جنرل میڈوز اس کے ساتھ مصافحہ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے سے باہر اپنے سکرٹری کو دیکھ کر جنرل میڈوز نے محمد علی کا عطا کردہ تعویذ نوچ کر اس کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔ "یہ اپنے پاس رکھو اور اس بے وقوف کو یہ سمجھاؤ کہ وہ جنگ کے اختتام تک مجھے پریشان کرنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ گدھا مجھے فتح کی خبر سنانے آیا تھا"۔

○

مئی ۱۷۹۰ء کے آخری ایام میں جنرل میڈوز نے مدراس سے پیش قدمی کی اور ترچنا پلی کے قریب ڈیرے ڈال دیے۔ جنرل میڈوز کی کمان میں پندرہ ہزار سپاہی بہترین ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس سے قبل کسی ایک محاذ پر انگریزوں کی اتنی بڑی فوج دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ سلطان ٹیپو کے لیے اب کسی علاقے کے شہروں یا قلعوں کی حفاظت کی بجائے پوری سلطنت کی حفاظت کا مسئلہ تھا اور میسور کی تمام سرحدوں پر دشمن کے اجتماع نے اسے اپنے لشکر کو کئی حصوں میں تقسیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جنرل میڈوز نے ۱۵ جون کو کرور کی طرف پیش قدمی کی اور چند ہفتوں میں کسی قابل ذکر مزاحمت کا سامنا کیے بغیر کرور اور دھارا پورم کے علاوہ چند اور قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

سلطان ٹیپو دشمن کے عزائم سے خبردار ہوتے ہی ٹراونکور کا محاصرہ چھوڑ کر کوئمبٹور پہنچ گیا۔ اس اثنا میں دوسرے محاذوں پر بھی انگریزی افواج جمع ہو رہی تھیں۔ اور سلطان نے قریباً ایک ہفتہ کوئمبٹور میں قیام کرنے کے بعد ایک وسیع پیمانے پر جنگ کے لیے تیاری کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے سرنگاپٹم کا رخ کیا۔ کوئمبٹور سے کوچ کرتے وقت سلطان نے اپنے چار ہزار سوار میر معین الدین عرف سید صاحب کی کمان میں دیے اور اسے ہدایت کی کہ تم اکا دکا حملوں سے دشمن کو ہراساں کر کے اس کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کرو تاکہ مجھے تیاری کے لیے وقت مل جائے۔

میر معین الدین کی مختصر سی فوج کسی میدان میں ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھی لیکن برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا اور اگر وہ سلطان کی ہدایات پر عمل کرتا تو یہ چار ہزار سوار جو گوریلا جنگ کے ماہر سمجھے جاتے تھے دشمن کے رسل و رسائل کا نظام درہم برہم کر کے اس کے لیے بے شمار رکاوٹیں پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن میر معین الدین جیسے جہاندیدہ سپاہی نے جس نااہلیت اور بزدلی کا مظاہرہ کیا وہ سلطان کی فوج کے کسی ادنیٰ افسر سے بھی غیر متوقع تھی۔ اس

نے کرنل فلائڈ کے دستوں کے ساتھ چند جھڑپوں کے بعد بھوانی کے شمال کی طرف پسپائی اختیار کی اور جنوب کے تمام علاقے دشمن کے لیے کھُلے چھوڑ دیے۔

میر معین الدین کی یہ کوتاہی فوجی لحاظ سے میسور کے لیے انتہائی تباہ کن نتائج پیدا کر سکتی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے جولائی کے مہینے میں برسات کا موسم شدّت اختیار کر چکا تھا۔ جنرل میڈوز نے میدان خالی دیکھ کر کوئمبٹور پر قبضہ کر لیا اور کرنل اسٹورٹ کو پال گھاٹ کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا لیکن موسم برسات کی شدّت کے باعث وہ زیادہ دُور نہ جا سکا۔ اگست کے دوسرے ہفتے کرنل اسٹورٹ نے دوبارہ پیش قدمی کی اور ڈنڈیگل کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ ایک بلند چٹان پر واقع تھا اور دفاعی لحاظ سے سلطنتِ میسور کے مضبوط قلعوں میں سے ایک تھا۔ قلعے کی محافظ فوج کی تعداد آٹھ سو سپاہیوں پر مشتمل تھی اور ان کا کمانڈر سید عباس سُلطان کا ایک نڈر سپاہی تھا۔ انگریزی توپ خانہ چار دن تک قلعے پر آگ برساتا رہا اور پانچویں دن کرنل اسٹورٹ نے دھاوے کا حکم دیا۔ لیکن اُسے شدید نقصانات اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا۔ سید عباس آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن اُس کے بیشتر سپاہی اور افسر کمک نہ پہنچنے کے باعث ہمّت ہار چکے تھے۔ چنانچہ ۲۲ اگست کے دن اس نے اس شرط پر قلعے کا دروازہ کھول دیا کہ قلعہ خالی کرتے وقت اس کے سپاہیوں کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

اس عرصے میں جنرل میڈوز کی دوسری افواج درّہ گجل ہٹی کے آس پاس کے بیشتر اہم قلعوں پر قبضہ کر چکی تھیں۔ اس درّے کی اہم دفاعی چوکیوں پر قبضہ کر لینے کے بعد انگریزوں کے ہاتھ میسور کی شہ رگ تک پہنچ چکے تھے۔ کوئمبٹور کا زرخیز صوبہ جہاں سے انھیں فراوانی کے ساتھ رسد مل سکتی تھی۔ اب مکمل طور پر ان کے قبضے میں تھا اور وہ کرور سے لے کر گجل ہٹی کے درّے تک چوکیاں قائم کر چکے تھے۔ دوسرے محاذ پر کرنل کیلی کی کمان میں کلکتہ کی دس ہزار فوج جسے بارہ محل فتح کرنے کی مہم سونپی گئی تھی، اگست کے شروع میں کنجی درم پہنچ چکی تھی جو

اسٹورٹ کو تین اطراف سے سرنگاپٹم کی طرف بڑھنے کے لیے اب صرف مالابار کے محاذ پر بمبئی کی افواج کی آمد کا انتظار تھا۔ میسور کی شمالی سرحد پر نظام اور مرہٹوں کی افواج جمع ہو رہی تھیں لیکن جنگ کے ابتدائی دور میں اُن کی حیثیت خاموش تماشائیوں سے زیادہ نہ تھی۔

لارڈ کارنوالس اور جنرل میڈوز کی پے در پے یاد دہانیوں کے باوجود جنگ کے میدان میں کودنے سے نانا فرنویس اور میر نظام علی کی ہچکچاہٹ کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے کسی کو سلطان ٹیپو کے صحیح عزائم کا علم نہ تھا۔ نانا فرنویس اور میر نظام علی کو اگر اس بات کا یقین ہوتا کہ وہ کسی خطرے کا سامنا کیے بغیر پیش قدمی کر سکتے ہیں تو انھیں فیصلہ کرنے میں کوئی دقّت محسوس نہ ہوتی۔ لیکن سُلطان ٹیپو نے سرنگاپٹم پہنچ کر جہاں جنگی تیاریوں کے لیے دو ماہ کا وقفہ حاصل کر لیا تھا۔ وہاں نظام اور مرہٹوں کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ اگر سُلطان نے سرنگاپٹم سے نکل کر جنوب میں انگریزوں کا سامنا کرنے کی بجائے شمال کی طرف توجّہ پھیر دی تو ان کی حالت قابلِ رحم ہو گی۔

○

مہابت جنگ کی کمان میں حیدرآباد کا لشکر رائچور کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہُوئے تھا اور اُسے ضروری ہدایات دینے کے لیے میر نظام علی بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ ایک دن میر نظام علی اپنے خیمے میں مہابت جنگ کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا کہ ایک افسر خیمے میں داخل ہُوا اور اس نے کورنش بجا لانے کے بعد کہا: "عالی جاہ! سر جان کینا وے پہنچ گئے ہیں اور انھوں نے آتے ہی حضور کی خدمت میں باریابی کی اجازت طلب کی ہے؟"

میر نظام علی نے بد دل ہو کر افسر کی طرف دیکھا اور کہا: "بہت اچھا۔ اسے لے آؤ۔" پھر وہ مہابت جنگ کی طرف متوجّہ ہُوا۔ "اس مرتبہ تمھاری ہار یقینی تھی۔ لیکن کینا وے نے شطرنج

کھیلتے نہیں دیکھنا چاہیے۔"

مہابت جنگ کے تالی بجانے پر ایک نوکر خیمے میں داخل ہُوا اور نظام کے اشارے سے شطرنج کا سامان اٹھا کر لے گیا۔

نظام نے جھک کر پاس ہی قالین پر پڑے ہُوئے کاغذات میں سے ایک نقشہ اٹھایا اور اسے تپائی پر پھیلاتے ہُوئے کہا: "اس مرتبہ وہ کمبخت ہمیں بہت پریشان کرے گا۔"

مہابت جنگ نے مسکرا کر جواب دیا: "مجھے یقین ہے کہ آپ اسے زیادہ پریشان کر سکیں گے۔"

نظام نے کہا: "ہمیں اپنی پیش قدمی میں تاخیر کے لیے کوئی معقول وجہ سوچ لینی چاہیے۔"

مہابت جنگ نے جواب دیا: "جناب گزشتہ تین ہفتوں میں کیناوے کے پانچ ایلچی میرے پاس آ چکے ہیں اور میرا عقل جو بہانے تلاش کر سکتی تھی وہ انھیں پیش کیے جا چکے ہیں اب تو میں یہ سوچ رہا ہُوں کہ مجھے اس ملاقات سے بچنے کے لیے بیماری کے بہانے اپنے خیمے میں لیٹ جانا چاہیے۔"

میر نظام علی ہنس پڑا۔

کیناوے خیمے میں داخل ہُوا۔ مہابت جنگ نے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا لیکن میر نظام علی نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

مہابت جنگ نے ایک کرسی گھسیٹ کر آگے کر دی اور میر نظام علی نے کہا: "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اس موسم میں سفر کی تکلیف اٹھانی پڑی۔ تشریف رکھیے!"

کیناوے نے کرسی پر بیٹھتے ہُوئے کہا: "موجودہ حالات میں میرے لیے حیدر آباد ٹھہرنا زیادہ تکلیف دِہ تھا۔ مجھے اپنے کسی خط کا تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ جنرل میڈوز اور لارڈ کارنوالس آپ کی تاخیر کے باعث بہت پریشان ہیں۔ فرمایئے آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

میر نظام علی نے جواب دیا: "اگر ہری پنت آج پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کر لے تو ہماری طرف سے ایک لمحہ کے لیے بھی تاخیر نہیں ہو گی۔ ہم تو یہاں بیٹھے بیٹھے تنگ آ چکے ہیں۔"

"یُور ہائی نس، سر چارلس میلیٹ نے مجھے یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہری پنت اور نانا فرنویس اس تاخیر کی ذمّہ داری آپ پر ڈالتے ہیں۔ آپ نہایت قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کوئمبتور کا سارا صُوبہ ہمارے قبضے میں آ چکا ہے۔ مشرق میں ہماری افواج بارہ محل پر قبضہ کرنے والی ہیں۔ اور چند دنوں تک بمبئی کی فوج مالا بار میں داخل ہو جائیگی۔ اگر آپ فوراً حملہ کر دیں تو سلطان ٹیپو کو سرنگا پٹم سے باہر کسی محاذ پر جوابی کارروائی کی جرأت نہیں ہو گی۔"

نظام نے کہا: "آپ کا خیال ہے کہ ٹیپو اب سرنگا پٹم میں ہی بیٹھا رہے گا؟"

"ہاں اگر اس میں لڑائی کی ہمت ہوتی تو وہ کوئمبتور جیسا زرخیز صُوبہ ہمارے لیے کھلا چھوڑ کر سرنگا پٹم میں پناہ نہ لیتا۔"

"آپ کا خیال غلط ہے۔ ٹیپو سرنگا پٹم میں بیٹھ کر آپ کا انتظار نہیں کرے گا۔ اُسے تیاری کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ وہ ایک خوفناک آندھی کی طرح اچانک میسور سے نکلے گا اور ہم ہر محاذ پر اپنی سابقہ تجاویز میں ردّو بدل کی ضرورت محسوس کریں گے۔"

"یور ہائی نس، آپ کو ٹیپو کی قوت سے اس قدر خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ فوراً حملہ کر دیں تو اُسے سرنگا پٹم سے نکلنے کی جُرأت نہیں ہو گی اور اگر اس نے یہ جرأت کی بھی تو اس کا رُخ شمال کی بجائے جنوب کی طرف ہو گا اور آپ کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر سرنگا پٹم پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ آپ سے پہلے ہمارے ساتھ نپٹ لینا بہتر خیال نہیں کرے گا؟"

"آپ کا خیال ہے کہ وہ ہماری طرف سے آنکھیں بند کر کے آپ پر حملہ کرے گا؟"

"ہاں اور اگر آپ نے ان دنوں سر چارلس میلیٹ سے ملاقات کی ہوتی تو وہ آپ کو بتاتے کہ ہری پنت کا بھی یہی خیال ہے۔"

"یور ہائی نس۔ مجھے معاف کیجیے ٹیپو اتنا نادان نہیں۔ اُسے ہماری قوت کی برتری کا احساس ہے"

اور یہی وجہ ہے کہ اُسے سرنگاپٹم سے باہر نکل کر ہمارا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہ حقیقت اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوگی کہ جب وہ شمال کا رُخ کرے گا تو اس کے تنگبھدرہ پہنچنے سے پہلے ہم سرنگاپٹم پہنچ چکے ہوں گے۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ سرنگاپٹم پہنچ جائیں گے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت تک ہمارے سامنے اپنے سپاہیوں کی لاشیں گننے کے سوا کوئی کام نہیں ہوگا۔"

کیناوے نے بددل سا ہو کر کہا۔ "جناب آپ جنگ میں ہمارے حلیف ہیں اور جنگ کو اختتام تک پہنچانے کے لیے ہم سب پر ایک سی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آپ اور مرہٹوں کے تذبذب کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جنگ لمبی ہو جائے اور ہم آپ سے مایوس ہو کر ٹیپو کے ساتھ صلح کر لیں اور اپنے اتحادیوں کو ہمیشہ کے لیے ٹیپو کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مزید چند برس تک تیاری کرنے کے بعد ہم میں سے ایک ایک کو نگل جائے گا۔"

میر نظام علی نے قدرے نرم ہو کر کہا۔ "آپ کو ہمارے متعلق اس قدر بدظن نہیں ہونا چاہیے۔"

"یور ہائی نس۔ میں بدظن نہیں ہوں لیکن میں آپ کے تذبذب کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔"

"ہمارا تذبذب صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ ٹیپو سرنگاپٹم سے باہر نہیں نکلتا۔ جب تک ہمیں اس کے عزائم کا صحیح علم نہیں ہوتا ہم جنگ کا کوئی نقشہ تیار نہیں کر سکتے۔"

"یور ہائی نس۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ بارہ محل اور مالا بار کا خیال چھوڑ کر آپ کی طرف توجہ کرے لیکن فرض کیجیے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو ہی جائے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ سرے سے جنگ میں حصہ ہی نہ لیں۔"

میر نظام علی نے جواب دیا۔ "اس صورت میں ہماری جنگ سراسر مدافعانہ ہوگی۔ ہمیں سرنگاپٹم کے متعلق سوچنے کی بجائے پونا اور حیدرآباد کی فکر کرنا پڑے گی۔ ـــــ ہم پوری قوت سے لڑیں گے لیکن ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم میسور کی حدود کے اندر دشمن کے نرغے میں آنے کی بجائے کسی ایسی جگہ اس کے ساتھ مقابلہ کریں جہاں سے ہماری رسد اور کمک کے راستے محفوظ ہوں۔ یہ آپ کی خوش قسمتی تھی کہ ٹیپو کوئمبتور میں آپ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور آپ نے کسی دقت کے بغیر ایک وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا ہے لیکن اگر ہم میسور کی سرحد پر اپنی فوجیں جمع نہ کرتے تو ٹیپو ہر قدم پر پوری شدت کے ساتھ آپ کا مقابلہ کرتا۔"

کیناوے نے کہا۔ "تو آپ کا فیصلہ یہی ہے کہ جب تک سرنگاپٹم سے ٹیپو کی فوج نقل و حرکت نہیں کرتی آپ یہیں پڑے رہیں گے؟"

"میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم دشمن کے ارادے سے باخبر ہونے سے پہلے اس کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی نہیں کر سکتے۔"

"فرض کیجیے کہ اگر ٹیپو نے سرنگاپٹم میں ہی اپنی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا تو آپ کا رویہ کیا ہوگا؟"

نظام مسکرایا۔ "آپ حیدر علی کے بیٹے کو نہیں جانتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد سرنگاپٹم سے کوچ کرے گا اور اس کی پہلی ضرب خواہ وہ ہم میں سے کسی پر ہو، بہت شدید ہوگی۔ میں مرہٹوں کا ذمہ نہیں لے سکتا لیکن میری طرف سے آپ لارڈ کارنوالس کو یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ میری افواج چند دن کے اندر اندر میدان میں آ جائیں گی۔ اگر شمال کی طرف اس کے متوقع حملے کے پیش نظر ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا تو آپ کی افواج کو بڑھنے کا موقع مل جائے گا اور اگر اس نے جنوب کی طرف پیش قدمی کی تو ہم شمال کے تمام علاقے تاخت و تاراج کر دیں گے۔ جنرل میڈوز کو یہ پیغام دیجیے کہ وہ اپنی پیش قدمی جاری رکھے تاکہ ٹیپو کو مزید تیاریوں کا موقع نہ ملے۔"

تھوڑی دیر بعد مسٹر کیناوے میر نظام علی سے رخصت ہو کر مرہٹوں کے پڑاؤ کا رُخ کر رہا تھا، اور میر نظام علی مہابت جنگ سے یہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے یقین ہے کہ اب چند دن تک یہ لوگ ہمیں پریشان نہیں کریں گے۔ لیکن تمہیں تیار رہنا چاہیے۔ ٹیپو اب زیادہ عرصہ سرنگاپٹم میں نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر اس نے جنوب کی طرف پیش قدمی کی تو ہمیں اس بات کا ثبوت دینا پڑے گا کہ ہم مرہٹوں سے پیچھے نہیں رہیں گے۔"

تیرھواں باب

"جین! جین!! نیچے آؤ!" لیگرانڈ نے مکان کے صحن سے آواز دی۔ جین لیگرانڈ کی آواز سُن کر گیلری میں نمودار ہوئی۔ نیچے صحن میں لیگرانڈ کے ساتھ ایک عمر رسیدہ آدمی کو دیکھ کر وہ چند ثانیے تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی اور پھر کیپٹن فرانسسک کو پہچان کر زینے کی طرف بڑھی اور تیزی سے نیچے اُترنے لگی۔

کپتان فرانسسک نے آگے بڑھ کر اُس کے ساتھ مصافحہ کیا اور جین نے اُس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی: "آپ کب تشریف لائے؟ ــــ آپ اتنا عرصہ کہاں تھے؟ ــــ ہم سوچا کرتے تھے کہ آپ ہمیں بھول گئے۔ فرانس میں ان دنوں کیا ہو رہا ہے؟ یہاں ایک عرصے سے عجیب و غریب خبریں آ رہی ہیں؟"

لیگرانڈ نے کہا "ہم بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔"

وہ نچلی منزل کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کپتان فرانسسک نے کہا "میں آج ہی سرنگا پٹم پہنچا ہوں اور آتے ہی میں نے موسیو لالی سے تمہارا پتا کیا تھا۔ خوش قسمتی سے لیگرانڈ بھی کیمپ میں موجود تھا۔ میں تمہارے لیے بہت اچھی خبر لایا ہوں لیکن اس سے پہلے میں تمہیں شادی کی مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں عمداً خط نہیں لکھا

انسپکٹر برنارڈ کو شبہ ہو گیا تھا کہ میں نے تمھاری مدد کی ہے اور اس نے پانڈی چری سے واپس جاتے ہی مجھے انقلابی جماعت کے ساتھ ہمدردی رکھنے کے الزام میں قید کروا دیا تھا۔

بسٹیل کے قید خانے میں وہ اکثر مجھ سے ملا کرتا تھا اور ہر بار یہ کہا کرتا تھا کہ اگر تم تمام واقعات ظاہر کر دو اور مجرموں کو پکڑوانے میں ہمارے ساتھ تعاون کرو تو تمھیں آزاد کر دیا جائے گا۔ میرے انکار پر اس نے مجھے ہر ممکن اذیت پہنچانے کی کوشش کی۔ بسٹیل کی ایک زمین دوز اور تنگ و تاریک کوٹھڑی میں میرے لیے قید کے آخری چند مہینے انتہائی کرب انگیز تھے۔ باہر سے کسی دوست رشتہ دار کو میرے ساتھ ملاقات یا نامہ و پیام کی اجازت نہ تھی۔ جو پہرے دار میرے لیے دو وقت کھانا لے کر آتے تھے انھیں بھی میرے ساتھ بات چیت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ پھر ایک دن حکومت کے باغیوں نے بسٹیل کے دروازے توڑ دیے اور مجھے معلوم ہوا کہ فرانس میں انقلاب آ چکا ہے۔"

جین نے مغموم لہجے میں کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ہمارے لیے اتنی اذیت اٹھائی اور ہم سرنگا پٹم میں محفوظ تھے۔ اگر آپ پولیس کو یہ بتا دیتے کہ ہم یہاں پہنچ چکے ہیں تو وہ شاید آپ کو اس قدر اذیت نہ پہنچاتے۔"

فرانسسک نے کہا "اگر میں ایک بات ظاہر کر دیتا تو وہ مجھ سے باقی تمام باتیں اُگلوا لیتے۔ مارسیلز سے پانڈی چری تک کے سفر کے حالات بتا کر میں ان تمام دوستوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہوتا جنھوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تھا۔ یہاں تک کہ ماریشس میں لیگرانڈ کے بہنوئی کو بھی ایک پریشان کن صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ پھر اگر میں یہ ذلت گوارا کر لیتا تو بھی پیرس کی پولیس سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ مجھے کسی اچھے سلوک کا مستحق سمجھیں گے۔

لیکن یہ تمام باتیں ماضی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ میں تمھیں حال اور مستقبل کے متعلق کچھ بتانے آیا ہوں۔ قید سے رہا ہوتے ہی میں انقلابیوں کے جن لیڈروں سے ملا وہ سب تمھارے بھائی کو جانتے تھے اور جب میں نے انھیں یہ بتایا کہ تم زندہ اور سلامت ہو اور میں نے تمھاری مدد کرنے کے جرم میں قید کاٹی ہے تو وہ مجھے اپنا مخلص ساتھی سمجھنے لگے تھے۔ وہ لیگرانڈ کو بھی اپنا دوست

سمجھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ تم فوراً فرانس واپس آجاؤ۔ حکومت نے تمھاری جو جائداد ضبط کی تھی وہ واگزار کر دی جائے گی۔ موسیو لالی کے نام انھوں نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ وہ تمھیں کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے روانہ کر دیں۔ تمھاری جلا وطنی کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب جب تم پیرس میں پہنچو گی تو ہزاروں انسان تمھارے لیے چشم براہ ہوں گے۔ میں یہاں موسیو لالی کے ساتھ بات چیت کر چکا ہوں اور انھیں لیگرانڈ کے واپس جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں جس جہاز پر پانڈی چری پہنچا تھا وہ واپسی پر منگلور پہنچ کر ہمارا انتظار کرے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم دو دن کے اندر اندر یہاں سے منگلور روانہ ہو جائیں لیکن میں لیگرانڈ کے تذبذب اور پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اس نے ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔"

جین سرنگاپٹم کی فضا میں اپنے وطن کی خوشگوار ہواؤں کے جھونکے محسوس کر رہی تھی۔ وہ پیرس کے کشادہ بازاروں کی سیر کر رہی تھی۔ وہ اپنے اجڑے ہوئے گھر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے نوکر اس کے سامنے کھڑے تھے اور اس کی سہیلیاں آگے بڑھ بڑھ کر اس سے گلے مل رہی تھیں۔ پھر اچانک اُسے سرنگاپٹم کا ایک گھر یاد آیا اور پیرس کے دلکش نظارے اس کی آنکھوں سے محو ہونے لگے۔ وہ تصور کے عالم میں انور، مراد اور اُن کی والدہ سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کا تبسم رخصت ہو چکا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔

کپتان فرانسسک نے کہا: "جین تم کیا سوچ رہی ہو۔ میں تمھارے قہقہے سننے کی بجائے تمھاری آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا ہوں؟"

جین نے چونک کر فرانسسک کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر لیگرانڈ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

لیگرانڈ نے کہا: "موسیو فرانسسک میری گردن آپ کے احسانات کے بوجھ سے ہمیشہ جھکی رہے گی لیکن موجودہ حالات میں مَیں فرانس جانے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

فرانسسک کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا اور اس نے بدحواس ہو کر کہا: "لیکن کیوں؟"

لیگرانڈ نے جواب دیا: "میں جنگ کے اختتام تک فرانس نہیں جا سکتا۔ میں ان لوگوں کو پیٹھ نہیں دکھا سکتا جنھوں نے ایک غریب الوطن کو اپنا دوست، اپنا بھائی اور اپنا بیٹا سمجھ کر سہارا دیا۔ میری زندگی کے تاریک ترین دور میں سرنگاپٹم میرے لیے روشنی کا مینار تھا۔ اور آج سرنگاپٹم ان لاکھوں انسانوں کی آخری اُمید ہے جو میری طرح امن و سکون، عزت اور آزادی کی زندگی کے طلبگار ہیں۔ ٹیپو اب میرے نزدیک ایک اجنبی حکمران نہیں ہے۔ بلکہ میں اس کے لیے اپنے سینے میں اطاعت اور محبت کے وہی جذبات محسوس کرتا ہوں جو اس ملک کے ہر باشندے کے سینے میں موجزن ہیں۔ میرے نزدیک اس کی فتح انسانیت کی فتح اور اس کی شکست انسانیت کی شکست ہو گی۔"

کپتان فرانسسک نے لاجواب سا ہو کر کہا: "اگر تمھارے جذبات یہ ہیں تو میں اس سلسلے میں مزید بحث کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تمھاری جگہ میں ہوتا تو میرا بھی یہی فیصلہ ہوتا۔ موسیو لالی نے مجھے کہا تھا کہ تم ایک اچھے سپاہی بن سکتے ہو اور میسور میں اچھے سپاہیوں کے لیے ترقی کے دروازے کھلے ہیں۔"

لیگرانڈ نے کہا: "میرا یہ مطلب نہیں کہ میں مستقل طور پر یہاں رہنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ بلکہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہم اپنے وطن چلے جائیں گے۔"

فرانسسک نے کہا: "میں یہ کوشش کروں گا کہ تمھاری غیر حاضری میں تمھاری جائداد کی حفاظت کی جائے۔ اس سلسلے میں مجھے شاید تمھاری طرف سے کسی تحریر کی ضرورت پڑے۔"

لیگرانڈ نے جواب دیا: "ہم دونوں آپ کو مختار نامہ لکھ دیں گے۔"

"لیکن تمھیں اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔ میں کل کا دن یہاں ہوں گا اور اگر اس عرصہ میں تمھاری رائے بدل جائے تو مجھے تم کو اپنے ساتھ لے جانے میں خوشی ہو گی۔ ابھی تک جین نے اس مسئلے میں کچھ نہیں کہا۔"

جین نے کہا: "لیگرانڈ کا فیصلہ میرا فیصلہ ہے۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں"

کی فوج میں عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

فرانسسک نے کہا: "انور علی ابھی تک نہیں آیا۔ میں چاہتا تھا کہ آج شام سے پہلے پہلے سرنگا پٹم میں چند اور دوستوں کو دیکھ لیتا۔"

جین نے پوچھا: "انور علی کو آپ کی آمد کی اطلاع مل چکی ہے؟"

"ہاں میں نے کیمپ سے روانہ ہوتے وقت اُسے پیغام بھیج دیا تھا۔"

لیگرانڈ نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ وہ آ ہی رہا ہوگا۔"

جین نے کہا: "موسیو فرانسسک میں آپ کی وساطت سے پیرس میں اپنی چند سہیلیوں کے نام خط بھیجنا چاہتی ہوں۔"

"بہت اچھا تم خط لکھ چھوڑو میں لے جاؤں گا۔ لیگرانڈ، میں غالباً ماریشس کے راستے جاؤں گا اس لیے تم بھی اپنی بہن کے نام خط لکھ رکھو۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگی۔ میں نے یہاں آ کر بہن کو کوئی پیغام نہیں بھیجا۔"

نوکر نے اندر جھانکتے ہوئے کہا: "انور علی صاحب تشریف لائے ہیں۔"

لیگرانڈ نے کہا: "انھیں یہاں لے آؤ۔" نوکر چلا گیا۔

○

ایک منٹ بعد انور علی کمرے میں داخل ہوا۔ فرانسسک اور لیگرانڈ اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور وہ ان کے ساتھ یکے بعد دیگرے مصافحہ کرنے کے بعد ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا: "موسیو فرانسسک میں صرف چند منٹ کے لیے آیا ہوں۔ آج پانچ بجے سپہ سالار برہان الدین نے فوج کے افسروں کو مستقر میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ رات کا کھانا میرے ہاں کھائیں اور اگر آپ تا دیر بھی وہیں کریں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

فرانسسک نے کہا: "لیکن آج تو میں موسیو لالی کی دعوت قبول کر چکا ہوں۔"

لیگرانڈ بولا: "اور کل دونوں وقت کے لیے یہ میرے مہمان ہیں۔ آپ کی باری پرسوں آئے گی بشرطیکہ یہ یہاں سے چلے نہ گئے۔"

انور علی نے فرانسسک کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: "آپ پرسوں کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں پرسوں واپس فرانس جا رہا ہوں۔"

"لیکن اتنی جلدی کیوں؟"

"سرنگا پٹم میں میرا کام ختم ہو چکا ہے اور میں جلد از جلد واپس لوٹنا چاہتا ہوں۔"

"اگر یہ کوئی راز کی بات نہ ہو تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا کام تھا؟"

"میں جین اور لیگرانڈ کو یہ خوشخبری دینے آیا تھا کہ ان کی جلاوطنی کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور اب اگر یہ چاہیں تو اپنے گھر واپس جا سکتے ہیں۔ فرانس کے انقلاب نے ان کے راستے کے تمام پتھر ہٹا دیے ہیں۔"

انور علی نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ جین اور لیگرانڈ کی طرف دیکھا اور کہا: "میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔"

جین نے کہا: "آپ کا شکریہ لیکن ہم یہیں رہیں گے۔ ہم میسور کے ہر اُفق پر جنگ کی مہیب آندھیاں دیکھ کر بھاگنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

کچھ دیر انور علی کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اس نے فرانسسک کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "اگر مجھے یقین ہوتا کہ میں یہیں رہوں گا تو اس بات پر اصرار نہ کرتا کہ آپ آج ہی میری دعوت قبول کریں۔ لیکن ہمیں ہر وقت کوچ کے لیے تیار رہنے کا حکم مل چکا ہے۔ میرا بھائی مُراد علی اپنے دستے کے ساتھ آج علی الصباح روانہ ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کہ برہان الدین نے ہمیں بھی کوئی اہم فیصلہ سنانے کے لیے بُلایا ہو اور ہمیں آج غروبِ آفتاب سے پہلے یہاں سے کوچ کا حکم مل جائے۔ اس صورت میں شاید میں آپ سے دوبارہ نہ مل سکوں۔ بصورتِ دیگر

آج میرے ہاں آپ سب کی دعوت ہوگی۔ میں آپ کی طرف سے موسیو لالی کو معذرت پیش کر دوں گا اور انھیں بھی وہیں بلالوں گا۔" پھر وہ جین کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ ضرور آئیں، امّی جان آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔"

فرانسسک نے کہا: "اگر موسیو لالی خفا نہ ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"آپ اطمینان رکھیں موسیو لالی خفا نہیں ہوں گے۔ انھیں اس بات کا علم ہے کہ آپ کی میزبانی کے لیے میرے حقوق اُن کی نسبت زیادہ ہیں۔ اگر مجھے فوراً نہ جانا پڑا تو آپ کو تھوڑی دیر تک اطلاع پہنچ جائے گی۔ اب مجھے اجازت دیجیے!"

انور علی یہ کہہ کر اٹھا اور خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

فرانسسک نے کہا: "موسیو لالی بھی کہتے تھے کہ انھیں کوچ کے لیے تیار رہنے کا حکم مل چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب بہت جلد کوئی اہم واقعہ پیش آنے والا ہے لیکن میں حیران ہوں کہ سلطان نے اتنا وقت کیوں ضائع کیا کوئمبتور کا علاقہ انگریزوں کے قبضے میں چلے جانے سے [illegible] کے لیے خطرات بہت بڑھ گئے ہیں۔"

لیگرانڈ نے جواب دیا: "سلطان کا کوئی اقدام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ انھوں نے یہاں بیٹھ کر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا ہے۔ اب تک اُن کی جنگی چال بہت کامیاب رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظام اور مرہٹوں سے ان کی مصالحانہ کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ لیکن سلطان کو یہاں بیٹھا پا کر وہ ابھی تک شمالی سرحد پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ اور انگریز جنھوں نے اُن کی اعانت کی امید پر بڑے جوش و خروش کے ساتھ پیش قدمی کی تھی اب تنہا آگے بڑھنے میں خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ اس عرصہ میں سلطان نے سرنگاپٹم کے دفاعی استحکامات اتنے مضبوط کر لیے ہیں کہ اگر ہمیں ہر محاذ سے پیچھے ہٹنا پڑا تو بھی ہم ایک طویل عرصہ کے لیے انگریزوں کے ساتھ لڑ سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ سلطان اب پوری تیاریوں کے بعد اچانک کسی محاذ پر اپنی قوت کا مظاہرہ کر کے دشمن کو ہراساں کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور سلطان کا حملہ جس قدر غیر متوقع ہوگا، اسی

شدید ہوگا۔ اگر وہ انگریزوں کو عبرتناک شکست دے سکے تو نظام اور مرہٹے جنگ کے نقصانات میں حصہ دار بننا پسند نہ کریں گے اور وہ مصالحت پر آمادہ ہو جائیں گے۔"

فرانسسک نے کہا: "لیکن اس صورت میں انگریز خاموش نہیں بیٹھیں گے وہ پوری قوت کے ساتھ سرنگاپٹم پر یلغار کریں گے۔"

لیگرانڈ مسکرایا: "سلطان اس خطرے سے غافل نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس خطرے سے بچنے کے لیے جو احتیاط ممکن تھی کی جا چکی ہے گجل ہٹی کے درّے سے آگے انھیں ہر قدم پر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور سلطان کو اتنا وقت ضرور مل جائے گا کہ وہ نظام اور مرہٹوں سے فارغ ہو کر انگریزوں کو راہِ راست پر لا سکیں۔"

"لیکن تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ سلطان ایک لامتناہی عرصہ کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہندوستان کی دو عظیم طاقتوں کا مقابلہ کر سکے گا؟"

لیگرانڈ نے جواب دیا: "جب میں پیرس کے فوجی اسکول میں تعلیم پاتا تھا تو میرا صرف یہی خیال تھا کہ جنگ صرف فتح کے لیے لڑی جاتی ہے لیکن یہاں آ کر میں نے ایک نیا سبق سیکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی کے بعض مقاصد ایسے بھی ہیں جو انسان کو فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر میدان میں کودنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔"

"تم ان مقاصد پر یقین رکھتے ہو؟"

"ہاں اگر میں اِن مقاصد پر یقین نہ رکھتا تو میں آپ کا پیغام سننے کے بعد فوراً یہ جواب دیتا کہ ہمیں آج ہی یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں سلطان کی فتح کے متعلق بھی مایوس نہیں ہوں۔ کیا یہ ایک معجزہ نہیں کہ میسور کی سلطنت اپنے محدود وسائل کے باوجود گزشتہ جنگ میں نظام اور مرہٹوں کی متحدہ قوت کو شکست دے چکی ہے اور انگریز جنھوں نے کلکتہ سے لے کر اودھ تک اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں اور جن کی فوجی قوت نے ہمیں مشرق سے اپنے پاؤں سمیٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حیدر علی کے زمانہ سے لے کر آج تک پے در پے حملوں کے باوجود اس

کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ ہم اس جنگ میں اس شخص کے حلیف نہیں بن سکے جو انگریزوں کے خلاف ہمارا بہترین ساتھی بن سکتا تھا۔ سلطان ٹیپو کا انجام خواہ کچھ ہو ایک بات یقینی ہے کہ اب مشرق میں فرانس کا مستقبل تاریک ہو چکا ہے۔ ہم پانڈی چری سے اس وقت اپنی فوجیں نکال رہے ہیں جب کہ ان کی اشد ضرورت تھی۔ ہمارے غیر جانبدار رہنے کی صورت میں بھی وہاں فرانس کے آٹھ دس ہزار سپاہیوں کا اجتماع انگریزوں کو جنگ سے باز رکھ سکتا تھا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم نے سلطان کے ساتھ بدعہدی کی ہے اور قدرت ہمارا یہ جرم معاف نہیں کرے گی۔"

"اس مسئلہ میں فرانس کا ہر دور اندیش آدمی تمھارا ہم خیال ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ جب انگریز پانڈی چری پر قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے تو ان کی نگاہوں میں معاہدہ وارسیلز کی تقدیس معاہدہ منگلور سے زیادہ نہیں ہوگی۔"

○

رات کے وقت انور علی کے گھر فرانسسکو کی دعوت تھی۔ موسیو لالی، لیگرانڈ اور زنا کے چند اور دیسی اور فرانسیسی افسر دسترخوان پر موجود تھے۔ جین زنان خانے میں انور علی کی ماں اور چند افسروں کی بیویوں کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔

انور علی کے ایک دوست کی بیوی نے فرحت سے کہا۔ "چچی جان! آپ بھائی انور کی شادی کب کریں گی؟"

فرحت نے جواب دیا۔ "تمھارے بھائی کی شادی سے پہلے مجھے کسی لڑکی کو تلاش کرنا پڑے گا۔"

ایک اور عورت بولی۔ "چچی جان سرنگا پٹم کا وہ کون سا خاندان ہے جو آپ کے ناطہ جوڑتے ہوئے فخر محسوس نہیں کرے گا؟"

فرحت نے جواب دیا۔ "رشتے تو بہت ہیں لیکن ابھی تک میرے بیٹے کو شادی کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب اس نے بڑی مشکل سے یہ وعدہ کیا ہے کہ جنگ کے بعد کوئی عذر پیش نہیں کرے گا۔"

ایک شوخ لڑکی نے آہستہ سے جین کے کان میں کہا۔ "جین اگر میں مرد ہوتی اور تمھیں دیکھ لیتی تو مجھے تمام عمر کوئی لڑکی پسند نہ آتی۔"

جین نے قدرے تلخ ہو کر کہا۔ "میں تمھارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تم بہت حسین ہو اور اگر انور علی نے یہاں کی لڑکیوں کو تمھارے معیار پر پرکھنے کی کوشش کی تو چچی جان کے لیے اس کی پسند کا رشتہ تلاش کرنا بہت مشکل ہوگا۔"

جین نے کہا۔ "لیکن تمھیں یہ کیسے خیال آیا کہ مجھے دیکھنے سے پہلے انور علی کا معیار پست تھا۔"

"جین بیٹی کیا بات ہے؟" فرحت نے دسترخوان کے دوسرے سرے سے سوال کیا۔

"جی کچھ نہیں۔"

چند عورتیں کھانا کھاتے ہی اپنے گھروں کو چلی گئیں لیکن باقی وہیں بیٹھی رہیں۔ نو بجے کے قریب فرحت کا چہرہ مغموم دکھائی دیتا تھا اور جین مہمان عورتوں میں دلچسپی لینے کی بجائے بار بار اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بالآخر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آگے بڑھ کر فرحت کے قریب بیٹھ گئی۔

"آپ کو مراد علی کے متعلق فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے کہا۔

فرحت نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "بیٹی اس عمر میں ایک بیوہ کے لیے یہ آزمائش بہت کڑی ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید انور علی چند دن میرے پاس رہے گا لیکن وہ بھی آج ہی جا رہا ہے۔"

"کب؟" جین نے چونک کر سوال کیا۔

"ابھی تھوڑی دیر تک وہ یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔"

"لیکن انھوں نے ہمیں نہیں بتایا؟"

"بیٹی اس کا خیال تھا کہ بعض مہمانوں کے لیے یہ دعوت بے لطف ہو جائے گی۔ پھر وہ کسی ایسی مہم پر جا رہا ہے جس کے متعلق کوئی خبر ظاہر کرنا مناسب نہ تھا۔"

خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے فرحت کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

فرحت اس سے کچھ پوچھے بغیر اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

جین نے اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔ چند منٹ توقف کے بعد وہ اٹھی اور کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں آگئی۔ اس کا اندازہ صحیح تھا صحن میں انور علی اپنی ماں کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور ان سے تھوڑی دور برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

انور علی کہہ رہا تھا "امی جان آپ کو فکرمند نہیں ہونا چاہیے مجھے یقین ہے کہ یہ جنگ بہت جلد ختم ہو جائے گی اور ہم سرخرو ہو کر واپس آئیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری فوج کے یورپین سپاہی بھی بہت جلد یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ لیگرانڈ کی غیر حاضری کے دوران میں آپ جین کو اپنے پاس بُلا لیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

ماں نے کہا "لیکن تم جین کو الوداع نہیں کہو گے؟"

"امی جان اب وقت نہیں آپ میری طرف سے معذرت کر دیجیے۔"

جین آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی قوتِ فیصلہ جواب دے چکی تھی۔

انور علی نے اپنی ماں کو خدا حافظ کہا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا صحن سے باہر نکل گیا۔

فرحت دیر تک دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔

جین قدرے توقف کے بعد آگے بڑھی اور اس نے فرحت کے قریب پہنچ کر مغموم لہجے میں کہا "امی جان چلیے۔"

فرحت نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

○

باہر مہمان خانے میں انور علی کے دوست کھانا کھانے کے بعد خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک نوجوان نے پوچھا "بھئی انور علی نے بہت دیر لگائی وہ کہاں چلے گئے ہیں؟"

لیگرانڈ نے جواب دیا "وہ کسی ضروری کام سے اندر گئے ہیں ابھی آجائیں گے۔"

چند منٹ بعد انور علی کمرے میں داخل ہوا اور فرانسسک نے کہا "موسیو آپ نے بہت دیر لگائی!"

انور علی نے جواب دیا "معاف کیجیے میں اپنی امی جان سے رخصت لینے گیا تھا۔"

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

"ہاں"

"کہاں؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں میں صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے دس بجے مستقر میں حاضری دینی ہے اور اس کے بعد رات کو کسی وقت ہمیں یہاں سے کوچ کرنا ہے۔"

"لیکن آپ نے مجھے پہلے نہیں بتایا ورنہ میں آپ کو اس تکلف کی اجازت نہ دیتا۔"

"میں نے کوئی تکلف نہیں کیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے آپ کی خدمت کا زیادہ موقع نہیں ملا۔"

مہمان اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور وہ لی نے کہا "میرا خیال ہے اب ہمیں بھی رخصت لینی چاہیے۔"

تھوڑی دیر بعد مہمان کمرے سے باہر نکل کر ڈیوڑھی کے سامنے کھڑے تھے اور انور علی باری باری ان سے مصافحہ کر رہا تھا۔ جب لیگرانڈ کی باری آئی تو اس نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ آپ کے دستے کو بھی یہاں سے بہت جلد کوچ کرنا پڑے گا اور ہماری دوسری ملاقات جنگ کے کسی میدان میں ہو گی۔"

لیگرانڈ نے کہا "اگر ہمیں کسی دوسرے محاذ پر نہ بھیجا گیا تو ہماری ملاقات بہت جلد ہو گی۔"

موسیو لالی نے مجھے بتایا ہے کہ ہمیں دو دن کے اندر اندر یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا۔"

"بہت اچھا۔ اب مہمانوں کو رخصت کرنا آپ کے ذمے ہے۔"

انور علی کا نوکر پاس ہی گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ شوخ اور تند گھوڑا اچھلا، ٹاپیں لگاتا ہُوا رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد لیگرانڈ، فرانسسک اور جین کے ساتھ اپنے مکان کا رُخ کر رہا تھا۔ راستے میں فرانسسک نے پُوچھا: "لیگرانڈ جب انور علی کھانا کھاتے ہی اُٹھ کر باہر نکل گیا تھا تو تمہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی والدہ سے رُخصت لینے گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہی کسی مہم پر روانہ ہو جاؤں گا۔"

"لیکن تم نے مجھے کیوں نہ بتایا؟"

"انور علی نے مجھے منع کیا تھا۔ وہ لوگ کھانے کے وقت اپنے مہمانوں کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔"

چودھواں باب

"دشمن ہمارے جاسوسوں کی اطلاع سے پہلے ہمارے سر پر پہنچ چکا ہے۔ کرنل فلاڈ کے دستے اس کا راستہ نہیں روک سکے۔ ہمارے لیے کوئمبتور کی طرف پسپا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

پیشتر اس کے کہ جنرل میڈوز اس قسم کی ناقابلِ یقین اطلاعات کی تصدیق کر سکتا، سلطان ٹیپو کی افواج ایک حیرت انگیز رفتار کے ساتھ یلغار کر کے ستیامنگلم کے قلعے پر قبضہ کر چکی تھیں اور کرنل فلاڈ اپنا توپ خانہ اور سامانِ رسد کی سینکڑوں گاڑیاں دشمن کے قبضے میں چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ ستیامنگلم سے تئیس میل دُور انگریزوں کی شکست خوردہ فوج مکمل طور پر دشمن کے نرغے میں آ چکی تھی۔ لیکن عین اس وقت جبکہ میسور کے طوفانی دستے فیصلہ کن حملے کر چکے تھے اور انگریزوں کی مکمل تباہی یقینی ہو چکی تھی، میسور کی فوج کا قابل ترین جرنیل اور سلطان کا برادرِ نسبتی برہان الدین شہید ہو گیا اور وہ سپاہی اور افسر جو اسے سلطان ٹیپو کے بعد میسور کے اسلحہ خانے کی بہترین تلوار سمجھتے تھے، دشمن کے پسپا ہوتے دستوں کا تعاقب کرنے کی بجائے اس کی لاش کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

سرنگاپٹم سے سلطان کی روانگی اور انگریزوں کی اس عبرتناک شکست کے درمیان صرف بارہ دن کا وقفہ تھا اور ان بارہ دنوں میں سے کم از کم آٹھ دن ایسے تھے جب کہ انگریزی فوج سلطان کی پیش قدمی سے قطعاً بے خبر تھی اور باقی چار دنوں میں انگریز اتنا نقصان اُٹھا چکے تھے کہ ان کی جارحانہ

جنگ مدافعانہ لڑائی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تاہم سلطان کے نزدیک کوئی بڑی سے بڑی کامیابی بھی برہان الدین کا بدل نہیں ہو سکتی تھی۔

عشرۂ محرم میں دریائے بھوانی کے کنارے پڑاؤ ڈالنے کے بعد سلطان نے پیش قدمی کی اور ایروڈ پر قبضہ کر لیا۔ اس عرصہ میں کرنل فلائڈ کے بقیۃ السیف دستے کوئمبٹور میں جنرل میڈوز کی فوج کے ساتھ شامل ہو چکے تھے اور پال گھاٹ سے انگریزی فوج کی ایک اور ڈویژن بھی، جسے سلطان کی اچانک پیش قدمی کے باعث واپس بلا لیا گیا تھا، کوئمبٹور پہنچ چکی تھی۔ سلطان نے ایروڈ سے جنوب کی طرف پیش قدمی کی اور اچانک انگریزوں کی اس فوج کا راستہ روک لیا جو کرور سے رسد اور جنگی سامان کے بہت بڑے ذخیرے لے کر کوئمبٹور کا رخ کر رہی تھی۔ جنرل میڈوز نے یہ اطلاع پاتے ہی کوئمبٹور سے پیش قدمی کی لیکن کوئمبٹور سے چند منازل دور پہنچ کر اسے یہ اطلاع ملی کہ سلطان ٹیپو اس کی رسد اور کمک کے قافلے پر حملہ کرنے کی بجائے راتوں رات یلغار کر کے کوئمبٹور پہنچ چکا ہے۔ جنرل میڈوز بدحواس ہو کر اپنے ہیڈ کوارٹر کو بچانے کے لیے واپس مڑا لیکن راستے میں اُسے یہ اطلاع ملی کہ میسور کا لشکر کوئمبٹور کی بجائے دھارا پورم کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔

دو دن بعد اُسے یہ اطلاع ملی کہ دھارا پورم کے قلعے پر اب ایسٹ انڈیا کمپنی کی بجائے سلطان کا پرچم لہرا رہا ہے۔ اس کے بعد جنرل میڈوز کو یہ معلوم نہ تھا کہ سلطان ٹیپو کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ وہ کوئمبٹور میں ٹھہر گیا کوئمبٹور سے باہر نکل کر کسی اور میدان میں سلطان کا مقابلہ کرنا اپنے لیے یکساں خطرناک سمجھتا تھا۔ کوئمبٹور کی جنگ کا نقشہ سراسر بدل چکا تھا اور پہل اب کلی طور پر سلطان ٹیپو کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل میڈوز کے لیے صرف ایک خبر حوصلہ افزا تھی اور وہ یہ کہ بنگال کی جس فوج نے بارہ محل کی طرف پیش قدمی کی تھی وہ میسور کی چند سرحدی چوکیوں پر قبضہ کرنے کے بعد کرشنا گری تک پہنچ چکی تھی۔

سلطان ٹیپو قمر الدین خاں کی کمان میں فوج کے چند دستے چھوڑ کر اچانک دھارا پورم سے نکلا اور چند دن بعد جنرل میڈوز حیرت و استعجاب کے عالم میں یہ خبر سن رہا تھا کہ کرشنا گری کی طرف پیش قدمی کرنے والی انگریزی سپاہ کا ہراول سلطان کے طوفانی دستوں کے ہاتھوں بری طرح پٹ چکا ہے۔ اور بنگال سے آنے والی کمک کے دس ہزار سپاہیوں کے مکمل طور پر کٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ جنرل میڈوز نے فوراً بارہ محل کی طرف پیش قدمی کی۔ سلطان ٹیپو انگریزوں کی دو طاقت ور افواج کے درمیان گھر جانے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے مغرب کی طرف بڑھا۔ اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اس کی فوج اپنے بھاری توپ خانے اور پورے جنگی ساز و سامان کے ساتھ پہاڑوں اور جنگلوں کے راستے پینتالیس میل سفر کر کے پالا گڈھ کے درے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

جنرل میڈوز کی افواج کا دیری پٹنم کے مقام پر بنگال کی افواج سے آملیں اور متحدہ لشکر نے سلطان کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنے کی نیت سے درّہ تھوپور کی طرف پیش قدمی کی۔ جنرل میڈوز نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا۔ لیکن اسے سلطان کا راستہ روکنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس ناکامی کے بعد جنرل میڈوز دوسرے حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ سلطان اچانک درّہ عبور کر کے ایک آندھی کی طرح کرناٹک کی طرف بڑھا۔ اور جنرل میڈوز جو میسور کے وسطی اضلاع کی طرف دیکھ رہا تھا پھر ایک بار ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کر رہا تھا۔ چند دنوں میں کئی اہم قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان کا لشکر ترچنا پلی کے قریب پہنچ چکا تھا۔

جنرل میڈوز میسور کے وسطی اضلاع پر حملے کا خیال چھوڑ کر ترچنا پلی کی حفاظت کے لیے مشرق کی طرف بڑھا لیکن اس اثنا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ جنگ کے آغاز میں جنرل میڈوز نے جو شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں وہ اب عبرتناک شکستوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ انگریزوں کے لیے اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ انھوں نے فوراً کوئی شاندار کامیابی حاصل نہ کی تو نظام اور مرہٹے مایوس اور بددل ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ ترچنا پلی سے تھوڑی دور جنرل میڈوز کو یہ اطلاع ملی کہ لارڈ کارنوالس فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے کلکتہ سے مدراس پہنچ چکا ہے۔

جنگ کا پہلا دور ختم ہو چکا تھا۔ جنرل میڈوز کی عظیم فوج کئی محاذوں پر شکست کھا چکی

تھی۔ اس کے بہترین جرنیل سلطان ٹیپو کی جنگی چالوں کے مقابلے میں عاجز تھے۔ شیر میسور نے ترچناپلی کی تسخیر میں وقت ضائع کرنے کی بجائے فرانسیسیوں کی اعانت حاصل کرنے کی اُمید پر پانڈی چری کے قریب پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا اور کارنوالس ارکاٹ سے لے کر مدراس تک مغربی ساحل پر اپنے تمام اہم قلعوں کے لیے خطرہ محسوس کرنے لگا۔ انگریزوں نے گزشتہ چند ماہ میں اگر کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل کی تھی تو وہ یہ تھی کہ مشرق اور مغرب کے کئی محاذوں پر سلطان کی مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر بمبئی کی فوج نے کنانور اور مالابار کے چند اور قلعوں پر کسی قابلِ ذکر مدافعت کا سامنا کیے بغیر قبضہ کر لیا تھا۔

شمال کے محاذ پر نظام اور مرہٹوں کی افواج نے سرنگا پٹم سے ٹیپو کی پیش قدمی کی اطلاع پاتے ہی حملہ کر دیا تھا لیکن ابھی تک انھیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مرہٹے چند غیر اہم سرحدی چوکیوں پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی ساری قوت دھاڑواڑ کے قلعہ پر قبضہ کرنے پر صرف کر رہے تھے اور یہاں بدرالزماں خاں کی قیادت میں سلطان کے دس ہزار جانباز مسلسل چار ماہ سے انھیں عبرت ناک شکستیں دے رہے تھے اور نظام کی فوج کی کارگزاری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی ساری قوت صرف کرنے کے باوجود کرپال کا قلعہ فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

○

ایک رات پانڈی چری سے کچھ دور سلطان کے پڑاؤ میں چند سرپٹ سوار داخل ہوئے وہ سلطان کے خیمے کے قریب پہنچ کر گھوڑوں سے اُتر پڑے اور ان میں سے ایک تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ یہ انور علی تھا۔

دروازے پر پہرے داروں نے اُسے سلامی دی اور ایک افسر نے ہاتھ کے اشارے سے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "جناب آپ کچھ دیر انتظار کریں۔ سلطان معظم اس وقت بہت مصروف ہیں۔"

لیکن انور علی نے برہم ہو کر جواب دیا "تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔" اور کسی جھجک کے بغیر خیمے کے اندر داخل ہو گیا۔

سلطان ایک کشادہ میز کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے دائیں بائیں اور سامنے فوج کے آٹھ چیدہ چیدہ افسر کھڑے تھے۔ انور علی نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور وہ افسر جو سلطان کے سامنے کھڑے تھے ایک طرف ہو گئے۔

سلطان نے کہا: "انور علی تمھارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم کوئی اچھی خبر نہیں لائے ہو!"

انور علی نے کہا: "عالیجاہ! کارنوالس چیتوڑ سے صرف بارہ میل دور رہ گیا ہے ہم نے کل شام ارکاٹ اور چیتوڑ کے درمیان اس کی رسد لے جانے والی فوج پر حملہ کیا تھا اور ۱۴ گاڑیاں چھین لی تھیں۔ ہمارے آٹھ اور دشمن کے ڈیڑھ سو آدمی ہلاک ہوئے۔ سپہ سالار کا خیال ہے کہ کارنوالس بنگلور کا راستہ صاف کرنے کے لیے کولار پر قبضہ کرنے کی کوشش کریگا اور کولار کی فوج موجودہ حالات کے ساتھ چند گھنٹوں سے زیادہ اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔"

"میں تمھارے آنے سے پہلے سید احمد کو یہ حکم بھیج چکا ہوں کہ اسے سردست دشمن کا سامنا کرنے کی بجائے صرف اس کے عقب میں حملہ کرنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔"

"لیکن عالیجاہ بنگلور کے لیے خطرہ پیدا ہو چکا ہے؟"

"ہمیں معلوم ہے۔ لیکن ہمارے سامنے صرف ایک خطرہ نہیں۔ تم ایسے وقت آئے ہو جب ہمیں کولار سے زیادہ اہم محاذ پر تمھاری خدمات کی ضرورت ہے ہم تمھیں دھاڑواڑ بھیجنا چاہتے ہیں۔ بدرالزماں نے اطلاع بھیجی ہے کہ دھاڑواڑ میں بارود کے ذخیرے ختم ہونے والے ہیں اور دشمن کے محاصرے نے اکثر سپاہیوں کو بددل کر دیا ہے۔ تم یہاں سے پانچ سو سپاہی لے کر آج ہی پچھلے پہر روانہ ہو جاؤ۔ بارود اور رسد کی گاڑیاں تمھیں راستے میں چتل دُرگ سے مہیا کی جائیں گی۔ دھاڑواڑ میں چند اچھے توپچیوں کی ضرورت ہے اور لالی اپنے توپ خانے کے چند آدمی تمھارے ساتھ روانہ کرے گا۔ اب تمھارے ذمے دو کام ہیں۔ ایک یہ کہ تم جلد از جلد چتل دُرگ

سے اسلحہ اور بارود لے کر دھاڑ واڑ پہنچ جاؤ۔ دشمن کی نظروں سے بچ کر قلعے میں داخل ہونا ایک مشکل کام ہے لیکن میں تمھاری ذہانت اور فرض شناسی پر اعتماد کر سکتا ہوں۔ تمھارے ذمہ دوسرا کام یہ ہے کہ تم قلعے کے محافظوں کے حوصلے بلند رکھو اور بدر الزماں کو میری طرف سے یہ پیغام دو کہ میں دھاڑ واڑ کو سرنگا پٹم کا دروازہ سمجھتا ہوں۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ دھاڑ واڑ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ اُسے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ صرف ہمارے ایک دُور افتادہ قلعے کی حفاظت کر رہا ہے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ مرہٹوں کو دھاڑ واڑ میں روک کر ہمیں انگریزوں کے ساتھ نپٹنے کا موقع دے رہا ہے۔ اگر اس نے دھاڑ واڑ کا قلعہ خالی کر دیا تو مرہٹے تمام شمالی اضلاع میں تباہی کا طوفان کھڑا دیں گے۔

چتل ڈرگ سے آگے دشمن کی نظروں سے بچ کر دھاڑ واڑ پہنچنے کے لیے تمھیں ایک تجربہ کار رہنما کی ضرورت پڑے گی۔ اس لیے ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ڈھونڈیا واغ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ صبح روانہ ہونے سے پہلے تمھیں تحریری احکام مل جائیں گے۔"

○

رات کے پچھلے پہر کسی نے انور علی کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور اس نے گہری نیند سے بیدار ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ خیمے کے ایک کونے میں چراغ روشن تھا۔ اس کا اردلی اور ڈھونڈیا واغ اس کے بستر کے قریب کھڑے تھے۔

"چار بجنے والے ہیں۔" ڈھونڈیا واغ نے کہا۔

"تم نے مجھے تین بجے کیوں نہیں جگایا؟" انور علی نے غصے سے اردلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اردلی کی بجائے ڈھونڈیا واغ نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم تھا کہ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں اس لیے میں نے اسے کہا تھا کہ سپاہیوں کے تیار ہونے تک آپ کو آرام کرنے دے۔ آپ چار بجے روانہ ہونا چاہتے تھے اور ابھی چار بجنے میں چند منٹ باقی ہیں۔"

"میں اندر آ سکتا ہوں؟" کسی نے باہر سے فرانسیسی زبان میں کہا۔

"کون؟ ــــــ لیگرانڈ ــــــ آئیے!"

"لیکن آپ اس وقت؟" انور علی نے اس کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اور مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ رات آپ نے موسیو لالی نے جو سات آدمی مانگے تھے اُن میں میرا نام نہیں تھا۔"

"موسیو لالی نے اپنی مرضی سے آدمیوں کا انتخاب کیا تھا لیکن اگر وہ مشورہ لیتے تو بھی میں انھیں یہ کہتا کہ مجھے اس مہم کے لیے تمھاری ضرورت ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ موسیو لالی کو یہاں آپ کی زیادہ ضرورت ہے اور مجھے یقین تھا کہ وہ آپ کو کہیں اور بھیجنا پسند نہیں کریں گے۔"

لیگرانڈ نے کہا۔ "موسیو لالی سے آپ کے ساتھ جانے کی اجازت لینے کے لیے مجھے بے حد اصرار کرنا پڑا۔"

"آپ کو اصرار نہیں کرنا چاہیے تھا۔" انور علی نے قدرے برہم ہو کر کہا۔ پھر وہ ڈھونڈیا واغ کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ تھوڑی دیر خیمے سے باہر انتظار کریں۔ مجھے لباس تبدیل کرنے میں دو منٹ لگیں گے۔"

ڈھونڈیا واغ، انور علی کا اردلی اور لیگرانڈ خیمے سے باہر نکل گئے۔

تھوڑی دیر بعد انور علی کی کمان میں پانچ سو سوار شمال مغرب کا رُخ کر رہے تھے۔ ڈھونڈیا واغ کا گھوڑا سب سے آگے تھا اور اس کے ساتھ کسی سپاہی یا افسر کو یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی کہ وہ کون سا راستہ اختیار کر رہے ہیں۔

ڈھونڈیا واغ چھینا گری کے ایک مرہٹہ خاندان کا چشم و چراغ تھا اور وہ ان حریت پسندوں

میں سے ایک تھا جو حیدر علی کو ہندوستان کی آزادی کا پاسبان سمجھ کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔ میسور کی پنڈارہ فوج کے ایک دستے کی کمان حاصل کرنے کے بعد وہ انگریزوں اور مرہٹوں کے خلاف کئی معرکوں میں حصہ لے چکا تھا اور سلطان ٹیپو کے ایک جاں نثار کی حیثیت میں اس نے غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں۔ سانولے رنگ اور میانے قد کا یہ انسان جس کی آنکھیں چیتے کی طرح چمکتی تھیں اپنے دوستوں اور دشمنوں کے لیے ایک معمّا تھا۔ جنگ اس کے لیے ایک کھیل تھا۔ وہ کئی کئی میل پیدل بھاگ سکتا تھا اور تھکاوٹ، بھوک، پیاس اور نیند کا احساس کیے بغیر پہروں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ سکتا تھا۔ اسے دن کی روشنی کی بجائے رات کی تاریکی زیادہ پسند تھی۔ میسور کے جنگلوں اور پہاڑوں کے تمام راستے اس کے دل پر نقش تھے۔ مرہٹے جنھیں اس نے گزشتہ جنگوں میں سب سے زیادہ نقصان پہنچایا تھا اس کے سر کے لیے انعام مقرر کر چکے تھے اور اب وہ انور علی کے ساتھ دھاڑواڑ کا رُخ کرتے ہوئے اس بات پر مسرور تھا کہ اُسے ایک ایسے محاذ پر بھیجا جا رہا ہے جہاں اُسے اپنے جوہر دکھانے کے لیے بہترین مواقع میسّر آ سکتے ہیں۔

ایک ندی عبور کرنے کے بعد اس نے اپنا گھوڑا انور علی کے ساتھ ملاتے ہوئے کہا "میں یہاں بے کار تھا۔ رات کے وقت پہرے داروں میں شامل ہو کر دشمن کے پڑاؤ کی سیر کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی ہے میں چہرے پر غازہ مل کر بھی انگریزوں کو دھوکا نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے اُن کی زبان نہیں آتی، لیکن مرہٹوں کے پڑاؤ میں تو دن کے وقت بھی یہ محسوس کیا کرتا ہوں کہ میں اپنے گاؤں میں پھر رہا ہوں۔"

O

لارڈ کارنوالس نے مختلف محاذوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکست خوردہ افواج کو جمع کرنے کے بعد پیش قدمی کی اور وَنَم باڑی اور پامانیر کے درمیان ایک طویل چکر کاٹنے کے بعد میسور میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا رُخ بنگلور کی طرف تھا۔ سلطان ٹیپو ترچنا پلی سے یلغار کرتا ہوا بنگلور پہنچا۔ راستے میں ہی اسے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ بنگلور کا فوجدار سید پیر اور ایک اور فوجی افسر راجہ رام چندر دشمن کے ساتھ ساز باز کر رہے ہیں۔ سلطان نے بنگلور پہنچتے ہی انہیں گرفتار کر لیا اور بہادر خاں کو جو اس سے قبل کرشنا گری کے فوجدار کی حیثیت سے قابلِ قدر خدمات انجام دے چکا تھا، بنگلور کا محافظ مقرر کیا۔ اس عرصہ میں لارڈ کارنوالس کسی قابلِ ذکر مدافعت کا سامنا کیے بغیر کولار اور ہوسکوٹ پر قبضہ کر چکا تھا۔ سلطان بنگلور کی حفاظت کے لیے دو ہزار سپاہی چھوڑ کر انگریزی فوج کے مقابلے کے لیے نکلا۔ اس نے بنگلور سے دس میل کے فاصلے پر انگریزی فوج کے عقب میں حملہ کر کے رسد اور بارود کی کئی گاڑیاں چھین لیں۔

اگلی شام میسور کے ایک ہزار سوار اچانک کمپنی کی اس فوج کے سامنے نمودار ہوئے جو کرنل فلائڈ کی کمان میں بنگلور کی مشرقی جانب پہنچ چکی تھی۔ کرنل فلائڈ نے ان پر حملہ کیا اور میسور[1] کے سوار کچھ دیر سختی سے مقابلہ کرنے کے بعد جنوب مغرب کی طرف ہٹ گئے۔ فلائڈ نے ان کا تعاقب جاری رکھا لیکن تھوڑی دیر بعد اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ سلطان کی پوری فوج کی زد تک آ چکا ہے۔ سلطان کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ آن کی آن میں انگریز سواروں کے دستے چار سو لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ فلائڈ بذاتِ خود زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑا لیکن اس کے ساتھی اسے نکال کر لے گئے۔ انگریزوں کی خوش قسمتی سے رات ہو چکی تھی اور میسور کے سواروں نے تاریکی میں دشمن کا تعاقب کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ اگلی صبح ایک سو زخمی انگریز جنھیں سلطان کے سپاہیوں نے قید کر لیا تھا لارڈ کارنوالس کے کیمپ میں حاضر ہوئے اور انھوں نے بتایا کہ سلطان نے ہماری مرہم پٹی کرنے کے بعد ہمیں رہا کر دیا ہے اور ہمیں بخشش کے طور پر ایک ایک روپیہ دیا ہے۔

کارنوالس کے میدان میں آتے ہی جنگ ایک نئے دور میں داخل ہو چکی تھی اور نظام

[1] یہاں میسور سے مُراد سلطنتِ خداداد نہیں بلکہ میسور کا ضلع ہے۔

اور مرہٹے انگریزوں کو اپنی نمائشی کارگزاری دکھانے کی بجائے پوری قوت میدان میں لا چکے تھے۔ سلطان ٹیپو نے اپنی فوج کا ایک حصہ اہم قلعوں کی حفاظت کے لیے شمال کی طرف منتقل کر دیا۔ اب دشمن کے ساتھ کسی ایک میدان میں جم کر لڑنے کی بجائے اس کی کوشش یہ تھی کہ اہم ترین محاذوں پر اس کی رسد اور کمک کے راستے مسدود کر لیے جائیں اور اس کے بعد پے در پے حملوں سے اسے ہراساں کیا جائے۔ چنانچہ جنگلور کے سامنے ڈیرہ ڈالنے کے بعد لارڈ کارنوالس یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک دلدل میں پھنس چکا ہے۔ ارکاٹ سے اس کے گھوڑوں کے لیے چارے اور سپاہیوں کے لیے غلے کی جو گاڑیاں آتی تھیں ان میں سے بیشتر میسور کے چھاپہ مار دستوں کے قبضہ میں چلی جاتی تھیں۔

سلطان نے لارڈ کے دستوں کو شکست دینے کے بعد منگلور سے چند میل دور ہٹ کر کنگری میں اپنا عارضی مستقر بنا لیا۔ کارنوالس نے اس امید پر منگلور کی طرف پیش قدمی کی تھی کہ نظام اور مرہٹوں کی فوجیں منگلور کی فتح میں حصہ دار بننے کے لیے پہنچ جائیں گی لیکن وہ الٹا اسے اپنی مدد کے لیے شمال کا رخ کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ وقت اب لارڈ کارنوالس کے خلاف جا رہا تھا اور اسے اپنی ابتدائی کامیابیاں اپنے تازہ نقصانات کے مقابلے میں بے حقیقت معلوم ہوتی تھیں۔ رسد اور چارے کی کمی پورا کرنے کے لیے وہ منگلور پر فوراً قبضہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ فوجی لحاظ سے بھی جنوب مشرق کے ہر شہر کے مقابلے میں منگلور کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ منگلور کی کشادہ سڑکیں، عالیشان مکانات اور تجارتی منڈیاں ہندوستان بھر میں مشہور تھیں۔ صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی یہ شہر سرنگاپٹم کے سوا ہندوستان کے تمام شہروں سے آگے تھا۔ سلطان کی فوج کے لیے اسلحہ اور بارود کی ضرورت کا ایک بڑا حصہ یہیں کے کارخانوں سے پورا ہوتا تھا۔ اس شہر کی فصیل کے گرد بیس فٹ گہری خندق تھی جو بانس اور خاردار جھاڑیوں کے گھنے جنگل سے گھری ہوئی تھی۔ شہر کے چار دروازے کافی مضبوط تھے۔ قلعہ شہر کے جنوبی کنارے پر تھا جس کا رقبہ قریباً ایک مربع میل تھا اور اس کی بلند اور کشادہ فصیل

پر چھبیس برج تھے اور ہر برج میں تین تین توپیں نصب تھیں۔ شہر کی طرح قلعے کی خندق بھی کافی گہری تھی۔

○

۷ مارچ کے دن انگریزوں نے شہر پر حملہ کیا اور منگلور کی فضا انگریزوں کی بھاری توپوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ پھر ایک گھمسان کی جنگ اور شدید نقصانات کے بعد انگریزوں نے شہر پر قبضہ کر لیا اور محافظ فوج قلعے کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ شہر کی بیشتر آبادی انگریزوں کے حملے سے پہلے ہی وہاں سے ہجرت کر چکی تھی۔ تاہم ابھی تک ہزاروں مرد اور عورتیں انگریزوں کی وحشت اور بربریت کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ لارڈ کارنوالس اپنی آنکھوں سے بے کس عورتوں پر اپنے سپاہیوں کی دست درازی دیکھ رہا تھا اور اپنے کانوں سے ان کی چیخ و پکار سن رہا تھا۔ کئی ایسے مورخ بھی تھے جنھیں لارڈ کارنوالس کو ہندوستان کا نجات دہندہ اور سلطان ٹیپو کو ایک جابر اور ظالم حکمران ثابت کرنے کی خدمت سونپی گئی تھی۔ لیکن انگریزی فوج کی لوٹ مار، سفاکی اور بربریت کے متعلق ان کی زبانیں گنگ تھیں۔ کارنوالس کی فوج نے مال غنیمت میں لاکھوں روپے کے زیورات جمع کیے۔ غلے، اسلحہ اور بارود کے چند بڑے بڑے ذخیرے بھی ان کے ہاتھ آ گئے۔ لیکن میسور کے سپاہی چارے کے بیشتر ذخیروں کو آگ لگا چکے تھے۔

سلطان ٹیپو کے لیے منگلور کے شہر کا اتنی جلدی فتح ہو جانا غیر متوقع تھا۔ اس نے فوراً کنگری سے پیش قدمی کی اور چند گھنٹوں کے اندر اندر منگلور کے سامنے پہنچ گیا۔ پہلے حملے میں کئی ہزار سپاہی شہر میں داخل ہو گئے لیکن انھیں زیادہ دیر شہر پر قبضہ رکھنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ تاہم شہر پر سلطان کا پہلا حملہ پسپا کرنے میں لارڈ کارنوالس کی خوشی بہت عارضی ثابت ہوئی۔ سلطان ٹیپو نے شہر کی گلیوں اور بازاروں میں لڑنے کا خیال چھوڑ کر باہر قلعے کی جنوب مغرب کی طرف ان بلند ٹیلوں پر قبضہ کر لیا جہاں سے انگریزوں پر کامیابی کے ساتھ گولہ باری

کی جا سکتی تھی۔ لارڈ کارنوالس اپنی تمام طاقت قلعے کی طرف مرکوز کر چکا تھا۔ لیکن پندرہ دن کی پے در پے کوششوں کے بعد بھی اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کی توپوں نے مسلسل گولہ باری کے بعد قلعے کی فصیل کے ایک حصے میں جو شگاف ڈالا تھا وہ باہر سے اس ٹیلے کی زد میں تھا جہاں سلطان کی توپیں نصب تھیں اور یہ توپیں شگاف کی طرف دھاوا بولنے والی فوج پر کامیابی کے ساتھ گولہ باری کر سکتی تھیں۔

لارڈ کارنوالس اپنی خواہش کے بغیر مدافعانہ جنگ لڑنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ اس نے ایک طرف قلعے کا محاصرہ کر رکھا تھا اور دوسری طرف سلطان کی فوج کے ہاتھوں محصور تھا جو ضرورت کے مطابق ہر وقت اپنی پوزیشن بدل سکتی تھی۔ ایک طرف قلعے کے محافظ اس کی فوجوں پر گولہ باری کر رہے تھے اور دوسری طرف باہر سے سلطان کا توپ خانہ اُن پر آگ برسا رہا تھا۔ شہر میں چارے کی کمی کے باعث انگریزوں کے گھوڑے اور بیل بھوک سے مر رہے تھے اور لارڈ کارنوالس کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ چند دن بعد اس کی بہترین سوار فوج گھوڑوں سے محروم ہو جائے گی اور بنگلور سے کسی دوسرے محاذ کا رُخ کرتے وقت اسے اپنے سامان کی گاڑیاں یہیں چھوڑنی پڑیں گی۔ لیکن جہاں جنگی قابلیت اور دانائی جواب دے چکی تھی وہاں عیاری کام آئی۔ جہاں قلعے کے مٹھی بھر محافظ آخری فتح کی اُمید پر پوری جرأت کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے وہاں چند غداروں نے دشمن کی کامیابی کا راستہ کھول دیا۔ ان غداروں کا سرغنہ کرشن راؤ تھا۔

حملے سے پہلے انگریزوں کو کرشن راؤ کی طرف سے ہدایات موصول ہو چکی تھیں کہ تم فلاں رات فلاں وقت قلعے کی فصیل کے فلاں حصے پر حملہ کرو تو ہمیں اپنے استقبال کے لیے موجود پاؤ گے۔ پہرے داروں کو وہاں سے ہٹا دیا جائے گا۔ کارنوالس نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ قلعے کے محافظ کو اس غداری کا اس وقت پتہ لگا جب آدھی رات کے وقت انگریزی فوج کے چند دستے قلعے میں داخل ہو چکے تھے۔ بہادر خاں اور اس کے ساتھ ایک ہزار جانباز لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ تین سو مجاہد جن میں سے بیشتر زخمی تھے قید کر لیے گئے اور باقی[1] بچ کر نکل گئے۔ انگریزوں نے اس فتح کی جو قیمت ادا کی وہ بھی کم نہ تھی۔ ٹیپو کو جب اس غداری کا علم ہوا تو اس نے فوراً دو ہزار سپاہی قلعے کے محافظین کی مدد کے لیے روانہ کیے۔ لیکن اس عرصہ میں قلعے پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔

بنگلور کا انگریزوں کے ہاتھ میں چلے جانا سلطان کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان تھا لیکن اس سے بڑا نقصان بہادر خاں کی موت تھی۔ بُرہان الدین کے بعد وہ سلطان کی فوج کا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد اور وفادار افسر تھا۔ یہ بلند قامت اور درویش خصلت انسان ستر سال کی عمر میں بھی اس قدر تندرست اور توانا تھا کہ جوانوں کو اس پر رشک آتا تھا۔ اس کے رُعب و جلال کا یہ عالم تھا کہ لارڈ کارنوالس جیسا انسانیت دشمن شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس نے سلطان کو یہ پیغام بھیجا کہ اگر آپ چاہیں تو میں بہادر خاں کی لاش آپ کے پاس بھیجنے کے لیے تیار ہوں۔ سلطان نے جواب دیا آپ کی یہ پیش کش قابلِ تعریف ہے۔ اگر آپ بہادر خاں کی لاش بنگلور کے مسلمانوں کے حوالہ کر دیں تو وہ اُسے پوری عزت اور احترام کے ساتھ دفن کریں گے۔

بنگلور کی فتح کے لیے لارڈ کارنوالس کو جو قیمت ادا کرنی پڑی وہ اس کی توقع سے زیادہ تھی۔ پھر اس کامیابی نے انگریزی فوج کے مستقبل کے متعلق چند ایسے خطرات پیدا کر دیے تھے جو بنگلور کی طرف پیش قدمی کرتے وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ بنگلور سے باہر اس کی رسد اور کمک کے تمام راستے کٹ چکے تھے اور رسد اور چارے کی بڑھتی ہوئی قلت کے باعث اس کے لیے ایک طویل محاصرے کا سامنا کرنا مشکل تھا لیکن شمال کی طرف مرہٹوں کے حملوں کی شدت اور میر نظام علی کے پندرہ ہزار سواروں کی پیش قدمی نے سلطان ٹیپو کو بنگلور کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

---

[1] کرشن راؤ بھی انہی لوگوں کے ساتھ قلعہ سے نکل چکا تھا لیکن وہ سلطان کے پاس جانے کی بجائے سرنگاپٹم پہنچ گیا۔ انہی ایام میں بنگلور سے کسی افسر کا خط پکڑا گیا جس سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ کرشن راؤ کو سرنگاپٹم میں بھی سلطان کے خلاف سازش کا جال پھیلانے کے کام پر مامور کیا گیا ہے۔ سلطان نے معین الدین عرف سید صاحب کو اس کے پیچھے روانہ کیا اور انہوں نے کرشن راؤ اور اس کے تین بھائیوں کو سازش میں حصہ لینے کا ثبوت فراہم ہونے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا۔

پندرھواں باب

بدرالزماں خاں دھاڑوار میں ڈٹا ہوا تھا۔ شہر کی آبادی مرہٹوں کی آمد سے پہلے ہجرت کر چکی تھی۔ مرہٹہ لشکر کا مستقر جنوب مغرب کی طرف پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ ہر روز پڑاؤ سے چند توپیں کھینچ کر شہر کے آس پاس کے ٹیلوں پر لے آتے اور شام تک گولہ باری جاری رکھتے۔ رات کے وقت وہ شہر سے میسور کے سواروں کا خطرہ محسوس کرکے اپنی توپیں دوبارہ پڑاؤ میں لے جاتے۔ لیکن چند ہفتے بعد کمپنی کی فوج کے چند دستے ان کی مدد کے لیے پہنچ گئے اور جنگ میں کچھ تیزی آگئی۔ مرہٹوں اور انگریزوں کی طرف سے گولہ باری کی بڑھتی ہوئی شدت کے جواب میں شہر کے محافظوں نے بھی جوابی حملے شروع کر دیے۔ میسور کے سوار کسی وقت اچانک شہر سے نکلتے اور آن کی آن میں دشمن کو شدید نقصان پہنچانے کے بعد واپس چلے جاتے۔

بالآخر ایک دن مرہٹوں نے ایک گھمسان کی جنگ کے بعد شہر پر قبضہ کرلیا اور شہر کے محافظ قلعے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے لیکن اگلے دن بدرالزّمان نے اچانک قلعے سے نکل کر جوابی حملہ کیا اور مرہٹے دھاڑوار کی گلیوں اور بازاروں میں لاشوں کے انبار چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ پانچ دن بعد مرہٹوں نے پوری قوت کے ساتھ ایک اور حملہ کیا اور دوبارہ شہر پر قابض ہو گئے لیکن قلعے سے شدید گولہ باری کے باعث انھیں شہر کے قریب قدم جمانے کا موقع نہ ملا۔ چنانچہ وہ شہر کی

فصیل کو بارود سے اُڑانے اور مکانات میں آگ لگانے کے بعد دوبارہ اپنے پڑاؤ میں آگئے۔

اس کے بعد قلعے کی ناکہ بندی شروع ہوئی لیکن مرہٹے جس بزدلی کا مظاہرہ کر رہے تھے وہ انگریزوں کے لیے بہت پریشان کن تھی۔

جنوب میں لارڈ کارنوالس کی افواج کو خطرے سے بچانے کی یہی ایک صورت تھی کہ مرہٹوں اور نظام کی افواج کسی تاخیر کے بغیر سرنگا پٹم کا رخ کریں۔ لیکن مرہٹے دھاڑوار کے قلعے کو اپنی شاہ رگ پر ایک خنجر سمجھتے تھے اور وہ اُسے فتح کیے بغیر کسی اور محاذ پر توجہ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔

پھر جب بمبئی سے انگریزوں کا ایک اور دستہ بھاری توپوں اور بارود کا ایک معقول ذخیرہ لے کر مرہٹوں کی اعانت کے لیے پہنچ گیا اور انھوں نے پوری شدت کے ساتھ قلعے پر گولہ باری شروع کر دی تو اس عرصہ میں بدرالزّماں کے سپاہیوں کی حالت نازک ہو چکی تھی۔ رسد اور بارود کے ذخیرے ختم ہو چکے تھے۔ اور قلعے کا پانی صرف چند دن کی ضرورت کے لیے کافی تھا۔

⊙

لے انگریزی دستے کا ایک افسر لیفٹیننٹ مور مرہٹوں کی اس جنگ کے چشم دید حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب کسی ایک توپ میں بارود ڈالا جاتا ہے توپ خانے کا سارا عملہ قریباً آدھ گھنٹے آرام سے بیٹھ کر تمباکو نوشی کرتا ہے۔ پھر توپ چلاتے وقت یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ اس کا نشانہ کہاں لگے گا۔ اگر خاصی مقدار میں گرد اُڑے تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ پھر جب دوبارہ بارود ڈالا جاتا ہے تو اسی طرح تمباکو نوشی اور گپ بازی شروع ہو جاتی ہے۔ دوپہر کے دو گھنٹے کھانے اور آرام کے لیے وقف ہوتے ہیں اور جنگ بند رہتی ہے۔ یہ توپیں اتنی پرانی اور ناقص ہیں کہ بسا اوقات چلتے وقت پھٹ جاتی ہیں۔ ایک اور مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ شام ہوتے ہی مرہٹے اپنی توپیں دھکیل کر واپس پڑاؤ میں لے جاتے ہیں اور دشمن کو رات کے وقت اطمینان سے فصیل کی مرمت کا موقع مل جاتا ہے۔ بارود کی سمت کے بارے میں کہ اس کی سپلائی اتنی قلیل اور بے قاعدہ ہے کہ یہ توپیں کئی کئی دن خاموش رہتی ہیں۔

ایک رات قلعے کے جنوب مشرقی کونے کے ایک بُرج کے قریب یکے بعد دیگرے دو چھوٹے پتھر گرے اور پہرےدار بندوقیں سنبھال کر باہر کی طرف جھانکنے لگے۔

تاریکی میں انھیں کسی کی آواز سنائی دی: "میں ڈھونڈیا واغ ہوں جلدی سے سیڑھی پھینکو!"

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"بے وقوفو! مجھے بادشاہ نے بھیجا ہے۔ جلدی سے سیڑھی پھینکو ورنہ میں اُوپر پہنچتے ہی تم سب کا گلا گھونٹ ڈالوں گا۔"

"ٹھہرو، ہم اپنے جمعدار کو اطلاع دیتے ہیں۔"

کوئی دس منٹ بعد جمعدار کے علاوہ فوج کے چند اور افسر وہاں پہنچ چکے تھے اور ڈھونڈیا واغ رسّی کی سیڑھی کے ساتھ فصیل پر چڑھ رہا تھا۔

"بدرالزماں خاں کہاں ہیں؟" اس نے فصیل پر پہنچتے ہی سوال کیا۔

"وہ آرہے ہیں۔" ایک افسر نے جواب دیا۔

"میں ان کا انتظار نہیں کرسکتا۔ چلیے مجھے ان کے پاس لے چلو مجھے اسی وقت واپس جانا ہے۔"

"تمھیں انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔" کسی نے بُرج کی طرف سے نمودار ہو کر کہا۔

ڈھونڈیا واغ نے کہا۔ "آپ بدرالزماں خاں ہیں؟"

"کہو کیا پیغام لائے ہو!"

"جناب کل رات پچھلے پہر انور علی پانچ سو سپاہیوں اور رسد اور بارود کی ڈیڑھ سو گاڑیوں کے ساتھ یہاں پہنچ جائے گا۔ میں قلعے سے باہر دشمن کے تمام مورچوں کا جائزہ لے چکا ہوں۔ مرہٹے کافی دُور ہیں اور ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن انگریزوں کے مورچے بہت قریب ہیں اور کمک کا راستہ صاف کرنے کے لیے انھیں پیچھے ہٹانا ضروری ہے۔ آپ کل سارا دن دشمن پر شدید گولہ باری کرتے رہیں تاکہ اس کی توجہ کسی اور طرف مبذول نہ ہو۔ اس کے بعد رات کے ٹھیک دو بجے آپ ان پر حملہ کر دیں۔ ہم مشرقی دروازے سے داخل ہوں گے اور ہمارے سوار دشمن کو آس پاس کے مورچوں

سے پیچھے ہٹانے کے لیے آپ کا ساتھ دیں گے۔ اب مجھے اجازت دیجیے مجھے اپنے ساتھیوں کی رہنمائی کے لیے واپس پہنچنا ہے۔"

بدرالزماں نے کہا۔ "سلطان معظم دھاڑواڑ کے حالات سے بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن میں حیران ہوں کہ انھوں نے صرف پانچ سو سپاہی بھیجے ہیں۔ اس قلعے کو بچانے کے لیے مجھے کم از کم دس ہزار سپاہیوں کی ضرورت ہے۔"

ڈھونڈیا واغ نے جواب دیا۔ "یہ بات سلطان سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ اس جنگ میں کس جگہ کتنے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ انور علی آپ کو یہ بتا دے گا کہ اس محاذ پر زیادہ فوج نہ بھیجنے کی وجوہات کیا ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ سرِدست آپ کو مزید کمک کی توقع نہیں رکھنی چاہیے اور سلطان معظم یہ چاہتے ہیں کہ آپ زیادہ سے زیادہ عرصہ دشمن کو اس محاذ پر مصروف رکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ دوبارہ ملاقات پر ہم اس کے متعلق زیادہ اطمینان سے باتیں کرسکیں گے۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

بدرالزماں نے خدا حافظ کہہ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور ڈھونڈیا واغ مصافحہ کرنے کے بعد رسّی کی سیڑھی کے ساتھ لٹک گیا ⁂

○

اگلی رات ایک پہرےدار نے مرہٹہ فوج کے سپہ سالار پرس رام بھاؤ کو گہری نیند سے بیدار کیا اور کہا: "سرکار ایک انگریز افسر خیمے کے باہر کھڑا ہے اور وہ اسی وقت آپ سے ملنا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔"

بھاؤ آنکھیں ملتا ہوا خیمے سے باہر نکلا۔ ایک افسر گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا اور مرہٹہ سپاہی اور اردلی اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

انگریز افسر نے کسی تمہید کے بغیر کہا: "دشمن نے قلعے سے باہر نکل کر ہمارے کیمپ پر حملہ کر دیا ہے۔

آپ کی فوج کے جو دستے ہمارے ساتھ تھے وہ بھاگ گئے ہیں اور ہم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔"

"تمھیں چوکس رہنا چاہیے تھا۔ میں نے تمھارے کرنل کو یہ مشورہ دیا تھا کہ رات کے وقت قلعے کے قریب رہنا خطرناک ہے۔ لیکن تم کب کسی کی سُنتے ہو؟"

"جب آپ کو صُورتِ حال کا پتہ چلے گا تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ ہمارا فیصلہ صحیح تھا۔ آپ کی غلطی کی وجہ سے ہم دشمن کی ناکہ بندی میں کامیاب نہیں ہوئے اور وہ رسد اور بارُود کی لاتعداد گاڑیاں لانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لیکن کرنل صاحب یہ کہتے ہیں کہ اگر آپ اب بھی فوراً حملہ کر دیں تو ہم بہت سی گاڑیاں قلعے میں داخل ہونے سے روک سکتے ہیں۔"

ایک ثانیہ کے لیے بھاؤ ایک سکتے کی حالت میں کھڑا رہا۔

انگریز افسر نے کہا۔ "جناب اب سوچنے کا وقت نہیں۔ جو فوج آپ نے دشمن کی رسد اور کمک کے راستوں کی دیکھ بھال کے لیے متعین کی تھی وہ انتہائی ناکارہ ثابت ہوئی ہے لیکن اب اگر آپ جلدی کریں تو بہت حد تک اس کوتاہی کی تلافی ہو سکتی ہے۔"

"تمھیں اس بات کا علم ہے کہ جو فوج رسد کی گاڑیوں کے ساتھ آئی ہے، اس کی تعداد کتنی ہے؟"

"جناب رات کے وقت یہ اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اُن کی تعداد زیادہ نہیں ہو سکتی آپ جلدی کریں!"

"میں ٹیپو جیسے دشمن کے معاملے میں جلد بازی کا قائل نہیں ہوں۔ تم اپنے دستے یہاں لے آؤ اور اپنے کرنل صاحب سے کہو کہ ہم صبح سے پہلے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔"

○

صبح کے وقت پرس رام بھاؤ کے خیمے میں چند انگریز اور مرہٹہ افسر جمع تھے۔ کرنل فریڈرک انتہائی غصے کی حالت میں پرس رام بھاؤ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ "آپ کے سپاہی جنگ کا مذاق سمجھتے ہیں۔ اگر کمپنی کے سپاہی اس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے تو ہم انھیں گولیوں سے اُڑا دیتے۔ یہ کتنے شرم اور افسوس کی بات ہے کہ دشمن کی رسد اور بارُود کی گاڑیاں دھاڑواڑ کے قریب پہنچ چکی تھیں اور راستے میں آپ کی چوکیوں کے محافظ بے خبر تھے!"

پرس رام نے جھنجھلا کر کہا۔ "دیکھیے کرنل صاحب اب بحث سے کوئی فائدہ نہیں جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ لیکن اگر آپ کو یہ دعویٰ ہے کہ آپ ہم سے زیادہ باخبر تھے تو آپ کے پاس اس بات کا کیا جواب ہے کہ دشمن کی گاڑیاں آپ کے مورچوں کے سامنے سے گزر کر قلعے میں داخل ہوئیں اور پھر بھی آپ ہمیں یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کی صحیح تعداد کیا تھی۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ رات کے وقت دشمن کا اچانک حملہ اس قدر شدید تھا کہ ہمیں مجبوراً قلعے کے آس پاس اپنے مورچے خالی کرنے پڑے لیکن اگر آپ ہماری مدد کو پہنچ جاتے تو ہم ان کی بیشتر گاڑیاں قلعے میں داخل ہونے سے روک سکتے تھے۔"

پرس رام نے قدرے نرم ہو کر کہا۔ "کرنل صاحب اب آپس میں جھگڑنے سے کوئی فائدہ نہیں میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ راستے کی چوکیوں کے محافظوں کو سخت سزا دی جائے گی۔ لیکن اس وقت ہمارے سامنے قلعہ فتح کرنے کا مسئلہ ہے۔"

کرنل فریڈرک نے کہا۔ "جناب موجودہ حالات میں یہ قلعہ فتح کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں آپ کو یہ مشورہ دینے آیا ہوں کہ اب ہمیں کسی توقف کے بغیر جنوب کی طرف کوچ کر دینا چاہیے! اگر دشمن کے چند سپاہی اس قلعے میں پڑے رہیں تو ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم جنوب میں دشمن کی طاقت کچلنے کے بعد کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر واپس آ کر یہ قلعہ فتح کر سکیں گے۔ لیکن اگر آپ یہاں بیٹھے رہے تو ہمارے جنگی منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ ہمارے دشمن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہماری قوت مختلف محاذوں پر بٹی رہے اور ہم کسی ایک میدان میں یکجا ہو کر اس پر فیصلہ کن ضرب نہ لگا سکیں۔"

پرس رام بھاؤ نے کہا۔ "ہمارے لیے یہ قلعہ فتح کیے بغیر آگے بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ دھاڑ واڑ کو اس حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بدرالزماں کو عقب سے ہمارے رسد اور کمک کے راستے کاٹنے کا موقع مل جائے۔ مجھے جنرل میڈوز کی مشکلات کا احساس ہے لیکن ہمیں پیشوا اور نانا فرنویس کا حکم ہے کہ ہم آگے بڑھنے سے پہلے یہ اچھی طرح دیکھ لیں کہ ہمارا عقب کس حد تک محفوظ ہے۔ اگر آپ ہمت سے کام لیں تو ہم چند دنوں میں قلعہ فتح کر سکتے ہیں، اس کے بعد مجھے آپ کی ہدایات پر عمل کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

کرنل فریڈرک نے کہا: "اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو میں آپ سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اب آپ کے سپاہی چوکس رہیں گے اور دشمن کو رسد اور کمک بھیجنے کا موقع نہیں ملے گا؟"

"میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ اب دشمن کا ایک سپاہی بھی اس علاقے میں داخل نہیں ہو سکے گا!"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ دشمن کس راستے سے یہاں پہنچا ہے اور آپ کی محافظ چوکیوں کے سپاہی کہاں تھے۔ اگر رسد کی دو چار گاڑیاں ہوتیں تو اور بات تھی لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ رات کے وقت جو گاڑیاں قلعے میں داخل ہوئی ہیں اُن کی تعداد سو سے زیادہ تھی اور ہماری نسبت قلعے کے محافظ اس قدر باخبر تھے کہ انھیں رسد اور کمک کی آمد کے صحیح وقت تک کا علم تھا۔"

پرسرام بھاؤ نے کہا: "کرنل صاحب اب اس مسئلے پر بحث کرنا بے سود ہے کہ دشمن کس راستے سے یہاں پہنچا ہے۔ میں نے چند ہوشیار آدمیوں کو گاڑیوں کے نشان دیکھنے کے لیے بھیج دیا ہے اور ان کی تحقیقات کے بعد جن چوکیوں کے سپاہی مجرم ثابت ہوں گے انھیں بدترین سزائیں دی جائیں گی۔ میں اس بات کا بھی ذمہ لیتا ہوں کہ آئندہ بدرالزماں کی فوج باہر سے اناج کا ایک دانہ تک حاصل نہیں کر سکے گی۔ اب یہ قلعہ فتح کرنا ہماری عزت کا مسئلہ ہے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم آج ہی اپنا پڑاؤ قلعے کے قریب لے جائیں تاکہ آپ کو بار بار یہ

کہنے کا موقع نہ ملے کہ ہم جنگ میں سنجیدہ نہیں ہیں۔"

○

دھاڑ واڑ کے محاصرے کو چھ ماہ گزر چکے تھے اور قلعے کے محافظ ایک غیر معمولی عزم و استقلال کے ساتھ دشمن کے پے در پے حملوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انگریزوں اور مرہٹوں کو بمبئی اور پونا سے کسی دقت کے بغیر رسد اور کمک پہنچ رہی تھی لیکن بدرالزماں کو مستقبل قریب میں کسی بیرونی اعانت کی اُمید نہ تھی۔ قلعے کے اندر رسد اور بارُود کے گودام بتدریج خالی ہو رہے تھے۔ دشمن کی شدید ناکہ بندی نے اُجڑے ہوئے شہر کے کنوؤں کا تازہ پانی حاصل کرنا ناممکن بنا دیا تھا اور قلعے کے اندر جو تالاب تھے وہ آہستہ آہستہ خالی ہو رہے تھے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ قلعے کے محافظوں کو مٹھی بھر اُبلے ہوئے چاول یا جوار کی ایک سوکھی روٹی اور پانی کے ایک پیالے پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ اور انتہائی ضرورت کے بغیر انھیں بارُود استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ تاہم وہ ڈٹے رہے اور قلعے کے باہر دشمن کی گولہ باری اور قلعے کے اندر بھوک، پیاس اور بیماریاں ان جانبازوں کے حوصلے متزلزل نہ کر سکیں جنھوں نے سلطان فتح علی ٹیپو سے زندگی کے آخری آداب سیکھے تھے۔ وہ جن کے چہروں پر زندگی کا خون دوڑتا تھا اب ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آتے تھے۔ انور علی جسے چند ہفتے قبل وہ صرف ایک بہادر اور فرض شناس افسر کی حیثیت سے جانتے تھے اب ان کی آنکھوں کا تارا بن چکا تھا۔ بدرالزماں سے لے کر ایک معمولی سپاہی تک اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ کبھی مریضوں کی تیمارداری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتا اور کبھی رات کے وقت قلعے سے باہر نکل کر دشمن کے کیمپ پر حملہ کرنے والے جانبازوں کی کمان سنبھال لیتا۔ کبھی وہ قلعے کی مسجد کے منبر پر کھڑا ہو جاتا اور اس کی رُوح پرور تقریروں سے قلعے کی شکستہ دیواروں کے اندر حوصلوں اور ولولوں کی ایک نئی دُنیا آباد ہو جاتی۔ ڈھونڈیا داغ سلطان کی ہدایات کے مطابق انور علی اور اس کے ساتھیوں کو قلعے میں پہنچانے

کے بعد دُوسرے محاذوں پر دکن اور پونا کی افواج کی نقل و حرکت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے واپس جا چکا تھا۔

لیگرانڈ نے دھاڑواڑ پہنچنے کے بعد چند ہفتے انتہائی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا، لیکن اب اس کی صحت پر مسلسل بھوک پیاس اور بے آرامی کے اثرات ظاہر ہو رہے تھے۔ دن بھر کے لیے پانی کی مقدار اب ایک کٹورے کی بجائے نصف کٹورا کر دی گئی تھی۔ ایک دن اس نے اُبلے ہُوئے چاول کے چند لقمے حلق سے اتارنے کے بعد اپنے حصے کا پانی پیا، لیکن اس کی تشنگی دُور نہ ہوئی۔ خالی کٹورا نیچے رکھتے وقت اُسے اس بات کا احساس ہُوا کہ ابھی پانی کی چند بُوندیں باقی رہ گئی ہیں چنانچہ اس نے دوبارہ کٹورا اٹھا کر مُنھ سے لگا لیا۔ انور علی اس سے چند قدم دُور بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ اپنا کٹورا اٹھا کر جلدی سے آگے بڑھا اور مسکراتا ہُوا لیگرانڈ کے قریب بیٹھ گیا۔ جب لیگرانڈ نے پانی کا آخری قطرہ حلق میں انڈیلنے کے بعد کٹورا نیچے رکھ دیا تو انور علی نے اپنے حصے کے چند گھونٹ اس میں ڈال دیے۔ لیگرانڈ نے اس کی طرف دیکھا اور پریشان سا ہو کر بولا "میرے دوست میں اپنے حصے کا پانی پی چکا ہُوں اور آپ کے ہونٹ مجھ سے زیادہ خشک ہیں مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔"

انور علی نے اپنا کٹورا اس کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہُوئے کہا "میرے لیے یہ دو گھونٹ کافی ہیں اور تمھیں اس وقت زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔"

لیگرانڈ نے کہا "آج میری طبیعت ٹھیک نہیں شاید مجھے بخار ہو رہا ہے۔"

"تم یہ پانی پی کر لیٹ جاؤ میں ابھی طبیب کو بُلاتا ہُوں۔"

لیگرانڈ نے تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر انور علی کی طرف دیکھا اور چند ثانیے تذبذب کے بعد کٹورا اُٹھا لیا۔

دُوسرے محاذوں پر اتحادی فوج نے اپنے لامحدُود جنگی وسائل کے باوجود کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ جنوب کی طرف میر نظام علی کے لشکر کی پیش قدمی نے سلطان ٹیپو کو منگلور کا محاصرہ اُٹھا کر پیچھے ہٹنے پر مجبُور کر دیا تھا اور وہ سرنگاپٹم کی طرف دشمن کی متوقع یلغار کے پیشِ نظر تمام راستوں کی چوکیوں اور قلعوں کو مضبُوط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لارڈ کارنوالس کو میسُور کی سرزمین کے ایک ایک اِنچ پر شدید مزاحمت کی توقع تھی اور وہ اپنے ساتھ مرہٹہ لشکر کو شامل کیے بغیر آگے بڑھنا خطرناک سمجھتا تھا لیکن پرس رام بھاؤ کا لشکر دھاڑواڑ میں پھنسا ہُوا تھا اور دوسرا مرہٹہ لشکر جس نے ہری پنت کی قیادت میں کرنول کی طرف پیش قدمی کی تھی قدم قدم پر شدید مزاحمت کا سامنا کر رہا تھا۔ ان کے متعلق ایک دن یہ خبر آتی کہ اُنھوں نے فلاں چوکی، فلاں شہر یا فلاں قلعے پر قبضہ کر لیا ہے تو اگلے دن یہ خبر سُنی جاتی کہ میسُور کی فوج نے انھیں فلاں مقام پر شکست دے کر اتنے کوس پیچھے دھکیل دیا ہے۔

یہ صورتِ حالات لارڈ کارنوالس کے لیے غیر متوقع تھی۔ تاہم وہ زیادہ پریشان نہ تھا۔ میر نظام علی اور مرہٹوں کے متعلق اس کا یہ خدشہ دُور ہو چکا تھا کہ وہ کسی وقت بھی میدان میں تنہا چھوڑ کر جنگ سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ دکن کا لشکر اس کے ساتھ شامل ہو چکا تھا اور مرہٹوں کے متعلق بھی اسے یہ یقین تھا کہ دھاڑواڑ کے محاذ سے فارغ ہوتے ہی پرس رام کی افواج ہری پنت کے لشکر سے آملیں گی۔ اور پھر یہ ٹڈی دل لشکر سرنگاپٹم کی طرف یلغار کرے گا۔

لارڈ کارنوالس کو فیصلہ کن جنگ کے لیے سلطان ٹیپو کی تیاریوں کا علم تھا لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ موجودہ حالات میں جنگ کا طُول کھینچنا اس کے لیے جس قدر نقصان دہ ہو سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ سلطان ٹیپو کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ میسُور کی نسبت وہ بجا طور پر اپنے اور اپنے اتحادیوں کے وسائل کی برتری پر فخر کر سکتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا بحری بیڑا بمبئی اور کلکتہ سے مشرق اور مغرب کے ساحلوں کی بندرگاہوں پر تازہ دم افواج اور جنگی سامان اتارنے میں مصروف تھا اور اس کے حلیف پونا اور حیدرآباد سے ایک لامحدُود عرصہ کے

کے لیے توپوں کا چارہ مہیا کر سکتے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود جب وہ جنگ کے آنے والے دور کے متعلق سوچتا تو کبھی اس قسم کے سوالات اسے پریشان کرنے لگتے "ٹیپو اس وقت کیا سوچ رہا ہو گا؟ ـــــ وہ کہاں حملہ کرے گا؟ ـــــ وہ اتنا نادان نہیں کہ اُسے ہمارے جنگی وسائل کا علم نہ ہو، پھر وہ کس اُمید پر لڑ رہا ہے؟ ـــــ ابھی تک اس کے حوصلے پست کیوں نہیں ہوئے؟"

پھر جب اُسے اچانک کسی دن یہ اطلاع ملتی کہ میسور کے طوفانی دستوں نے کسی مقام پر حملہ کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی، نظام یا مرہٹوں کے اتنے سپاہی ہلاک کر دیے ہیں اور رسد اور بارُود کی اتنی گاڑیاں چھین لی ہیں تو اُسے یہ احساس ہونے لگتا کہ تیز ہوا کے یہ اکا دکا جھونکے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔

○

لیگرانڈ چند دن سے بیماروں اور زخمیوں کے ساتھ قلعے کے ایک کشادہ کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ ایک دوپہر انور علی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے لیگرانڈ کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "آج آپ کی حالت بہتر معلوم ہوتی ہے!"

"ہاں میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا بخار اُتر رہا ہے لیکن آج کیا بات ہے مجھے چند گھنٹوں سے دشمن کی توپوں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کل کے حملے میں شدید نقصان اٹھانے کے بعد انھوں نے اس محاذ سے منہ پھیر لیا ہو۔ میں کئی آدمیوں سے پوچھ چکا ہوں۔ لیکن کسی نے مجھے تسلی بخش جواب نہیں دیا۔"

انور علی نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا "نہیں یہ بات نہیں دشمن کو ہمارے حالات کا بخوبی علم ہے اور اُسے اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ وہ مزید نقصانات اٹھائے بغیر ہمیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ آج علی الصباح انھوں نے ہمارے کمانڈر کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے اور بدر الزّماں خاں بعض شرائط پر قلعہ خالی کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور انھوں نے مزید گفتگو کے لیے چار افسر پرس رام بھاؤ کے ایلچیوں کے ساتھ روانہ کر دیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ صبح سے دشمن کا توپ خانہ خاموش ہے۔"

لیگرانڈ نے مغموم لہجے میں کہا "میرا خیال تھا کہ قلعہ کے کمانڈنٹ آپ کے مشورہ پر عمل کریں گے۔"

انور علی نے جواب دیا "مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں۔ اس سے قبل دشمن دو بار جنگ بند کرنے کی پیش کش کر چکا ہے اور بدر الزّماں خاں صرف میری مخالفت کے باعث قلعہ خالی کرنے کے متعلق اُن کی شرائط ٹھکرا چکے ہیں۔ لیکن اب حالات ایسے ہیں کہ میں اُن کے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔"

ایک سپاہی کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے انور علی کی طرف متوجّہ ہو کر کہا "آپ کو قلعہ دار صاحب بُلاتے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا وفد واپس آ گیا ہے۔" یہ کہہ کر انور علی اٹھا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ دو منٹ بعد وہ بدرُ الزّماں کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں چند افسر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بدرُ الزّماں کے سامنے ایک چھوٹی سی میز پر ایک کاغذ پڑا ہوا تھا۔ انور علی اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر اُس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

بدرُ الزّماں نے میز سے کاغذ اُٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لیجیے یہ پڑھ لیجیے! آپ کے خدشات بالکل بے بنیاد تھے۔ پرس رام بھاؤ نے میری تمام شرائط مان لی ہیں۔ ہمیں قلعہ چھوڑتے وقت اپنا اسلحہ اور تمام سرکاری روپیہ ساتھ لے جانے کی اجازت ہو گی اور جب تک ہم دریا کے پار نہیں پہنچ جاتے پرس رام بھاؤ کے خاص دستے ہماری حفاظت کریں گے۔ دشمن کو اس بات پر اصرار ہے کہ ہم سات توپوں سے زیادہ اس قلعے سے باہر نہیں نکال سکتے۔ لیکن ہمارے لیے یہ سودا مہنگا نہیں ہماری بیشتر توپیں ناکارہ ہو چکی ہیں۔"

انور علی معاہدے کی تحریر پڑھنے کے بعد بدرالزمان کی طرف متوجہ ہُوا اور بولا: "موجودہ حالات میں آپ اس سے بہتر شرائط نہیں منوا سکتے تھے۔ لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ انگریز اور مرہٹے ان شرائط کو پُورا کریں گے اور جو دستے ہماری حفاظت کے لیے متعین کیے جائیں گے انھیں یہ ہدایت نہیں ہوگی کہ وہ قلعے سے باہر موقع پاتے ہی ہم پر ٹوٹ پڑیں؟"

بدرالزمان نے جواب دیا: "اس بات کی کوئی ضمانت نہیں لیکن موجودہ حالات میں ہمارے لیے دشمن کی شرافت اور نیک نیّتی پر اعتماد کرنا ایک مجبوری ہے۔ تم جانتے ہو کہ یہ معاہدہ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے نہیں کیا۔ میرے سامنے ان انسانوں کا مسئلہ ہے جنھیں قلعے کے اندر اب موت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہماری رسد ختم ہو چکی ہے تالاب جن میں ہم نے گزشتہ بارش سے کچھ پانی جمع کیا تھا پھر خشک ہو رہے ہیں۔ میرے دس ہزار سپاہیوں کی تعداد اب تین ہزار تک پہنچ چکی ہے اور رسد اور پانی کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے وہ پانچ چھ دن سے زیادہ ان آدمیوں کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔ قلعے سے باہر نکلنے کی صورت میں اگر دشمن نے بدعہدی کی تو بھی اس بات کا امکان ہے کہ کچھ آدمی زندہ بچ کر نکل جائیں لیکن چند دن بعد قلعے کے اندر لاشوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ سلطان معظم مجھے یہ نہیں کہیں گے کہ میں نے ان کی حکم عدولی کی ہے اور آپ میں سے بھی کوئی مجھے بے غیرتی یا بزدلی کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ میں دشمن کو یہ پیغام بھیج رہا ہوں کہ ہم پانچ دن کے اندر اندر قلعہ خالی کر دیں گے۔ اس معاہدے کی رو سے ہم قلعہ خالی کرنے تک باہر سے اپنی ضرورت کے مطابق پانی حاصل کر سکیں گے اور ہمیں دشمن کے پڑاؤ سے اناج خریدنے کی بھی اجازت ہوگی۔ آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟"

انور علی نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا: "نہیں مجھ میں اب کچھ کہنے کی ہمت باقی نہیں رہی۔ میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہُوں کہ آپ قلعے سے باہر نکلنے کے بعد مرہٹوں کے متعلق چوکس رہیں۔"

بدرالزمان نے جواب دیا: "قلعے سے باہر نکلنے کے بعد اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو کسی سپاہی یا افسر کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں اس کی کوئی مدد کر سکوں گا۔ ہمارا یہ فرض ہوگا کہ ہم اپنی اپنی جانیں بچانے کی کوشش کریں۔ مَیں نے دشمن سے پانچ دن کی مہلت اس لیے مانگی ہے کہ پیاس اور فاقہ کشی کے باعث میرے ساتھی نڈھال ہو چکے ہیں اور میں یہ چاہتا ہُوں کہ قلعہ خالی کرنے سے پہلے وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں۔"

انور علی نے دوبارہ کاغذ پر نظر ڈالتے ہُوئے کہا: "لیکن اس معاہدے کے مطابق تو آپ کو کل ہی قلعے سے باہر نکلنا پڑے گا۔"

"ہاں بھاؤ کو اس بات پر اصرار ہے کہ میں نیک نیّتی کا ثبوت دینے کے لیے کل ہی اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دوں۔ میں اپنے ساتھ صرف چند آدمی لے جاؤں گا اور میری غیر حاضری میں فوج کی کمان آپ کے سپرد ہوگی۔ اگر دشمن نے میرے ساتھ بدعہدی کی تو تمھیں اطلاع مل جائے گی اور میری طرف سے کوئی اطلاع نہ آنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں دشمن کی قید میں ہُوں یا قتل ہو چکا ہوں۔ پھر یہ سوچنا آپ کا کام ہوگا کہ آپ کو کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

اگلے دن مرہٹہ فوج کے چند افسر قلعے سے باہر کھڑے تھے۔ بدرالزمان پچاس آدمیوں کے ساتھ قلعے سے باہر نکلا۔ ایک افسر نے آگے بڑھ کر اُسے سلام کیا اور کہا: "مہاراج بھاؤ صاحب نے آپ کے لیے پالکی بھیجی ہے۔"

بدرالزمان پیدل چلنا چاہتا تھا لیکن مرہٹہ افسر کے اصرار پر وہ پالکی پر بیٹھ گیا کہاروں نے پالکی اٹھائی اور یہ قافلہ مرہٹہ کیمپ کی طرف روانہ ہُوا۔ مرہٹوں کے پڑاؤ میں داخل ہوتے ہی سینکڑوں آدمی انتہائی جوش و خروش کی حالت میں نعرے لگاتے اور گالیاں دیتے ہُوئے اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ اور زمین سے مٹی اٹھا اٹھا کر بدرالزمان کی پالکی پر پھینکنے لگے۔ اس اشتعال انگیز ماحول میں میسور کے سپاہیوں کا ضبط و سکون قابلِ دید تھا۔ بعض مرہٹے اُچھلتے کودتے اور ناچتے ہُوئے آگے بڑھتے اور اپنی تلواریں ان کی آنکھوں کے سامنے گھمانے لگتے۔ بعض اپنے خنجر ان کی گردنوں پر رکھ دیتے اور بعض اپنی بندوقوں کی نالیاں ان کے سینوں تک لے جاتے۔ اچانک ایک

طرف سے چند بندوقیں چلنے کی آواز آئی اور ہجوم اِدھر اُدھر سمٹنے لگا۔ پرس رام بھاؤ فوج کے چند سرداروں اور اپنے محافظ دستے کے ساتھ نمودار ہُوا۔ کہاروں نے بدرالزّمان کی پالکی نیچے رکھ دی۔ پرس رام نے آگے بڑھ کر کہا: "مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جن لوگوں نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی ہے۔ انھیں بدترین سزائیں دی جائیں گی۔"

بدرالزّمان خاں اپنی قبا سے گرد جھاڑتا ہوا پالکی سے اُترا اور بولا: "مجھے ان لوگوں سے کوئی شکایت نہیں۔ میرے ساتھ اُن کی نفرت اس بات کا ثبوت ہے کہ میں سُلطان کا ایک وفادار سپاہی ہوں۔"

"لیکن ایک بہادر اور شریف دشمن کے ساتھ اس طرح پیش آنا انتہائی زوالت ہے۔ میں نے آپ کا خیمہ اپنے قریب نصب کروایا ہے اور اب آپ کی حفاظت میرا ذمہ ہوگا۔"

"شکریہ! لیکن مجھے اپنے پاس رکھ کر آپ کو اپنے سپاہیوں پر بہت سی پابندیاں عائد کرنی پڑیں گی۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے پڑاؤ سے کچھ دُور ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔ میرا آپ کے پاس چلے آنا اس امر کی ضمانت ہے کہ میرے ساتھی معاہدے کی شرائط کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ تاہم آپ کو مجھ پر اعتماد نہ ہو تو میرے ساتھ اپنے چند سپاہی بھیج دیجیے۔"

"مجھے یہ بات منظور ہے۔"

بدرالزّمان نے کہا: "قلعے کے اندر میرے ساتھی بھوک اور پیاس سے مر رہے ہیں اور آپ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ میرے یہاں پہنچتے ہی آپ ان کے لیے رسد اور پانی کا انتظام کر دیں گے۔"

پرس رام بھاؤ نے جواب دیا: "میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔"

کچھ دیر بعد بدرالزمان اور اس کے ساتھی مرہٹہ پڑاؤ سے دو میل کے فاصلے پر شموگہ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے ڈیرہ ڈال چکے تھے۔

سولھواں باب

پانچویں دن سہ پہر کے وقت انور علی اور اُس کے باقی ساتھی دھاڑواڑ کا قلعہ خالی کر رہے تھے۔ رسات توپیں اور خزانہ دو دن قبل بدرالزمان کے کیمپ میں پہنچایا جا چکا تھا۔ بیماروں اور زخمیوں کو کھاٹوں پر ڈال کر قلعے سے باہر نکالا گیا۔ لیگر انور گزشتہ بیماری کے باعث کافی کمزور ہو چکا تھا، لیکن وہ کھاٹ پر لیٹنے کی بجائے پیدل چلنے پر مُصر تھا۔

جب یہ قافلہ قلعے سے باہر نکل کر اپنے کیمپ کی طرف روانہ ہو رہا تھا تو انگریز اور مرہٹہ سپاہیوں کے چند دستے دروازے کے قریب کھڑے تھے۔ سواروں کا ایک دستہ اس قافلے کے ساتھ چل دیا اور باقی مسرت کے نعرے لگاتے ہوئے قلعے کے اندر داخل ہونے لگے۔ کچھ دور چلنے کے بعد انور علی نے مُڑ کر دیکھا تو قلعے میں تھوڑی دیر پہلے جس جگہ میسور کا جھنڈا لہرا رہا تھا انگریزوں اور مرہٹوں کے جھنڈے نصب کیے جا رہے تھے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہو گئے اور وہ چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "میرے دوستو! اپنی گردنیں اُونچی رکھو۔ اگر خدا نے چاہا تو ہم بہت جلد واپس آئیں گے۔"

رات کے وقت فوج کے چند افسر بدرالزّمان خاں کے خیمے میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہ اُن سے کہہ رہا تھا: "مرہٹوں نے ہمارے ساتھ جنگ کے دوران میں پہلی بار انسانیت کا ثبوت دیا ہے۔"

ایک افسر نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "پرس رام بھاؤ ایک شریف دشمن ہے اور مجھے اُس کی طرف سے کسی بدسلوکی کی توقع نہ تھی" ——— اور پھر کئی افسر یکے بعد دیگرے پرس رام کے طرزِ عمل کے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ انور علی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ بالآخر اس نے کہا "بھاؤ کا سلوک واقعی غیر متوقع ہے لیکن جب تک ہم کسی محفوظ جگہ نہیں پہنچ جاتے مجھے اس کی انسانیت یا شرافت کا یقین نہیں آئے گا۔ مرہٹوں کو ہمارے متعلق اپنے ارادے بدلنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اس لیے میں پھر ایک بار آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے کوچ کر دینا چاہیے!"

بدرالزمان خان نے کہا "بھاؤ نے مجھے یقین دلایا ہے کہ ضروری انتظامات کے بعد تین چار دن تک ہمیں یہاں سے روانہ ہونے کی اجازت مل جائے گی۔"

انور علی نے کہا "اگر یہ کوئی خفیہ بات نہ ہو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ انتظامات کیا ہیں؟"

"ہم گاڑیوں کے لیے بیل حاصل کیے بغیر اپنا سامان اور اپنے زخمی اور بیمار ساتھیوں کو نہیں لے جا سکتے۔ بھاؤ نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں یہاں سے بیلوں کے علاوہ چند گھوڑے بھی خریدنے کی اجازت ہوگی۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ انتظامات کل ہی مکمل ہو جائیں اور ہمیں کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے کوچ کرنے کی اجازت مل جائے لیکن بھاؤ نے اگر ہمیں دو ایک دن اور یہاں ٹھہرانے پر اصرار کیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بھاؤ کو یہ اندیشہ تھا کہ راستے میں مرہٹہ چوکیوں کے سپاہی ہمیں پریشان کریں گے، چنانچہ ہمیں دھاڑوار کے علاقے سے گزارنے کے لیے اس نے ہمارے ساتھ اپنے سپاہی بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

انور علی نے کہا "مجھے اندیشہ ہے کہ بھاؤ کے یہ سپاہی ہمارے لیے راستے کی مرہٹہ چوکیوں کے سپاہیوں کی نسبت زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔"

بدرالزمان خاں نے جواب دیا "میں یہ نہیں کہوں گا کہ تمھارے اندیشے بے بنیاد ہیں لیکن ان حالات میں ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

ایک افسر نے کہا "کاش ہم دریا کے آس پاس اپنی چوکیوں کو ان حالات سے باخبر کر سکتے۔ آج ہمیں ڈھونڈیا واغ کی ضرورت تھی۔"

بدرالزماں نے کہا "موجودہ حالات میں مرہٹوں کی اجازت کے بغیر ہمارے کسی آدمی کا یہاں سے نکلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے تمام راستوں کی مکمل ناکہ بندی کر رکھی ہے اور میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ ہمارا ایلچی یہاں سے نکلتے ہی گرفتار ہو جائے اور مرہٹوں کو ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے کا بہانہ مل جائے۔"

انور علی نے کہا "اگر ہم دریا تک پہنچ سکیں تو آگے ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ہماری چوکیاں ہمارے حالات سے بے خبر نہیں ہیں۔ میں انھیں اطلاع بھیج چکا ہوں۔"

"کب؟" بدرالزماں نے حیران سا ہو کر سوال کیا۔

"آپ کے قلعہ خالی کرنے سے اگلی رات میں نے ایک ایلچی بھیج دیا تھا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تمھارا ایلچی پکڑا نہیں گیا۔"

"وہ ڈھونڈیا واغ کے انتہائی قابلِ اعتماد ساتھیوں میں سے تھا اور میں نے اس بات کے انتظامات کر لیے تھے کہ وہ پکڑا جائے تو مرہٹے یہ شبہ نہ کریں کہ وہ ہماری مرضی سے فرار ہوا ہے۔ میں نے اسے خزانے سے روپوں کی ایک تھیلی نکال کر دے دی تھی تاکہ اگر ضرورت پڑے تو وہ اپنے آپ کو ایک کامیاب چور ثابت کر سکے۔"

"اور تمھیں یقین ہے کہ وہ پکڑا نہیں گیا؟"

"ہاں، لیکن اگر وہ پکڑا جاتا تو بھی ہمارے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مرہٹہ پہرے دار اسے گرفتار کر کے پرس رام سے شاباش حاصل کرنے کی بجائے چوری کے مال میں حصہ دار بننا زیادہ سُود مند سمجھیں گے۔"

ایک افسر نے کہا "لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ جب تک ہم اس علاقے سے باہر نہیں نکلتے ہماری چوکیاں ہماری کیا مدد کر سکتی ہیں؟"

انور علی نے جواب دیا "میں نے یہ نہیں کہا کہ ہماری چوکیوں کے سپاہی اس علاقے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ میں نے صرف یہ سوچا تھا کہ اگر راستے میں مرہٹوں کی نیت خراب ہو جائے تو شاید چند آدمی لڑتے بھڑتے دریا کی طرف نکل جائیں اور وہاں ہمارے سپاہیوں کی بروقت مداخلت سے ان کی جانیں بچ جائیں۔ بھاؤ کے سپاہی اگر ہمیں کسی خاص راستے پر لے جانے کے لیے مُصر نہ ہوں تو ہمارے لیے جنگل اور پہاڑ کا راستہ اختیار کرنا بہتر ہوگا۔"

○

پرس رام نے تین دن کی ٹال مٹول کے بعد بدرالزماں کو کوچ کرنے کی اجازت دے دی اور یہ قافلہ مرہٹہ سپاہیوں کی حفاظت میں روانہ ہوا۔ قافلے کے ساتھ تیس بیل گاڑیاں تھیں جن میں سے بعض پر توپیں اور دوسرا سامان لدا ہوا تھا اور باقی زخمیوں اور بیماروں سے بھری ہوئی تھیں۔ بدرالزماں کے علاوہ پانچ بڑے افسر گھوڑوں پر سوار تھے۔ لیگرانڈ کی حالت قدرے بہتر تھی لیکن دو تین میل چلنے کے بعد اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ انور علی نے اس کے قریب آکر اپنا گھوڑا روکا اور اترتے ہوئے کہا "لیگرانڈ اگر تم بیماروں اور زخمیوں کے ساتھ بیل گاڑی پر سفر کرنا پسند نہیں کرتے تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ ابھی تم پیدل چلنے کے قابل نہیں ہو۔"

لیگرانڈ نے کچھ دیر پس و پیش کیا لیکن انور علی کے اصرار پر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد بدرالزماں نے انور علی کی تقلید کی اور اپنا گھوڑا ایک نحیف اور لاغر ساتھی کے حوالے کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی افسر بھی اپنے گھوڑوں سے اُتر پڑے اور انھیں زیادہ مستحق ساتھیوں کے حوالے کرنے کے بعد قافلے کے ساتھ پیدل چلنے لگے۔

دوپہر کے قریب مرہٹہ پڑاؤ کی طرف سے کوئی پچاس سرپٹ سوار نمودار ہوئے اور دستوں کا افسر قافلے کو رُکنے کا حکم دے کر ان کی طرف متوجہ ہُوا۔

ان پچاس سواروں میں سے ایک مرہٹہ فوج کا با اثر سردار تھا۔ اس نے قافلے کے

قریب پہنچ کر اپنے ساتھیوں کو رُکنے کا حکم دیا، پھر آگے بڑھ کر محافظ دستوں کے افسر کے ساتھ کوئی گفتگو کی اور بالآخر بدرالزماں کے قریب آکر کہا "آپ کو کچھ دیر یہاں رُکنا پڑے گا!"

بدرالزماں نے پوچھا "یہ آپ کی خواہش ہے یا بھاؤ صاحب کا حکم ہے؟"

"کچھ سمجھ لیجیے۔"

"آپ کوئی معقول وجہ بیان کیے بغیر مجھے نہیں روک سکتے۔ یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی۔"

"معاہدے کی خلاف ورزی آپ کی طرف سے ہُوئی ہے۔ ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ آپ نے قلعہ خالی کرتے وقت بارود کا بہت بڑا ذخیرہ ضائع کر دیا ہے۔"

"یہ غلط ہے۔ اگر ہمارے پاس بارود ہوتا تو ہم قلعہ خالی نہ کرتے۔"

"آپ نے صرف بارود ہی ضائع نہیں کیا بلکہ بہت سی فالتو بندوقیں بھی کسی جگہ چھپا دی ہیں۔"

انور علی نے آگے بڑھ کر جواب دیا "یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے تمام فالتو بندوقیں گن کر آپ کے افسروں کے حوالے کی تھیں۔ تم دیکھ سکتے ہو ہمارے کسی سپاہی کے پاس ایک سے زیادہ بندوق یا تلوار نہیں۔"

سردار نے کہا "بھاؤ صاحب کا حکم ہے کہ آپ اپنی بندوقیں اور تلواریں ہمارے حوالے کر دیں اور یہاں ٹھہر کر ان کے حکم کا انتظار کریں۔ وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ آپ نے معاہدے کی شرائط کی خلاف ورزی نہیں کی ہے تو آپ کو کوچ کی اجازت مل جائے گی۔"

بدرالزماں نے کہا "بھاؤ صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ ہم لڑائی میں شکست کھانے کے بعد بے وقوف بھی بن گئے ہیں۔ اگر تمھاری نیت بدل گئی ہے تو میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تم صرف لاشوں کے انبار سے بندوقیں تلاش کر سکو گے۔ میرے ساتھی تمھارے آدمیوں کے گھیرے میں ہیں لیکن مرنے سے پہلے وہ آخری بار اپنی بندوقیں اور تلواریں استعمال کرنے کا موقع کھونا پسند نہیں کریں گے۔"

مرہٹہ سردار نے قدرے نرم ہو کر کہا "بھاؤ صاحب نے ہمیں آپ سے لڑنے کی اجازت

نہیں دی۔"

بدرالزمان نے جواب دیا "میں بھاؤ صاحب کو بلاوجہ ناراض نہیں کرنا چاہتا لیکن ہمارے لیے سفر جاری رکھنا ضروری ہے۔"

"آپ کی مرضی لیکن آپ کا فائدہ اسی میں ہے کہ آپ یہاں رُک جائیں۔"

"اگر بھاؤ صاحب کی نیت خراب ہے تو ہمارے رُکنے یا سفر کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ جب چاہیں ہم پر حملہ کر سکتے ہیں۔"

"آپ کو بھاؤ صاحب کی نیت کے متعلق شُبہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ صرف آپ سے اس بات کی تسلی حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے قلعہ خالی کرنے کے متعلق معاہدے کی شرائط کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔"

"میں آپ کو جواب دے چکا ہوں کہ ہم نے کسی شرط کی خلاف ورزی نہیں کی ہے لیکن اگر آپ یہ جواب تسلی بخش نہیں سمجھتے تو میں آپ کے ساتھ بھاؤ صاحب کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ اس سے زیادہ نیک نیتی کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سے بات کرنے کے بعد بھاؤ صاحب مطمئن ہو جائیں گے۔"

انور علی نے مضطرب ہو کر کہا "آپ کا یہ فیصلہ درست نہیں۔"

لیکن بدرالزمان نے اس کی طرف توجہ دینے کی بجائے مرہٹہ سردار سے مخاطب ہو کر کہا "میں آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن آپ پہلے اپنے سپاہیوں سے اس بات کی تسلی کر لیں کہ وہ میرے واپس آنے تک قافلے کو روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ بھاؤ صاحب سے ملاقات کے بعد میں فوراً واپس آنا چاہتا ہوں۔ میرے بیس سپاہی میرے ساتھ جائیں گے اور آپ کو ہم سب کے لیے گھوڑے مہیا کرنے پڑیں گے۔"

مرہٹہ سردار نے کہا "چھ گھوڑے آپ کے پاس ہیں اور پانچ چھ گھوڑوں کا انتظام ہو سکتا

ہے۔ آپ کو اس سے زیادہ آدمی ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔"

بدرالزمان نے جواب دیا "مجھے زیادہ آدمی ساتھ لے جانے کا شوق نہیں لیکن میرا محافظ دستہ کسی صورت میرا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں کرے گا۔ بہر حال آپ کو کوئی اعتراض ہو تو میں ان کی تعداد کم کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"تو آپ گھوڑوں کا انتظام کیجیے۔ میں اتنی دیر میں اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دیتا ہوں لیکن اس بات کا خیال رکھیے کہ ہمارے پاس جو گھوڑے تھے وہ ان لوگوں کو دے دیے گئے ہیں جو پیدل چلنے کے قابل نہ تھے۔"

"بہت اچھا آپ تیار ہو جائیں میں گھوڑوں کا انتظام کرتا ہوں۔" سردار نے یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کی باگ موڑلی اور مرہٹہ فوج کے افسروں اور سپاہیوں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا۔

انور علی نے بدرالزمان کا بازو پکڑ کر سرگوشی کے انداز میں کہا "آپ یہ غلطی نہ کریں۔"

بدرالزمان نے جواب دیا "ان واقعات کے بعد مجھے تمھاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بھاؤ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ لیکن میں تم لوگوں کو موقع دینا چاہتا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ حملہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں بھاؤ کے پاس اس لیے جا رہا ہوں کہ تمھیں شام تک سفر کرنے کا موقع مل جائے اور تم رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا سکو۔ میرے جانے کے بعد مرہٹہ سپاہیوں کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ تم شام کے وقت کہیں رُک کر میرا انتظار کرو گے لیکن تمھاری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ تم سفر جاری رکھو۔ کیونکہ تم جتنا مرہٹوں کے پڑاؤ سے دُور ہوتے جاؤ گے اتنا ہی محفوظ ہوتے جاؤ گے۔"

پاس ہی مرہٹہ سردار محافظ دستوں کے افسر سے کہہ رہا تھا "اگر تمھاری طرف سے کوئی غلطی ہوئی تو بھاؤ صاحب سخت سزا دیں گے۔ راستے میں انھیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں ان کو دوستوں کی طرح رخصت کرنا ہے۔"

مرہٹہ افسر نے کہا "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم یہیں پڑاؤ ڈال کر خان صاحب کی واپسی کا انتظار کریں؟"

"نہیں نہیں" بدرالزماں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ساتھی بعض زخمیوں کی حالت بہت نازک ہے اور ہم انھیں جلد از جلد کسی ایسی جگہ پر پہنچانا چاہتے ہیں جہاں سے ان کے لیے طبی امداد حاصل کر سکیں۔ انھیں شام تک سفر کرنے دیجیے۔ میں بہت جلد قافلے کے ساتھ آ ملوں گا۔"

○

تھوڑی دیر بعد بدرالزماں خاں اور اس کے ساتھی پچاس مرہٹہ سپاہیوں کے پہرے میں پرس رام بھاؤ کے پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گئے اور انور علی نے باقی قافلے کو کوچ کا حکم دیا۔ پانچ بجے کے قریب مرہٹہ سپاہیوں نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن انور علی غروب آفتاب تک سفر کرنے پر مُصر تھا اور مرہٹہ فوج کے افسر کو تھوڑی دیر ردّ و قدح کے بعد اس کی بات ماننی پڑی۔

مرہٹوں کے تیور دیکھنے کے بعد قیدیوں کو ان کے عزائم کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ قافلے کے چاروں طرف ان کی نقل و حرکت یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ حملہ کرنے کے لیے رات کی تاریکی کا انتظار نہیں کریں گے۔

غروبِ آفتاب کے قریب وہ ایک ندی کے کنارے پہنچے۔ مرہٹہ دستوں کے افسر نے انور علی کے قریب پہنچ کر کہا "اب شام ہونے کو ہے اور اس ندی سے تھوڑی دور آگے جنگل شروع ہو جائے گا۔ اس لیے رات کے وقت پڑاؤ ڈالنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ملے گی۔"

انور علی نے کہا "ہم رات کے اندھیرے سے پہلے جنگل کے قریب پہنچ جائیں گے اور وہاں کسی جگہ رک جائیں گے۔"

"نہیں جناب، میرے ساتھی تھک گئے ہیں لیکن اگر آپ بضد ہیں تو ہم ندی کے دوسرے کنارے پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔"

مرہٹہ افسر نے یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ پھر آن کی آن میں چند دستے ندی کے کنارے صف بستہ کھڑے ہو گئے اور باقی قافلے کے دائیں بائیں اور عقب میں صفیں درست کرنے لگے۔

انور علی نے بلند آواز سے "ہوشیار" کہا اور اس کے ساتھیوں نے آنکھ جھپکنے کی دیر میں زمین پر لیٹ کر اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی مرہٹوں نے چاروں اطراف سے گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ زمین پر لیٹنے والوں کی نسبت بیل گاڑیوں میں پڑے ہوئے بیماروں اور زخمیوں پر مرہٹہ سپاہیوں کے نشانے زیادہ کامیاب تھے۔ اس کے بعد میسور کے سپاہیوں نے جوابی فائر کیے اور مرہٹہ سپاہی پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن ان کے پاس بارود کی مقدار اتنی قلیل تھی کہ وہ اپنی رائفلوں کو کام میں نہیں لا سکتے تھے اور مرہٹوں کو اس بات کا علم تھا۔

تھوڑی دیر بعد نیزہ بازوں کا ایک دستہ آگے بڑھا اور تیس چالیس آدمیوں کو زخمی اور ہلاک کرنے کے بعد دوسری طرف نکل گیا۔ پھر دوسری سمت سے نیزہ بازوں کے ایک اور دستے نے حملہ کیا لیکن اتنی دیر میں میسور کے سپاہی اپنی بندوقیں دوبارہ بھر چکے تھے اور حملہ کرنے والوں کو ان کی فائرنگ نے پسپائی پر مجبور کر دیا۔

چند منٹ کی لڑائی میں مرہٹوں نے جو نقصان اُٹھایا تھا وہ ان کی توقع سے بہت زیادہ تھا، انھوں نے اپنے گھوڑے پیچھے ہٹا دیے اور دُور دُور درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں بندوقوں کی لڑائی پر اکتفا کرنے لگے۔ لڑائی کے آغاز میں انور علی کے ساتھ ستر ساتھی جن میں سے بعض پہلے ہی زخمی یا بیمار تھے، شہید ہو چکے تھے لیکن بندوقوں کی لڑائی میں فریقین میں سے کسی کا پلڑا بھاری نہ تھا اور جُوں جُوں تاریکی بڑھ رہی تھی میسور کے آدمیوں کے لیے بچ نکلنے کے امکانات زیادہ ہو

رہے تھے۔

انور علی نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنے ساتھیوں کو یہ پیغام پہنچا دیا تھا کہ اب مرہٹے رات کی تاریکی میں ہم پر حملہ کرنے کی بجائے صبح تک ہمیں اپنے گھیرے میں رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد ان کی مزید فوج نہ بھی آئی تو بھی دن کی روشنی میں ہم میں سے کوئی بچ کر نہیں نکل سکے گا۔ اس لیے تمھارے لیے یہی وقت ہے۔ میں ہر شخص کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرے۔

میسور کے سپاہی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں زمین پر رینگتے ہوئے ندی کی طرف کھسکنے لگے اور تھوڑی دیر میں ندی کا گھٹنے گھٹنے پانی عبور کرنے کے بعد دوسرے کنارے پہنچ گئے اور انھوں نے جنگل کی طرف اپنا راستہ روکنے والے مرہٹہ دستوں پر حملہ کر دیا۔ اب تاریکی بڑھ رہی تھی اور دست بدست لڑائی میں دوست اور دشمن کی تمیز نہ تھی۔ آن کی آن میں مرہٹے افراتفری کے عالم میں دائیں اور بائیں اطراف سمٹ رہے تھے اور میسور کے سپاہی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر جنگل کا رخ کر رہے تھے۔ انور علی اپنے ساتھیوں کو بھاگنے کا موقع دینے کے لیے دیر تک تیس چالیس سرفروشوں کے ساتھ ندی کے دوسرے کنارے ڈٹا رہا اور انھوں نے جوابی فائرنگ سے دشمن کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میدان اب قریباً خالی ہو چکا ہے۔ پھر جب جنوب کی سمت سے دشمن کی چیخ پکار سنائی دینے لگی تو انور علی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "اب تمھیں یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی جانیں بچانے کی فکر کرو۔ لیکن جانے سے پہلے چند بندوقیں بھر کر میرے پاس رکھ دو اور اپنے لیے آس پاس پڑے ہوئے ساتھیوں کی بندوقیں اٹھا لو۔"

ایک ساتھی نے کہا: "آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟"

"نہیں ابھی میرے حصے کا کام ختم نہیں ہوا۔"

"تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

انور علی نے گرج کر کہا: "تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

دوسرا ساتھی بولا: "لیکن زخمیوں کے متعلق آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"تم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ تمھاری حماقت کے باعث ان کی تعداد میں اضافہ ضرور ہو سکتا ہے۔"

○

چند منٹ بعد انور علی کے قریب بندوقوں کا ڈھیر لگ چکا تھا اور اس کے ساتھی رات کی تاریکی میں غائب ہو چکے تھے۔ اس نے یکے بعد دیگرے بھری ہوئی بندوقیں اٹھا کر مختلف سمتوں میں فائرنگ شروع کر دی۔ دشمن پر یہ تاثر ڈالنے کے لیے کہ فائر کرنے والوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چل کر کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری جگہ سے فائر کر رہا تھا۔ اچانک اسے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر بندوق کا دھماکہ سنائی دیا اور وہ دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ زمین پر رینگتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور دھماکے کے ساتھ اسے بندوق سے نکلتی ہوئی آگ کا شعلہ بھی دکھائی دیا۔ تاریکی میں اس کے لیے نشانہ باز کو پہچاننا مشکل تھا۔ تاہم اسے اس بات کی تسلی ہو چکی تھی کہ اس کی بندوق کا رخ دشمن کی طرف ہے۔

"تم کون ہو؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"سر، میں انور علی ——! میں لیگرانڈ ہوں۔" یہ کہہ کر لیگرانڈ رینگتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

انور علی نے کہا: "لیگرانڈ، تم نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ میرا خیال تھا کہ تم جنگل میں پہنچ چکے ہو گے۔"

"میں جنگل کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھ چند آدمی ابھی تک یہیں ہیں تو مجھے بھاگنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔"

"تم نے سخت حماقت کی ہے۔ میرے تمام ساتھی جا چکے ہیں۔"
"مجھے معلوم ہے۔ میں راستے میں اُن سے ملا ہُوں۔"
"اور اس کے باوجود تم یہاں آ گئے ہو۔ تمھارا گھوڑا کہاں ہے؟"
"وہ زخمی ہو گیا تھا۔"

مرہٹے اندھا دُھند گولیاں برسا رہے تھے۔ انور علی نے شمال کی طرف فائر کرنے کے بعد کہا: "تم اپنی بندوق بھر چکے ہو تو مغرب کی طرف فائر کردو اور میرے ساتھ آؤ!"

لیگرانڈ نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور تھوڑی دیر بعد وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں بندوقوں کا ڈھیر لگا ہُوا تھا۔ انور علی نے اپنی خالی بندوق ایک طرف رکھ کر بھری ہُوئی بندوق اٹھالی اور کہا: "لیگرانڈ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم اپنی جان بچانے کا بہترین موقع کھو چکے ہو لیکن اب بھی بہت کرو تو تمھارے بچ نکلنے کے کچھ امکانات باقی ہیں۔"

"میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔" لیگرانڈ نے فیصلہ کُن لہجے میں جواب دیا۔

"لیگرانڈ خدا کے لیے میری بات مان لو۔ یہ خودکشی ہے۔ تم یہاں رہ کر مجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔"

لیگرانڈ نے کہا: "میں آپ کو یقین دلاتا ہُوں کہ میں یہاں اپنی بہادری یا ایثار کا ثبوت دینے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ اگر میں بھاگ سکتا تو مجھے شاید اس بات کی پروا نہ ہوتی کہ آپ پیچھے رہ گئے ہیں۔ مجھے جنگل میں گھرے ہُوئے شکار کی طرح مرہٹوں کے ہاتھوں مارا جانا پسند نہ تھا۔ میں اس لیے واپس آیا ہُوں کہ شاید میری وجہ سے ایک دوست کی جان بچ جائے۔ اب آپ جائیں میں دشمن کو اپنی طرف متوجہ رکھوں گا۔"

انور علی نے کہا: "اگر تم میری وجہ سے آئے ہو تو چلو۔ مجھے بلاوجہ مرنا پسند نہیں۔ اگر تم نہ آتے تو بھی میرا ایک گھنٹے سے زیادہ یہاں ٹھہرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ہم دونوں یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ مرہٹے رات کی تاریکی میں اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ صبح ہونے

سے پہلے آگے بڑھ کر صورتِ حال کا جائزہ لینے کی جُرأت نہیں کریں گے۔"

یہ کہہ کر انور علی نے یکے بعد دیگرے چند اور فائر کر دیے۔ پھر لیگرانڈ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "چلو!"

لیگرانڈ نے کرب انگیز لہجے میں کہا: "انور علی میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں زخمی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں واپس آگیا ہُوں۔"

چند ثانیے انور علی کے مُنھ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر وہ جلدی سے آگے بڑھ کر لیگرانڈ کا جسم ٹٹولتے ہُوئے بولا: "زخم کہاں ہے؟"

لیگرانڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دائیں کندھے سے ذرا نیچے رکھتے ہوئے کہا: "یہاں!"

انور علی کا ہاتھ اس کے تازہ اور گرم خون سے بھیگ گیا۔ ایک ثانیے کے لیے اس کے جسمانی اور ذہنی قویٰ جواب دے چکے تھے۔ پھر اس نے ایک ہی جھٹکے میں لیگرانڈ کی قمیص نوچ ڈالی اور اپنا پٹکا اُتارتے ہُوئے کہا: "تمھارا خون بہہ رہا ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتا دیا کہ تم زخمی ہو؟" ——— انور علی نے پھٹی ہُوئی قمیص کے ایک ٹکڑے کو تہہ کر کے گدی بنائی اور لیگرانڈ کے ہاتھ میں دیتے ہُوئے کہا: "اسے زخم کے اُوپر دبا رکھو میں پٹّی باندھتا ہُوں۔"

لیگرانڈ نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور انور علی اپنے گرد و پیش سے بے پروا ہو کر پٹّی باندھنے میں مصروف ہو گیا۔ لیگرانڈ نے کہا۔ "میرے دوست! آپ بلاوجہ تکلیف کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میری منزل قریب آچکی ہے۔ زخمی ہونے کے بعد مجھے خیال تھا کہ مرنے سے پہلے میری زندگی کے آخری چند لمحات شاید ایک دوست کو بچانے کے کام آسکیں۔ لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہُوں کہ آپ میری وجہ سے مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ اگر آپ میری موت کے لمحات کو میرے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ نہیں بنانا چاہتے تو یہاں سے نکل جائیے!"

انور علی نے کہا: "تم زخمی ہو کر میرے پاس آئے ہو۔ میری تلاش میں آئے ہو اور پھر مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں تمھیں اس حال میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ اگر تم میری جان بچانا

چاہتے ہو تو تمہیں ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کچھ دُور چل سکتے ہو یا نہیں؟"

لیگرانڈ نے جواب دیا۔" آپ کی جان بچانے کے لیے میں کئی میل چل سکتا ہوں۔"

"بہت اچھا تم تھوڑی دیر یہاں میرا انتظار کرو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں آکر بتاؤں گا۔" انور علی یہ کہہ کر اُٹھا اور پُوری رفتار سے ایک طرف بھاگنے لگا۔

○

لیگرانڈ قریباً نصف گھنٹہ بے حس و حرکت پڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر وہ اضطراب کی حالت میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مرہٹے اب مختلف اطراف سے اندھا دُھند گولیاں برسانے کی بجائے اکا دُکا فائر کرنے پر اکتفا کر رہے تھے۔ اچانک اُسے ایک طرف سے آگ کا چھوٹا سا شُعلہ دکھائی دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد جب آگ کا شُعلہ آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اُسے پاس ہی کسی بھاگتے ہوئے انسان کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔

"انور علی میں یہاں ہوں!" اس نے کہا۔

انور علی ہانپتا ہُوا آگے بڑھا اور اس نے کہا۔" اب اُٹھو!"

لیگرانڈ اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل دیا۔ کوئی تیس چالیس قدم چلنے کے بعد انہیں چاروں اطراف دشمن کی چیخ و پکار سنائی دی۔ انور علی اور لیگرانڈ دوبارہ زمین پر لیٹ گئے۔ آگ کا شُعلہ پھیل کر ایک بہت بڑا الاؤ بنتا جا رہا تھا اور میدان میں دُور دُور تک روشنی پھیل رہی تھی۔

لیگرانڈ نے انور علی کو آگ کے شعلوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔" موسیو آپ سامان کی گاڑیوں کو آگ لگا کر آئے ہیں؟"

"ہاں!"

"لیکن کیوں۔ اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"تم بے حس و حرکت پڑے رہو۔ میں دشمن کو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اب یہاں لاشوں اور کراہتے ہُوئے زخمیوں کے سوا کچھ نہیں۔"

"میں بھی حیران تھا کہ آپ نے اتنی دیر کیوں لگائی ہے؟"

انور علی نے کہا۔" دس بارہ گاڑیوں کے بیل کھولنا، پھر بعض گاڑیوں سے لاشیں اُتارنا اور پھر انھیں ایک جگہ جمع کر کے آگ لگانا معمولی کام نہ تھا۔"

"لیکن اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"مرہٹوں کو معلوم ہے ان گاڑیوں پر ہمارا خزانہ بھی ہے۔ وہ ہر قیمت پر آگ بجھانے کی کوشش کریں گے اور میں نے تمام روپیہ نکال کر الاؤ کے گرد بکھیر دیا ہے۔ تم تھوڑی دیر میں ایک عجیب تماشا دیکھو گے ——— دیکھو وہ آ رہے ہیں! اب دم بخود ہو کر پڑے رہو۔ اس طرف سے کئی آدمی گزریں گے اور تمہیں یہ ظاہر کرنا پڑے گا کہ تم ایک لاش ہو۔"

لیگرانڈ نے کہا۔" میں نہیں جانتا کہ ہمیں اس سے کیا فائدہ ہو گا لیکن آپ کا یہ کھیل دلچسپ ضرور ہے۔"

چند منٹ بعد میدان میں دُور دُور روشنی پھیل چکی تھی اور پیدل اور سوار مرہٹے چیختے چلاتے الاؤ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مرہٹوں کی چند ٹولیاں انور علی اور لیگرانڈ کے قریب سے گزر گئیں۔ پھر سواروں کا ایک دستہ نمودار ہُوا اور انور علی نے جلدی سے اُٹھ کر لیگرانڈ کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔" اب اٹھو!"

چند سواروں کے گھوڑے ان کے سر پر آ چکے تھے اور انور علی نے بڑی مشکل سے لیگرانڈ کو کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ جب وہ گزر گئے تو لیگرانڈ نے کہا۔" اب یہاں سے نکلیے۔ وہ آگ کی روشنی میں ہمیں پہچان لیں گے۔"

"تم اطمینان رکھو۔ اب کوئی ہماری طرف توجہ نہیں دے گا۔ تھوڑی دیر پہلے میں سوچ رہا تھا کہ میں تمہیں گھوڑے کے بغیر یہاں سے کیسے نکال سکوں گا۔ لیکن اب اگر چاہو تو میں تمہارے لیے بیس گھوڑے حاصل کر سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"تمھیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

انور علی کی چال اس کی توقع سے زیادہ کامیاب تھی۔ جو لوگ جلتی ہوئی گاڑیوں کے قریب پہنچ چکے تھے وہ آگ بجھانے کی بجائے سونے چاندی کے چمکدار سکّوں کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ ان کا سالار گھوڑا بھگاتا ہوا آیا اور چلّا چلّا کر کہنے لگا۔ "بیوقوفو! تم یہاں کیا کر رہے ہو — دشمن کے سینکڑوں آدمی ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گئے ہیں۔ تم ان کا پیچھا کیوں نہیں کرتے — ان گاڑیوں کی پرواہ نہ کرو — تمھیں کیا ہو گیا ہے — تم کیا کر رہے ہو؟"

اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو اس نے خود بھی گھوڑے سے چھلانگ لگا دی۔ لیکن اپنے زیادہ مستعد ساتھیوں کے دھکّے کھانے کے بعد وہ ایک طرف ہٹ کر پوری قوّت سے چلّا رہا تھا۔ "بدمعاشو یہ زر یہ سرکاری ہے۔ اگر تم پیچھے نہ ہٹے تو میں سواروں کو حملہ کرنے کا حکم دے دوں گا۔"

لیکن موقع پر پہنچنے والے سوار پیادوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کے خالی گھوڑے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ایک افسر اپنے سپاہی کا گریبان پکڑ کر چلّا رہا تھا۔ "بدمعاش تم نے میرا گھوڑا کیوں چھوڑ دیا ہے؟" اور سپاہی کہہ رہا تھا۔ "مہاراج مجھ غریب پر ظلم نہ کیجیے۔ بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دیجیے۔ میرے پانچ بچے ہیں۔ آپ کا گھوڑا کہیں بھاگ نہیں جائے گا۔ دیکھیے سب کے گھوڑے یہاں پھر رہے ہیں۔" پھر اچانک اسے زمین پر پڑا ہوا کوئی سکّہ دکھائی دیا اور وہ اپنی قمیص کا ایک ٹکڑا افسر کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

انور علی اور لیگرانڈ آگے بڑھے اور انھوں نے اطمینان سے دو آوارہ گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں اور تھوڑی دور جا کر ان پر سوار ہو گئے۔ الاؤ کے گرد ہجوم کی افراتفری کا یہ عالم تھا کہ بعض آدمی اپنے ساتھیوں کے پاؤں تلے روندے جا رہے تھے۔ ہجوم کے ریلے میں ایک سپاہی کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ ایک جلتی ہوئی گاڑی کے پہیے پر گر پڑا۔ آن کی آن میں اس کے کپڑوں کو آگ لگ گئی اور وہ چیخیں مارتا ہوا اِدھر اُدھر بھاگنے لگا لیکن کسی نے اس پر توجّہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

سترھواں باب

انور علی اور لیگرانڈ ندی عبور کرنے کے بعد جنگل میں داخل ہوئے اور تھوڑی دیر بعد انور علی نے کہا۔ "اب ہمیں صبح تک دشمن کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم باقی رات چلتے رہیں۔"

لیگرانڈ نے جواب دیا۔ "میں آپ کا ساتھ دینے کی کوشش کروں گا۔"

انور علی نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور لیگرانڈ اس کے پیچھے ہو لیا۔ کوئی ایک گھنٹہ جنگل کی تنگ پگڈنڈی پر سفر کرنے کے بعد انور علی نے اپنا گھوڑا روکا اور مڑ کر لیگرانڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیگرانڈ اب تمھیں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ میں اب یہ راستہ چھوڑ کر جنگل عبور کرنا چاہتا ہوں۔"

لیگرانڈ نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ "میرے دوست میری طاقت جواب دے رہی ہے۔ میں بڑی مشکل سے گھوڑے کی زین پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

انور علی نے کہا۔ "اب تمھیں ہمّت سے کام لینا چاہیے۔ یہ علاقہ ہمارے لیے انتہائی غیر محفوظ ہے۔"

"بہت اچھا چلیے۔ لیکن میرے ساتھ اس بات کا وعدہ کیجیے کہ اگر میں کسی جگہ گھوڑے

سے گر پڑوں تو آپ اپنا سفر جاری رکھیں گے۔"

"میں تمھارے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں تمھیں ساتھ نہ لے جا سکا تو میری منزل سرنگا پٹم نہیں ہوگی۔ میں چین کر یہ پیغام نہیں دے سکوں گا کہ میں تمھارے زخمی شوہر کو جنگل میں چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں۔"

تقریباً دو گھنٹے بعد جنگل میں ایک اور چھوٹی سی ندی عبور کرتے ہوئے لیگرانڈ نے کہا۔ "ٹھہریے میں سخت پیاس محسوس کر رہا ہوں" —— پھر وہ کسی توقف کے بغیر اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ انور علی نے گھوڑے سے کود کر اسے سہارا دیا اور ندی کے کنارے بٹھا دیا۔ لیگرانڈ پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد بولا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں تھوڑی دیر سستا لوں۔"

انور علی نے شفقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "میرے خیال میں یہ جگہ محفوظ ہے تم چند منٹ آرام کر سکتے ہو۔"

لیگرانڈ کنارے سے ذرا ہٹ کر زمین پر لیٹ گیا۔ انور علی نے گھوڑوں کی لگامیں ایک درخت کی ٹہنی کے ساتھ باندھ دیں اور لیگرانڈ کے قریب بیٹھ کر اس کا سر زانو پر رکھ لیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت زیادہ تکلیف محسوس کر رہے ہو؟" اس نے کہا۔

"اب تکلیف زیادہ نہیں لیکن گھوڑے پر میری حالت بہت خراب تھی۔"

انور علی نے لیگرانڈ کی نبض ٹٹولنے کے بعد اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اضطراب کی حالت میں زخم کے آس پاس اس کا سینہ ٹٹولنے لگا۔ اچانک اس نے اپنی انگلیوں پر نمی محسوس کی اور بولا۔ "معلوم ہوتا ہے تمھارا خون بند نہیں ہوا اسے پٹی کو کس کر باندھنے کی ضرورت ہے۔"

"بہت اچھا۔ لیکن جلدی کیجیے مجھے اس جنگل میں مرنا پسند نہیں۔"

انور علی نے جلدی سے پٹی کھولی اور زخم پر ایک نیا پھاہا رکھنے کے بعد دوبارہ کس کر باندھ دیا۔ پھر اس نے ندی کے پانی سے اپنے ہاتھ دھوتے اور دوبارہ لیگرانڈ کے قریب بیٹھ گیا۔

لیگرانڈ نے کراہتے ہوئے کہا: "راستے میں ہمیں اپنا کوئی ساتھی نہیں ملا۔ میں حیران ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہوں گے؟"

"وہ جانتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی راستہ محفوظ نہیں۔ وہ ادھر اُدھر منتشر ہو کر جنگل عبور کر رہے ہوں گے۔ اگر ہم پیدل ہوتے تو ممکن تھا کہ اب تک کئی آدمی ہمارے ساتھ شامل ہو چکے ہوتے لیکن تاریکی میں ہمارے گھوڑوں کی آہٹ انھیں ہم سے دُور رکھنے کے لیے کافی تھی۔"

"آپ کا کیا خیال ہے وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ اگر دشمن کے سواروں نے صبح کے وقت پیچھا کیا تو وہ کئی آدمیوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تاہم اگر ہمارے ساتھیوں نے رات کے وقت غلط راستے اختیار نہ کیے تو بہت سے آدمیوں کے بچ نکلنے کا امکان ہے۔ میں ان لوگوں کے متعلق بہت پریشان ہوں جو زخمی ہیں۔ وہ شاید زیادہ دُور نہ جا سکیں۔"

لیگرانڈ اور انور علی تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ اچانک آس پاس جھاڑیوں اور درختوں کی شاخوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا اور اُن کے گھوڑے بدحواس ہو کر اُچھلنے لگے۔ لیگرانڈ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کے لیے آپ بھاگ جائیں ہم دشمن کے گھیرے میں آ چکے ہیں۔"

انور علی نے جواب دیا۔ "یہ ہمارے ساتھی ہیں دشمن کے آدمی نہیں ہو سکتے۔ تم اطمینان سے لیٹے رہو" —— پھر اس نے بلند آواز میں کہا: "اگر تم مرہٹہ فوج کے سپاہی نہیں ہو تو یہاں تمھارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ میں انور علی ہوں۔"

ایک آدمی نے درختوں کی آڑ سے نمودار ہو کر کہا۔ "جناب میں نے آپ کی آواز پہچان لی تھی لیکن آپ کسی اور زبان میں باتیں کر رہے تھے اور یہ بیوقوف آپ کو انگریز سمجھتے تھے۔ ہمیں آپ کے گھوڑوں کی ٹاپ سے دھوکا ہوا تھا۔"

انور علی نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم نے رات کے وقت ہمیں گولیوں کا نشانہ بنانے کی

کوشش نہیں کی۔"

تھوڑی دیر میں پچیس تیس آدمی ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انور علی نے کہا "تمھارے اب یہاں ٹھہرنے اور باتیں کرنے کا وقت نہیں تم اپنا سفر جاری رکھو!"

"لیکن آپ؟" کسی نے سوال کیا۔

"لیگرانڈ زخمی ہے اور اسے چند منٹ آرام کی ضرورت ہے۔"

ایک سپاہی نے کہا "جناب اگر یہ بات ہے تو ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔"

انور علی نے جواب دیا "تم ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس گھوڑے ہیں اور ہم تھوڑا دیر تک ان پر سوار ہو کر تم سے آملیں گے لیکن اگر ہم کسی اور سمت نکل جائیں تو تمھیں ہمارا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔"

لیگرانڈ انور علی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے فرانسیسی زبان میں بولا "آپ ان سے میرے ساتھیوں کے متعلق پوچھیے۔"

انور علی نے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم میں سے کسی کو ہمارے یورپین ساتھیوں کے متعلق علم ہے؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا "جناب میں اُن کے ساتھ تھا۔ میدان سے نکلتے وقت ان کا ایک ساتھی زخمی ہو گیا تھا اور جنگل کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کی حالت خراب ہو گئی تھی اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیں۔ وہ لیگرانڈ کو بھی تلاش کرنا چاہتے تھے۔"

انور علی نے کہا "اچھا تم روانہ ہو جاؤ۔ تمھارے لیے جنوب مغرب کی سمت زیادہ محفوظ ہو گی۔ ہم بہت جلد تم سے آملیں گے۔"

ایک سپاہی نے پوچھا "جناب آپ کو خان صاحب کے متعلق کوئی اطلاع ملی؟"

"نہیں لیکن تم وقت ضائع نہ کرو۔"

یہ لوگ دوبارہ جنگل میں غائب ہو گئے اور انور علی کوئی آدھ گھنٹہ لیگرانڈ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ بالآخر لیگرانڈ نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں اب تھوڑی دیر گھوڑے پر سواری کر سکتا ہوں۔"

انور علی نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور پھر اس کے گھوڑے کی باگ کھول کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ لیگرانڈ کی حالت پھر خراب ہو رہی تھی اور وہ بڑی مشکل سے گھوڑے کی زین پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انور علی نے اپنا گھوڑا ایک زخمی کے حوالے کر دیا اور خود لیگرانڈ کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر آگے آگے چلنے لگا۔ راستے میں صبح تک ان کے ساتھ کوئی ڈیڑھ سو آدمی شامل ہو چکے تھے۔ لیگرانڈ کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے زین کا ہرنا پکڑ کر اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

○

طلوعِ آفتاب سے تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب پہنچ کر انور علی نے اپنے ساتھیوں کو رُکنے کا حکم دیا۔ لیگرانڈ کو گھوڑے سے اُتار کر زمین پر لٹا دیا گیا۔ بعض سپاہیوں نے اپنے تھیلوں سے باسی روٹیاں نکال کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیں اور وہ جھیل کے کنارے بیٹھ گئے۔ انور علی کا ایک ساتھی جراحی کا کچھ تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے پٹی کھول کر لیگرانڈ کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد کہا "گولی زیادہ دُور نہیں گئی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں گولی نکال کر زخم کو داغ دیتا ہوں، ورنہ تھوڑا تھوڑا خون اِسی طرح رستا رہے گا۔"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طرح ان کی جان بچ جائے گی تو میں تمھیں اجازت دینے کے لیے تیار ہوں۔"

اس نے لیگرانڈ کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے بعد فکرمند سا ہو کر کہا "اگر ان کا بخار اتنا تیز نہ ہوتا تو میرا کام نسبتاً آسان ہوتا۔ لیکن اب میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ راستے میں ان کا بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ ایسی حالت میں زخم داغنے کی

تکلیف ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گی۔"

لیگرانڈ نے ملتجی نگاہوں سے انور علی کی طرف دیکھا اور کہا "انور علی پہلے میں اس بات پر مُصر تھا کہ آپ مجھے وہیں چھوڑ دیں اور اپنی جان بچانے کی فکر کریں لیکن اب میری آخری خواہش یہ ہے کہ میں موت سے پہلے جین کو دیکھ لوں اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو مجھے سرنگاپٹم پہنچانے کی کوشش کریں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اس جنگل میں میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔"

انور علی نے کرب کی حالت میں گردن جھکا لی اور اس کے ایک ساتھی نے کہا "جناب مجھے ان کی حالت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔ ہماری کوشش یہی ہونی چاہیے کہ انھیں کسی تاخیر کے بغیر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے۔ انھیں کسی قابل جرّاح کی ضرورت ہے اور اگر ہم جلد ڈرگ پہنچ جائیں تو وہاں ان کا علاج ہو سکتا ہے۔"

انور علی نے دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "تم احتیاط سے پٹّی باندھ دو۔ ا‌ب یہاں سے آگے ان کے لیے گھوڑے کا سفر بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ میں انھیں اٹھانے کے لیے ایک کھٹولا تیار کرواتا ہوں۔"

انور علی کے ساتھیوں نے جلدی سے چند لکڑیاں کاٹیں اور انھیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر ایک کھٹولا تیار کر دیا۔ پھر انور علی نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میرے دوستو میں جانتا ہوں کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو اور تمھیں چند گھنٹے آرام کی ضرورت ہے لیکن لیگرانڈ کی جان بچانے کے لیے مجھے چند ایسے رضاکاروں کی ضرورت ہے جو اسی وقت میرے ساتھ روانہ ہونے کے لیے تیار ہوں۔"

یہ سنتے ہی چند آدمی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے کہا "جناب ہم سب آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔"

"مجھے صرف آٹھ جفاکش آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

ایک سپاہی نے کہا "جناب ہم میں سے کوئی بھی پیچھے رہنا پسند نہیں کریگا۔ اس لیے آپ خو اپنی مرضی کے آٹھ آدمی منتخب کر لیں۔"

انور علی نے یکے بعد دیگرے آٹھ آدمیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ باقی ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اچانک انھیں ایک طرف سے گھوڑے کی ٹاپ سُنائی دی اور ایک سپاہی نے چوکنا ہو کر کہا "جناب کوئی اس طرف آ رہا ہے؟"

انور علی نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنہا ہے، تاہم تم چُپ چاپ منتشر ہو کر چھُپ جاؤ!"

انور علی کے ساتھیوں نے جلدی سے لیگرانڈ کو کھٹولے پر ڈالا اور اُسے اُٹھا کر پاس ہی گھنے درختوں کی آڑ میں چلے گئے۔ باقی آدمی بھی اِدھر اُدھر رُوپوش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک سوار جھیل کے کنارے پہنچا اور انور علی درختوں کی آڑ سے باہر نکل کر بلند آواز میں چلایا۔ "بھئی کوئی خطرہ نہیں۔ یہ ہمارا ساتھی ہے!"

سوار انور علی کو دیکھتے ہی گھوڑے سے کُود پڑا اور بھاگتا ہُوا اس کے قریب پہنچا۔ یہ اُن آدمیوں میں سے ایک تھا جو بدرُالزّمان کے ساتھ مرہٹوں کے پڑاؤ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ "جناب خدا کا شکر ہے کہ آپ زندہ ہیں۔"

"تم بدرالزّمان کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟" انور علی نے سوال کیا۔

"جناب، وہ پرس رام کی قید میں ہیں۔ مرہٹوں نے راستے میں حملہ کر کے ہمارے تین ساتھی قتل اور چار پانچ زخمی کر دیے تھے۔ بدرالزّمان خاں بھی زخمی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمیں قیدی بنا کر پرس رام کے پاس لے گئے۔ وہ بظاہر مرہٹہ سپاہیوں کی اس کارگزاری پر بہت نادم تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ اس کے ایما پر ہُوا ہے اس نے بدرالزّمان کو یقین دلایا تھا کہ اب ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دی جائے گی۔ اور اس نے ان کے علاج کے لیے انگریزی فوج کا ایک ڈاکٹر بھی بلا لیا تھا۔ تاہم جب انھوں نے یہ پوچھا تھا کہ ہمیں واپس جانے کی اجازت کب ملے گی تو بھاؤ نے کہا تھا کہ جنگ کے زمانے میں آپ لوگ میرے مہمان ہیں اور میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو نرگند بھیج دیا جائے۔ مجھے آدھی رات کے وقت بھاگنے کا موقع مل گیا تھا۔"

"تم نے راستے میں مرہٹوں کی فوج دیکھی ہے؟"

"جی نہیں۔ میں مغرب کی سمت سے ایک لمبا چکر لگانے کے بعد اس طرف آیا ہوں۔"

چند اور سوالات پوچھنے کے بعد انور علی اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ "ابھی تم لوگ خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے اس لیے تمھیں زیادہ دیر یہاں قیام نہیں کرنا چاہیے۔ اگر دشمن پیچھا کرے تو تمھارے لیے لڑنے کی بجائے منتشر ہو کر جنگل میں چھپنے کی کوشش کرنا بہتر ہوگا۔ رات کے وقت یہ جنگل تمھارے لیے زیادہ محفوظ ہوگا اور تم کسی خطرے کے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکو گے۔ میں دوسرا گھوڑا ابھی تمھارے حوالے کرتا ہوں اور یہ فیصلہ کرنا تمھارا کام ہے کہ اس پر سواری کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے۔"

جس وقت انور علی یہ باتیں کر رہا تھا، مرہٹہ فوج کے چند دستے جو صبح ہوتے ہی بھاگنے والوں کی تلاش میں روانہ ہو چکے تھے اس مقام سے کوئی پانچ میل دُور مشرق کی طرف میسور کے پچاس ساٹھ سپاہیوں کو قتل کرنے اور کوئی ڈیڑھ سو آدمیوں کو گرفتار کرنے کے بعد واپس جا رہے تھے۔

○

دوپہر کے وقت جنگل ختم ہو چکا تھا اور سامنے ایک میل کے فاصلے پر ایک گاؤں نظر آ رہا تھا۔ انور علی نے اپنے ساتھیوں کو رُکنے کے لیے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم تھوڑی دیر یہاں ٹھہرو میں ابھی اس بستی سے ہو کر واپس آتا ہوں۔ اگر یہ علاقہ محفوظ ہے تو ہم سفر جاری رکھ سکیں گے۔ ورنہ شام تک ہمیں یہیں ٹھہرنا پڑے گا۔"

انور علی کے ساتھیوں نے لیگرانڈ کو جھاڑیوں کی آڑ میں اُتار دیا اور انور علی بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دُور آگے مویشیوں کا ایک ریوڑ چر رہا تھا اور تین چرواہے ایک درخت کی چھاؤں میں سو رہے تھے۔ انور علی نے ایک چرواہے کے قریب جا کر اسے جگایا اور کہا۔ "کیوں بھئی ادھر

گاؤں ہے؟"

چرواہے نے ہڑبڑا کر اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

انور علی نے اپنی جیب سے ایک پگوڈا (چاندی کا سکہ) نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور پوچھا۔ "یہاں آس پاس مرہٹہ سپاہیوں کی کوئی چوکی ہے؟"

چرواہے نے غور سے انور علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جناب اگر آپ میسور کے سپاہی ہیں تو آپ کو یہ پوچھنے کے لیے پگوڈا دینے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم سلطان ٹیپو کی رعایا ہیں۔ یہ واپس لے لیجیے۔"

انور علی نے کہا۔ "میرے دوست میرا مقصد تمھاری توہین نہ تھا۔ یہ اپنے پاس رکھو اور میرے سوال کا جواب دو۔"

چرواہے نے کہا۔ "جناب مرہٹوں کی چوکی ہمارے گاؤں میں تھی لیکن اب ان کا کوئی آدمی وہاں نہیں ہے۔"

"وہ وہاں سے چلے گئے ہیں؟"

"جناب وہ گئے نہیں ہیں بلکہ میسور کے سپاہیوں کی قید میں ہیں۔ اُنھوں نے ہمیں بہت تنگ کیا ہوا تھا۔ انھوں نے ہمارے گھر لوٹ لیے تھے اور ہمارے سردار کو بہت ذلیل کیا تھا۔ کل رات خدا نے ہماری فریاد سُن لی۔ وہ شراب سے مدہوش سو رہے تھے کہ آدھی رات کے وقت ہمیں ان کی چیخیں سُنائی دیں اور پتہ چلا کہ میسور کے سپاہی پہنچ گئے ہیں اور انھوں نے چوکی پر قبضہ کر لیا ہے۔"

"چوکی میں مرہٹوں کے کتنے آدمی تھے؟"

"جناب پہلے تو ان کی تعداد سو کے لگ بھگ تھی لیکن چند دنوں سے صرف بیس آدمی رہ گئے تھے۔ جناب آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"میں بہت دُور سے آیا ہوں۔" انور علی یہ کہہ کر بستی کی طرف بھاگنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد

وہ گاؤں کے سردار کی حویلی کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور ڈھونڈیا داغ کے علاوہ پچاس ساٹھ سپاہی اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔

انور علی نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات ڈھونڈیا واغ سے کر دیے: "تم کہاں سے آئے ہو؟ ــــ تمھارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟ ــــ باقی فوج کہاں ہے؟"

ڈھونڈیا داغ نے جواب دیا۔ "میں چتل ڈرگ سے غازی خاں کی فوج کے ساتھ آیا ہوں۔ شاہنواز کے قریب پہنچ کر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آپ دھاڑواڑ کا قلعہ خالی کرنے والے ہیں۔ غازی خاں پانچ ہزار سواروں کے ساتھ دریا کے پار رُک گئے ہیں اور مجھے اُنھوں نے آپ لوگوں کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے سوچا کر مرہٹوں کی چوکی پر قبضہ کر کے شاید میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔ بدرالزمان اور باقی آدمی کہاں ہیں؟"

"بدرالزمان خاں مرہٹوں کی قید میں ہیں اور جو آدمی بچ گئے ہیں ان میں سے اکثر آج شام تک جنگل عبور کر لیں گے۔ اب انھیں آس پاس کے علاقے میں تلاش کرنا تمھارا فرض ہے۔ لیگرانڈ زخمی ہے اور میں اُسے یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر چھوڑ آیا ہوں۔ اسے فوراً کسی محفوظ جگہ پہنچانا ضروری ہے۔ اگر ہم چتل ڈرگ پہنچ جائیں تو شاید اس کی جان بچ جائے وہ بہت تکلیف میں ہے اور ہم اسے لکڑی کے ایک کھٹولے پر ڈال کر لائے ہیں لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ اس کے لیے ایک آرام دہ پالکی کا انتظام کر دیا جائے۔"

بستی کا سردار قریب کھڑا ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں آپ کو اپنی پالکی دے سکتا ہوں۔"

انور علی نے کہا۔ "میرے ساتھی بہت تھکے ہوئے ہیں اور زخمی کو اُٹھانے کے لیے مجھے چند جفاکش آدمیوں کی بھی ضرورت پڑے گی۔"

"آدمیوں کا انتظام بھی ہو جائے گا لیکن آپ کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ

نے دیر سے کچھ نہیں کھایا۔ میں آپ کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

انور علی نے کہا۔ "میرے ساتھی مجھ سے زیادہ بھوکے ہیں۔ آپ آٹھ آدمیوں کا کھانا تیار کروائیے۔ میں انھیں لے کر آتا ہوں۔ زخمی کے لیے آپ کو دُودھ کا انتظام کرنا پڑے گا۔ آپکے پاس کاغذ اور قلم ہو تو منگوا دیجیے۔ میں جانے سے پہلے ایک ضروری خط لکھنا چاہتا ہوں۔"

"میں ابھی لاتا ہوں۔" سردار یہ کہہ کر بھاگتا ہُوا اندر چلا گیا اور انور علی نے ڈھونڈیا واغ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "آپ تین چار قابلِ اعتماد آدمیوں کو گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیں میں انھیں ضروری پیغام دے کر سرنگاپٹم بھیجنا چاہتا ہوں۔"

بستی کا سردار تین چار منٹ بعد ایک لکڑی کی صندوقچی جس میں کاغذ اور لکھنے کا سامان پڑا ہُوا تھا، لے کر آ گیا۔ انور علی ڈیوڑھی کے اندر ایک کھاٹ پر بیٹھ کر خط لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ یکے بعد دیگرے تین کاغذوں پر چند سطور لکھنے کے بعد وہ ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا اور ڈھونڈیا واغ کی طرف متوجہ ہُوا۔ "آپ کے آدمی تیار ہیں؟"

"جی ہاں وہ باہر کھڑے آپ کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔"

انور علی ڈھونڈیا داغ کے ساتھ حویلی کی چاردیواری سے باہر نکلا۔ سامنے چار سپاہی گھوڑوں کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ ان کے یکے بعد دیگرے تینوں کاغذ ایک سپاہی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خط تمھیں سرنگاپٹم پہنچ کر ہمارے گھر میں لیگرانڈ کی بیوی کو دینا ہے یہ دوسرا خط میں نے سرنگاپٹم کے فوج دار کے نام لکھا ہے۔ تم لیگرانڈ کی بیوی سے یہ کہو کہ اس کا خاوند زخمی ہے اور میں اسے چتل ڈرگ لے جا رہا ہوں۔ اور اگر وہ چتل ڈرگ آنے کے لیے تیار ہو تو سرنگاپٹم کا فوج دار اس کے لیے سفر کا ضروری انتظام کرے گا۔ اور یہ تیسرا خط پہلے دو خطوں سے علیحدہ رکھو۔ یہ راستے کی تمام چوکیوں کے افسروں کے نام ہے۔ اگر تمھیں کہیں تازہ دم گھوڑے حاصل کرنے میں دقت پیش آئے تو یہ خط تمھارے کام آئے گا۔ اب تم فوراً روانہ ہو جاؤ۔"

سپاہی سلام کرنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہوگیا اور اس کے ساتھی اس کے پیچھے ہولیے۔

○

چند دن بعد لیگرانڈ چتل ڈرگ کے قلعے کے ایک کمرے میں پڑا ہُوا تھا۔ دریائے تنگبھدرہ عبور کرنے کے بعد اس نے بیشتر راستہ بیہوشی اور نیم بیہوشی کی حالت میں طے کیا تھا۔ چتل ڈرگ سرنگا پٹم کے بعد سلطنتِ خداداد کا اہم ترین دفاعی حصار تھا اور یہاں لیگرانڈ کی دیکھ بھال کے لیے فوج کے بہترین طبیب اور جرّاح موجود تھے۔ اس کے زخم سے گولی نکالی جاچکی تھی لیکن چتل ڈرگ کے بہترین جرّاح کی اَن تھک کوشش کے باوجود اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی تھی۔ رستے ہوئے ناسور اور دائمی بخار کے باعث وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ انور علی صبح شام اس کی تیمار داری کے لیے موجود رہتا تھا۔ ایک رات اس کی حالت زیادہ خراب تھی اور انور علی اس کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ لیگرانڈ نے کہا۔ "موسیو آپ سو جائیں۔ میں آپ کو اس قدر تکلیف دینے کا حق نہیں رکھتا۔"

انور علی نے جواب دیا۔ "لیگرانڈ تم میری فکر نہ کرو۔ جب تمھیں نیند آجائے گی تو میں بھی سو جاؤں گا۔"

لیگرانڈ نے کہا۔ "اب مجھے نیند سے خوف آتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں سو گیا تو شاید دوبارہ میری آنکھ نہ کھلے۔ آپ کی تسلیوں کے باوجود میں یہ جانتا ہُوں کہ میرا وقت اب قریب آچکا ہے۔ میرے معالج زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن ان کی نگاہیں مجھے یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ میں موت کے دروازے پر کھڑا ہُوں۔ راستے میں مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ وہ یہاں پہنچ کر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اب کافی دن گزر چکے ہیں۔ اگر آپ کے ایلچی کی طرف سے کوتاہی نہیں ہُوئی تو اسے اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ اب میں زیادہ دیر اس کا انتظار نہیں کر سکوں گا۔ آپ مجھے یہاں لانے کی بجائے سیدھے سرنگا پٹم لے جاتے تو اچھا ہوتا۔"

انور علی نے کہا۔ "لیگرانڈ! سرنگا پٹم بہت دُور ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ جین اب ایک دو دن میں یہاں پہنچ جائے گی۔"

لیگرانڈ نے پُر امید ہو کر کہا۔ "آپ نے پہرے داروں کو ہدایت کر دی ہے کہ اگر وہ رات کے وقت یہاں پہنچے تو اس کے لیے دروازہ کھول دیا جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ شاید پہرے دار رات کے وقت اسے قلعے میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں۔"

انور علی نے جواب دیا۔ "تم اطمینان رکھو جب وہ آئے گی تو پہریدار اسے یہاں لے آئیں گے۔"

"نہیں وہ نہیں آئے گی۔" لیگرانڈ نے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کرتے ہُوئے کہا۔

انور علی نے پیار سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔ "میرے دوست تمھیں مایُوس نہیں ہونا چاہیے۔"

انور علی ساری رات لیگرانڈ کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ کبھی درد سے کراہتا ہُوا آنکھیں کھولتا اور اس کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف ہو جاتا اور کبھی دیر تک بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہتا۔ پچھلے پہر لیگرانڈ سو رہا تھا۔ انور علی نماز کے لیے اُٹھا اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر قریب بیٹھ گیا۔ لیگرانڈ ابھی تک گہری نیند کی حالت میں پڑا ہُوا تھا۔ انور علی گزشتہ بے آرامی کے باعث نڈھال ہو چکا تھا اور کچھ دیر اونگھنے کے بعد اسے بھی نیند آگئی۔

○

طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر بعد اسے کمرے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی اور اس کی آنکھ کھُل گئی۔ جین اس کے سامنے کھڑی تھی۔

ایک ثانیہ کے لیے انور علی کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ پھر وہ کرسی سے اٹھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "ابھی لیگرانڈ کو جگانا ٹھیک نہیں۔ اسے بڑی دیر کے بعد نیند آئی ہے۔ آپ

تشریف رکھیں۔"

جین کی نگاہیں لیگرانڈ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔

"اب ان کا کیا حال ہے؟" جین نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

انور علی نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی ان کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ تشریف رکھیے!"

جین آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ انور علی نے پاس ہی دوسری کرسی اٹھائی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ جین نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ لیگرانڈ کی پیشانی پر رکھ دیا اور پھر انور علی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "ان کا بخار بہت تیز ہے؟"

انور علی نے آگے بڑھ کر لیگرانڈ کی نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "رات کے وقت اس کا بخار زیادہ تیز تھا۔ میں ابھی طبیب کو بلاتا ہوں۔ اتی جان کیسی ہیں؟"

"وہ بالکل ٹھیک نہیں۔ معاف کیجیے مجھے ان کے متعلق کچھ کہنا یاد نہیں رہا۔ ابھی تک میرے حواس درست نہیں ہوئے۔ مجھے یہ تمام واقعات ایک بھیانک سپنا معلوم ہوتے ہیں۔"

ان الفاظ کے ساتھ جین کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے اور وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

انور علی نے کہا۔ "جین! لیگرانڈ کو حوصلہ دینے کے لیے تمھیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

انور علی کمرے سے باہر نکل گیا۔ لیگرانڈ نے کچھ دیر کراہنے کے بعد آنکھیں کھول دیں اور چند ثانیے سکتے کے عالم میں جین کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نحیف آواز میں "جین جین" کہتے ہوئے اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور جین نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

لیگرانڈ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جین تم یہاں تھیں اور میں تمھیں ہزاروں

میل دور پیرس کی گلیوں میں تلاش کر رہا تھا۔ میں تمھارے انتظار میں موت سے لڑ رہا تھا اور اب میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ جین میں تمھارا شکر گزار ہوں۔ تم کب آئیں؟ تمھیں یہاں پہنچتے ہی مجھے جگا دینا چاہیے تھا۔"

"میں ابھی آئی ہوں۔" جین نے جواب دیا۔ "انور علی کہتا تھا کہ آپ بہت دیر کے بعد سوئے ہیں۔"

"وہ کہاں گیا ہے؟"

"وہ طبیب کو بلانے گیا ہے۔"

"اب مجھے طبیب کی ضرورت نہیں ——— جین مجھے تمھاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔ تمھارے چہرے پر ایک دائمی مسکراہٹ دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ لیکن میں تمھیں آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔"

جین نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "اب تمھاری طبیعت کیسی ہے۔ زخم میں زیادہ تکلیف تو نہیں؟"

لیگرانڈ نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے جواب دیا۔ "اب مجھے اس کے سوا کسی اور بات کا احساس نہیں کہ تم میری نگاہوں کے سامنے ہو۔ اب مجھے موت کا چہرہ بھی بھیانک محسوس نہیں ہوتا۔"

لیگرانڈ نے کچھ دیر کھانسنے کے بعد پانی مانگا۔ جین نے جلدی سے اٹھ کر پاس ہی ایک صراحی سے پانی کا پیالہ بھرا۔ لیگرانڈ درد سے کراہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے جین کے ہاتھ سے پانی کا کٹورا پکڑ کر منہ کو لگا لیا۔ پانی پینے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا اور چند ثانیے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کی آنکھیں ایک ناقابل برداشت تکلیف کا اظہار کر رہی تھیں۔

انور علی طبیب اور ایک سپاہی جو دواؤں کا صندوقچہ اٹھائے ہوئے تھا، کمرے میں داخل ہوئے۔ جین کھڑی ہو گئی۔ طبیب نے لیگرانڈ کی نبض دیکھنے کے بعد انور علی کی طرف متوجہ

ہو کر کہا: "میں ان کا زخم صاف کرنے کے بعد پٹی تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ آپ چند منٹ کے لیے مادام کو دوسرے کمرے میں بٹھا دیں۔"

جین نے کہا: "نہیں میں یہیں رہوں گی۔"

جب طبیب پٹی کھولنے لگا تو انور علی نے کہا: "مادام آپ بیٹھ جائیں۔"

جین کرسی پر بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد لیگرانڈ کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر طبیب نے انور علی سے کہا: "آج ان کی حالت کچھ بہتر معلوم ہوتی ہے لیکن انھیں آرام کی سخت ضرورت ہے اس کے لیے زیادہ باتیں کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ میں اور دوا بھیج دیتا ہوں۔ آپ انھیں تین گھنٹے کے بعد ایک ایک پڑیا کھلاتے رہیں۔ اگر انھیں نیند آجائے تو جگانے کی کوشش نہ کریں۔"

طبیب اور اس کا ساتھی کمرے سے باہر نکل گئے اور انور علی جین کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک نوکر طشت میں دودھ کا کٹورا اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ انور علی آگے بڑھا اور لیگرانڈ کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا: "لیگرانڈ تمھارا ناشتا آگیا ہے۔"

لیگرانڈ نے کہا: "مجھ سے پہلے آپ کو جین کا خیال کرنا چاہیے تھا۔"

"تم فکر نہ کرو جین کا کھانا آرہا ہے۔"

نوکر نے طشت آگے کر دیا اور انور علی نے دودھ کا پیالہ اٹھا کر لیگرانڈ کے منھ کو لگا دیا۔

دودھ کے چند گھونٹ پینے کے بعد لیگرانڈ نے کہا: "بس میں اس سے زیادہ نہیں پی سکتا۔"

لیگرانڈ نے پیالہ دوبارہ طشت میں رکھ دیا اور انور علی نے نوکر سے کہا: "اب تم میم صاحب کے لیے کھانا لے آؤ اور اس کے بعد ان کے لیے یہاں ایک کھاٹ ڈال دو۔"

جین نے کہا: "مجھے اس وقت بھوک نہیں ہے۔"

"نہیں آپ تھوڑا بہت ضرور کھا لیجیے۔"

نوکر نے کہا: "اور آپ کا کھانا بھی یہیں لے آؤں؟"

انور علی کی بجائے لیگرانڈ نے جواب دیا: "ہاں لے آؤ۔ تمھارا کیا خیال ہے یہ آج کھانا

نہیں کھائیں گے۔ میرے خیال میں آج انھوں نے ناشتا بھی نہیں کیا۔"

○

ایک گھنٹہ بعد انور علی نے لیگرانڈ اور جین سے اجازت لی اور ساتھ کے کمرے میں چلا گیا، گزشتہ بے خوابی اور تھکاوٹ کے باعث اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر ایک کھاٹ پر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دو بجے کے قریب اسے نوکر نے جھنجوڑ کر جگایا اور کہا: "جناب میم صاحب آپ کو بلا رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ لیگرانڈ کی حالت ٹھیک نہیں۔"

انور علی جلدی سے اٹھا اور بھاگتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ لیگرانڈ سخت تکلیف کی حالت میں کراہ رہا تھا اور جین اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" انور علی نے جھک کر گھٹی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

جین نے جواب دیا: "ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ ابھی آپ کو آوازیں دے رہے تھے۔"

انور علی نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور نوکر سے کہا: "تم فوراً طبیب کو بلا لاؤ۔" نوکر چلا گیا۔

لیگرانڈ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "میرے دوست طبیب کو بلانے کی ضرورت نہیں، تم میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

انور علی کرسی گھسیٹ کر اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

لیگرانڈ نے تکلیف کی حالت میں تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کرلیں اور پھر انور علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "انور علی مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میرے بعد تم جین کا آخری سہارا ہو۔ زندگی میں تم میرے سب سے بڑے محسن تھے اور موت کے وقت اپنی روح کے سکون کے لیے میں یہ اطمینان چاہتا ہوں کہ تم جین کو بے چارگی اور بے بسی کا احساس نہیں ہونے دو گے۔"

"لیگرانڈ ـــــ !" انور علی نے آبدیدہ ہو کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن الفاظ اس کے سینے میں گھُٹ کر رہ گئے۔

لیگرانڈ نے کہا: "انور علی میں جین کو آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔ لیکن تم اگر چاہو تو اسے زندگی کی تمام مسکراہٹیں اور قہقہے عطا کر سکتے ہو۔"

انور علی نے جین کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انور علی نے سراپا التجا بن کر کہا: "اپنے شوہر کو تسلی دو۔ اسے کہو مجھے تمہاری ضرورت ہے اسے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونے دو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

جین نے اضطراری حالت میں اپنا ہاتھ لیگرانڈ کے ماتھے پر رکھ دیا اور سسکیاں لینے لگی۔

لیگرانڈ نے کہا: "انور علی اب مجھے تسلیاں دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرا وقت قریب آ چکا ہے اور مجھے قدرت سے کوئی شکایت نہیں۔ اس دنیا میں ہر مسافر کی ایک آخری منزل ہوتی ہے۔ مجھے صرف اس اطمینان کی ضرورت تھی کہ میرے بعد جین بے سہارا نہیں ہو گی" ـــــ پھر اُس نے جین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور دوسرا ہاتھ انور علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "انور علی ذرا قریب آ جاؤ اور اپنا ہاتھ مجھے دو۔"

انور علی نے کرسی گھسیٹ کر آگے کر لی اور اپنا ہاتھ لیگرانڈ کے ہاتھ میں دے دیا۔

لیگرانڈ نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ انور علی کا ہاتھ کھینچ کر جین کے ہاتھ کے اوپر رکھ دیا اور ایک گہری سانس لینے کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔

انور علی نے اپنے جسم میں ایک کپکپی محسوس کی اور مضطرب سا ہو کر کہا: "لیگرانڈ! لیگرانڈ!"

لیگرانڈ نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی سانس اُکھڑ چکی تھی لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب تبسم کھیل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ جین اور انور علی کے ہاتھوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔

طبیب ہانپتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"آپ نے بہت دیر لگا دی!" انور علی نے کہا۔

"میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا!" طبیب نے جواب دیا۔

لیگرانڈ نے ایک جھرجھری لی اور انور علی نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ طبیب نے جلدی سے اس کی نبض دیکھی اور گردن جھکا لی۔

جین کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھی رہی اور پھر بے اختیار لیگرانڈ کے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

طبیب نے انور علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "میں نے بہت کم آدمیوں کو اس بہادری سے موت کا مقابلہ کرتے دیکھا ہے۔"

چند منٹ بعد طبیب کمرے سے باہر نکل گیا۔ انور علی کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ بالآخر وہ اُٹھا اور جین کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا: "جین تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہیے اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے لیگرانڈ کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ چیپل ڈرگ کے عیسائیوں کے ایک چھوٹے سے قبرستان میں دفن کیا جا رہا تھا۔

○

ایک ہفتہ بعد جین اپنے کمرے کے دریچے کے سامنے کھڑی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"کون ہے؟" جین نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

انور علی کی آواز سنائی دی: "میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"آئیے!"

انور علی کمرے میں داخل ہوا اور وہ ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

انور علی چند منٹ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "جین مجھے ڈر ہے کہ مرہٹے عنقریب

چتل ڈرگ پر حملہ کردیں گے۔ ان حالات میں آپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میں یہ چاہتا
ہوں کہ آپ کسی تاخیر کے بغیر سرنگاپٹم چلی جائیں۔ فوجدار کی بھی یہی رائے ہے اور انھوں نے
مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کل صبح آپ کے سفر کا بندوبست کردیں گے۔"

جین نے مغموم لہجے میں جواب دیا: "میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گی۔"

"یہ حکم نہیں بلکہ ایک مجبوری ہے۔ مجھے اپنے متعلق ابھی سرنگاپٹم سے کوئی ہدایت نہیں
ملی۔ فوجدار کی خواہش ہے کہ مجھے یہیں روک لیا جائے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ میں چند دن کے بعد
سرنگاپٹم یا کسی اور محاذ پر چلا جاؤں۔"

جین نے کہا: "میں کل جانے کے لیے تیار ہوں لیکن آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی
ہوں۔"

"کہیے!"

"میں آپ سے کوئی مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتی لیکن اگر میرے لیے نہیں تو کم از کم
والدہ کی تسلی کے لیے خط ضرور لکھتے رہیں۔ دھارواڑ سے کئی ہفتے آپ کے متعلق کوئی اطلاع
نہ ملنے کے باعث وہ سخت پریشان تھیں۔"

انور علی نے جواب دیا: "دھارواڑ کے حالات ہی ایسے تھے کہ میرے لیے خط بھیجنا مشکل
تھا۔ لیکن اب میں ہر ہفتے کم از کم ایک خط ضرور لکھا کروں گا۔ لیگرانڈ کی وفات کے بعد
مجھ پر آپ کے حقوق کم نہیں ہوئے بلکہ زیادہ ہو گئے ہیں۔ اب آپ آرام کریں۔ اگر [illegible]
ٹھیک ہوا تو آپ کو علی الصباح روانہ کر دیا جائے گا۔"

انور علی یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور چند ثانیے توقف کے بعد کمرے سے باہر نکل گیا۔ جین
دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ لیگرانڈ کی موت کے بعد ایسے مواقع بہت کم آتے تھے
جب اس نے اطمینان کے ساتھ انور علی سے باتیں کی تھیں۔ وہ صبح و شام اس کے کمرے میں
آتا اور کھڑے کھڑے تسلی و تشفی کے چند الفاظ دہرانے کے بعد واپس چلا جاتا۔ کبھی کبھی

جین یہ محسوس کرتی کہ وہ صرف مجبوری کی حالت میں اس کے ساتھ شریک ہے ورنہ
اس کے خیالات کہیں اور ہیں۔ کبھی کبھی غیر شعوری طور پر اس کی نگاہیں جین کے چہرے
پر مرکوز ہو جاتیں۔ لیکن جب جین اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتی تو وہ پریشان سا
ہو کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا۔ جین کوئی سوال کرتی تو وہ مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔

شروع شروع میں جین کا خیال تھا کہ انور علی کو جنگ کی کلفتوں اور لیگرانڈ کی موت
کے صدمے نے نڈھال کر دیا ہے اور چند دنوں، چند ہفتوں یا چند مہینوں کے بعد اس
کے ذہن سے گزشتہ حادثات کے اثرات دور ہو جائیں گے۔ لیکن اب وہ یہ محسوس
کر رہی تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان اجنبیت کے پردے زیادہ دبیز ہوتے جا
رہے ہیں۔ انور علی نے جو اسے پانڈی چری کی بندرگاہ پر ملا تھا اور جس کے ساتھ اس نے
سرنگاپٹم تک سفر کیا تھا، اب اس کے لیے ایک معمہ بن چکا تھا۔

اگلی صبح وہ سفر کی تیاری کرنے کے بعد انور علی کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک سپاہی کمرے
میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "آپ کے ساتھی سفر کے لیے تیار کھڑے ہیں!"

جین نے گھٹی ہوئی آواز میں سوال کیا: "انور علی کہاں ہیں؟"

سپاہی نے جواب دیا: "وہ بھی قلعے کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ چلیے!"

جین سپاہی کے ساتھ چل پڑی۔ قلعے کے دروازے سے باہر چند سپاہی جو سرنگاپٹم سے
ان کے ساتھ آئے تھے اپنے گھوڑوں کی باگیں تھامے کھڑے تھے اور انور علی انھیں ہدایات
دے رہا تھا: "میم صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمھیں راستے میں ان کا بہت زیادہ خیال
رکھنا چاہیے۔ اگر مجھے یہ شکایت ملی کہ انھیں راستے میں کوئی تکلیف ہوئی ہے تو میں تمھارے
ساتھ بہت سختی سے پیش آؤں گا۔ چند دن تک تمھیں راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ اس لیے میں
یہ چاہتا ہوں کہ تم اطمینان اور آرام کے ساتھ سفر کرو!"

جین انور علی کے پیچھے کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی اور اس کی سرد مہری کے متعلق وہ اپنے

خیالات میں ایک تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ انور علی نے مڑکر اس کی طرف دیکھا اور ایک گھوڑے کی باگ پکڑ کر اس کے قریب لاتے ہوئے فرانسیسی زبان میں کہا "اب آپ سوار ہو جائیں اور رات سے پہلے پہلے ایک منزل طے کر لیں۔"

جین نے آبدیدہ سی ہو کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ انور علی نے اسے سہارا دے کر گھوڑے کی زین پر بٹھا دیا۔ وہ چند ثانیے تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ انور علی نے کہا "جین اگر خدا نے زندگی دی تو ہم دوبارہ ملیں گے۔ خدا حافظ!"

جین کے ساتھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکے تھے۔ اس نے "خدا حافظ" کہہ کر اپنے گھوڑے کی باگ موڑ لی اور یہ قافلہ روانہ ہوا۔

میسور میں جین کی زندگی کا ایک باب ختم ہو چکا تھا اور انور علی کے یہ الفاظ کہ "اگر خدا نے زندگی دی تو ہم دوبارہ ملیں گے۔" اس کی داستان حیات کے ایک نئے باب کا عنوان بن چکے تھے۔ انور علی اب اس کے لیے ایک معمّا نہ تھا۔

اٹھارھواں باب

دھاڑواڑ کی فتح کے بعد جنوب کی طرف مرہٹوں کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ پرسرام بھاؤ نے ماہ اپریل کے آخر میں دریائے تنگ بھدرہ عبور کیا اور راماگری پر قبضہ کر لیا۔

لارڈ کارنوالس کو یہ امید تھی کہ دھاڑواڑ کی فتح کے بعد بھاؤ کا لشکر کسی تاخیر کے بغیر کمپنی کی افواج سے آ ملے گا۔ لیکن پرسرام بھاؤ اپنا عقب محفوظ کیے بغیر آگے بڑھنا خطرناک سمجھتا تھا، اس نے راماگری سے چیتل ڈرگ کی طرف پیش قدمی کی۔ لیکن اسے ہر قدم پر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

مرہٹوں کا ایک اور لشکر گنپت راؤ مہین ڈیل کی کمان میں بدنور کی طرف بڑھا اور اس نے چند علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ٹیپو کی فوج نے جوابی حملے کر کے اسے پسپائی پر مجبور کر دیا۔

ان حالات میں پرسرام بھاؤ نے چیتل ڈرگ پر حملہ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ بدنور کے محاذ پر بھیج دیا۔ مرہٹوں نے بدنور کے چند علاقے دوبارہ فتح کر لیے۔ اس کے بعد مرہٹوں کی پیش قدمی کی رفتار بہت سست تھی اور لارڈ کارنوالس جو نظام علی کے لشکر کے ساتھ بنگلور سے سرنگاپٹم کی طرف پیش قدمی کر چکا تھا ایک بار پھر یہ

محسوس کر رہا تھا کہ اس کے مرہٹہ حلیف دھاڑ واڑ سے نکلنے کے بعد ایک دلدل میں پھنس گئے ہیں۔

اس عرصہ میں مرہٹہ فوج کے سپہ سالار ہری پنت کی سرگرمیاں سرا کے علاقوں تک محدود تھیں اور وہ جنوب کی طرف پیش قدمی کے لیے مناسب حالات کا انتظار کر رہا تھا جب اسے سرنگا پٹم کی طرف لارڈ کارنوالس اور نظام کی افواج کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس نے شمال اور مغرب کے ہر محاذ کی مرہٹہ فوج کو سرنگا پٹم کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ لارڈ کارنوالس موسم برسات سے پہلے پہلے سرنگا پٹم فتح کرنا چاہتا تھا لیکن مرہٹوں کی سست رفتاری کے باعث اس کے تمام منصوبے خاک میں مل چکے تھے۔ منگلور سے نکلنے کے بعد اس نے راناگری اور میسور کے چند اور اہم قلعوں سے کترا کر ایک طویل اور دشوار گزار راستہ اختیار کیا۔ لیکن یہاں بھی اسے ہر قدم پر سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ راستے کی تمام بستیاں انسانوں کے وجود سے خالی تھیں اور انگریزی فوج کے چارے اور غلے کے ذخیروں کی جگہ راکھ کے انبار نظر آتے تھے۔ برسات شروع ہو چکی تھی اور چھوٹے چھوٹے نالے اور ندیاں دریا بن چکے تھے۔ چھاپہ ماز دستوں کے پے در پے حملوں کے باعث رسد اور کمک کا انتظام مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ چارے کی کمی کے باعث ہر روز سینکڑوں مویشی ہلاک ہو رہے تھے۔ سپاہیوں کو آدھے راشن پر گزارہ کرنا پڑتا تھا

قریباً دس دن کی مارا ماری کے بعد کارنوالس کی فوج ان گنت مصائب کا سامنا کرنے کے بعد سرنگا پٹم سے نو میل مشرق کی طرف دریائے کاویری کے کنارے پہنچ چکی تھی اور اس عرصے میں سلطان کی باقاعدہ فوج کا سامنا کیے بغیر اس نے جو نقصانات اٹھائے تھے وہ کسی بڑی جنگ کے نقصانات سے کم نہ تھے اور اب جب وہ سرنگا پٹم کے قریب پہنچ چکا تھا تو دریائے کاویری کی سرکش موجیں اس کے راستے میں حائل تھیں ؂

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ محمود خاں بھاگتا ہوا مکان کے برآمدے میں داخل ہوا اور بلند آواز سے چلایا۔ "بی بی جی! بی بی جی! مراد علی صاحب آگئے ہیں۔"

فرحت اور جبین نچلی منزل کے ایک کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگئیں۔ مراد علی صحن میں داخل ہوا۔ اس کا لباس کیچڑ اور پانی سے لت پت تھا۔ فرحت اسے دیکھتے ہی برآمدے سے نکل کر بڑھی اور بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ مراد علی نے کہا۔ "امی جان بارش ہو رہی ہے اور میرے کپڑے کیچڑ سے بھرے ہوئے ہیں۔"

لیکن فرحت کو مراد علی کی موجودگی کے سوا کسی اور بات کا احساس نہ تھا۔ اس نے مراد علی کی آنکھوں اور پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "میرے لال تمھیں دیکھنے کے بعد میں ساری عمر اس بارش میں کھڑی رہ سکتی ہوں۔"

مراد علی اسے اپنے بازو کا سہارا دیے برآمدے کی طرف بڑھا۔ وہاں جبین کو دیکھ کر چند ثانیہ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ فرحت نے اپنی آنکھوں سے مسرت کے آنسو پونچھتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "مراد تم نے بہت پریشان کیا۔ مجھے کئی مہینوں سے تمھارے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ آخر تم کہاں تھے؟"

مراد علی نے جواب دیا۔ "امی جان ہماری فوج پہلے مالابار کی ساحلی چوکیوں کی حفاظت پر متعین تھی۔ اس کے بعد مجھے بدنور کے شمال میں مرہٹہ لشکر کی نقل و حرکت معلوم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ پھر مجھے دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے قلعے کی حفاظت پر متعین کر دیا گیا۔ ان حالات میں میرے لیے خط لکھنا ناممکن تھا۔"

فرحت نے کہا۔ "بیٹا میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ پہلے تم نہا کر کپڑے بدل لو۔"

مراد نے جواب دیا۔ "امی جان اگر شام تک بارش کا یہی حال رہا تو مجھے لباس تبدیل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں سورج غروب ہوتے ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟" ماں نے مضطرب ہو کر سوال کیا۔

مراد علی مسکرایا۔ "امی جان پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں اب میں زیادہ دُور نہیں جاؤں گا۔ مجھے یہاں سے کوئی پانچ میل دُور دریا کے دوسرے کنارے ایک پہاڑی کی چوکی کی حفاظت پر متعین کیا گیا ہے۔ مجھے سرنگا پٹم کے مستقر میں حاضری دیتے ہی وہاں پہنچنے کا حکم مل گیا ہے۔"

فرحت نے منور خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "منور تم مُراد کے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر غسل خانے میں رکھ دو۔"

مراد علی قدرے جرأت سے کام لے کر جین کی طرف متوجہ ہُوا اور اس نے مغموم لہجے میں کہا۔ "بہن مجھے لیگراںڈ کی موت کا بہت افسوس ہے۔ میں چتل دُرگ سے ہو کر آیا ہوں۔"

فرحت نے چونک کر سوال کیا۔ "تم انور سے ملے تھے؟"

"ہاں امی جان!"

"وہ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں امی جان وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

جین بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

فرحت نے کہا۔ "بیٹا چتل دُرگ کے قلعے کو کوئی خطرہ تو نہیں؟"

"نہیں امی جان چتل دُرگ کا قلعہ بہت محفوظ ہے اور اب مرہٹوں کا رُخ چتل دُرگ کی بجائے سرنگا پٹم کی طرف ہے۔"

منور خاں ایک کمرے سے نمودار ہُوا اور اس نے کہا۔ "جناب مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کون سا لباس پسند کریں گے۔ اس لیے میں نے سفید کپڑوں کے ایک جوڑے کے علاوہ ایک نئی وردی بھی نکال کر غسل خانے میں رکھ دی ہے۔"

مُراد علی مسکرایا۔ "بھئی تم بہت ہوشیار ہو گئے ہو۔ مجھے صرف وردی کی ضرورت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد مراد علی نئی وردی پہنے اپنی ماں اور جین کے ساتھ بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جین نے لیگراںڈ کی موت کی درد انگیز تفصیلات سنانے کے بعد کہا۔ "پچھلے ہفتے موسیو لالی یہاں آئے تھے اور وہ انگریزوں کی پیش قدمی کے متعلق بہت فکرمند تھے۔ اس کے بعد ہمیں چند دن تک کوئی تسلی بخش اطلاع نہیں ملی۔ کل ہم نے یہ خوشخبری سنی تھی کہ دریا کے پار ایک لڑائی میں انگریزوں کے سینکڑوں سپاہی مارے گئے ہیں۔"

مراد علی نے کہا۔ "یہ خبر درست ہے انگریزوں کا واقعی بہت نقصان ہُوا ہے اور انشاءاللہ دو چار دن تک آپ اس سے بڑی خوشخبری سُنیں گی۔ گزشتہ چند دنوں میں حالات کافی بدل چکے ہیں ہم نے انگریزی فوج کی رسد اور کمک کے تمام راستے کاٹ دیے ہیں۔ اب انہیں باہر سے اناج کا ایک دانہ تک نہیں مل سکے گا۔ ہمارے سواروں کے دستے تمام راستوں پر پہرہ دے رہے ہیں۔ اب سرنگا پٹم سے زیادہ لارڈ کارنوالس کا اپنا لشکر محاصرے کی حالت میں ہے۔ قدرت نے ہماری بروقت مدد کی ہے۔ آپ خدا سے یہ دُعا کریں کہ یہ بارشیں چند دن اور ختم نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کاویری کی طغیانی سے انگریزوں کے حوصلے سرد پڑ جائیں گے۔ اس موسم میں سرنگا پٹم پر لارڈ کارنوالس کا یورش سلطان کی خواہش کے عین مطابق ہوگا۔ انگریزوں کے پڑاؤ پر ہماری ناکہ بندی اتنی سخت ہے کہ انھوں نے جو ایلچی مرہٹوں کی طرف روانہ کیے تھے وہ تمام گرفتار کر لیے گئے ہیں۔"

جین نے کہا۔ "آپ کا خیال ہے کہ مرہٹے انگریزوں کی مدد کے لیے نہیں آئیں گے؟"

"وہ ضرور آئیں گے۔ مجھے ان کی نقل و حرکت کا پورا علم ہے اور میں سلطان کو ان کی پیش قدمی سے باخبر کرنے کے لیے آیا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم ان کی آمد سے پہلے پہلے لارڈ کارنوالس کے دانت کھٹے کر سکیں گے۔"

جین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "میں میسور کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ لیکن اس جنگ میں سُلطان کو تین عظیم طاقتوں سے نپٹنا پڑے گا اور میسور کے جنگی وسائل بہرحال ان کی نسبت زیادہ محدود ہیں۔"

مراد علی نے جواب دیا۔ "میسور کے سپاہی اپنے جنگی وسائل کی نسبت اپنے مقاصد کی برتری پر

پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارے لیے آزادی کی زندگی یا عزت کی موت کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ دشمن ہماری لاشیں روند سکتا ہے ہمیں اپنی غلامی کا طوق پہننے پر آمادہ نہیں کرسکتا۔ لیکن آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ میسور کی عزت اور آزادی کے دشمن اس مرتبہ اپنی تباہی کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں "

○

لارڈ کارنوالس کی مشکلات میں آئے دن اضافہ ہوتا گیا۔ جو رسد وہ اپنے ساتھ لایا تھا قریباً ختم ہوچکی تھی۔ چارے کی کمی کے باعث ہر روز اس کے کیمپ میں سینکڑوں گھوڑے اور مویشی ہلاک ہو رہے تھے۔ بھوک کے سپاہی مُردہ جانوروں کا گوشت کھانے پر مجبور ہوچکے تھے۔ لگاتار بارشوں کے ساتھ پڑاؤ میں بڑھتی ہوئی غلاظت کے باعث چیچک، ہیضہ اور دوسری وبائیں پھوٹ نکلیں اور لارڈ کارنوالس کا اپنا کیمپ بیماروں کا ہسپتال نظر آنے لگا۔ میسور کے چھاپہ مار دستے کبھی دن اور کبھی رات کے وقت پڑاؤ کے آس پاس کے ٹیلوں اور پہاڑیوں پر نمودار ہوتے اور چند سنسناتی گولیاں برسانے کے بعد رُوپوش ہوجاتے تھے۔ کمپنی کے سپاہیوں کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ اگر ان میں سے کوئی رات کے وقت نیند کی حالت میں بڑبڑا اٹھتا تو سارے کیمپ میں افراتفری مچ جاتی۔ میر نظام علی کے سپاہیوں کی حالت انگریزوں سے بھی زیادہ قابلِ رحم تھی۔

ان حالات میں لارڈ کارنوالس نے کسی تاخیر کے بغیر سرنگا پٹم پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ قلعے کے قریب دریا کے قابلِ عبور حصے تک پہنچنے کے لیے اس کے راستے میں ایک ایسی پہاڑی حائل تھی جس کی چوٹی پر میسور کی توپیں نصب تھیں۔ کارنوالس نے پورے جوش و خروش کے ساتھ اس پہاڑی پر حملہ کیا اور ایک گھمسان کی جنگ کے بعد اس پر قبضہ کرلیا۔ میسور کی فوج کے چند دستے پیچھے ہٹ گئے اور انگریزی فوج ان کے تعاقب میں دریا کے کنارے پہنچ گئی۔ لیکن جزیرے[1]

[1] جزیرے سے مراد سرنگا پٹم ہے۔

کی توپوں کی شدید گولہ باری کے باعث انھیں سخت نقصانات کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ اس ناکامی کے بعد لارڈ کارنوالس نے چند میل دُور ہٹ کر ایک اور گھاٹ سے دریا عبور کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔

لارڈ کارنوالس، مرہٹوں کی نقل و حرکت سے بے خبر تھا اور اس کی آخری اُمید یہ تھی کہ مالابار کے راستے جنرل ابرکرومبی کی کمان میں کمپنی کی افواج اس کی مدد کے لیے پہنچنے والی ہیں اور وہ رسد، اسلحہ اور بارُود کی ایک بہت بڑی مقدار اپنے ساتھ لا رہی ہیں۔ لیکن اچانک ایک دن اسے یہ اطلاع ملی کہ راستے میں میسور کے دستوں نے حملہ کر کے اس کا بیشتر سامان چھین لیا ہے۔ اس اطلاع کے بعد لارڈ کارنوالس کی مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی چنانچہ اس نے بادلِ ناخواستہ پسپا ہونے کا فیصلہ کیا —— ایک رات حملہ آور فوج کے کیمپ سے آگ کے مہیب شعلے نمودار ہوئے اور میسور کے جاسوسوں نے سلطان ٹیپو کو اطلاع دی کہ لارڈ کارنوالس نے اپنی سینکڑوں بیل گاڑیاں نیچے اور بارُود کے بھیے ذخیرے ایک جگہ جمع کر کے انھیں آگ لگا دی ہے اور اس نے اپنی بیشتر توپیں بھی ضائع کردی ہیں "

اگلی صبح لارڈ کارنوالس واپس بنگلور کا رُخ کر رہا تھا۔ بھوک اور بیماری کے باعث اس کے سپاہی راستے میں قدم قدم پر دم توڑ رہے تھے۔ بیل گاڑیوں سے محروم ہونے کے باعث جو تھوڑا بہت سامان یہ لوگ اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لائے تھے وہ راستے میں پھینکا جا رہا تھا۔ عقب اور بازوؤں سے میسور کے سواروں کے حملے کے خوف سے افراتفری کا یہ عالم تھا کہ کوئی اپنے گرتے ہوئے ساتھی کو سہارا دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ بارش کے طوفان میں کوئی چھ میل طے کرنے کے بعد انگریزوں کو اپنے سامنے سواروں کے چند دستے دکھائی دیے اور ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب لارڈ کارنوالس اپنے ساتھیوں کی صفیں درست کر چکا تھا اُن سواروں کی ایک ٹولی اس کے قریب پہنچی اور اسے معلوم ہوا کہ یہ لوگ میسور کے سپاہی نہیں بلکہ مرہٹہ لشکر کے ہراول دستے ہیں اور پرسرام بھاؤ، ہری پنت اور دوسرے مرہٹہ سردار

باقی فوج کے ساتھ صرف چند میل کے فاصلے پر ہیں۔ لارڈ کارنوالس نے اپنے لشکر کو پہاڑی کے دامن میں پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ چند گھنٹے بعد مرہٹوں کی باقی فوج بھی وہاں پہنچ گئی اور ہری پنت نے اپنے گھوڑے سے اُترتے ہی لارڈ کارنوالس سے مُصافحہ کرتے ہُوئے کہا۔ "اب آپ کو پسپائی کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔ ہم سرنگا پٹم فتح کیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔"

لارڈ کارنوالس کا چہرہ غصّہ سے تمتما اُٹھا تاہم اس نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہُوئے جواب دیا۔ "اگر آپ لوگ دو تین دن تک اور یہاں نہ پہنچتے تو میرا کوئی سپاہی آپ کے ملنے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔ میں شکرگزار ہُوں کہ ہمارے اتحادیوں کی بروقت اعانت سے ہمارے واپس بنگلور پہنچنے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔"

ہری پنت نے جواب دیا۔ "جناب سرنگا پٹم پر چڑھائی کرنے سے پہلے اگر آپ ہمارا انتظار کر لیتے تو آپ کو ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ہمیں تو کئی دن تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ آپ سرنگا پٹم کے قریب پہنچ چکے ہیں۔"

لارڈ کارنوالس نے کہا۔ "ہم نے برسات کے آغاز سے پہلے پہلے سرنگا پٹم فتح کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور آپ میری تجاویز سے متفق تھے۔ میں نے چند دن یا چند ہفتے نہیں بلکہ چند مہینے آپ کا انتظار کرنے کے بعد بنگلور سے پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے بعد میں آپ کے پاس کئی ایلچی بھیج چکا ہُوں۔"

"جناب یہ ہماری کوتاہی نہیں بلکہ ہمارے دشمن کا کمال ہے کہ آپ کا کوئی ایلچی ہمارے پاس نہیں پہنچ سکا اور ہم نے جو ایلچی آپ کی طرف روانہ کیے تھے وہ بھی لاپتہ ہیں۔ لیکن اب ہمیں ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر آپ کو رسد اور بارُود کی ضرورت ہے تو وہ ہم مہیا کر سکتے ہیں۔ اب آپ پسپائی کا خیال ترک کر دیں۔"

"نہیں!" لارڈ کارنوالس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ "اب مجھ میں دشمن کے مزید کمالات دیکھنے کی ہمت باقی نہیں رہی۔ آپ اگر مجھ پر کوئی مہربانی کر سکتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ آپ ہماری

رہی سہی فوج کو بنگلور تک پہنچا دیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں سرنگا پٹم فتح کرنے کا ارادہ ترک کر چکا ہوں لیکن میری فوج کا جائزہ لینے کے بعد آپ کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان حالات میں ہمارے لیے جنگ جاری رکھنا خودکشی کے مترادف ہے۔ آپ ہمیں جو رسد اور بارُود دیں گے وہ صرف چند دن کے لیے کافی ہو گا۔ اس کے بعد آپ کے لشکر کی حالت ہم سے مختلف نہیں ہو گی۔ موسم برسات کے اختتام تک میں اپنی فوج کو دوبارہ منظم کر سکوں گا۔ پھر اگر آپ نے ہمارا ساتھ دیا تو ہم اس شکست اور ناکامی کا پُورا انتقام لے سکیں گے۔ اس وقت میرے سامنے صرف یہ مسئلہ ہے کہ ہم جلد از جلد بنگلور پہنچ جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ دشمن کے چھاپہ مار دستے اس وقت بھی ہمارے تعاقب میں ہیں اور اگر سلطان ٹیپو نے سرنگا پٹم سے نکل کر ہمارا پیچھا کیا تو ہمیں ایک عبرت ناک تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

ہری پنت نے بددل ہو کر کہا۔ "بہت اچھا اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

○

ایک دن علی الصّباح مراد علی مکان میں داخل ہُوا۔ خادمہ صحن میں جھاڑو دے رہی تھی۔

مراد علی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "امّی جان کہاں ہیں؟"

خادمہ نے جواب دیا۔ "وہ اُوپر نماز پڑھ رہی ہیں۔"

"اور جین کہاں ہے؟"

خادمہ مسکرائی۔ "وہ بھی نماز پڑھ رہی ہیں۔"

مراد علی نے حیران سا ہو کر کہا۔ "جین نماز پڑھ رہی ہے؟"

"جی ہاں اور اب ان کا نام جین نہیں منیرہ خانم ہے ——— میں سچ کہتی ہوں وہ مسلمان ہو گئی ہیں۔"

مراد علی اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتا ہُوا تیزی سے بالائی منزل کی سیڑھیوں پر

چڑھنے لگا۔ آخری سیڑھی پر کے قریب پہنچ کر وہ ایک ثانیے کے لیے رُکا اور پھر دبے پاؤں آگے بڑھا۔ بالائی منزل کے ایک کمرے سے اسے فرحت اور جین کی آوازیں سنائی دیں اور وہ دروازے کے سامنے رُک کر اندر جھانکنے لگا۔ فرحت اور جین نماز سے فارغ ہو کر بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھیں۔ فرحت پُرسوز آواز میں دُعا مانگ رہی تھی اور جین آہستہ آہستہ اس کے الفاظ دُہرا رہی تھی۔ مُراد علی دروازے سے ایک طرف ہٹ کر یہ دُعا سُننے لگا۔ "مولائے کریم! ہمارے سینے ایمان کی روشنی سے منوّر کر دے۔ ہمیں ہمّت دے کہ ہم زندگی کے آلام و مصائب کا مقابلہ کر سکیں۔ تیری رحمت کے سوا ہمارا کوئی سہارا نہیں۔ ہمارے سُلطان کو فتح دے۔ اسے اپنے دین کا بول بالا کرنے اور اسلام کے دشمنوں کو مغلوب کرنے کی طاقت دے۔ انور اور مُراد کو ان کے باپ کی روایات پر چلنے کی ہمّت دے۔ میرے مولا وہ دن لا جب وہ فتح کے پرچم لہراتے ہُوئے گھر واپس آئیں۔ میرے مولا ہمارے سُلطان کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کر! آمین!"

دُعا کے بعد وہ باتیں کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ جین نے کہا: "امّی جان! آج آپ بارش کے لیے دعا کرنا بھُول گئیں۔"

فرحت نے جواب دیا: "بیٹی اب دشمن کی فوج پسپا ہو چکی ہے اور ہمیں یہاں مزید بارشوں کی ضرورت نہیں۔"

"امّی جان سرنگاپٹم کے بعد ہمیں دوسرے محاذوں پر اسی قسم کی بارش کی ضرورت ہے۔ آپ دُعا کریں کہ ہمارے دشمنوں کو میسُور کی سرزمین پر ایک لمحہ کے لیے بھی چین نصیب نہ ہو اور وہ جہاں جائیں وہاں دنیا کے تمام بادل ان کے استقبال کے لیے موجود ہوں۔

مُراد علی نے کہا: "منیرہ بہن میں اندر آسکتا ہُوں؟"

فرحت اور جین نے مُڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور مُراد علی مسکراتا ہُوا اندر داخل ہُوا۔ ماں بلائیں لیتی ہُوئی آگے بڑھی اور پیار سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیے۔ جین نے مُصلّیٰ لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور فرحت سے دو تین قدم دُور کھڑی ہو گئی۔

مراد علی نے جین کی طرف متوجّہ ہو کر کہا: "اگر خادمہ نے میرے ساتھ مذاق نہیں کیا اور آپ سچ مُچ مسلمان ہو گئی ہیں تو میں آپ کو اور آپ سے زیادہ امّی جان کو مبارکباد پیش کرتا ہُوں۔ منیرہ بہت اچھا نام ہے۔ چیتل ڈرگ میں بھائی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے جین کو خواب میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ منیرہ کاش آپ میری خوشی کا اندازہ لگا سکتیں۔" —— پھر اس نے غور سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور فکرمند ہو کر کہا: "امّی جان کیا بات ہے آپ بہت کمزور نظر آتی ہیں؟"

"بیٹا میں تمھارے جاتے ہی بیمار ہو گئی تھی۔ لیکن اس بیماری سے یہ فائدہ ہُوا ہے کہ تمھاری بہن نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ منیرہ کا دل مدّت سے اسلام قبول کر چکا تھا۔ لیکن میرا بخار اسے کلمہ پڑھوانے کے لیے ایک بہانہ بن گیا۔ اب تم اطمینان سے بیٹھ کر ہمیں جنگ کے حالات سناؤ۔"

وہ قالین پر بیٹھ گئے اور مراد علی نے کہا: "امّی جان جنگ کے حالات اب ہمارے حق میں ہیں۔ اگر دشمن پر بارش کے طوفان نازل کرنے میں منیرہ بہن کی دُعاؤں کا کوئی دخل تھا تو میسُور کے ہر سپاہی کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

منیرہ نے مسکرا کر کہا: "بھائی جان اگر میری دعاؤں میں تاثیر ہوتی تو آج سخت ترین بارش ہونی چاہیے تھی۔ کل جب آسمان صاف ہونے لگا تھا تو میں نے بڑے درد کے ساتھ مزید بارش کے لیے دعا شروع کی تھی۔ آج بھی میں امّی جان کے ساتھ تہجّد کے لیے اٹھی تھی اور اس وقت سے دعا کر رہی ہُوں۔ لیکن اس کا اثر یہ ہُوا کہ اب آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا۔"

مراد علی ہنس پڑا اور فرحت نے کہا: "بیٹا تم نے جنگ کے متعلق اپنی بات ختم نہیں کی۔"

مراد علی نے کہا: "امّی جان! خدا نے ہم پر بڑا فضل کیا ہے۔ لارڈ کارنوالس اب مدّت تک اپنے زخم چاٹتا رہے گا۔ وہ اپنا بیشتر جنگی سامان ضائع کرنے کے بعد یہاں سے بھاگا ہے۔ مالابار کی طرف سے انگریزوں کی جو فوج آ رہی تھی وہ اپنا پُورا توپ خانہ راستے میں چھوڑ کر پسپا ہو گئی ہے۔ مگر صرف ایک بات کا افسوس ہے اور وہ یہ کہ مرہٹوں کا ٹڈی دل لشکر بروقت پہنچ جانے کے باعث

ہم لارڈ کارنوالس اور میر نظام علی کی افواج کا تعاقب جاری نہیں رکھ سکے۔ اگر مرہٹے صرف دو چار دن اور تاخیر سے کام لیتے تو میں آپ کو یہ خوشخبری سناتا کہ ہم نے میسور کی سرزمین پر کسی انگریز کو زندہ نہیں چھوڑا۔"

منیرہ نے پوچھا: "اب انگریزوں کی فوج کہاں ہے؟"

"اب وہ بنگلور پہنچ چکے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تیاری کے بعد دوبارہ سرنگاپٹم پر چڑھائی کریں گے؟"

مراد علی نے جواب دیا: "کارنوالس برسات گزارنے سے پہلے سرنگاپٹم کا رُخ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن مرہٹوں کی آمد کے باعث دوسرے محاذوں پر دشمن کی سرگرمیاں تیز ہو جائیں گی۔ مجھے آرام کے لیے تین دن کی چھٹی ملی ہے۔ لیکن سلطان کا حکم ہے کہ فوج کے تمام افسر اور سپاہی چوبیس گھنٹے تیار رہیں۔"

فرحت نے کہا: "بیٹا! انور علی کی طرف سے کوئی پیغام نہیں آیا؟"

"امی جان جنگ کے دنوں میں خط بھیجنا آسان نہیں ہوتا۔ بھائی جان کے متعلق آپ کو فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ چتل ڈرگ کا قلعہ بہت محفوظ ہے اور میں آج ہی ان کی طرف خط بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوں گے کہ منیرہ مسلمان ہو چکی ہے۔"

"نہیں نہیں بھائی جان آپ انھیں میرے متعلق کچھ نہ بتائیں۔"

"کیوں آپا جان یہ کوئی چھپانے والی بات تو نہیں۔ میں تو سارے شہر میں یہ منادی کروانا چاہتا ہوں کہ میری بہن مسلمان ہو چکی ہے۔"

منیرہ نے ملتجی ہو کر فرحت کی طرف دیکھا اور اس نے کہا: "بیٹا منیرہ کی یہ خواہش ہے کہ تمھارا بھائی گھر پہنچ کر یہ خوشخبری سنے اور میں یہ وعدہ کر چکی ہوں کہ میں انور کو اس کے مسلمان ہونے کی اطلاع نہیں بھیجوں گی۔ تم اگر چاہو تو اسے یہ لکھ سکتے ہو کہ منیرہ بہت خوش ہے اور صبح شام تمھاری سلامتی کے لیے دعائیں کرتی ہے۔"

"نہیں نہیں" منیرہ نے ملتجی ہو کر کہا: "انھیں صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ میں زندہ ہوں اور ان کے لیے میرا نام منیرہ نہیں بلکہ جین ہے۔ بھائی جان آپ وعدہ کریں کہ آپ انھیں میرے مسلمان ہونے کے متعلق کچھ نہیں لکھیں گے۔"

مراد علی پریشانی کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جس کے ہاتھ میں ایک دلچسپ کھلونا دے کر اسے یہ حکم سنا دیا گیا ہو کہ تم اس کے ساتھ دل بہلا سکتے ہو لیکن اپنے ساتھیوں کو نہیں دکھلا سکتے۔ اس نے کہا: "بہن میں آپ کے اعتراض کی وجہ نہیں سمجھ سکا تاہم میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھائی جان کو آپ کے متعلق کچھ نہیں لکھوں گا۔"

اُنیسواں باب

سرنگاپٹم سے پسپائی کے بعد بنگلور میں اتحادی افواج کا اجتماع لارڈ کارنوالس کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ بن چکا تھا۔ مرہٹہ فوج اپنے ساتھ جو فالتو رسد لائی تھی وہ اتنے بڑے لشکر کے لیے چند دنوں کی ضرورت سے زیادہ نہ تھی۔ میر نظام علی اور مرہٹوں کی افواج جن راستوں سے رسد اور کمک حاصل کرتی تھیں وہ سلطان ٹیپو کے طوفانی دستوں کے پے در پے حملوں کے باعث مسدود ہو رہے تھے۔ برسات کی طغیانیوں میں کرناٹک سے رسد اور سامانِ جنگ حاصل کرنے کے لیے پالاکدھ کا درہ سب سے آسان اور مختصر راستہ تھا۔ لیکن اس درے میں سلطان کے چند مضبوط قلعے حائل تھے۔ لارڈ کارنوالس کسی تاخیر کے بغیر ان قلعوں پر قبضہ کرنا اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھتا تھا لیکن پرس رام بھاؤ، ہری پنت اور نظام کی فوج کے افسر اپنا عقب غیر محفوظ سمجھ کر یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ انگریزی فوج ان کے ساتھ سرا کی طرف پیش قدمی کرے۔ کارنوالس جیسے جہاندیدہ سپاہی کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ سرا کی طرف پیش قدمی سے جس قدر نظام اور مرہٹوں کی افواج محفوظ ہو جائیں گے اسی قدر کمپنی کی افواج کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ مرہٹہ سردار اور نظام کی فوج کے افسر چند دن اس مسئلہ پر لارڈ کارنوالس کے ساتھ بحث کرتے رہے اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ مرہٹے اپنی بیشتر فوج سرا کی طرف روانہ کردیں تاکہ

کا لشکر شمال مشرق کی طرف پیش قدمی کرے اور انگریز کرناٹک کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے لیے پالاکدھ کے درّے کی چوکیوں پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ ہری پنت نے اپنی فوج کے چند دستے کارنوالس کی اعانت کے لیے روک لیے۔ باقی مرہٹہ فوج پرس رام کی کمان میں سرا کی طرف روانہ ہوگئی۔ دکن کے سپہ سالار نے بھی اپنی پیادہ اور سوار فوج کے چند دستے لارڈ کارنوالس کے سپرد کر دیے اور باقی لشکر کے ساتھ گرم کنڈہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

جولائی کے وسط میں لارڈ کارنوالس نے چند شدید معرکوں کے بعد ہوسر اور رایا کوٹی کے قلعوں کے علاوہ پالاکدھ کے درے کی چند اور چوکیوں پر قبضہ کرلیا اور کمپنی کی فوج کے لیے کرناٹک سے رسد اور سامانِ جنگ حاصل کرنے کا راستہ صاف ہوگیا۔ اس کے بعد سرنگاپٹم کے گرد چند میل کے رقبہ کے سوا سارے میسور کو آگ اور خون کا طوفان اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔ مرہٹوں کی ٹڈی دَل فوج سرا اور اس کے جنوب مشرق میں دوسرے زرخیز علاقوں کو تاخت و تاراج کر رہی تھی۔ دکن کے سوار گرم کنڈہ کے اردگرد ایک وسیع علاقے میں تباہی مچا رہے تھے اور انگریزی افواج مغربی اور مشرقی ساحلوں کے درمیان جنوب کے وسیع علاقے فتح کرنے میں مصروف تھیں۔

اتحادی سرنگاپٹم پر دوبارہ یلغار کرنے سے پہلے سلطنتِ خداداد کے ان قلعوں اور چوکیوں کو ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے جن کی افواج کی ناکہ بندی نے اس سے قبل لارڈ کارنوالس کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیے تھے لیکن مختلف محاذوں پر چند مہینے خونریز جنگیں لڑنے کے بعد انھیں بڑی شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ سرنگاپٹم کی طرح ان قلعوں اور چوکیوں

لہ رسد اور سامانِ جنگ کے لیے لارڈ کارنوالس کی احتیاج کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کرناٹک سے جو پہلا قافلہ اس کے پاس پہنچا وہ رسد اور جنگی سامان کی گاڑیاں کھینچنے والے چھ ہزار بیلوں، کئی ہاتھیوں اور ہزاروں مزدوروں پر مشتمل تھا۔ جیمس مل لکھتا ہے کہ اس سے قبل ہندوستان میں برطانوی ترکتازی کی تاریخ میں اتنے بڑے قافلے کی مثال نہیں ملتی۔

کی قوتِ مدافعت کے متعلق بھی ان کے اندازے غلط تھے۔ میسور ایک وسیع دلدل تھا اور وہ ہر نئے دن اُس کے اندر دھنستے جا رہے تھے۔

مرہٹوں نے چند اہم شہروں اور قلعوں پر ناکام حملوں کے بعد اپنی تمام تر توجہ ان زرخیز علاقوں کو تباہ و برباد کرنے پر مرکوز کر دی تھی جہاں سے سُلطان اپنی افواج کے لیے رسد حاصل کرتا تھا۔ شمال مغرب کے وسیع علاقوں میں انسانوں کی بستیوں کی بجائے راکھ کے انبار ان کی سفاکی اور بربریت کی گواہی دے رہے تھے۔ صوبہ سرا میں تباہی مچانے کے بعد پرس رام بھاؤ نے چتل درگ کی طرف پیش قدمی کی لیکن اسے جلد ہی چتل ڈرگ کی دفاعی قوت کا اندازہ ہو گیا اور وہ راستے کی چند بستیوں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں لوٹ مار کرنے کے بعد چاند گری کی طرف لوٹ آیا۔ اس کے بعد اس نے بدنور کا رُخ کیا اور راستے کی چند چوکیوں پر قبضہ کرنے کے بعد شموگہ کے ضلع میں تباہی مچا دی۔ یہاں انگریزی فوج کے ایک ہزار سپاہی اپنے توپ خانے سمیت اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور جنوری ۱۷۹۲ء کے آغاز میں انھوں نے پے در پے حملوں کے بعد شموگہ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

شموگہ کے بعد پرس رام نے بدنور کے دارالحکومت کی طرف پیش قدمی کی اور راستے میں اننت پور کے علاوہ چند اور چھوٹے چھوٹے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس عرصہ میں اسے یہ اطلاع ملی کہ میر قمر الدین خاں کی قیادت میں میسور کے سواروں کا ایک لشکر بدنور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس اطلاع نے اسے جنوب مشرق کی طرف پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ جنوری کے آخر میں پرس رام کی افواج ہوتری درگ کے مقام پر لارڈ کارنوالس کے لشکر کے شامل ہو گئیں۔ بدنور سے پسپا ہونے کے بعد مرہٹوں کا ٹڈی دل لشکر اپنے راستے کی سینکڑوں بستیاں ویران کر چکا تھا۔

سرنگا پٹم سے لارڈ کارنوالس کی پسپائی کو دس مہینے گزر چکے تھے اور ان دس مہینوں میں کم از کم سات مہینے ایسے تھے جب کہ سلطنتِ خداداد کی تاریخ کا کوئی دن خونریز معرکوں اور سُلطان ٹیپو کے اولوالعزم سپاہیوں کے تذکروں سے خالی نہ تھا۔ ان سات مہینوں کے دنوں اور راتوں کے بیشتر لمحات ایسے تھے جو شیرِ میسور نے گھوڑے کی زین پر گزارے تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس کی نظیر پورے ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ میسور کے جانبازوں کا کتنا خون تھا جو وطن کی آزادی کے لیے بہہ چکا تھا۔ کتنے شہر تھے جو ویران ہو چکے تھے۔ کتنی بستیاں تھیں جو راکھ کے انبار بن چکی تھیں۔ میسور کی رعایا کے کتنے آنسو تھے جو وطن کی خاک پر نچھاور ہو چکے تھے اور میسور کے مجاہدوں کے عزم و ثبات، جرأت و شجاعت اور ایثار و خلوص کی کتنی داستانیں تھیں جنھیں تاریخ اپنے صفحات میں جگہ نہیں دے سکی؟ آج دو صدیوں کے بعد ہم ان سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے۔ تاہم جن داستانوں کو مورخوں نے اپنی توجہ کے قابل سمجھا ہے وہ قیامت تک اس دنیا کے انسانوں سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہیں گی۔

لارڈ کارنوالس کی پشت پر وہ قوم تھی جس کے جنگی وسائل لامحدود تھے۔ جنوبی ہند کے ساحلوں پر برطانیہ کے عظیم جنگی بیڑے کا تسلط تھا۔ اپنے رسد اور کمک کے راستے محفوظ کرنے کے بعد لارڈ کارنوالس جس قدر اسلحہ اور بارود حاصل کر چکا تھا وہ اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ برطانیہ سے آنے والے تازہ دم سپاہی اس کی فوجی قوت میں آئے دن اضافہ کر رہے تھے۔ ہندوستان میں اس کے حلیف وہ تھے جو ہر میدان میں میسور کے ایک سپاہی کے مقابلے میں پانچ سپاہی لا سکتے تھے۔ ایک طویل عرصہ کے لیے انگریزوں کے علاوہ ہندوستان کی دو بڑی طاقتوں کا مقابلہ کرنا سُلطان ٹیپو کی سپاہیانہ زندگی کا عظیم ترین کارنامہ تھا۔ سُلطان کی جنگ صرف دشمن کے خلاف مدافعانہ کارروائیوں تک محدود نہ تھی۔ اس کے جانباز اگر ایک میدان میں چند میل پیچھے ہٹتے تو دوسرے میدان میں دشمن کو چند میل پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ایک دن یہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں قلعہ، فلاں شہر یا فلاں چوکی پر دشمن نے قبضہ کر لیا ہے تو دوسرے دن یہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں قلعے

پر انگریزوں، مرہٹوں یا نظام کی بجائے سلطان ٹیپو کا پرچم لہرا رہا ہے۔ ایک دن لارڈ کارنوالس کا لشکر وآرر کی فتح پر خوشیاں منا رہا تھا تو چند دن بعد اس کے ایلچی اسے یہ خبر سنا سے تھے کہ سلطان کی فوج نے کوئمبٹور پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ جن ایام میں پرس رام بھاؤ کی افواج شموگہ اور بدنور کے علاقے تاخت و تاراج کر رہی تھیں انہی ایام میں لارڈ کارنوالس کے کیمپ میں یہ دہائی مچی ہوئی تھی کہ سلطان کے طوفانی دستے سیلم کے آس پاس انگریزوں کی چوکیاں تباہ کرنے کے بعد کرناٹک میں فورٹ سینٹ جارج کے دروازوں تک پہنچ چکے ہیں۔

ان جنگوں میں سلطان کے کئی تجربہ کار جرنیل شہید ہو چکے تھے لیکن انگریز اور ان کے اتحادی یہ محسوس کر رہے تھے کہ سلطان کے ترکش میں ابھی بہت سے تیر باقی ہیں۔ سلطان کا اولوالعزم بیٹا فتح حیدر ان نوجوان افسروں میں سے ایک تھا جو اپنی تلواروں کی نوک سے سلطنتِ خداداد کی تاریخ کا ایک ورق اُلٹ رہے تھے۔ فتح حیدر کو اٹھارہ سال کی عمر میں میر نظام علی کے لشکر کے مقابلے کے لیے گرم کنڈہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ حافظ فرید الدین کی قیادت میں حیدر آباد کی فوج نے گرم کنڈہ سے چند میل دُور اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن جوان سال شہزادے نے اسے عبرتناک شکست دی۔ حافظ فرید الدین جنگ میں مارا گیا اور فتح حیدر نے آگے بڑھ کر ایک شدید حملے کے بعد گرم کنڈہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سلطان ٹیپو کی افواج اپنے محدود وسائل کے باعث جنگ کا پانسہ نہ پلٹ سکیں۔ یہ درست ہے کہ گزشتہ چند ماہ کے ان گنت معرکوں میں انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کے لشکر کے نقصانات میسور کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے لیکن ان کے وسائل اس قدر لامحدود تھے کہ وہ ہر وقت اپنے نقصانات کی تلافی کر سکتے تھے۔ اپنے نقل و حمل کے راستے محفوظ کر لینے کے بعد انھیں اسلحہ، بارود، رسد اور تازہ دم سپاہی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ پرس رام اور ہری پنت کی پُشت پر پُوری مرہٹہ قوم تھی۔ حیدر آباد کی فوج کی اعانت کے لیے بھی تازہ دم دستے پہنچ رہے تھے۔ انگریز سپاہیوں کی تعداد میں بھی بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ لیکن

سُلطان کو باہر سے کسی اعانت کی اُمید نہ تھی۔ میسور کے زرخیز علاقے جہاں سے اسے رسد مل سکتی تھی تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ اتحادی ایسے کئی شہروں پر قبضہ کر چکے تھے جن کے کارخانوں میں میسور کے لیے اسلحہ اور بارُود تیار ہوتا تھا۔ سلطان کی آخری اُمید یہ تھی کہ جنگ کی طوالت کے باعث شاید اتحادی ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیں۔ لیکن یہ اُمید بھی موہوم ثابت ہُوئی۔ میر نظام علی اور نانا فرنویس انگریزوں کے ساتھ وطن کی عزت اور آزادی کا سودا کر چکے تھے۔

۱۰ فروری ۱۷۹۲ء کے آغاز میں انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کی افواج اپنے اپنے عقب سے پُوری طرح مطمئن ہو کر سرنگاپٹم کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

○

ایک دوپہر فرحت اور منیرہ نچلی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ فرحت ایک کتاب پڑھ رہی تھی اور منیرہ کپڑا سینے میں مصروف تھی۔ اچانک انھیں دروازے کے قریب مُراد علی کی آواز سنائی دی۔ "امی جان!"

فرحت کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی اور وہ دم بخود ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ مُراد علی لڑکھڑاتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا۔ منیرہ کپڑا ایک طرف پھینک کر جلدی سے آگے بڑھی اور اس کا بازو پکڑ کر بولی: "بھائی جان کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں بہن میں بالکل ٹھیک ہوں۔" یہ کہہ کر مُراد علی آگے بڑھا اور فرحت کے قریب بیٹھ گیا۔

فرحت چند ثانیے سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اچانک اس نے مراد علی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اپنے آغوش میں لے لیا۔

"میرے لال!" اس نے کانپتی ہُوئی آواز میں کہا: "میرے لال تم بہت کمزور ہو گئے ہو اور اتنی مدت کے بعد میرے کانوں کو تمھاری آواز بھی اجنبی محسوس ہوتی ہے۔"

مُراد علی نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "امّی جان مجھے کئی دن سے آرام نہیں ملا اور میں نے دو دن سے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"میں ابھی کھانا تیار کرواتی ہوں۔" مُنیرہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

مراد علی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "امّی جان بھائی جان کا کوئی خط آیا ہے؟"

ماں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "ہمیں دو ماہ سے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اس نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ میں چتل دُرگ سے شموگر کی طرف جا رہا ہوں۔ اس کے بعد کوئی اطلاع نہیں آئی۔"

مُراد علی کچھ دیر سر جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "امّی جان آپ فکر نہ کریں مجھے یقین ہے کہ بھائی جان محفوظ ہیں۔ موجُودہ حالات میں ان کے لیے خط بھیجنا بہت مشکل ہے۔"

منیرہ کمرے میں داخل ہوئی اور مُراد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ کا کھانا چند منٹ میں تیار ہو جائے گا۔ امّی جان آپ کے متعلق بہت پریشان تھیں۔ آپ اتنا عرصہ کہاں تھے؟"

مُراد علی نے جواب دیا۔ "گزشتہ چار ماہ سے میں غازی خان کے ساتھ تھا اور ہمیں کبھی عقب سے انگریزوں کی رسد اور کمک کے راستے کاٹنے اور کبھی اپنی رسد کے قافلوں کی حفاظت اور کبھی مرہٹوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ گرم کنڈہ کی جنگ میں میں شہزادہ فتح حیدر کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئمبتور کے محاذ پر بھیج دیا گیا تھا۔ کوئمبتور فتح کرنے کے بعد ہمارے دستے کرناٹک کے وسط تک پہنچ چکے تھے۔ اگر ہم چند دن شمال مشرق کی طرف سے مرہٹوں کی لاتعداد فوج کی پیش قدمی روک سکتے تو آج لارڈ کارنوالس کو سرنگا پٹم پر حملہ کرنے کی بجائے مشرقی ساحل کی بندرگاہیں بچانے کی فکر ہوتی۔"

"اور اب کیا ہوگا؟" منیرہ نے مغموم لہجے میں سوال کیا۔

مُراد علی نے جواب دیا۔ "اب میسُور کی آزادی کی جنگ سرنگا پٹم کی خندقوں، فصیلوں، گلیوں اور

بازاروں میں لڑی جائے گی۔ دشمن ہماری لاشیں روندے بغیر ہماری آزادی کے پرچم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اب ہماری کوشش یہ ہو گی کہ دشمن کو موسم برسات تک کاویری کے پار روکا جائے اور برسات کے موسم میں ہم اپنے دشمنوں پر پھر ایک بار یہ ثابت کر سکیں گے کہ انھوں نے اس مرتبہ بھی ہماری قوّت کا صحیح اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے۔"

فرحت نے پُوچھا۔ "بیٹا اب تمھیں کہیں باہر تو نہیں بھیجا جائیگا؟"

"مجھے معلوم نہیں امی جان۔ لیکن میرا خیال ہے کہ موسم برسات کے آغاز تک میں یہیں رہوں گا۔ لیکن یہاں بھی میری مصروفیات ایسی ہوں گی کہ میں شاید ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکوں۔"

○

دریائے کاویری کی دو شاخوں کے درمیان سرنگا پٹم کا جزیرہ ساڑھے تین میل لمبا اور ڈیڑھ میل چوڑا تھا۔ شمال مغربی کونے میں جزیرے کا تقریباً ایک تہائی حصّہ قدیم شہر اور قلعے کی خندقوں اور فصیلوں کے اندر گھرا ہُوا تھا۔ بیرونی فصیل کے بعض حصّے بیس فٹ اور بعض پینتیس فٹ بلند تھے۔ شاہی محل شمال کی جانب تھا۔ قلعے کے شمال مشرقی کونے سے پانچ سو گز مشرق کی طرف جو مورچے تعمیر کیے گئے تھے وہ مٹّی کی ایک کشادہ اور بلند دیوار سے گھرے ہُوئے تھے۔ جزیرے کے مشرقی حصّے کے عین درمیان ایک پُر رونق قصبہ شہر گنجام کے نام سے پُکارا جاتا تھا۔ اس سے متّصل مشرقی کونے میں لال باغ تھا۔ دریا کی دو شاخوں کے علاوہ جگہ جگہ بلند پشتوں پر سُلطان کی توپیں جزیرے کے اس حصّے کی حفاظت کرتی تھیں۔ جزیرے کے اندرونی حصّوں میں بھی جگہ جگہ فصیلوں اور پشتوں پر توپیں نصب تھیں۔ اس کے علاوہ کناروں کے ساتھ ساتھ بانس کے گھنے درخت اور خاردار جھاڑیاں ایک باڑ کا کام دیتی تھیں۔ شمال مشرق کی طرف دریا کے پار ایک پہاڑی پر سُلطان کے توپخانے ایک بیرونی دفاعی خط کا کام دیتے تھے۔ پانچ ہزار سواروں اور چالیس ہزار پیادہ سپاہیوں پر مشتمل

فوج اس جزیرے کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی تھی۔

۵ فروری کے دن اتحادی افواج سرنگاپٹم کے شمال میں قریباً چار میل کے فاصلے پر فرنچ راکس کے پیچھے پڑاؤ ڈال چکی تھیں۔ لارڈ کارنوالس کی فوج بائیس ہزار آزمودہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھی حیدرآباد کے اٹھارہ ہزار سواروں کے علاوہ کمپنی کی دو بٹالین شہزادہ سکندر جاہ کی کمان میں تھیں اور ہری پنت کے لشکر کے علاوہ بارہ ہزار مرہٹہ سوار سرنگاپٹم کے معرکے میں حصہ لینے کے لیے جمع ہو چکے تھے۔ انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کے لیے سرنگاپٹم پر قبضہ کرنا اپنے وقار کا مسئلہ بن چکا تھا۔ انھیں اپنی قوت کی برتری کا احساس تھا لیکن اس کے باوجود وہ جنگ کی طوالت اپنے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ سرنگاپٹم پر گزشتہ حملے کے دوران میں لارڈ کارنوالس نے جو سبق سیکھا تھا اس کے بعد وہ برسات کی طغیانیوں کو سلطان ٹیپو کا سب سے خطرناک حلیف سمجھتا تھا۔ برسات کی آمد میں صرف اڑھائی یا تین مہینے باقی تھے اور اتحادی بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتے تھے کہ اگر یہ جنگ برسات سے پہلے ختم نہ ہوئی تو بیرونی قلعوں اور چوکیوں میں سلطان کی رہی سہی فوج کی سرگرمیوں سے ان کا عقب انتہائی غیر محفوظ ہو جائے گا نیز پرس رام بھاؤ کا لشکر اور بمبئی کے گورا سپاہی جو ایبر کرومبی کے ساتھ آ رہے تھے ابھی سرنگاپٹم کے راستے میں تھے۔ سکندر جاہ اور ہری پنت حملہ کرنے سے پہلے ان کا انتظار کرنا چاہتے تھے لیکن لارڈ کارنوالس معمولی تاخیر بھی اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا۔

۶ فروری کو غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد انگریزی فوج کے پیادہ دستے تین حصوں میں تقسیم ہو کر جزیرے کا رخ کر رہے تھے۔ دریا سے کچھ دور وہ چلنے کی بجائے زمین پر رینگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ سردی کے موسم میں دریا پایاب تھا اور حملہ آوروں کے تین ڈویژن آدھی رات کے قریب شمال مشرقی کنارے کے بعض مقامات پر پاؤں جما کر بانس کے گھنے درختوں سے اپنا راستہ صاف کر رہے تھے۔

سرنگاپٹم کے محافظوں کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا اور رات کے وقت بیرونی پشتوں سے ان کی گولہ باری زیادہ مؤثر نہ تھی۔ سلطان کی سوار فوج کے میدان میں آنے سے قبل حملہ آور چند

پشتوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ جنرل میڈوز ایک ڈویژن کے ساتھ عیدگاہ کے پشتے کے قریب جا نکلا جہاں سید حمید کے دستے متعین تھے۔ سید حمید اور اس کے چار سو ساتھی لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور جنرل میڈوز نے پشتے پر قبضہ کر لیا۔ اس عرصہ میں انگریزی فوج کا دوسرا ڈویژن دولت باغ کے قریب شدت کی گولہ باری کا سامنا کرنے کے بعد پسپائی اختیار کر رہا تھا۔ تیسرا ڈویژن ایک گھسان کی لڑائی کے بعد مشرقی کنارے کی چند توپوں پر قابض ہو چکا تھا۔ رات کے تیسرے پہر جزیرے کے بیرونی مورچوں اور پشتوں کے محافظ ایک غیر منظم صورت میں جگہ جگہ حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہے تھے اور اس صورت حالات سے فائدہ اٹھا کر کارنوالس کی فوج کے کئی اور دستے دریا عبور کر کے دولت باغ اور شہر گنجام کے مشرق میں کئی اہم مورچوں پر قابض ہو گئے۔

طلوع سحر کے قریب سلطان کے پیادہ اور سوار سپاہیوں نے ایک خونریز لڑائی کے بعد چند مورچوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ لیکن سرنگاپٹم کی پہلی دفاعی لائن ٹوٹ چکی تھی اور طلوع آفتاب سے کچھ دیر بعد حیدرآبادی اور مرہٹہ افواج بھی جزیرے کے بعض حصوں پر پاؤں جما چکی تھیں۔ گزشتہ رات کی لڑائی کے شدید نقصانات کے باوجود اتحادیوں کی یہ کامیابی ان کی توقع سے زیادہ تھی۔ لیکن دوپہر کے وقت انھیں پھر ایک بار سلطان کا پلڑا بھاری نظر آتا تھا۔ میسور کے جانباز پے در پے حملوں سے انھیں دریا کی طرف دھکیل رہے تھے۔

لارڈ کارنوالس کو اس بات کا یقین تھا کہ اتحادی افواج جزیرے پر پاؤں جمانے کے بعد چند گھنٹے کے اندر اندر قلعے کے دروازے توڑ رہی ہوں گی۔ لیکن اس کی یہ توقع غلط ثابت ہوئی، اتحادی افواج پورے اٹھارہ دن کی پیہم جدوجہد کے باوجود ان مورچوں سے آگے نہ بڑھ سکیں جن پر انھوں نے جنگ کے ابتدائی چند گھنٹوں میں قبضہ کر لیا تھا۔ قلعے کے اردگرد کے مورچوں اور پشتوں پر سلطان کے جانباز ابھی تک ڈٹے ہوئے تھے اور قلعے کی فصیلیں اور خندقیں لارڈ کارنوالس کو ایک اور طویل اور صبر آزما جنگ کا پیغام دے رہی تھیں۔

ایک رات مُراد علی نے اپنے مکان کی ڈیوڑھی کے دروازے پر دستک دی۔ کریم چاچا نے دروازہ کھولا اور کہا "خدا کا شکر ہے کہ آپ آ گئے۔ دلاور خاں کی حالت بہت خراب ہے"۔

"کیا ہُوا اسے؟" مراد علی نے پریشان سا ہو کر پُوچھا۔

"جی اسے بخار ہے۔ طبیب ابھی دیکھ کر گیا ہے اور بی بی جی اس کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں"۔

مُراد علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہُوا ڈیوڑھی سے تھوڑی دُور نوکروں کی رہائش گاہ کے ایک کمرے میں داخل ہُوا۔ دلاور خاں آنکھیں بند کیے بستر پر پڑا تھا اور فرحت اور منیرہ اس کے پاس ایک چھوٹی سی کھاٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ منور ایک طرف دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ مراد علی "السلام علیکم" کہہ کر آگے بڑھا اور اس نے دلاور خاں کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ دلاور خاں نے آنکھیں کھولیں اور چند ثانیے ٹکٹکی باندھ کر مراد علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے نحیف آواز میں کہا "میں بڑی بے تابی سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ بی بی جی کہتی ہیں لڑائی بند ہو گئی ہے؟"

"ہاں چچا لڑائی بند ہو گئی ہے۔ لیکن دشمنوں نے صلح کے لیے جو شرائط پیش کی ہیں وہ شاید سُلطانِ معظم کے لیے قابلِ قبول نہ ہوں ــــــ" پھر وہ فرحت کی طرف متوجہ ہو کر بولا "امی جان انھیں کب سے بخار ہے؟"

"بیٹا یہ پرسوں سے اسی طرح پڑا ہُوا ہے"۔

دلاور خاں نے کہا "آپ کو میری بیماری سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یہ بتایئے دشمن نے صلح کے لیے کیا شرائط پیش کی ہیں؟"

مراد علی نے جواب دیا "دشمن نے ہماری آدھی سلطنت کے علاوہ تین کروڑ اور ساٹھ لاکھ روپے تاوان کا مُطالبہ کیا ہے۔ اس میں سے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ ہمیں فی الفور ادا

کرنا ہوگا اور باقی ایک سال کے اندر اندر چار قسطوں میں ادا کرنا پڑے گا۔ جب صلح کے معاہدے کی تمام تفصیلات طے ہو جائیں گی تو فریقین جنگی قیدیوں کو رہا کر دیں گے"۔

فرحت نے مغموم لہجے میں کہا "بیٹا یہ شرائط تو بہت سخت ہیں"۔

مراد علی نے کہا "امی جان ان حالات میں ہم اپنے دشمنوں سے بہتر شرائط کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ وہ ہمارے زخم دیکھ چکے ہیں۔ اگر انھیں جنگ کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو وہ ان شرائط پر بھی صلح کے لیے آمادگی ظاہر نہ کرتے۔ آج زمانے کی گردش نے گیدڑوں کو شیر اور گدھوں کو عقاب بنا دیا ہے۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ المناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انگریز مسلمانوں کی عزّت اور ناموس کے سب سے بڑے محافظ سے یہ مُطالبہ کر رہے ہیں کہ تم اپنے دو بیٹوں کو یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے کر دو"۔

منیرہ نے آبدیدہ ہو کر کہا "لیکن بھائی جان یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سلطان ٹیپو اپنے بیٹوں کو انگریز کے حوالے کر دے"۔

مراد علی نے جواب دیا "اس وقت سلطان معظم اپنے بیٹوں سے زیادہ اپنی رعایا کے متعلق سوچتے ہوں گے۔ اگر انھیں صلح کی صورت میں میسُور کا کوئی فائدہ نظر آیا تو وہ ایک باپ کی محبت کو ایک حکمران کے فرائض پر اثر انداز نہیں ہونے دیں گے"۔

دلاور خاں ایک سکتے کے عالم میں کچھ دیر مراد علی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا اور غضبناک لہجے میں چلّانے لگا "نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میسور کے سپاہی کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ ان کے شہزادے دشمن کے حوالے کر دیے جائیں۔ میسور کی رعایا کے لیے ایسی ذلّت موت سے بدتر ہوگی۔ جب ایسا وقت آئے گا تو وہ میسُور کے شہزادوں کے راستے میں لاشوں کا ڈھیر لگانے کے لیے تیار ہو جائیں گے"۔

مُراد علی نے کہا "چچا آپ آرام سے پڑے رہیں۔ سلطان معظم کو اپنی رعایا کی وفاداری اور اپنے سپاہیوں کی ہمّت و شجاعت کے متعلق کوئی شبہ نہیں"۔

دلاور خاں کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اچانک شدید کھانسی کے باعث اس کے مُنہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ دو تین منٹ کھانسنے کے بعد اس نے نڈھال سا ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور مراد علی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیا۔ تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی بالآخر مراد علی نے اپنی ماں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "امّی جان آپ جا کر آرام کریں میں یہاں بیٹھتا ہُوں"۔

دلاور خاں نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور مراد علی کی طرف متوجہ ہو کر نحیف آواز میں کہا: "آپ کو میرے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ آپ گھر جا کر کھانا کھائیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی تک شاید بی بی جی اور منیرہ نے بھی کھانا نہیں کھایا"۔

مراد علی نے تھوڑی دیر تذبذب کے بعد اُٹھتے ہوئے کہا: "بہت اچھا میں ابھی آتا ہوں۔ منوّر تم چچا کے پاس رہو اور کریم خاں کو بھی یہاں بلا لو"۔

دلاور خاں نے کہا "نہیں جی کریم خاں کی یہاں ضرورت نہیں۔ وہ بہت بے وقوف ہے"۔

"کیوں چچا کیا کیا اس نے؟"

"جی اسے بار بار نبض ٹٹولنے کا شوق ہے اور مجھے اس کی تیمارداری سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جب صابر بیمار ہُوا تھا تو وہ یہ کہا کرتا تھا کہ میرا باپ اسی بیماری سے مرا تھا۔ اور اب میں بیمار ہوا ہوں تو وہ یہ کہتا ہے کہ میری ماں کو بالکل یہی بیماری تھی۔ شہر میں کوئی بے وقوف پنساری اس کا دوست ہے اور اس نے اسے چند بُوٹیوں کے نام بتا دیے ہیں۔ اب یہ ہر روز کسی درخت یا جھاڑی کے پتے توڑ کر میرے پاس لے آتا ہے اور مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں حکیم صاحب کی دوائی کھانے کی بجائے اس کا نسخہ استعمال کروں"۔

منیرہ نے فکرمند سی ہو کر کہا "آپ نے اس کی دی ہُوئی کوئی دوائی کھائی تو نہیں؟"

"نہیں جی میں کوئی بے وقوف تھوڑا ہوں"۔

مُراد علی نے منوّر سے کہا "تم ان کا خیال رکھو اور کریم خاں سے کہو انھیں پریشان نہ کرے۔ میں ابھی آتا ہُوں۔ آئیے امّی جان!"

فرحت اور منیرہ اٹھیں اور مراد علی کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

○

۲۶ر فروری کی دوپہر سلطان ٹیپو کے دو کمسن بیٹے شہزادہ عبدالخالق اور شہزادہ معزالدین قلعے سے باہر نکلے اور سجے ہُوئے ہاتھیوں پر سوار ہو گئے۔ ان کے آگے چند آدمی نیزے اور جھنڈے اٹھائے ہُوئے تھے۔ پیچھے دو اور ہاتھیوں پر سلطان کے وکیل غلام علی اور رضا علی سوار تھے۔ ہاتھیوں کے پیچھے قریباً دو سو سوار اور پیادہ سپاہی تھے۔ دروازے کے سامنے کشادہ میدان میں ہزاروں انسان اپنے حکمران کے بیٹوں کو الوداع کہنے کے لیے جمع ہو چکے تھے۔ سلطان ٹیپو فصیل کے ایک بُرج سے یہ دلگداز منظر دیکھ رہا تھا۔ شہزادہ عبدالخالق کی عمر آٹھ سال اور معزالدین ابھی پانچ سال کا تھا۔ قلعے کی توپوں نے سلامی دی اور یہ قافلہ روانہ ہُوا۔ قلعے کی فصیل سے یہ منظر دیکھنے والے سپاہیوں اور دروازے کے سامنے کھڑے ہونے والے لوگوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز نہ تھیں۔ لیکن سلطان کے چہرے پر ایک غایت درجے کا سکون تھا۔ ایک افسر نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا "عالی جاہ! ڈھونڈیا واغ آپ سے ملاقات کی اجازت چاہتا ہے"۔

"ڈھونڈیا واغ! وہ کہاں ہے؟"

"عالی جاہ! وہ ابھی پہنچا ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی لیکن وہ مُصر ہے"۔

"بلاؤ اُسے!"

افسر سلام کر کے نیچے اُتر گیا اور تھوڑی دیر بعد ڈھونڈیا واغ سیڑھیوں سے نمودار ہُوا۔ اس

نے آگے بڑھ کر سلطان کے پاؤں چھونے کی کوشش کی لیکن سلطان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا: "مجھے تمھارے آداب پسند نہیں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ڈھونڈیا واغ نے آبدیدہ ہو کر کہا: "عالی جاہ! میں یہ التجا لے کر آیا ہوں کہ آپ شہزادوں کو دشمن کے حوالے نہ کریں۔"

سلطان نے جواب دیا: "اب ان باتوں کا وقت گزر چکا ہے۔"

"لیکن عالیجاہ! صلح کے متعلق دشمن کی نیت نیک نہیں۔ میں کل سے دشمن کے پڑاؤ کا چکر لگا رہا تھا اور میں نے اپنے کانوں سے کئی مرتبہ مرہٹہ سرداروں کو باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ شہزادوں کو قیدی بنا کر آپ سے بدترین شرائط منوانا چاہتے ہیں۔"

سلطان نے کہا: "ڈھونڈیا واغ! ایک سپاہی کی زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب اسے لڑنے کی بجائے اپنی تلوار نیام میں ڈالنے کے لیے زیادہ ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمھیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میرے دشمن کون ہیں اور ان کے عزائم کیسے ہیں۔ میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اور عالیجاہ! یہ جانتے ہوئے بھی آپ اپنے بیٹوں کو ان کے حوالے کر رہے ہیں؟"

"میری جنگ اپنے بیٹوں کے لیے نہیں میسور کے لیے تھی اور اب میسور کے حالات کا تقاضا ہے کہ میں اپنی تلوار نیام میں ڈال لوں۔ موجودہ حالات میں میں اپنی رعایا سے مزید قربانیوں کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ تم کاویری کے پار ہماری ان بستیوں کا حال دیکھ چکے ہو جو دشمن کے ہاتھوں تباہ ہو چکی ہیں۔ اور میں تمھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میری بے بس رعایا کو امن کی ضرورت ہے۔ میں نے یہ جنگ شروع نہیں کی تھی۔ تم جانتے ہو کہ میں میسور کو اس جنگ کی آگ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کر چکا ہوں۔ اب اگر دشمن نے کسی وجہ سے صلح کے لیے آمادگی ظاہر کی ہے تو میں مستقبل کی اُمید پر حال کی تلخیاں برداشت کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔"

ڈھونڈیا واغ نے کہا: "عالی جاہ! مجھے اپنی کمتری کا اعتراف ہے۔ میں وہ باتیں نہیں سوچ سکتا جو میرے بادشاہ کے ذہن میں آ سکتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کا فیصلہ اٹل ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں شرافت اور انسانیت کے ان دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کروں گا جن کے باعث ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ میں مرتے دم تک یہ نہیں بھولوں گا کہ میرے آقا کے بیٹے میری آنکھوں کے سامنے قیدی بنائے گئے تھے۔ میں انگریزوں کو معاف کر سکتا ہوں کیونکہ میسور کے حریت پسندوں کے ساتھ ان کی دشمنی کی وجہ میری سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن میں نظام اور مرہٹوں کو کبھی معاف نہیں کروں گا جو ان چوروں اور ڈاکوؤں کو ہمارے گھروں تک لے آئے ہیں۔"

"ڈھونڈیا واغ! اب تمھیں صبر سے کام لینا چاہیے۔ میں تمھیں خبردار کرتا ہوں کہ جب تک ان کی طرف سے متارکۂ جنگ کی شرائط کی خلاف ورزی نہیں ہو گی میں میسور کی حدود کے اندر تمھیں کسی ایسے اقدام کی اجازت نہیں دوں گا جو ہمارے درمیان وجہِ نزاع بن جائے۔"

ڈھونڈیا واغ نے جواب دیا: "عالیجاہ! خدا نے آپ کو ایک بادشاہ کا دل دیا ہے اور آپ صبر سے کام لے سکتے ہیں لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔"

سلطان نے قدرے تلخ ہو کر کہا: "ڈھونڈیا واغ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں عالیجاہ! میں آپ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں اور مجھے میسور کی حدود کے اندر دم مارنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ لیکن میسور کی حدود سے باہر آپ میرے کسی فعل کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ مجھے اجازت دیجیے!"

"تم جا سکتے ہو۔" سلطان نے غصے کی حالت میں یہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔

○

اتحادی صلح کی شرائط کی تفصیلات طے کرنے سے پہلے سلطان سے تاوانِ جنگ کا پہلی قسط وصول کرنے پر مُصر تھے۔ لیکن ایک طویل جنگ کے اخراجات کے باعث سلطان

کے بیت المال میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی مطلوبہ رقم پوری کرنے کے لیے روپیہ نہ تھا اور انگریز اسے چند دن کی مہلت دینے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ سلطان نے شاہی محل سے سونے اور چاندی کے برتن اور قیمتی جواہرات جمع کیے۔ شاہی خاندان کی خواتین نے بھی اپنے تمام زیورات اُتار کر اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔ تاوان کی رقم جمع کرنے میں سرنگا پٹم کے تجارت پیشہ لوگوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ لوگ رضا کارانہ طور پر سلطان کی خدمت میں پیش ہوتے اور حسبِ توفیق روپوں کی تھیلیاں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے۔ سرنگا پٹم کی با اثر خواتین بھی اس مہم میں حصہ لے رہی تھیں۔ وہ لوگوں کے گھروں میں جاتیں اور اپنی بہنوں سے چندے کے لیے اپیل کرتیں۔ مطلوبہ رقم ادا کرنے کے متعلق اپنے حکمران کا وعدہ پورا کرنا ہر امیر اور غریب کے لیے ایک قومی مسئلہ بن چکا تھا اور ہندوستان کی تاریخ میں راعی اور رعیت کا یہ تعلق ایک نئی چیز تھی۔

ایک صبح چار کہار ایک خوبصورت پالکی اٹھائے شاہی محل کے دروازے کے سامنے نمودار ہوئے۔ پہریداروں نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ایک فوجی افسر ڈیوڑھی سے نمودار ہوا اور اس نے پالکی کے قریب پہنچ کر کہاروں سے سوال کیا "اس پالکی پر کون ہے؟"

ایک کہار نے جواب دیا "جناب اس پالکی پر انور علی کی والدہ ہیں"۔

"انھیں اندر لے چلو!" افسر یہ کہہ کر ان کے آگے چل پڑا اور کہار اس کے پیچھے ہو لیے۔ دُوسری ڈیوڑھی کے قریب رُک کر افسر نے کہاروں کی طرف دیکھا اور کہا "تم یہاں ٹھہرو۔ میں داروغہ صاحب کو اطلاع دیتا ہوں"۔

کہاروں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندر چلا گیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد محل کا داروغہ ڈیوڑھی سے نمودار ہوا اور اس نے پالکی کے قریب آکر کہا "محترمہ آپ معظم علی کی بیوہ ہیں؟"

"جی ہاں"۔

"تشریف لائیے سلطان معظم آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔

فرحت برقع اوڑھے پالکی سے باہر نکلی اور داروغہ کے پیچھے چل دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک طویل اور کشادہ برآمدے سے گزرنے کے بعد ایک کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ داروغہ نے کہا۔ "آپ یہاں ٹھہریے سلطان معظم ابھی تشریف لاتے ہیں"۔

داروغہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ فرحت نے برقعے سے اپنا ہاتھ نکال کر چاندی کی ایک چھوٹی سی صندوقچی اور مخمل کی ایک تھیلی ایک کرسی پر رکھ دی اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ کشادہ کمرہ بیش قیمت قالینوں اور آبنوس کی کرسیوں سے آراستہ تھا۔ کوئی دس منٹ بعد فرحت کے بائیں ہاتھ ایک دروازہ کھلا اور سلطان ٹیپو برابر کے کمرے سے نمودار ہوا۔ فرحت اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

سلطان نے آگے بڑھ کر کہا "آپ معظم علی کی بیوہ ہیں؟"

"جی ہاں!"

"تشریف رکھیے!"

فرحت بیٹھ گئی۔

سلطان نے قدرے توقف کے بعد کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ میں بہت مصروف تھا۔ مجھے آپ کا خط ملا تھا۔ اگر آپ انور علی کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہیں تو آپ کو اتنی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔ آپ نے مراد علی کو بھیج دیا ہوتا۔ معظم علی کا بیٹا میرے لیے اجنبی نہیں۔ میں انور علی کے متعلق یہ اطمینان کر چکا ہوں کہ شموگہ کے قریب ایک لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا اور مرہٹوں نے اسے قیدی بنا کر نرگنڈ بھیج دیا ہے۔ اب چند دن تک جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہو گا تو ان شاء اللہ آپ کے پاس پہنچ جائے گا"۔

فرحت دوسری کرسی سے چاندی کی صندوقچی پکڑ کر اٹھی اور بولی "عالی جاہ! میں انور علی کے متعلق پوچھنے کے لیے نہیں آئی۔ اس کے متعلق چتل دُرگ کے قلعہ دار کا خط میری تسلی کے لیے

کافی تھا۔ میں ایک اور کام سے آئی ہوں۔ یہ لیجیے اس صندوقچی میں میرے چند زیورات کے علاوہ وُہ ہیرے ہیں جو آج سے بتّیس سال قبل نواب سراج الدولہ نے اپنے ایک وفادار سپاہی کی خدمت کے صلے میں دیے تھے۔ یہ سپاہی میرے شوہر کا باپ تھا جو پلاسی کی جنگ میں زخمی ہونے کے بعد جانکنی کی حالت میں مُرشد آباد پہنچا تھا۔ موجودہ حالات میں جب کہ آپ کو ایک ایک کوڑی کی ضرورت ہے میں ان ہیروں کا اس سے بہتر مصرف نہیں سوچ سکتی۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ سرنگا پٹم آنے سے قبل ہم چند ہیرے اپنے ذاتی مصرف میں لا چکے تھے۔"

سلطان نے قدرے توقّف کے بعد کہا: "میں آپ کا شکر گزار ہوں، لیکن میں اپنی ایک بہن کا تحفہ قبول نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ معظّم علی کا خاندان میسور کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کریگا۔ لیکن جس ضرورت کے لیے میں نے اپنی رعایا کی مالی اعانت قبول کی تھی وہ پوری ہو چکی ہے۔ انشاءاللہ کل تک دشمن کو تاوان کی رقم ادا کر دی جائے گی۔"

"عالیجاہ! مجھے مرتے دم تک اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں نے ایک فرض سے کوتاہی کی ہے۔"

"میری بہن آپ کا شوہر اور آپ کے دو بیٹے میرے جھنڈے تلے شہید ہو چکے ہیں اور میرے نزدیک ان کا خون رُوئے زمین کے تمام خزانوں سے قیمتی ہے۔"

فرحت نے بددل سی ہو کر چاندی کی صندوقچی دوبارہ کرسی پر رکھ دی اور مخمل کی تھیلی اٹھاتے ہوئے کہا: "عالیجاہ! پرسوں ہمارا ایک نوکر وفات پا گیا تھا۔ اس تھیلی میں اس کی عمر بھر کی کمائی ہے۔ مرتے وقت اس نے یہ میرے سپرد کی تھی اور میں نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی طرف سے یہ نذرانہ پیش کروں گی۔"

"اُس کا کوئی وارث نہیں؟"

"نہیں عالیجاہ!"

سُلطان نے آگے بڑھ کر فرحت کے ہاتھ سے تھیلی پکڑ لی اور اپنے ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا: "تھوڑی دیر پہلے میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرا خزانہ خالی ہو چکا ہے۔ لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اس حالت میں بھی رُوئے زمین کا امیر ترین آدمی ہوں۔ آپ کے نوکر کا کیا نام تھا؟"

"دلاور خاں۔" فرحت نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد فرحت اپنے گھر کا رُخ کر رہی تھی۔

○

اتّحادیوں نے معاہدۂ جنگ کے ابتدائی شرائط نامہ میں سلطان سے ان اضلاع کا مطالبہ کیا تھا جو پیشوا اور نظام کی سلطنتوں اور کمپنی کے مقبوضات سے ملحق تھے۔ لیکن سُلطان کے بیٹوں کو حراست میں لینے اور مطلوبہ رقم وصول کرنے کے بعد وہ اپنی اپنی خواہشات کے مطابق ان شرائط کی تاویلیں کر رہے تھے۔ سلطان ٹیپو بارہ محل، ڈنڈیگل کے اضلاع اور مالابار کے بیشتر علاقے انگریزوں کے حوالے کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن کارنوالس کورگ کے علاوہ بلاری، گوٹی اور سیلم کے ان علاقہ جات پر بھی اپنا حق جتا رہا تھا جو اتحادی مقبوضات کی کسی سرحد سے ملحق نہ تھے۔ انگریزوں کا مقصد مالِ غنیمت حاصل کرنے کے علاوہ مستقبل کے لیے سلطان کی دفاعی قوت کو زیادہ سے زیادہ مضمحل کرنا تھا۔ کورگ کا علاقہ مالابار کے ساحل اور سرنگا پٹم کے درمیان ایک اہم ترین حدِّ فاصل کا کام دیتا تھا اور یہاں فوجی اڈے قائم کرنے کے بعد انگریز سرنگا پٹم کے لیے ایک دائمی خطرہ بن سکتے تھے۔ کورگ کمپنی کے کسی علاقے سے ملحق نہ تھا اور ابتدائی شرائط کے متعلق بحث و تمحیص کے دوران میں اس کا ذکر تک نہیں آیا تھا۔ لیکن اب سلطان کے وکلا کے اعتراضات کے جواب میں لارڈ کارنوالس کے نمائندے بھیڑیے کی روایتی منطق سے کام لے رہے تھے۔ ان کے نزدیک ملحقہ علاقوں سے مُراد صرف وہ علاقے نہ تھے جن کی سرحدیں اتحادیوں کے

مقبوضات سے ملتی تھیں۔ بلکہ وہ علاقے تھے جن کی سرحدیں اتحادیوں کے مقبوضات سے زیادہ دور نہ تھیں۔ سرجان کینیا وے جسے لارڈ کارنوالس کی طرف سے معاہدے کی شرائط طے کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اس غیر منصفانہ مطالبے کے جواز میں دوسری دلیل یہ پیش کرتا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کورگ کے متعلق اس کے سابق راجہ کے ساتھ ایک علیحدہ معاہدہ کر چکی ہے۔

چند دن کی بے نتیجہ بحث و تمحیص کے بعد سلطان اور اتحادیوں کے درمیان مصالحت کی بات چیت ٹوٹ گئی اور لارڈ کارنوالس نے سلطان پر دباؤ ڈالنے کے لیے دوبارہ سرنگاپٹم کا محاصرہ جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اتحادی افواج کی نقل و حرکت کے ساتھ ہی سرنگاپٹم میں یہ خبر سنی گئی کہ شہزادہ عبدالخالق اور معز الدین کو مدراس کی طرف روانہ کیا جا رہا ہے اور شہزادوں کے ساتھ جو دوسرے سپاہی اور افسر بھیجے گئے تھے انھیں غیر مسلح کر کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں بھیج دیا گیا ہے۔

لارڈ کارنوالس کی یہ حرکت متارکۂ جنگ کی شرائط کی صریح خلاف ورزی تھی۔ اس نے سلطان ٹیپو کو اس امر کا یقین دلایا تھا کہ صلح کی بات چیت ٹوٹ جانے کی صورت میں شہزادوں کو واپس بھیج دیا جائے گا اور تاوان کا ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ بھی لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن اتحادیوں کی نیت بدل چکی تھی اور انھیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ شہزادوں کو قیدی بنا کر سلطان سے ہر مطالبہ منوا سکتے ہیں۔ چنانچہ دوبارہ جنگ شروع کرنے کے متعلق اپنی دھمکیوں کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے اتحادیوں نے دریائے کاویری کے آر پار لوٹ مار شروع کر دی۔ ایک دو دن میں انگریزوں کی ایک فوج نے کاویری کے جنوب میں کئی بستیاں تباہ کر ڈالیں۔ انگریزوں کی ایک اور فوج نے لال باغ کے خوبصورت چمن ویران کرنے کے بعد شہر گنجام کی گلیوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ نظام کے ایک لشکر نے گرم کنڈہ کے آس پاس حملے شروع کر دیے اور مرہٹوں کی افواج نے کاویری کے شمال کی طرف تباہی مچا دی۔

ان حالات میں سلطان کے لیے لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مارچ کے دوسرے ہفتے میں

سلطان کے سپاہی دن رات قلعے کے دفاعی استحکامات مضبوط کرنے میں مصروف تھے۔ قلعے سے باہر جزیرے کے مختلف مقامات پر انگریز اپنی بھاری توپیں نصب کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دونوں فریق قریباً یکساں طور پر اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ کسی طرح یہ جنگ ٹل جائے۔ اتحادیوں کو اپنے سپاہیوں کی تعداد اور جنگی سامان کی برتری کے باوجود اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر سلطان ڈٹ گیا تو وہ کسی صورت برسات سے پہلے سرنگاپٹم کا قلعہ فتح نہیں کر سکیں گے اور برسات کے موسم میں سرنگاپٹم سے باہر سلطان کی رہی سہی فوج کے لیے ان کے رسد اور کمک کے راستے کاٹنا مشکل نہیں ہو گا۔ فتح کے لیے انھیں لاتعداد قربانیاں دینی پڑیں گی اور شکست کی صورت میں انھیں عبرتناک تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دوسری طرف سلطان ٹیپو یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ تنہا ایک لامتناہی عرصہ کے لیے مرہٹوں، نظام اور انگریزوں کی لاتعداد فوج کے ساتھ جنگ جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے دشمن کی بدعہدی کو اشتعال انگیزی کے باوجود اس کا رویہ انتہائی مصالحانہ تھا۔

پھر ایک دن اچانک بدنور سے میر قمر الدین خاں کی ایک ڈویژن فوج سامانِ رسد کی ایک بھاری مقدار کے ساتھ سرنگاپٹم پہنچ گئی اور مار دھاڑ کرتی ہوئی قلعے کے اندر داخل ہو گئی۔ میر قمر الدین خاں کی آمد سے چند گھنٹے بعد اتحادی افواج کے رہنما لارڈ کارنوالس کے خیمے میں جمع ہو کر ایک دوسرے کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ اب حالات بدل چکے ہیں اور اب ہمیں سنجیدگی کے ساتھ صلح کے متعلق سلطان کی پیش کش پر غور کرنا چاہیے۔ چنانچہ ۱۸ مارچ کو لارڈ کارنوالس کی دعوت پر سلطان کے وکیل اس کے کیمپ میں پہنچے اور کارنوالس نے ان کے ساتھ ایک طویل بحث کے بعد صلح کے شرائط نامے کا نیا مسودہ تیار کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ صلح کے معاہدے میں جو ترمیمیں کی گئی تھیں وہ ہری پنت اور نظام کے سپہ سالار سکندر جاہ کے نزدیک تسلی بخش نہ تھیں۔ مرہٹہ سلطنت کی حدود دریائے کرشنا تک بڑھا دی گئی تھیں۔ نظام کو کڑپہ، کانڈی کوٹ اور گمیم کے علاوہ دریائے کرشنا اور زیریں تنگ بھدرہ

کے درمیان بعض اضلاع دے دیے گئے تھے۔ سلطنتِ خداداد کی بندر بانٹ میں انگریزوں نے اپنے لیے سب سے بڑا نوالہ رکھا تھا۔ انھوں نے ڈنڈیگل اور بارہ محل کے اضلاع کے علاوہ مالابار کا بیشتر ساحلی علاقہ اور کالی کٹ اور کنانور کی بندرگاہیں سلطان سے ہتھیا لی تھیں۔ کورگ پر قبضہ جمانے کے متعلق بھی اپنا مطالبہ منوا لیا تھا۔ چند متنازعہ فیہ علاقوں پر انھوں نے سلطان کا حق تسلیم کر لیا تھا۔

معاہدے کی شرائط کو اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سُود مند بنانے کے لیے انگریز سُلطان کے ساتھ جس فریب کاری اور بد عہدی کے مرتکب ہوئے تھے وہ ان کے سابقہ سیاسی کردار کے عین مطابق تھی۔ لیکن سلطان کی طرح اپنے حلیفوں کے ساتھ بھی انھوں نے کوئی نیک سلوک نہ کیا۔ اگر نظام اور مرہٹے چند علاقے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تو اس کی وجہ انگریزوں کی دوست نوازی نہ تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی وقت بھی سلطان کے ساتھ مل کر کے انگریزوں کے لیے خطرہ پیدا کر سکتے تھے۔ بلکہ ان دو بڑی طاقتوں کی عدم جانب داری بھی انگریزوں کے لیے تباہی کا سامان پیدا کر سکتی تھی۔ اس لیے لارڈ کارنوالس ان کی طرف چند ہڈیاں پھینکنے پر مجبور تھا۔

لیکن ٹراونکور کا راجہ جس کی اعانت کے بہانے انگریزوں نے یہ جنگ شروع کی تھی، ایک کمزور اور بے بس حلیف کی حیثیت میں لارڈ کارنوالس کے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں بن سکتا تھا اس لیے اُسے مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت صاف طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ اُس نے پہلے انگریزوں کی شہ پر سلطان کے ساتھ جنگ کی ابتدا کی تھی اور شدید نقصانات اٹھائے تھے۔ اس کے بعد اُس نے انگریزوں کی اعانت کے عوض انھیں پچیس لاکھ روپیہ ادا کیا تھا۔ پھر جب سلطان کے ساتھ انگریزوں کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی تو اس نے اپنے تمام فوجی اور اقتصادی وسائل ان کی نذر کر دیے۔ لیکن جنگ سے فارغ ہونے کے بعد انگریزوں نے اپنے اس بے وقوف، بے بس اور کمزور دوست کو مالِ غنیمت میں حصہ دار بنانے کی بجائے اس کے بعض

علاقے چھین کر راجہ کوچین کے حوالے کر دیے۔

اس جنگ میں انگریز اور ان کے حلیف اگرچہ سُلطان کو پوری طرح مغلوب نہ کر سکے، تاہم وہ میسور کے اقتصادی اور فوجی وسائل پر ایک کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ مالابار کے گرم مصالحے کی تجارت سلطان کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا اور اب اس کا بیشتر حصہ انگریزوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ بارہ محل اور کورگ پر قبضہ جمانے کے بعد انگریزوں کے لیے مشرق اور مغرب کے اطراف سے میسور پر یلغار کرنا بہت آسان ہو گیا تھا۔ ڈنڈیگل اور دریائے کرشنا اور تنگ بھدرہ کے درمیان سُلطان اپنے زرخیز ترین علاقوں سے محروم ہو چکا تھا۔ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ جنگ ایک اور جنگ کے لیے انگریزوں اور ان کے ہندوستانی حلیفوں کا راستہ صاف کر چکی تھی۔

بیسواں باب

مارچ کے آخر میں جنگی قیدیوں کا تبادلہ اور اتحادی افواج کا انخلا شروع ہو چکا تھا۔ محاصرے کے دوران میں نظام، مرہٹہ اور کمپنی کے عساکر کے کیمپوں میں طرح طرح کی بیماریاں پھیل چکی تھیں اور ان کے لیے زخمیوں کے علاوہ سینکڑوں مریضوں کو نکالنے کا مسئلہ پریشان کن بن چکا تھا۔ اس مرحلہ پر سلطان نے انسانیت دوستی کا ایک اور ثبوت دیا اور دشمن کے زخمی اور بیمار آدمیوں کے لیے ڈولیاں اور کہار بھیج دیے۔

ایک دن علی الصباح ہری پنت ایک کشادہ خیمے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک پہرے دار اندر داخل ہوا اور اُس نے کہا "مہاراج میسور کی فوج کا ایک افسر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے"۔

"اسے لے آؤ"۔

پہرے دار باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد سید غفار خیمے میں داخل ہوا اور اس نے آداب بجا لانے کے بعد کہا "جناب مجھے سلطان معظم نے بھیجا ہے اور وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو وہ پورے دس بجے یہاں پہنچ جائیں گے"۔

"سلطان ٹیپو مجھے ملنے کے لیے آ رہے ہیں؟" ہری پنت نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں، انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ آپ کل جا رہے ہیں"۔

ہری پنت نے قدرے توقف کے بعد کہا "مجھے افسوس ہے کہ اس ملاقات کے لیے پہل میری طرف سے نہیں ہوئی۔ بہرحال میں ان کا شکرگزار ہوں۔ آپ انھیں پیغام دیں کہ میں ان کی راہ دیکھ رہا ہوں"۔

سید غفار سلام کر کے باہر نکل گیا۔ خیمے سے تھوڑی دور اس کے پانچ ساتھی گھوڑوں کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ سید غفار نے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر ایڑ لگا دی اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔

تھوڑی بعد ہری پنت کی فوج کے چیدہ چیدہ سردار اور سپاہی اس کے خیمے سے باہر صفیں مرتب کر رہے تھے۔ دس بجے سلطان ٹیپو سواروں کے ایک دستے کے ہمراہ مرہٹہ فوج کے کیمپ میں داخل ہوا۔ سپاہیوں کی صفوں کے قریب پہنچ کر سلطان اپنے گھوڑے سے اترا۔ مرہٹہ سپاہیوں نے اسے سلامی دی۔ پھر ہری پنت نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور وہ خوبصورت قالینوں پر سے گزرتا ہوا خیمے کے اندر داخل ہوا۔

"عالی جاہ! تشریف رکھیے"۔ ہری پنت نے ایک مرصع کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میرا توپ خانہ کل یہاں سے روانہ ہو چکا ہے اور میں آپ کو سلامی دینے کا انتظام نہیں کر سکا"۔

سلطان نے کہا "میں اپنی ذاتی حیثیت میں آپ کے پاس آیا ہوں اس لیے رسومات کی ضرورت نہ تھی۔ آپ تشریف رکھیے میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں"۔

ہری پنت دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور سلطان نے قدرے توقف کے بعد کہا "اب ہماری جنگ ختم ہو چکی ہے اور میں اس کی تلخیوں کا ذکر کرنے میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اب آپ کو سرنگاپٹم کی طرف دیکھنے کی بجائے انگریزوں کے عزائم کے متعلق خبردار رہنا چاہیے۔ میرا خاندان تقریباً تیس سال سے جنوبی ہند میں انگریزوں کی جارحیت کا

سیلاب روکے ہوئے ہے اور اس عرصہ میں ہم نے اس سیلاب کے راستے میں جو دیواریں کھڑی کی تھیں وہ بہت حد تک منہدم ہو چکی ہیں۔ لیکن میں آپ کو اس حقیقت سے خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ جب سرنگاپٹم کی آزادی کے پرچم سرنگوں ہو جائیں گے تو آپ یا نظام الملک پونا اور حیدرآباد کے راستے میں کوئی اور ناقابلِ تسخیر دیوار کھڑی نہیں کر سکیں گے۔ میں کارنوالس کی ان مجبوریوں سے واقف ہوں جن کے باعث اس نے جنگ کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن مجھے اس کی نیت کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔ اسے نئی جنگ کے لیے تیاری کی ضرورت ہے اور جب اس کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو اسے دوبارہ جنگ شروع کرنے کے لیے کوئی بہانہ تلاش کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اس وقت سرنگاپٹم کا معاہدہ منگلور کے معاہدے سے زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوگا۔ لیکن آپ کو اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ انگریز دلی تک اپنے جھنڈے گاڑنا چاہتے ہیں اور سرنگاپٹم، پونا، حیدرآباد، اندور اور گوالیار وغیرہ ان کے راستے کی مختلف منزلیں ہیں۔ بنگال کی طرف سے انگریز لکھنؤ تک پہنچ چکے ہیں۔ اب یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ جنوب میں میسور کی رہی سہی قوتِ مدافعت کچلنے کے بعد انھیں اپنے راستے کی باقی منازل طے کرنے میں کتنی دیر لگے گی۔ کاش! آپ مرہٹہ قوم کے اکابر کو میرا یہ پیغام پہنچا سکتے کہ ہم سب کی آزادی پورے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ مشروط ہے۔"

ہری پنت نے مغموم لہجے میں جواب دیا: "مہاراج! اب ہمیں انگریزوں کی نیت کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔ ہم نے اس جنگ میں ندامت کے سوا کچھ نہیں حاصل کیا۔ دوسروں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے آپ مجھے اپنا دشمن نہیں پائیں گے۔ کاش ہم لوگ ہلکر کے مشورے پر عمل کرتے۔ میں ان جنگوں کے متعلق ہمیشہ ایک سپاہی کے ذہن سے سوچنے کا عادی تھا۔ لیکن جب آپ کے کمسن بیٹے انگریزوں کے کیمپ میں لائے گئے تھے میں وہاں موجود تھا اور مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا تھا کہ ہندوستان کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے میرا بھی ان کے ساتھ

کوئی رشتہ ہے۔ اس وقت انگریزوں کی مسکراہٹیں میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھیں۔"

سلطان نے کہا: "آپ کو میرے بیٹوں کے متعلق پریشان ہونے کی بجائے میسور کے ان ہزاروں بیٹیوں کے متعلق سوچنا چاہیے تھا جو وطن کی آزادی کے لیے اپنا خون پیش کر چکے ہیں۔ آپ کو بنگال کے نواب سراج الدولہ، بنارس کے چیت سنگھ، روہیل کھنڈ کے حافظ رحمت خاں اور اودھ کی ان بیگمات کے متعلق سوچنا چاہیے تھا جنھوں نے انگریزوں کی بدعہدی اور مکاری کے اس سے زیادہ جانگداز مناظر دیکھے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد ہری پنت کے ساتھ سلطان کی ملاقات ختم ہوئی اور ہری پنت نے خیمے سے باہر نکل کر سلطان کو رخصت کیا۔ سلطان کے جاتے ہی مرہٹہ فوج کے بڑے بڑے سردار ہری پنت کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ ایک برہمن نے کہا: "مہاراج دیکھ لیا آپ نے میسور کا بادشاہ خود آپ کے پاس آیا تھا۔ اگر آپ چند دن اور لڑائی جاری رکھتے تو وہ پیدل چل کر آپ کے پاس آتا۔"

ہری پنت نے برہم ہو کر کہا: "تم بے وقوف ہو۔ ہم سلطان ٹیپو کو شکست دے سکتے ہیں، اس کی سلطنت پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کی عظمت نہیں چھین سکتے۔"

○

جنگ ختم ہوئے پانچ مہینے گزر چکے تھے۔ سلطان صلح کے معاہدے کے فوراً بعد تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر چکا تھا۔ لیکن پرسں رام بھاؤ جس نے سرنگاپٹم سے واپسی پر اپنے راستے کی کئی بستیوں کو تباہ و ویران کر دیا تھا۔ ابھی تک میسور کے ان قیدیوں کو واپس کرنے میں لیت و لعل سے کام لے رہا تھا جو سرنگاپٹم کے محاصرے سے قبل نرگند بھیجے جا چکے تھے۔ ہری پنت نے پونا پہنچ کر متعدد بار پرسں رام کی سینہ زوری کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن اس کو نانا فرنویس کی تائید حاصل تھی اور پیشوا کے دربار میں ہری پنت کی چیخ پکار بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ لیکن ماہ اگست کے

آخر میں سندھیا، جو پیشوا کے بعد مرہٹوں پر سب سے زیادہ اثر و رسوخ کا مالک تھا، پونا پہنچا اور اس کی کوششوں سے پونا کی حکومت کے طرزِ عمل میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہونے لگی۔

جنگ کے بعد فرحت پر اپنے بیٹے کی جُدائی کے اثرات ظاہر ہو رہے تھے۔ مسلسل بے چینی اور بے خوابی کے باعث اس کی صحت آئے دن بگڑتی جا رہی تھی۔ پھر جب چند ماہ بعد شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ پرسس رام نے جنگی قیدیوں کو قتل کر دیا ہے تو فرحت کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ ایک دن وہ شدید بخار کی حالت میں پڑی ہوئی تھی اور منیرہ اور مُراد علی اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ سنتری خاں کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے منیرہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"بی بی جی ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" منیرہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"بی بی جی وہ آپ کے ملک کا آدمی معلوم ہوتا ہے لیکن مَیں نے اُسے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ایک فرانسیسی افسر اس کے ساتھ آیا تھا اور اسے دیوان خانے میں بٹھا کر واپس چلا گیا ہے۔ وہ کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ فرانسیسی افسر نے جاتے وقت اسے بڑے ادب سے سلام کیا تھا۔"

"وہ کون ہو سکتا ہے؟" منیرہ نے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں مُراد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں دیکھتا ہُوں۔" مراد علی یہ کہہ کر اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور منیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بہن اس کا نام جولین ہے۔"

"جولین!" منیرہ نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی تم ڈر کیوں گئی، جولین کون ہے؟" فرحت نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"امّی جان وہ لیگرانڈ کا بہنوئی ہے۔"

فرحت نے مراد علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بیٹا جاؤ اسے اندر لے آؤ اور نچلی منزل کے کمرے میں بٹھا دو۔"

"نہیں امّی جان میں وہیں جاتی ہُوں، بھائی جان آپ امّی جان کے پاس رہیں۔"

منیرہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دیوان خانے کے ایک کمرے میں جولین کے سامنے کھڑی تھی اور جولین شکایت کے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "جین مجھے سرنگاپٹم پہنچنے سے پہلے لیگرانڈ کی موت کے متعلق کوئی علم نہ تھا، کاش تم نے ہمیں اطلاع دی ہوتی۔"

منیرہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کر رہی تھی۔ جولین نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ایک کُرسی پر بٹھا دیا اور کہا۔ "اب تمھارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں، تم جلد از جلد سفر کی تیاری کرو۔"

"نہیں جولین مَیں ابھی سرنگاپٹم نہیں چھوڑ سکتی۔"

جولین بددل سا ہو کر اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر سر جُھکا کر سوچنے کے بعد بولا۔ "میں یہاں پہنچتے ہی جن فرانسیسی افسروں سے ملا ہوں انھوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہ لوگ بہت رحم دل ہیں اور تمھارے ساتھ ان کا سلوک بہت اچھا ہے۔ لیکن تم ان کے پاس ساری عمر جلاوطنی کی زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ مَیں جانتا ہُوں کہ تمھارے دل پر ابھی تک پیرس کے المناک حادثات کی یاد تازہ ہے۔ لیکن اب فرانس کے حالات بدل چکے ہیں۔ وہ بھیانک رات جس کی تاریکیوں سے پناہ لینے کے لیے تم وہاں سے نکلی تھیں اب گزر چکی ہے اب تمھیں اپنے وطن میں ایک نئی روشنی دکھائی دے گی۔"

منیرہ نے کہا۔ "میرے لیے موجودہ حالات میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں مجھے سوچنے کے لیے وقت کی ضرورت ہے۔"

جولین نے کہا۔ "مَیں نے یہ نہیں کہا کہ ہم آج ہی واپس جا رہے ہیں۔ میری چھُٹی کے ابھی تین مہینے باقی ہیں اور مَیں چند ہفتے یہاں گزار سکتا ہُوں۔ تمھیں سوچنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔"

منیرہ نے کہا: "جولین! اس گھر کی معزز خاتون مجھے اپنی بیٹی سمجھتی ہے۔ وہ ان دنوں سخت بیمار ہے اور اس کا ایک بیٹا ابھی تک مرہٹوں کی قید میں ہے۔ ان حالات میں اگر میں فرانس جانے کا ارادہ کروں تو بھی میرے لیے سرنگاپٹم چھوڑنا بہت مشکل ہوگا۔ ممکن ہے کہ چند دن تک حالات بدل جائیں۔ ان کی صحت ٹھیک ہو جائے اور ان کا بیٹا گھر واپس آجائے اور پھر میں یہاں رہنے کے متعلق اپنا ارادہ بدل دوں۔ لیکن جب تک مجھے یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ یہاں اب میری ضرورت باقی نہیں رہی میں اپنے وطن جانا پسند نہیں کروں گی۔ میں ان لوگوں کے احسانات نہیں بھول سکتی۔ انھوں نے ہمیں اس وقت سہارا دیا تھا جب خدا کی زمین ہمارے لیے تنگ ہو چکی تھی۔ میں نے اس گھر میں اس وقت قدم رکھا تھا جب اس کا ہر گوشہ مسرت کے قہقہوں سے آباد تھا اور اس کے در و دیوار پر تاریک سائے دیکھ کر میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گی۔"

جولین کچھ دیر سر جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے منیرہ کے چہرے پر آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا: "میں ان لوگوں کے متعلق کیپٹن فرانسسک سے بہت کچھ سن چکا تھا اور یہاں پہنچتے ہی میں اپنے جن ہم وطنوں سے ملا ہوں انھوں نے بھی میری معلومات میں کافی اضافہ کیا ہے۔ جین سچ بتاؤ تمھارے یہاں ٹھہرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ تم اپنے دل پر ان لوگوں کے احسانات کا بوجھ محسوس کرتی ہو؟"

"کیا یہ وجہ کافی نہیں؟"

"نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں اور انھوں نے تم پر بہت احسان کیے ہوں گے۔ لیکن تمھارے ساری عمر یہاں ٹھہرنے کے لیے یہ وجہ کافی نہیں۔ جین بُرا نہ ماننا فرانسیسی کیمپ سے میں اس نوجوان کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں جو ان دنوں مرہٹوں کی قید میں ہے۔"

ایک ثانیہ کے لیے منیرہ کی آنکھوں کے سامنے انور علی کی تصویر آگئی۔ اس نے ایک

جھرجھری لی اور آبدیدہ ہو کر جولین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ نہیں جین میں صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ تم نے اس سے کوئی غلط توقع وابستہ نہ کی ہو۔ ایک فرانسیسی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید تم ــــــــ!" جولین نے اپنا فقرہ پورا کرنے کی بجائے منیرہ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

منیرہ جلدی سے اٹھی۔ لیکن دروازے کی طرف چند قدم اٹھانے کے بعد رک گئی۔

جولین نے کہا: "جین جین! ٹھہرو میں نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تم اس سے محبت کرتی ہو۔ تم اس نوجوان سے محبت کرتی ہو جس کی دنیا تمھاری دنیا سے مختلف ہے۔"

منیرہ چند ثانیے دم بخود کھڑی رہی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اچانک ایک ایسی حقیقت کے چہرے کا نقاب اُٹھ چکا تھا جو بیک وقت دلکش بھی تھی اور بھیانک بھی اور ایک ایسے طوفان کے بند ٹوٹ چکے تھے جسے وہ ایک مدت سے اپنے سینے کی گہرائیوں میں دبائے ہوئے تھی۔ اس نے مڑ کر جولین کی طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "ہاں جولین، میں اس سے محبت کرتی ہوں لیکن میں نے اس سے کوئی توقع وابستہ نہیں کی۔"

جولین نے قدرے نرم ہو کر کہا: "نادان لڑکی بیٹھ جاؤ۔ تم اپنے سوا کسی اور کو دھوکا نہیں دے سکتیں۔"

منیرہ نڈھال سی ہو کر بیٹھ گئی اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر ایک بچے کی طرح سسکیاں لینے لگی۔ جولین نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے متعلق تمھارے احساسات سے بے خبر نہیں ہوگا۔"

منیرہ نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں روکتے ہوئے جواب دیا: "اسے میرے متعلق کچھ معلوم نہیں اور میں کبھی یہ گوارا نہیں کروں گی کہ اسے میرے احساسات کا علم ہو۔"

"اور اس کے باوجود تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟"

"ہاں!" میرہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"فرض کرو کہ اگر وہ میری موجودگی میں یہاں پہنچ جائے اور پھر تمھیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی دنیا میں تمھارے لیے کوئی جگہ نہیں تو تم اس صورت میں بھی میرے ساتھ جانا پسند نہیں کرو گی؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"فرانسسک نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے ساتھ تمھاری پہلی ملاقات پانڈی چری میں ہوئی تھی۔"

"ہاں!"

"اور پھر تم نے وہاں سے سرنگا پٹم تک اس کے ساتھ سفر کیا تھا؟"

میرہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے۔ اس کے ساتھ سفر کے دوران میں یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ کسی دن میری توجہ کا مرکز بن جائے گا۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس وقت تمھیں اپنے احساسات کا صحیح علم نہ ہو اور یہ تلخ حقیقت تم نے لیگرانڈ کی بیوی بننے کے بعد محسوس کی ہو کہ تمھاری زندگی میں کوئی خلا باقی رہ گیا ہے؟"

میرہ نے کرب انگیز لہجے میں کہا: "آپ مجھے جی بھر کر کوس سکتے ہیں لیکن میں آپ کو یہ کہنے کی اجازت نہیں دوں گی کہ مجھے اپنے شوہر سے محبت نہیں تھی۔"

جولین نے کہا: "جین میرا مقصد تمھاری توہین کرنا نہیں۔ میری نگاہوں میں تم ایک فرشتہ ہو لیکن میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ محبت اور رحم میں بہت فرق ہے۔ تمھیں ایک سے محبت تھی اور دوسرے پر رحم آتا تھا۔ پھر تمھارا رحم تمھاری محبت پر غالب آیا اور تم نے لیگرانڈ سے شادی کر لی۔"

میرہ نے کہا: "یہ بات شاید آپ کی سمجھ میں نہ آسکے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں ایک

بے وفا بیوی نہ تھی۔"

"تمھیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں جین۔ میں جانتا ہوں تم جیسی رحم دل لڑکی بے وفا نہیں ہو سکتی۔ اور یہ تمام باتیں میں نے تمھارا دل دکھانے کے لیے نہیں کیں۔ میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ یہاں رہنے کے متعلق تمھارے اصرار کی اصل وجہ کیا ہے اور اب میں مطمئن ہوں۔ اب اگر تم چاہو بھی تو میں تمھیں اپنے ساتھ لے جانا پسند نہیں کروں گا۔ لیگرانڈ کی روح کے لیے اس سے بڑا اطمینان اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد تم اس دنیا میں تنہا نہیں ہو۔ ایک افسر نے میرے ساتھ گفتگو کے دوران میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ اب مرہٹے جنگی قیدیوں کو رہا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ خدا کرے وہ میری موجودگی میں یہاں پہنچ جائے اور میں تمھاری تمام الجھنیں دور کر سکوں۔ ورنہ میں اپنے بھتیجے کا کام کسی اور کے سپرد کر جاؤں گا۔ اب مجھے اجازت دو!"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں فرانسیسی کیمپ میں قیام کروں گا۔"

"آپ یہاں کیوں نہیں ٹھہرتے؟"

"نہیں میرا وہیں ٹھہرنا مناسب ہے۔ وہاں مجھے لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے کی آزادی ہو گی۔ ایک فرانسیسی افسر میرا بچپن کا دوست نکل آیا ہے اور اس نے میرے لیے میسور میں روزگار کا بندوبست کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن میں اپنے قیام کے دوران میں برابر تم سے ملتا رہوں گا۔"

میرہ نے کہا: "میں نے ابھی تک آپ کی بیوی کے متعلق کچھ نہیں پوچھا، وہ کیسی ہے؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے اور اب دو بچیوں کی ماں بن چکی ہے۔"

"آپ اب تک مرشیس میں ہیں؟"

"ہاں، لیکن میرا خیال ہے کہ میری رخصت ختم ہونے پر مجھے فرانس بلا لیا جائے گا۔"

"آپ کا عہدہ کیا ہے؟"

"میں کرنل بن چکا ہوں؟" جولین یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

لیکن منیرہ نے کہا۔ "ٹھہریے میں مراد علی کو بھیجتی ہوں وہ آپ کو کیمپ تک پہنچا آئے گا۔"

"نہیں نہیں اُسے تکلیف دینے کی ضرورت نہیں مجھے راستہ معلوم ہے۔"

منیرہ جولین کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی اور ڈیوڑھی کے دروازے کے قریب اُسے رُخصت کرنے کے بعد رہائشی مکان کی طرف چل پڑی۔

○

تھوڑی دیر بعد وہ فرحت کے کمرے میں داخل ہوئی۔ فرحت نے اس کے پاؤں کی آہٹ پا کر آنکھیں کھولیں اور منیرہ کچھ کہے بغیر اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔

فرحت نے کہا۔ "بیٹی کیا بات ہے تم بہت پریشان معلوم ہوتی ہے۔ ریگنالڈ کا بھتیجا کوئی بُری خبر لے کر تو نہیں آیا؟"

منیرہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں امّی جان وہ کوئی بُری خبر نہیں لایا۔"

فرحت مراد علی کی طرف متوجہ ہوئی۔ "بیٹا تم جا کر مہمان کے پاس بیٹھو۔"

منیرہ نے کہا۔ "امّی جان وہ چلا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں فرانسیسی کیمپ میں کسی دوست کے پاس رہوں گا۔"

"بیٹی وہ تمہارا مہمان تھا اور تمھیں اسے یہاں ٹھہرانا چاہیے تھا۔"

"امّی جان وہ اپنے کسی دوست کے پاس ٹھہرنے کا وعدہ کر چکا تھا اور میں نے آپ کی علالت کے پیشِ نظر یہاں ٹھہرانے پر اصرار نہیں کیا۔"

فرحت نے مُراد علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "بیٹا تم جا کر اپنے بھائی کا پتہ کرو، شاید

فوج کے دفتر میں کوئی اطلاع آئی ہو۔"

"بہت اچھا امّی جان!" مراد علی یہ کہہ کر اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

فرحت قدرے توقف کے بعد منیرہ سے مخاطب ہوئی۔ "بیٹی سچ کہو ریگنالڈ کا بھتیجا تمھاری کسی بات سے خفا ہو کر تو نہیں چلا گیا؟"

"نہیں امّی جان۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ یہاں قیام کے دوران میں میرے پاس آتا رہے گا۔"

فرحت نے کہا۔ "بیٹی مجھے ڈر ہے کہ وہ تمھیں اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہے گا۔"

"امّی جان میں اس کے ساتھ جانے سے انکار کر چکی ہوں۔"

ایک ثانیے کے لیے فرحت کے نحیف اور لاغر چہرے پر کچھ تازگی آگئی اور اُس نے کہا۔ "بیٹی ابھی تھوڑی دیر پہلے جب تم نیچے گئی تھیں تو میں یہ سوچ رہی تھی کہ میرے دل میں کتنی باتیں ہیں جو ابھی تک میں نے تم سے نہیں کہیں۔ میرا ایک بیٹا مسعود علی اننت پور کے قلعے کی حفاظت کرتا ہوا شہید ہو گیا تھا اور اس کا بڑا بھائی صدیق علی ان جنگی قیدیوں کے ساتھ تھا جنھیں انگریزوں نے اس قلعے کی فصیل کے ساتھ کھڑا کر کے گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ صدیق علی کی شہادت کا انتہائی دردناک پہلو یہ تھا کہ ایک جوان اور حسین لڑکی اسے بچانے کے لیے انگریز سپاہیوں کی بندوقوں کے سامنے آگئی تھی اور اُس نے گولی کھانے کے بعد میرے بیٹے کی لاش سے لپٹ کر جان دی تھی۔ ان کی لاشیں اننت پور کے قلعے کے پاس ایک ہی گڑھے میں دفن ہیں۔ مجھے انتہائی جستجو کے باوجود ان سوالات کا تسلی بخش جواب نہ مل سکا کہ وہ لڑکی کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور وہ ایک دوسرے کو کب سے جانتے تھے؟ اس کی خیالی تصویریں میری نگاہوں کے سامنے رہا کرتی تھیں۔ میرے دل میں اس کے لیے وہی محبت تھی جو ایک ماں کے دل میں اپنی بیٹی کے لیے ہو سکتی ہے۔ میں تصور میں اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی، اس کے بال سنوارا کرتی تھی۔ پھر جب تم ہمارے گھر آئیں تو میں یہ

محسوس کرتی تھی کہ قدرت نے میری بے بسی پر رحم کھا کر مجھے ایک جیتی جاگتی بیٹی عطا کر دی ہے اور میں اس لڑکی کے حصّے کی تمام محبّت اور شفقت تمھیں دینا چاہتی تھی۔"

فرحت یہاں تک کہہ کر رُک گئی اور کچھ دیر منیرہ کی طرف دیکھنے کے بعد بولی: "مجھے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا وقت قریب آ چکا ہے اور شاید قدرت مجھے اپنی زندگی کا اہم فریضہ پُورا کرنے کی مہلت نہ دے۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ انور علی کے متعلق تمھارے خیالات کیا ہیں۔ لیکن میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو تم اس کا انتظار کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤ گی۔ میرے بعد اس گھر کو تمھاری ضرورت رہے گی۔"

منیرہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہُوئے کہا: "امی جان اگر اس گھر میں میری ضرورت نہ ہو تو بھی میں خوشی کے ساتھ اسے چھوڑنا پسند نہ کروں گی۔"

"بیٹی میں یہ چاہتی ہُوں کہ تم انور علی کے ساتھ شادی کر لو۔"

منیرہ نے کچھ کہنے کی بجائے اپنا سر جُھکا لیا۔

فرحت بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اُس نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہُوئے کہا: "منیرہ یہاں آؤ!"

منیرہ آگے بڑھی اور فرحت نے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ وہ دیر تک اس کے سُنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ منیرہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خادمہ نے دروازے سے جھانکتے ہُوئے کہا: "بی بی جی آپ کے لیے دُودھ لے آؤں؟"

"نہیں ابھی مجھے بھوک نہیں۔ تم قلم دوات اور کاغذ لے آؤ میں کچھ لکھنا چاہتی ہُوں۔"

خادمہ واپس چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اس نے لکھنے کا سامان لا کر فرحت کے قریب ایک تپائی پر رکھ دیا۔

"آپ کیا لکھنا چاہتی ہیں امّی جان؟" منیرہ نے پُوچھا۔

"میں ایک ضروری خط لکھنا چاہتی ہُوں۔"

"آپ کو تکلیف ہو گی مجھے لکھوا دیجیے یا تھوڑی دیر مُراد علی کا انتظار کر لیجیے۔"

"نہیں میں خود لکھوں گی۔"

مُنیرہ اُٹھ کر کُرسی پر بیٹھ گئی اور فرحت خط لکھنے میں مصروف ہو گئی۔ اُس نے چند سطور لکھنے کے بعد ایک کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا اور پھر دُوسرے کاغذ پر لکھنے لگی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد اس نے لکھا ہُوا کاغذ تہ کیا اور منیرہ کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا: "بیٹی اگر انور علی میرے بعد گھر آئے تو اُسے یہ خط دے دینا۔"

منیرہ نے کہا: "خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ جب وہ آئیں گے تو آپ ان کے استقبال کے لیے نیچے کھڑی ہوں گی۔"

فرحت نے بستر پر لیٹتے ہُوئے جواب دیا: "بیٹی میری عمر کے انسان کو ہر وقت اس دنیا سے کُوچ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

○

اگلے دن فرحت کی حالت زیادہ تشویشناک ہو گئی اور وہ چار روز موت و حیات کی کشمکش میں مُبتلا رہی۔ پانچویں روز آدھی رات کے وقت مراد علی اس کے قریب بیٹھا ہُوا تھا اور خادمہ جس نے کئی دن بے آرامی کی حالت میں گزارے تھے، فرحت کے بستر کے دُوسری طرف قالین پر پڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ فرحت نے مُراد علی کی طرف دیکھتے ہُوئے خفیف آواز میں کہا۔

"بیٹا جاؤ تم آرام کرو۔ میری فکر نہ کرو میں اب بالکل ٹھیک ہُوں۔"

مُراد علی نے جواب دیا: "امّی جان میں دن کے وقت کافی سو لیا تھا۔"

"نہیں بیٹا جاؤ تمھاری آنکھیں نیند سے سُرخ ہو رہی ہیں۔"

منیرہ آنکھیں ملتی ہُوئی کمرے میں داخل ہُوئی اور اس نے کہا: "بھائی جان آپ جا کر آرام

کریں میں امّی جان کے پاس بیٹھتی ہُوں۔"

مراد علی نے کہا: "بہن آپ کو چند گھنٹے آرام کرنا چاہیے تھا۔"

"میری نیند پُوری ہو چکی ہے۔" منیرہ نے مُراد علی کے قریب دُوسری کُرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

فرحت نے کہا: "جاؤ بیٹا اب آرام کرو میری فکر نہ کرو۔"

مراد علی ماں کے پاس بیٹھنے پر بضد تھا۔ لیکن فرحت اور منیرہ کے اصرار پر وہ بادلِ ناخواستہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دو تین قدم اٹھانے کے بعد اس نے مُڑ کر منیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "بہن ایک گھنٹے کے بعد آپ امّی جان کو دوائی پلا دیں اور اگر ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے دیجیے۔"

"بیٹا تم جا کر اطمینان سے سو جاؤ اگر ضرورت پڑی تو میں خود بُلا لوں گی۔"

"بہت اچھا امّی جان!" مراد یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

پچھلے پہر مُراد علی اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ خادمہ چیختی چلاتی اس کے کمرے میں داخل ہُوئی۔ مُراد علی نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور ایک ثانیے کے لیے سکتے کی حالت میں خادمہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"مُراد مُراد!" خادمہ نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کرتے ہُوئے کہا: "بی بی جی فوت ہو گئی ہیں۔"

مُراد علی بستر سے اُٹھا اور بھاگتا ہُوا برابر کے کمرے میں داخل ہُوا۔ فرحت کے پُرسکون چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ منیرہ کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"امّی جان! امّی جان!" مراد علی فرحت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر کرب انگیز آواز میں چلّایا۔ پھر اس نے منیرہ کا بازو جھنجھوڑ کر اسے اپنی طرف متوجّہ کیا۔ منیرہ نے ایک کپکپی لی اور اپنی نگاہیں

مراد علی کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ آن کی آن میں اس کی خوبصورت نیلی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اس نے مڑ کر فرحت کی طرف دیکھا اور سسکیاں لیتی ہُوئی اس کی لاش سے لپٹ گئی۔

مراد علی کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پھر خادمہ کی طرف جو اب دروازے کے قریب کھڑی تھی متوجّہ ہُوا: "کاش تم نے مجھے پہلے جگا دیا ہوتا!"

خادمہ نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "جی مَیں سو رہی تھی اور جب مَیں منیرہ کی چیخ سن کر بیدار ہُوئی تو بی بی جی کا دم نکل چکا تھا۔"

منیرہ نے گردن اٹھا کر دوبارہ مراد علی کی طرف دیکھا اور لرزتی ہُوئی آواز میں کہا: "بھائی جان آخری وقت تک انھوں نے مجھے اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ ان کا وقت قریب آچکا ہے۔ مَیں یہ سمجھتی رہی کہ ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ انھوں نے میرے ساتھ باتیں کرتے کرتے اچانک آنکھیں بند کر لیں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ انھیں نیند آگئی ہے۔"

○

فرحت کی وفات سے تین ہفتے بعد ایک دن منیرہ پڑوس کی چند عورتوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی ہُوئی تھی۔ خادمہ کمرے میں داخل ہُوئی اور اس نے کہا: "بی بی جی آپ کو مراد علی صاحب بلاتے ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟" منیرہ نے اُٹھ کر سوال کیا۔

"جی وہ برآمدے میں کھڑے ہیں۔"

منیرہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھی۔ مُراد سپاہیانہ لباس پہنے کھڑا تھا منیرہ نے سوال کیا: "آپ اتنی جلدی واپس آگئے۔ کیسے اُن کے متعلق کوئی پتہ چلا؟"

مُراد علی نے جواب دیا: "فوجدار نے اس خبر کی تصدیق کی ہے کہ مرہٹوں نے زگنڈ اور دوسرے

مقامات سے تمام قیدی رہا کر دیے ہیں۔ آج صبح فوج کے چند افسر راستے میں ان کا استقبال کرنے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کی اجازت مانگی تھی لیکن مجھے ایک اور ذمّہ داری سونپ دی گئی ہے۔"

"کیسی ذمّہ داری؟"

"سلطانِ معظّم تاوان کی دوسری قسط سے انگریزوں کے حصّے کا روپیہ دے کر ہمیں مدراس بھیج رہے ہیں۔"

"آپ کب جا رہے ہیں؟" منیرہ نے سوال کیا۔

"ہمیں ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں سے کوچ کا حکم مل چکا ہے۔ میں آپ کے متعلق بہت پریشان ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ میری واپسی تک بھائی جان یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں مدراس جانے پر خوش نہ تھا لیکن جب فوجدار صاحب نے مجھے یہ بتایا کہ سلطانِ معظم نے اس ذمہ داری کے لیے فوج کے بڑے بڑے افسروں کے مقابلے میں میرا نام پسند فرمایا ہے تو میں انکار نہ کر سکا۔ میں نے جولین کا پتہ کیا ہے وہ ابھی تک سکار سے واپس نہیں آیا۔ شاید دو ایک دن تک یہاں پہنچ جائے۔"

منیرہ نے کہا: "آپ کو یقین ہے کہ انور علی رہا ہونے والے قیدیوں کے ساتھ آئیں گے؟"

مراد علی نے جواب دیا: "ابھی تک رہا ہونے والے قیدیوں کے ناموں کی فہرست یہاں نہیں پہنچی۔ لیکن یہ بات بہرحال یقینی ہے کہ مرہٹوں نے تمام قیدیوں کو رہا کیا ہے اور بھائی جان ان کے ساتھ ہیں۔ سرِدست ہمارے پاس دُعاؤں کے سوا کچھ نہیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے اگر آپ تنہائی محسوس کریں تو پڑوس کی کسی عورت کو اپنے پاس بُلا لیں۔ خُدا حافظ!"

منیرہ نے ڈوبتی ہُوئی آواز میں خدا حافظ کہا اور مُراد علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہُوا باہر نکل گیا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ منوّر خاں منیرہ کے کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے اطلاع دی کہ موسیو جولین آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

"انھیں یہیں لے آؤ!"

منوّر بھاگتا ہُوا باہر نکل گیا اور چند منٹ بعد جولین کمرے میں داخل ہُوا۔

اس نے منیرہ کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہُوئے کہا: "جین میں آج ہی واپس آیا ہوں۔ اور یہاں پہنچتے ہی مجھے مراد علی کی ماں کی موت کی خبر ملی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جو دوسروں کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھتے ہیں۔ کیمپ میں یہ خبر مشہور ہے کہ مرہٹوں نے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا ہے۔ لیکن انور علی کے متعلق مجھے کوئی تسلّی بخش معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ ——— جین میں پُورے خلوص کے ساتھ یہ دُعا کرتا ہُوں کہ وہ واپس آ جائے۔ لیکن موجُودہ حالات میں تمھیں اچھی یا بُری ہر طرح کی خبر کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں مرہٹوں کی وحشت اور بربریّت کے متعلق بہت کچھ سُن چکا ہُوں۔ فرض کرو اگر انور علی کے متعلق کوئی اچھی خبر نہ آئی تو سرنگاپٹم میں تمھارا مستقبل کیا ہوگا؟"

منیرہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہُوئے کہا: "خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے۔"

جولین نے شفقت آمیز لہجے میں کہا: "میں تمھارا دشمن نہیں ہُوں۔ جین میں صرف یہ چاہتا ہُوں کہ تم حقیقت پسندی کا ثبوت دو۔ انور علی کے بغیر تمھارے لیے یہ ملک سپنوں کی جنّت نہیں ہوگا۔ میں تمھارے ساتھ وعدہ کرتا ہُوں کہ میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک مجھے اس کے متعلق پوری تسلّی نہیں ہو جاتی۔ رہا ہونے والے قیدی چند دن تک یہاں پہنچ جائیں گے اور اگر ضرورت پڑی تو میں مزید رخصت کے لیے درخواست بھیج دوں گا۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ان حالات میں تمھیں یہاں چھوڑ جاؤں۔"

منیرہ نے کہا: "جولین میں ناشکر گزار نہیں ہُوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم میری بہتری کے

لیے یہ باتیں کہہ رہے ہو لیکن میں بے بس ہوں۔ اس گھر کے در و دیوار میری زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ اب میں جیتے سر نگاہم نہیں چھوڑ سکتی۔ جب آپ نے پہلی بار اس موضوع پر گفتگو کی تھی اس وقت انور علی کی والدہ زندہ تھیں اور میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر انور علی نے واپس آکر مجھ پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس کی دُنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو شاید میرا غرور مجھے یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ دے لیکن اب انور علی کی والدہ فوت ہو چکی ہیں اور میرے دل میں غرور کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔"

"تمھیں اس بات کی پروا نہیں ہوگی کہ اس گھر میں تمھارا مقام کیا ہے؟"

میرہ نے جواب دیا۔ "ہاں اب مجھے ایک خادمہ کی حیثیت میں بھی یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور اگر انور علی واپس نہ آیا تو میں یہ سمجھوں گی کہ مراد علی کو اپنی ماں کی موت کے بعد ایک بہن کی ضرورت ہے۔"

جولین کرسی سے اُٹھ کر تھوڑی دیر کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر اچانک میرہ کے قریب رُک کر بولا۔ "جین مجھے معلوم نہ تھا کہ میسور کی آب و ہوا نے ایک فرانسیسی لڑکی کے دل و دماغ میں اتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اب آئندہ میں تمھارے ساتھ اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کروں گا۔ لیکن میں تم سے صرف ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر یہاں کے حالات کسی دن تمھیں اپنے خیالات بدلنے پر مجبور کر دیں تو تم مراد علی کی طرح مجھے بھی اپنا بھائی سمجھو گی۔"

میرہ نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو اس وقت بھی اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔"

"تو پھر میرے ساتھ یہ وعدہ کرو کہ اگر کسی دن تمھیں اپنے وطن کی یاد ستانے لگے تو تم مجھے ضرور اطلاع دو گی۔ میں تمھارا خط ملتے ہی یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں اور میں یہ چاہتی ہوں کہ جب تک آپ یہاں ہیں کسی اور کے پاس ٹھہرنے کی بجائے ہمارے پاس ٹھہریں۔ اس مکان کی نچلی منزل کے تمام کمرے آپ

کے لیے خالی کر دیے جائیں گے۔"

جولین نے جواب دیا۔ "نہیں مجھے شکار پر روانہ ہونے سے پہلے ہی یہ حکم مل گیا تھا کہ واپسی پر مجھے شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا جائے گا۔ آپ کے پاس آتے وقت میں نے اپنا سامان سرکاری مہمان خانے میں بھجوا دیا تھا۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ انور علی اگر چند دن تک یہاں پہنچ گیا تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گا۔"

اکّیسواں باب

رات کے وقت فضا میں کچھ حبس تھا اور منیرہ بالائی منزل کی چھت پر ایک برساتی کے نیچے سو رہی تھی۔ آدھی رات کے قریب مُوسلا دھار بارش شروع ہوئی اور ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ پانی کے چھینٹوں نے اسے گہری نیند سے بیدار کر دیا۔ وہ بستر سے اٹھی اور برساتی سے نکل کر زینے کی طرف بڑھی۔ گھُپ اندھیرے میں پھُونک پھُونک کر قدم رکھتے ہوئے وہ مکان کی دوسری منزل میں داخل ہوئی اور ہاتھوں سے اپنا راستہ ٹٹولتی ہوئی ایک کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ اچانک اسے نچلی منزل سے کوئی آواز سنائی دی اور وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ چند ثانیے بعد وہ پریشانی اور اضطراب کی حالت میں زینے کے راستے نچلی منزل کا رُخ کر رہی تھی۔

برآمدے کے قریب پہنچ کر اسے چند قدم دور ایک کمرے کے کھُلے دروازے سے روشنی دکھائی دی اور وہ کچھ دیر آگے بڑھنے یا واپس مُڑنے کا فیصلہ نہ کر سکی۔ پھر اسے کریم خان کی آواز سُنائی دی۔ "منوّر تم جا کر خادمہ کو جگاؤ اور اسے کہو فوراً کھانا تیار کرے ——"! کسی نے مانوس اور دلکش آواز میں جواب دیا۔ "نہیں نہیں خادمہ کو جگانے کی ضرورت نہیں! میں راستے میں کھانا کھا چکا ہوں۔" اور منیرہ کی کائنات زندگی کے دلکش نغموں سے لبریز ہو گئی۔ وہ بولنا چاہتی تھی

لیکن اس کے حلق میں آواز نہ تھی۔ وہ بھاگ کر کمرے میں داخل ہونا چاہتی تھی لیکن اس میں پاؤں اٹھانے کی سکت نہ تھی۔ برآمدے کی تاریکی اور کمرے کی روشنی کے درمیان چند قدم کا فاصلہ اسے ایک پہاڑ نظر آتا تھا۔ کمرے سے منوّر خاں کی آواز سنائی دی۔ "جناب چھوٹی بی بی جی اُوپر برساتی کے نیچے سو رہی ہیں انھیں جگا دوں؟"

"نہیں! انھیں اس وقت بے آرام کرنے کی ضرورت نہیں تم جاؤ۔"

منیرہ کا دل مسرت کی دھڑکنوں کی بجائے شکایات سے لبریز ہو گیا۔ منوّر اور کریم خاں کمرے سے باہر نکلے اور وہ دیوار کے ساتھ سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ جب وہ صحن میں روپوش ہو گئے تو وہ جھجک جھجک کر قدم اٹھاتی ہُوئی کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ ہر لحظہ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھا وہ کچھ سوچ کر آگے بڑھنے کی بجائے ایک طرف ہٹ گئی اور پھر دروازے پر دستک دینے لگی۔

"کون ہے؟" انور علی نے کہا۔

"میں اندر آ سکتی ہوں؟" منیرہ نے دہلیز پر پاؤں رکھ کر اندر جھانکتے ہُوئے کہا۔

"مینی ——" انور علی چونک کر بستر سے اُٹھا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

منیرہ کمرے میں داخل ہُوئی۔ وہ چند ثانیے ایک دوسرے کے سامنے بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ بالآخر انور علی نے کُرسی اُٹھا کر اس کے قریب رکھ دی اور کہا۔ "مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ جاگ رہی ہیں۔ تشریف رکھیے۔"

منیرہ بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور اس کی نگاہیں انور علی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "آپ کب یہاں پہنچے؟"

"مجھے یہاں پہنچے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے —— امی جان کے متعلق مجھے راستے میں اطلاع مل گئی تھی۔"

"آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔"

"یہ مرہٹوں کی قید کا اثر ہے۔"

"آپ تھکے ہوئے ہیں بیٹھ جائیے۔"

انور علی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا

منیرہ نے کہا "مراد علی مدراس جا چکا ہے۔"

"ہاں مجھے نوکروں نے بتایا تھا۔"

"آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟"

"نہیں میں کھانا راستے میں کھا چکا ہوں۔"

"کاش آپ چند ہفتے پہلے آ جاتے! امی جان کو آخری وقت تک آپ کا انتظار تھا۔"

"یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ مرہٹوں کی قید سے رہا ہونے کے بعد میں نے راستے میں بہت کم آرام کیا ہے۔ میرے ساتھی ابھی کئی منازل دور ہیں۔ راستے میں یہ خیال کہ امی جان میری راہ دیکھ رہی ہیں، میرے لیے ایک بہت بڑا سہارا تھا اور مجھے تھکاوٹ کا احساس تک نہ تھا۔ لیکن کل جب ایک چوکی سے مجھے اطلاع ملی کہ امی جان فوت ہو چکی ہیں تو میری ہمت جواب دے گئی۔"

منیرہ نے قدرے توقف کے بعد کہا "یہ عجیب بات ہے، کہ قیدیوں کی رہائی کی خبر سننے کے بعد میں دن رات آپ کا انتظار کیا کرتی تھی۔ لیکن آج جب آپ کو یہاں آنا تھا تو میں شام ہوتے ہی سو گئی تھی۔"

انور علی نے کہا "میں نوکروں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے بیماری کے ایام میں امی جان کی بہت خدمت کی ہے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ منور کہہ رہا تھا کہ آپ کا کوئی رشتہ دار یہاں آیا ہوا ہے۔ کون ہے وہ؟"

"وہ فیگرانڈ کا بہنوئی جولین ہے۔"

"تو پھر اُسے یہاں ٹھہرنا چاہیے تھا؟"

"گھر میں امی جان بیمار تھیں اس لیے میں نے اسے یہاں ٹھہرنے پر مجبور نہ کیا۔ اب وہ شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہے۔"

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ انور علی کی گردن جھکی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے۔ منیرہ اچانک کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے کہا "آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"ٹھہریے میں آپ کو اوپر چھوڑ آتا ہوں۔" انور علی یہ کہہ کر اٹھا اور اس نے آگے بڑھ کر چراغ اٹھا لیا۔

وہ کمرے سے باہر نکلے۔ برآمدے میں داخل ہوتے ہی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ لیکن انور علی نے جلدی سے چراغ کے آگے ہاتھ تان کر اُسے بجھنے سے بچا لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک دوسرے سے کوئی بات کیے بغیر بالائی منزل کے ایک کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ انور علی نے اپنے دیے کی لَو سے کمرے کا چراغ روشن کر دیا۔ پھر وہ منیرہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا "اب آپ آرام کریں۔"

منیرہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ انور علی کا طرزِ عمل اس کے لیے ایک معمہ تھا۔ وہ جنت جو اُس نے انور علی کے ساتھ دوبارہ ملاقات کے تصورات سے آراستہ کی تھی چند منٹ کے اندر اندر ویران ہو چکی تھی۔ اس کی حالت اس انسان کی سی تھی جو لُٹے اور میٹھے پانی کے چشمے کے کنارے بیٹھ کر پیاسا واپس آ گیا ہو۔ چند منٹ قبل انور علی کے کمرے میں داخل ہوتے وقت اس کے سینے میں جو ولولے بیدار ہوئے تھے وہ اب سو چکے تھے۔ وہ نوجوان جسے اس نے پہلی بار پانڈی چری کی بندرگاہ پر دیکھا تھا بدل چکا تھا۔ اس کی رُوکھی پھیکی اور رسمی گفتگو اسے اپنے ساتھ قدرت کا بدترین مذاق محسوس ہوتی تھی۔ انور علی کمرے سے نکل گیا اور وہ نڈھال سی ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ انتہائی تھکن کے باوجود وہ انور علی کے طرزِ عمل کا جواز معلوم نہ کر سکی۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہی

تھی: "میں جانتی ہوں کہ تم نے مرہٹوں کی قید میں اَن گنت اذیتوں کا سامنا کیا ہوگا اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمھارے لیے اپنی ماں کی موت کا صدمہ ناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن کاش تم اتنا سمجھ سکتے کہ میں ہر مصیبت میں تمھاری حصہ دار تھی۔ جب تم جنگ کے میدان میں تھے تو میں تمھارے لیے دُعائیں کیا کرتی تھی۔ جب تم قید میں تھے تو میں تمھاری راہ دیکھا کرتی تھی اور تمھاری ماں کی موت کے بعد میں یہ محسوس کرتی تھی کہ اس دُنیا میں مجھ سے زیادہ بے بس اور بدنصیب کوئی نہیں۔ لیکن تم مجھ سے اتنا بھی نہ پُوچھ سکے کہ تنہائی اور بے بسی کے دن میں نے کس طرح گزارے ہیں۔"

○

منیرہ بستر پر لیٹ گئی اور دیر تک بے چینی کی حالت میں کروٹیں بدلنے کے بعد سو گئی۔ چند گھنٹے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو نماز کا وقت گزر چکا تھا۔ آسمان پر بادل چھٹ چکے تھے اور دریچے سے سُورج کی شعاعیں کمرے میں آ رہی تھیں۔ وہ بستر سے اُٹھ کر باہر نکلی اور ہاتھ مُنھ دھونے کے بعد واپس آ گئی۔ پھر اس نے صندوق کھول کر کپڑوں کا ایک جوڑا نکالا لیکن لباس تبدیل کرنے کی بجائے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ خادمہ نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا: "بی بی جی مبارک ہو، رات انور علی صاحب آ گئے ہیں۔ آج آپ بہت دیر سوتی رہیں۔ ناشتہ لے آؤں؟"

"اُنھوں نے ناشتہ کر لیا ہے؟"

"جی ہاں!"

"مجھے اس وقت بھوک نہیں تم نیچے جاؤ اور میرے پُرانے کپڑوں کا بکس اٹھا لاؤ!"

"چمڑے کا بکس؟"

"ہاں، انور علی صاحب کیا کر رہے ہیں؟"

"جی وہ تو ناشتہ کرتے ہی منوّر کے ساتھ اپنی والدہ کی قبر پر چلے گئے تھے۔ بہت کمزور ہو گئے ہیں وہ۔" خادمہ یہ کہہ کر واپس چلی گئی اور چند منٹ بعد ایک چمڑے کا بکس لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد منیرہ ہندوستانی لباس کی بجائے فرانسیسی لباس پہنے دریچے کے سامنے کھڑی باہر جھانک رہی تھی۔

انور علی نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا: "میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"آئیے یہ آپ کا گھر ہے!"

انور علی کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے کہا: "خادمہ کہتی ہے آج آپ نے ناشتہ نہیں کیا؟"

منیرہ اس سے اپنے لباس کی تبدیلی کے متعلق کچھ سُننا چاہتی تھی لیکن اسے مایوسی ہُوئی۔ اس نے جواب دیا: "مجھے بھوک نہیں۔"

انور علی نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "بیٹھ جاؤ میں تمھارے ساتھ چند باتیں کرنا چاہتا ہُوں۔"

وہ جھجکتی ہُوئی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ انور علی کچھ دیر گردن جھکائے سوچتا رہا بالآخر اس نے کہا: "میں صبح امّی جان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد سرکاری مہمان خانے چلا گیا تھا۔"

"آپ بوربین سے مل کر آئے ہیں؟"

"ہاں، اور وہ یہ کہتا ہے کہ میں ایک ہفتے تک یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ رات تم نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ تمھیں لینے آیا ہے۔"

منیرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ انور علی نے کہا: "منیرہ میرے لیے یہ بات کہنا آسان نہیں لیکن اس زندگی میں ہمیں کئی تلخیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔"

منیرہ نے کہا: "آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس کے ساتھ چلی جاؤں؟"

انور علی نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ وہ اضطراب کی حالت میں کرسی سے اٹھا اور تھوڑی دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد دریچے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

مینرہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

انور علی نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور مینرہ کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر کہا: "جین مجھے تمھارا مستقبل اپنی خواہشات سے زیادہ عزیز ہے۔"

وہ بولی: "موسیو میں یہاں رہ کر آپ کی پریشانیوں میں اضافہ نہیں کروں گی۔ مجھے صرف اس بات کا انتظار تھا کہ آپ یہاں آ کر مجھے یہ حکم سنائیں کہ اب اس گھر کے دروازے تمھارے لیے بند ہیں۔"

انور علی نے مڑ کر دیکھا۔ مینرہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور وہ بڑی مشکل سے ہونٹ بھینچ کر اپنی سسکیاں ضبط کر رہی تھی۔ اس نے کہا: "موسیو! جولین کو یہ پیغام بھیج دیجیے کہ میں تیار ہوں۔ اب اسے ایک ہفتہ اور یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔"

"جین یہ ایک مجبوری ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" مینرہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے کہا۔

"جولین ابھی یہاں آئے گا اور میں یہ کوشش کروں گا کہ وہ مراد علی کی واپسی تک ٹھہر جائے۔"

"نہیں نہیں!" مینرہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: "خدا کے لیے مجھے اس سے زیادہ سزا نہ دیجیے۔"

"سزا ——! تم کیا کہہ رہی ہو جین؟ کاش تمھیں معلوم ہوتا کہ تمھارے ساتھ اس گھر کی رہی سہی راحتیں بھی رخصت ہو جائیں گی۔"

وہ بولی: "میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اس گھر کو میری ضرورت نہیں۔"

انور علی نے دوبارہ منہ پھیر لیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "جین یہ باتیں میں تمھیں میسور کی

کسی بندرگاہ سے جہاز پر سوار کرتے وقت کہنا چاہتا تھا لیکن اب میں اس وقت کا انتظار نہیں کر سکتا۔ تمھیں میرے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے تمھیں پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب میسور کے آسمان کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں دو مصیبت زدہ انسانوں کو اپنی زندگی کی بے پایاں مسرتوں میں حصہ دار بنا سکتا ہوں۔ لیکن اب میرے سامنے بھیانک تاریکیاں ہیں۔ میں میسور کے مستقبل سے مایوس نہیں لیکن وہ سہانی صبح جس کی روشنی میں میں تمھیں زندگی کی حسین منازل دکھا سکتا تھا شاید بہت دور ہے۔"

مینرہ نے گردن اوپر اٹھائی اور پُر اُمید سی ہو کر انور علی کی طرف دیکھنے لگی۔

انور علی نے کہا: "ہمارے دشمن اس جنگ کے اختتام کے ساتھ ایک نئی جنگ کا بیج بو چکے ہیں اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اگر کسی دن اس وحشت و بربریت کا سیلاب، جس کے دلگداز مناظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں، ہمارے گھروں تک پہنچ گیا تو تمھارا انجام کیا ہوگا؟ میں نے گزشتہ جنگ کے دوران میں جیتے جاگتے انسانوں کی بستیوں کی جگہ راکھ کے ڈھیر دیکھے ہیں۔ میں نے اپنی قوم کے بیٹوں کی بے گور و کفن لاشیں دیکھی ہیں۔ میں تمھارے سامنے یہ بیان نہیں کر سکتا کہ ان بھیڑیوں نے میری قوم کی بیٹیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ جنگ میں زخمی ہونے کے بعد جب میں قیدیوں کے ساتھ ایک بستی سے گزر رہا تھا تو مجھے گلیوں میں مردوں کی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں اور مکانوں کے اندر مرہٹہ سپاہیوں کے قہقہے اور بے بس عورتوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں زخموں سے نڈھال ہونے کے باعث ایک بیل گاڑی پر لیٹا ہوا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ جین، وہ دردناک چیخیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کوئی نیا طوفان آنے سے پہلے اپنے وطن چلی جاؤ۔ اس لیے نہیں کہ اس گھر کو تمھاری ضرورت نہیں بلکہ اس لیے کہ فرانس میں تمھارا گھر اس گھر کی نسبت زیادہ محفوظ ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اگر تم یہاں رہنا پسند کرتی ہو تو میں دوبارہ اس موضوع پر گفتگو نہیں کروں گا۔"

منیرہ نے کہا: "آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ میں آپ کو ناراض کر کے یہاں رہ سکتی ہوں؟"

انور علی کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا: "جین اگر تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ تمھارے متعلق میرے احساسات کیا ہیں تو سنو۔ جب میں قید میں تھا اور مرہٹے مجھے ستانے کے لیے اس قسم کی خبریں سنایا کرتے تھے کہ اب ہم نے سرنگاپٹم کی مکمل ناکہ بندی کر لی ہے اور ہم چند دن کے اندر اندر میسور کے دارالحکومت پر اپنے جھنڈے گاڑ دیں گے، تو میں ایک دن یہ دعا کرتا تھا کہ کاش تم فرانس واپس جا چکی ہو اور دوسرے دن یہ دعا مانگتا تھا کہ کاش میں ایک بار پھر تمھیں دیکھ سکوں۔"

منیرہ کے چہرے سے حزن و ملال کے بادل چھٹ گئے اور اس نے کہا: "میں سمجھتی تھی کہ آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔"

"جین تمھارا یہ مطلب ہے کہ میں انسان نہیں ہوں۔ تمھاری محبت میری زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی۔ اور اس آزمائش کا دور اُس وقت شروع ہوا تھا جب میں نے پہلی بار تمھیں پانڈی چری کی بندرگاہ پر دیکھا تھا اور اس کا سب سے زیادہ صبر آزما مرحلہ وہ ہو گا جب میں میسور کے ساحل پر تمھیں خدا حافظ کہوں گا۔"

منیرہ نے کہا: "آپ کو اب بھی یہ خیال ہے کہ ہماری زندگی میں ایسا مرحلہ آ سکتا ہے؟"

انور علی نے کہا: "جین میری محبت مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں تمھیں اپنے آلام و مصائب میں حصہ دار بناؤں لیکن اگر تم ایک ایسے آدمی کو اپنے لیے کوئی سہارا سمجھ سکتی ہو جس کے راستے میں قدم قدم پر مصائب کے پہاڑ کھڑے ہیں تو مجھے ناشکر گزار نہیں پاؤ گی۔"

خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا: "بی بی جی! جولین صاحب تشریف لائے ہیں۔"

منیرہ نے انور علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو اسے یہیں بلا لیا جائے۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، وہ آپ کا رشتہ دار ہے؟"

منیرہ نے خادمہ سے کہا: "جاؤ انھیں اُوپر لے آؤ!"

خادمہ چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد جولین کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کہا: "جین میں تمھیں مبارکباد دیتا ہوں۔"

اُس نے جواب دیا: "موسیو میرا نام جین نہیں منیرہ ہے۔ میرا وطن فرانس نہیں میسور ہے۔ اور میں پیرس میں نہیں بلکہ سرنگاپٹم میں پیدا ہوئی ہوں۔"

جولین نے بدحواس ہو کر یکے بعد دیگرے منیرہ اور انور علی کی طرف دیکھا۔

منیرہ نے کہا: "موسیو حیران ہونے کی کوئی بات نہیں میں مسلمان ہو چکی ہوں۔"

"کب؟" جولین نے پوچھا۔

"بہت دیر کی بات ہے۔"

انور علی نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "لیکن مجھے یہ بات کسی نے نہیں بتائی۔"

"میں نے نوکروں کو منع کر رکھا تھا۔"

"لیکن کیوں؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

جولین نے مسکراتے ہوئے کہا: "موسیو مجھے آپ کی سادگی پر تعجب آتا ہے۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کی شادی کب ہو گی؟"

انور علی نے جواب دیا: "میرا خیال تھا کہ آپ جین سے فرانس کے سفر کے متعلق مشورہ کرنے آئے ہیں۔"

منیرہ نے کہا: "میں پھر احتجاج کرتی ہوں کہ میرا نام جین نہیں منیرہ ہے۔"

"بہت اچھا منیرہ آئندہ مجھ سے یہ غلطی نہیں ہو گی لیکن آپ نے موسیو جولین کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ یہ پوچھ رہے ہیں کہ ہماری شادی کب ہو گی؟"

منیرہ کرسی سے اُٹھی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی: "اس سوال کے جواب کے

لیے موسیو جولین کو کچھ دن انتظار کرنا پڑے گا۔"

جولین نے کہا: "ٹھہرو تم کہاں جا رہی ہو؟ میں ایک مہینہ انتظار کر سکتا ہوں۔"

"میں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا۔ آپ کچھ کھائیں گے؟"

"نہیں تم جلدی آؤ!"

میرہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا دماغ مسرت کے ساتویں آسمان پر تھا۔

○

جولین نے مُسکراتے ہوئے انور علی کی طرف دیکھا اور کہا: "میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ آپ اور جین کے درمیان آخری دیوار گرانے کے لیے میرا یہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میری خدمات کی ضرورت نہیں پڑی۔"

انور علی نے کہا: "لیکن آپ تو یہ کہتے تھے کہ آپ صرف جین کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ کرنے کے لیے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جین نے سرنگاپٹم کے ایک مغرور نوجوان کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کرنے میں کہاں تک عقلمندی سے کام لیا ہے۔"

"آپ کو یہ خیال کیسے ہوا کہ میں مغرور ہوں؟"

"جین کے ساتھ چند باتیں کرنے کے بعد میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ آپ کے درمیان جو چیز اب تک حائل رہی ہے وہ صرف آپ کا غرور ہے۔"

"کیا آپ کے نزدیک یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ میرے دوست کی بیوی تھی؟"

"موسیو! جین کو صرف آپ کے غرور نے لیگراںڈ کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو مغرور کہنے سے میرا مقصد آپ کی توہین ہے۔ میں آپ کو ایک بلند ترین انسان سمجھتا ہوں۔ مجھے آپ کے ایثار و خلوص اور آپ کی نیکی اور شرافت کا اعتراف ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر آپ کی نگاہوں کے سامنے غرور کے پردے حائل نہ ہوتے تو آپ کو یہ جاننے میں اتنی دیر نہ لگتی کہ وہ بے بس لڑکی جسے آپ نے پہلی بار پانڈی چری کی بندرگاہ پر دیکھا تھا آپ کو اپنی اُمیدوں کا مرکز بنا چکی ہے۔"

"موسیو! پانڈی چری میں میں نے جس لڑکی کو دیکھا تھا وہ لیگراںڈ کے ساتھ منسوب ہو چکی تھی اور اگر میرے سامنے کوئی چیز حائل تھی تو وہ غرور نہیں بلکہ ایک شریف آدمی کی حیا اور اخلاق تھا اور میں جین کے متعلق یہ سُننا پسند نہیں کروں گا کہ وہ ایک وفا شعار بیوی نہیں تھی۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ جین وفا شعار بیوی نہیں تھی۔ اگر وہ میری بہن ہوتی تو بھی میرے دل میں اس کے لیے اس سے زیادہ عزت نہ ہوتی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو لیگراںڈ کی بے بسی پر رحم آیا اور آپ نے جین سے مُنہ پھیر لیا۔ اسی طرح جین کو اس پر رحم آیا اور اس نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ لیگراںڈ میرا عزیز تھا اور میں اس مروت اور رحم دلی کے لیے آپ دونوں کا شکر گزار ہوں۔ لیکن جب میں آپ اور جین کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ لیگراںڈ آپ سے اتنی بڑی قربانی لینے کا حقدار نہ تھا۔ لیکن اب اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں صرف آپ کو یہ سمجھانے کے لیے آیا تھا کہ اب جین بیوہ ہو چکی ہے اور اُسے آپ کی ضرورت ہے۔ مجھے اس نے پہلے یہ بات نہیں بتائی کہ وہ آپ کے لیے اپنا مذہب بھی تبدیل کر چکی ہے۔ ورنہ میں یہاں آپ کا انتظار کرنے کی بجائے آپ کے لیے ایک خط لکھ کر چھوڑ جاتا۔ اب اگر آپ اس حقیقت کو سمجھ گئے ہیں کہ آپ کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے تو سرنگاپٹم میں میرا کام ختم ہو جاتا ہے۔ میں اسی ہفتے واپس چلا جاؤں گا۔ اب آپ کو میرے صرف ایک سوال کا جواب دینا ہے اور وہ یہ کہ آپ کی شادی کب ہو رہی ہے؟"

انور علی کچھ دیر خاموشی سے جولین کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "اس وقت میں اس سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنے بھائی کی آمد کا انتظار کرنا پڑے گا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ عرصہ اور یہاں ٹھہر جائیں؟"

"نہیں، اگر یہ ضروری ہوتا تو میں ضرور ٹھہرتا لیکن اب مجھے جانا چاہیے۔"

"تو پھر آج سے آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میں ابھی شاہی مہمان خانے سے آپ کا سامان منگوا لیتا ہوں۔"

"مجھے منظور ہے۔"

انور علی نے کہا۔ "موسیو جولین آپ بہت ذہین ہیں۔ لیکن میں ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں ـــــ ابتدا میں اگر مجھے جین کے ساتھ کوئی دلچسپی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لیگرانڈ میرا دوست تھا اور لیگرانڈ کی زندگی میں جین کے ساتھ میرا رشتہ ایسا تھا جس پر بہن اور بھائی دونوں فخر کر سکتے ہیں۔ میں جب ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے اس وقت بھی محسوس ہوتا ہے کہ اگر لیگرانڈ زندہ ہو جائے اور میں انہی حالات میں پھر ایک بار جین کے ساتھ پانڈیچری کی بندرگاہ سے سرنگاپٹم تک سفر کروں تو میرے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔"

جولین نے کہا۔ "میرے دوست تم کو یہ باتیں کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم عام انسانوں سے مختلف ہو۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں یہاں پیدا نہیں ہوا ورنہ آپ لوگوں کے ساتھ جینا مرنا میں اپنے لیے ایک سعادت سمجھتا۔"

منور خاں کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "جناب چند آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا میں آتا ہوں۔ دیکھو جین نے اگر ناشتہ کر لیا ہو تو اسے اوپر بھیج دو۔"

منور خاں نے جواب دیا۔ "جناب وہ نیچے محلے کی عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہیں۔"

انور علی نے جولین کی طرف متوجہ ہو کر فرانسیسی زبان میں کہا۔ "مجھے چند لوگ ملنے آئے ہیں۔ جین نیچے پڑوس کی عورتوں کے ساتھ مصروف ہے۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں۔"

جولین نے کہا۔ "میرا خیال ہے آج آپ سارا دن مصروف رہیں گے۔ اس لیے مجھے اجازت دیجیے۔ میں شام تک واپس آ جاؤں گا۔ ویسے بھی آپ کے ہاں منتقل ہونے سے پہلے میرے لیے شاہی مہمان خانے کے ناظم سے اجازت لینا ضروری ہے۔"

"بہت اچھا لیکن شام کے وقت آپ ضرور آ جائیں میں نوکر کو آپ کا سامان لانے کے لیے بھیج دوں گا۔"

جولین اٹھ کر انور علی کے ساتھ چل دیا۔ مکان کی ڈیوڑھی کے قریب پہنچ کر انور علی نے جولین کو رخصت کیا اور دیوان خانے میں چلا گیا۔ باقی سارا دن اس کے یہاں پڑوسیوں اور دوستوں کا تانتا بندھا رہا اور اُسے منیرہ سے کوئی بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ رات کے وقت اس نے دیوان خانے کے ایک کمرے میں جولین کے ساتھ کھانا کھایا اور کچھ دیر اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ دس بجے کے قریب وہ اپنے مہمان سے رخصت لے کر دیوان خانے سے باہر نکلا تو رہائشی مکان کے دروازے پر منور خاں کھڑا تھا۔

انور علی نے کہا۔ "کون! منور تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

"جناب میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

انور علی نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "جاؤ آرام کرو!"

منور خاں نے کہا۔ "جناب میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہو!"

"لیکن مجھے ڈر ہے کہ بی بی جی خفا ہوں گی۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر تمھیں خاموش رہنا چاہیے۔"

"لیکن جناب میں یہ سمجھتا ہوں کہ گھر کی کوئی بات آپ سے پوشیدہ نہیں رہنی چاہیے۔ میں کوئی بات نہیں کہنا چاہتا ـــــ بات یہ ہے کہ بی بی جی مسلمان ہو چکی ہیں اور ان کا نام اب جین نہیں بلکہ منیرہ ہے۔ میں نے انھیں اپنی آنکھوں سے کئی بار نماز پڑھتے دیکھا ہے۔"

انور علی نے کہا۔ "منور تم نے بہت اچھی خبر سنائی ہے اور صبح میں تمھیں انعام دوں گا۔"

منور خاں نے کہا۔ "جناب میں آپ کو اور ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ ابھی بی بی جی یہاں کھڑی آپ کا راستہ دیکھ رہی تھیں۔ میں قریب سے گزرا تو وہ مجھے دیکھ کر واپس چلی گئیں۔

صحن میں پہنچ کر انھوں نے مجھے آواز دی اور کہا جب آپ آئیں تو میں آپ کو یہ بتاؤں کہ وہ کھانا کھاتے ہی سو گئی تھیں۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار انھیں آپ کا انتظار کرتے دیکھ چکا ہوں۔"

"اچھا جاؤ اب سو جاؤ!" انور علی یہ کہہ کر اندر داخل ہوا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنے کمرے میں لباس تبدیل کر رہا تھا تو اُسے اپنے بستر کے تکیے پر ایک کاغذ دکھائی دیا۔ اس نے کاغذ اٹھا کر کھولا اور کرسی گھسیٹ کر چراغ دان کے قریب بیٹھ گیا۔ کاغذ پر اپنی ماں کے ہاتھ کی تحریر پہچان کر وہ اپنے دل میں جذبات کا تلاطم محسوس کرنے لگا۔ انور علی کے نام فرحت کے ہاتھ کی آخری تحریر یہ تھی:

نورِ چشم! مجھے معلوم نہیں تم کہاں ہو اور کس حال میں ہو۔ میں بیماری کی حالت میں تمھیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اب میں شاید زیادہ دیر تمھارا انتظار نہ کر سکوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مرنے کے بعد میری رُوح کو بے چینی نہیں رہے گی کہ میرے بعد تمھارے بھائی کے سوا اس گھر میں تمھارا انتظار کرنے والا کوئی نہیں۔ جب تم آؤ گے تو منیرہ تمھاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اس کا ایک رشتہ دار اسے لینے کے لیے آیا ہے لیکن اس نے اپنے وطن جانے سے انکار کر دیا ہے۔ تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ اس انکار کی وجہ کیا ہے۔ منیرہ اسلام قبول کر چکی ہے اور میری آخری خواہش یہ تھی کہ تم اس کے ساتھ شادی کرو۔ ایک ماں سے اپنے بچوں کی کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ تم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔

منیرہ اگر میری اپنی بیٹی ہوتی تو بھی شاید اس سے زیادہ میری خدمت نہ کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ تم ضرور آؤ گے۔ تمھارے متعلق میں نے جو خواب دیکھے ہیں وہ تمام غلط نہیں ہو سکتے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میں تمھیں نہیں دیکھ سکوں

گی۔ لیکن میری رُوح ہمیشہ تمھاری مسرتوں میں شریک رہے گی۔

تمھاری ماں

انور علی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ اس نے خط کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ آنسو آنکھوں سے چھلک کر بہہ نکلے اور کاغذ میں جذب ہو گئے۔

جولین انور علی کے ہاں ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد رُخصت ہوا اور اس کے جانے سے دس دن بعد مراد علی مدراس سے واپس آ گیا۔ مراد علی کے گھر پہنچتے ہی انور اور منیرہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور دو ہفتے بعد وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ دعوتِ ولیمہ میں شہر کے معززین، حکومت کے بڑے بڑے عہدہ دار اور فوج کے افسر شریک تھے۔ مہمانوں میں سے کئی افسر ایسے بھی تھے جو انور علی کے ساتھ مرہٹوں کی قید میں رہ چکے تھے۔ بدر الزماں خاں جسے مرہٹوں نے سب سے آخر میں آزاد کیا تھا شادی سے دو دن قبل سرنگا پٹم پہنچ چکا تھا اور وہ علالت کے باوجود دعوت میں شریک تھا۔ شادی کے بعد کئی دن تک شہر کے معزز گھرانوں کی بہو بیٹیاں دُلھن کے لیے تحائف لے کر آتی رہیں۔ چنانچہ ایک دن منیرہ نے انور علی سے کہا۔

"اب میرے پاس اتنے کپڑے جمع ہو گئے ہیں کہ آپ کو میرے لیے کئی سال تک نیا لباس بنوانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں چند جوڑے پڑوس کی بیوہ اور محتاج عورتوں میں تقسیم کر دوں؟"

انور علی نے جواب دیا۔ "ایک نیک کام کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے تمام فالتو جوڑے شہر کی ان عورتوں میں تقسیم کر دو جن کے شوہر جنگ میں شہید ہو چکے ہیں۔"

○

شادی سے چند ہفتے بعد انور علی سرنگا پٹم میں ایک ہزار سواروں کی کمان سنبھال چکا تھا

اور مُراد علی رسالدار کے عہدہ پر ترقی کر کے چیتل ڈرگ روانہ ہو چکا تھا۔ جنگ کے اختتام سے اگلے سال لارڈ کارنوالس انگلستان واپس چلا گیا اور اس کی جگہ سر جان شور نے کمپنی کی زمامِ کار سنبھال لی۔ لارڈ کارنوالس کی واپسی سے قریباً چھ ماہ بعد انگریزوں نے سلطان کے دو بیٹے، جنھیں وہ یرغمال کے طور پر مدراس لے گئے تھے، واپس بھیج دیے۔ سلطان ٹیپو معاہدے کی شرائط کے مطابق پہلے سال ہی انگریزوں کو تاوان کی رقم ادا کر چکا تھا اور اس کے بعد شہزادوں کو اتنی مدت روکے رکھنے کے لیے کوئی وجہِ جواز نہ تھی۔ لیکن میر نظام علی کی مداخلت کے باعث کمپنی کی حکومت صلح کی شرائط کے خلاف کئی مہینے شہزادوں کی واپسی کا مطالبہ ٹالتی رہی۔

سلطان کے خلاف میر نظام علی کی معاندانہ سرگرمیوں کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ کے نتائج سے مطمئن نہ تھا اور وہ ان ہڈیوں کو اپنے لیے ناکافی سمجھتا تھا جو میسور کے مالِ غنیمت سے اس کے حصے میں آئی تھیں۔ وہ سلطان سے کرنول کا علاقہ چھیننے پر بضد تھا۔ انگریز کچھ مدت درپردہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ لیکن جنوبی ہند کی سیاست میں اچانک ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی اور انگریزوں نے بدلتے ہوئے حالات سے مجبور ہو کر نظام کے نامعقول مطالبات کی تائید و حمایت سے انکار کر دیا۔

مہادجی سندھیا، جو مرہٹہ حکمرانوں میں سب سے زیادہ بااثر، ہوشیار اور دور اندیش تھا اور جس کی بساطِ سیاست پر دلّی کے مفلوج اور بے بس حکمران شاہ عالم ثانی کی حیثیت ایک مُہرے سے زیادہ نہ تھی، پونا پہنچا اور اس نے اپنے غیر معمولی اثر و رسوخ سے مرہٹوں کی سیاست کا رُخ بدل دیا۔ سندھیا جنوبی ہندوستان میں میسور کی سلطنت کو انگریزوں کے راستے کی آخری دیوار سمجھتا تھا۔ اس نے پیشوا اور اُس کے مشیروں اور جرنیلوں کو اس بات کا احساس دلایا کہ تم نے گزشتہ جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دے کر غلطی کی ہے۔ تم ایک بیرونی خطرے کو اپنی سرحدوں کے قریب لے آئے ہو۔ تمھارا دشمن سلطان ٹیپو نہیں جس کا خاندان برسوں سے جنوبی ہندوستان کے دروازے پر پہرہ دے رہا ہے بلکہ وہ لوگ ہیں جن کے کندھے پر اپنی بندوقیں رکھ کر اس

ملک کی عزت اور آزادی کے دشمن آہستہ آہستہ دلّی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہمیں سلطان ٹیپو کی طاقت سے نہیں بلکہ میر نظام علی کی کمزوری سے خوف کھانا چاہیے جو اپنی حفاظت کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کی سنگینوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اگر تمھیں ہوش نہ آیا تو وہ دن دُور نہیں جب حیدر آباد کے ہر شہر میں انگریزوں کی چھاؤنیاں ہوں گی اور وہ ہمیں ایک ایک کر کے نگلنا شروع کر دیں گے۔ اصل خطرہ میسور سے نہیں بلکہ حیدر آباد سے ہے۔

مہادجی سندھیا کی آمد سے قبل سلطان ٹیپو کے متعلق ہری پنت کے خیالات میں بھی ایک بہت بڑا انقلاب آ چکا تھا اور وہ انگریزوں کی بجائے سلطان ٹیپو کے ساتھ مرہٹوں کے تعلقات استوار کرنے کے لیے کوشاں تھا لیکن پرس رام بھاؤ اور نانا فرنویس کی مخالفت کے باعث اس کی کوششیں بارآور ثابت نہ ہوئیں۔ اب پونا میں سندھیا کی آمد کے باعث ہری پنت اور اُس کے ہم خیال مرہٹہ لیڈروں کے ہاتھ مضبوط ہو گئے اور پیشوا کو نظام اور انگریزوں کی بجائے سلطان ٹیپو کی طرف مائل ہونا پڑا لیکن سندھیا اور سلطان ٹیپو کے درمیان ابھی دوستانہ خط و کتابت ہو رہی تھی کہ سندھیا اور ہری پنت یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے اور ان کی کوششیں کوئی عملی نتیجہ پیدا نہ کر سکیں۔ تاہم پیشوا اور مرہٹہ سرداروں کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ انھیں سلطان ٹیپو کی نسبت انگریزوں کی دشمنی اور میر نظام علی کی ابن الوقتی سے زیادہ خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ پونا میں سندھیا کے قیام کے دوران میں انگریز بے حد پریشان تھے۔ اس کی موت کے بعد وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایک بہت بڑا خطرہ ٹل چکا ہے۔ تاہم مرہٹوں کی سیاست میں تبدیلی کے آثار دیکھ کر انھوں نے سلطان ٹیپو کو کسی نئے محاذ پر الجھائے رکھنے کی پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اور مدراس میں نظر بند شہزادوں کو عزت اور احترام کے ساتھ واپس روانہ کر دیا۔

اس عرصہ میں ڈھونڈیا واغ جو صلح کی شرائط سے بددل ہو کر میسور سے نکل گیا تھا، مرہٹوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں میں مصروف رہا۔ اس نے دھارواڑ کے قریب لوٹ مار کرنے کے بعد [illegible] اور شاہنور پر قبضہ کر لیا اور سلطان ٹیپو کی خدمت میں ایلچی بھیج کر مرہٹوں سے میسور کے تمام

مفتوحہ علاقے چھیننے کی پیش کش کی لیکن سلطان ٹیپو نے اس کے ساتھ کوئی سروکار رکھنے سے انکار کر دیا۔ ڈھونڈیا واغ سرپھروں کی ایک مٹھی بھر جماعت کے ساتھ کافی عرصہ مرہٹوں کو پریشان کرتا رہا۔ بالآخر پونا کی حکومت نے دو ہزار سوار اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیے اور ڈھونڈیا واغ ایک گھمسان کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد ادھونی کی طرف بھاگ نکلا۔

○

ایک دن منیرہ اپنے کمرے میں بیٹھی مراد علی کے نام خط لکھ رہی تھی:

"پیارے مراد! تم نے پچھلے مہینے یہ اطلاع دی تھی کہ تمھیں عنقریب چھٹی ملنے والی ہے۔ اس کے بعد تمھارا کوئی خط نہیں آیا۔ تم نے اپنے بھائی جان کے خط کا جواب بھی نہیں لکھا۔ ان دنوں ہماری گفتگو عام طور پر تمھاری شادی کے مسئلہ پر ہوتی ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم تین ماہ کی چھٹی لے کر گھر آجاؤ۔ میں نے تمھارے لیے ایک رشتہ تلاش کر لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے انتخاب کو پسند کرو گے۔ لڑکی نہایت حسین اور سمجھدار ہے اور ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ میں نے تمھارے بھائی جان کو اس کے باپ سے رشتہ کے متعلق بات کرنے کو کہا تھا۔ لیکن وہ بات کرنے سے پہلے تمھاری رضامندی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

میں بہت خوش ہوں۔ تم جلد آنے کی کوشش کرو اور اگر کسی وجہ سے جلدی نہ آسکو تو جواباً مجھے اس بات کی اجازت دو کہ میں اس لڑکی کی والدہ سے تمھارے رشتے کے بارے میں گفتگو کروں۔"
(تمھاری بھابی منیرہ)

دو ہفتے بعد ایک سہ پہر انور علی ہاتھ میں ایک کاغذ لیے منیرہ کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "منیرہ مراد علی کا خط آیا ہے۔"

منیرہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور اس نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا: "لائیے!"

انور علی نے جواب دیا: "میں پڑھ کر تمھیں سنا دیتا ہوں۔"

وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انور علی نے خط کا مضمون پڑھنا شروع کیا۔ مراد علی نے لکھا تھا:

بھائی جان! السلام علیکم،

میں سرحد کی دفاعی چوکیوں کے معائنے کے لیے گیا ہوا تھا اس لیے آپ اور بھابی جان کے خطوط کا جواب نہ لکھ سکا۔ مجھے ایک ماہ کی چھٹی مل گئی ہے لیکن میں گھر آنے سے پہلے چچا اکبر خاں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ ایک مدت سے ان کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے حالات معلوم کرنا ہمارا فرض ہے۔ ان سے ملنے کے بعد میں چھٹی کے باقی دن آپ کی خدمت میں گزارنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر مجھے ان کے ہاں زیادہ دیر ٹھہرنا پڑا تو میں چیتل دُرگ واپس آجاؤں گا۔ زمیندار نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ مجھے تین چار ماہ کے بعد دوبارہ چھٹی مل جائے گی۔

اب مجھے بھابی جان سے کچھ کہنا ہے۔ انھوں نے پھر میری شادی کا مسئلہ چھیڑ دیا ہے۔ بھائی جان آپ میری سفارش کریں ابھی میرے لیے ان باتوں کے سوچنے کا وقت نہیں آیا۔ بھابی جان کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیجیے۔"

منیرہ نے مایوس ہو کر کہا: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شادی کے مسئلہ کو اتنا غیر اہم کیوں سمجھتا ہے۔ کاش میں اسے وہ لڑکی دکھا سکتی۔"

انور علی مسکرایا: "لڑکی دکھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میں اپنے بھائی کو جانتا ہوں۔"

منیرہ نے کہا: "آپ کا مطلب ہے کہ وہ شادی نہیں کرے گا؟"

"ضرور کرے گا۔"

"کب؟"

"جب اس کی مرضی ہو گی۔"

بائیسواں باب

ایک سہ پہر مُراد علی اکبر خاں کے گاؤں سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے ایک ندی کے کنارے اترا۔ ارد گرد گھنا جنگل تھا۔ مُراد علی نے راستے سے چند قدم ہٹ کر ایک درخت کے ساتھ اپنا گھوڑا باندھ دیا اور ندی کے پانی سے وضو کرنے کے بعد نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہو کر اٹھنے لگا تو اس نے اچانک محسوس کیا کہ کوئی تیز چیز اس کی گردن کو چھُو رہی ہے۔ اس کی بندوق سامنے پڑی ہوئی تھی لیکن بندوق اٹھانے کا موقع نہ تھا۔ وہ ایک ثانیہ توقف کے بغیر جھُکا اور پھر کُود کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ آنکھ جھپکنے کی دیر میں وہ اپنی تلوار نکال چکا تھا لیکن اتنے میں ایک آدمی کے نیزے کی نوک اس کے سینے کو چھُو رہی تھی اور اس کے دائیں بائیں دو اور آدمی اپنی بندوقیں سیدھی کیے کھڑے تھے۔ یہ لوگ اپنے لباس سے مرہٹے معلوم ہوتے تھے۔ مراد علی نے مڑ کر دیکھا تو دو اور مسلح آدمی اس کے گھوڑے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس نے اپنی تلوار پھینک دی۔ مرہٹے نے اطمینان سے اپنا نیزہ جھکاتے ہوئے پوچھا: "تم کون ہو؟"

مُراد علی نے کہا: "یہ سوال مجھے تم سے پُوچھنا چاہیے تھا!"

مرہٹے نے دوبارہ اپنے نیزے کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی اور تلخ ہو کر کہا: "تم ابھی

تک یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ادھونی کی گلیوں میں پھر رہے ہو؟"

"میں ادھونی سے نہیں آیا اور تمھیں بات کرنے کے لیے بار بار نیزہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس وقت تمھارے نرغے میں ہوں۔"

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"میں سرنگاپٹم سے آیا ہوں۔"

مرہٹہ پریشان سا ہو کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ مُراد علی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چمڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکال کر ان کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا: "مجھے افسوس ہے کہ مجھے راستے میں آپ سے ملاقات کی توقع نہ تھی ورنہ میں آپ کو مایوس نہ کرتا۔ اس وقت میرے پاس یہی کچھ ہے۔"

مرہٹے نے جھک کر تھیلی اُٹھائی اور آگے بڑھ کر مُراد علی کو پیش کرتے ہوئے کہا: "اسے اپنے پاس رکھیے۔ اگر آپ سرنگاپٹم سے آئے ہیں تو ہمیں اپنا دوست سمجھیے لیکن ہم آپ کو تھوڑی سی تکلیف اور دینا چاہتے ہیں۔ اپنی تلوار اور بندوق اٹھا لیجیے اور ہمارے ساتھ چلیے!"

"کہاں؟" مُراد علی نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"ہمارے سردار کے پاس۔ آپ کو زیادہ دُور نہیں جانا پڑے گا۔"

"تمھارا سردار کون ہے؟"

"آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اگر آپ سرنگاپٹم سے آنے والے ہیں تو ہمارے سردار کو اپنا دوست پائیں گے اور اگر آپ نے جھُوٹ بولا ہے تو آپ کا بھی پتہ چل جائے گا اور آپ باقی سفر کی تکلیف سے بچ جائیں گے۔"

دُوسرے آدمی نے ہنستے ہوئے کہا: "اگر ہمارے سردار کو یہ پتہ چلا کہ آپ جھُوٹ بول کر جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں تو آپ کو اسی جنگل کے کسی درخت کے ساتھ پھانسی دی جائے گی۔"

ایک آدمی نے مراد علی کا گھوڑا پکڑ لیا اور وہ کچھ کہے بغیر ان کے ساتھ چل پڑا۔

○

ندی کے کنارے کنارے گھنے جنگل میں کوئی آدھ میل چلنے کے بعد مُراد علی کو ایک جگہ تیس چالیس آدمی دکھائی دیئے جو ایک بوسیدہ خیمے کے اردگرد بیٹھے ہُوئے تھے۔ یہ لوگ مراد علی کو دیکھتے ہی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک نوجوان آگے بڑھ کر چلّایا: "ارے ظالمو! یہ میسور کی فوج کے افسر ہیں۔ مَیں نے انھیں کئی بار دیکھا ہے۔ اگر تم لے ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو سردار تمھاری کھال اُتار لے گا۔"

مراد علی کی پریشانی حیرت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ خیمے سے ایک آدمی جس کے بازو اور گردن پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں نمودار ہُوا اور مرہٹے اسے دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ مراد علی نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ ڈھونڈیا واغ تھا۔ وہ آگے بڑھا اور تھوڑی دیر مراد علی کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد چلّایا: "ارے آپ مراد علی ہیں!"

مراد علی نے شکایت کے لہجے میں کہا: "خُدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ورنہ آپ کے آدمی مجھے اسی جنگل میں پھانسی دینے کی خوشخبری سُنا چکے ہیں۔"

ڈھونڈیا واغ نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا: "آپ کے ایک بال کے بدلے میں ان سب کو پھانسی دے سکتا ہُوں۔ لیکن آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"میں ابّا جان کے ایک دوست کے پاس آیا ہُوں۔ ان کا گاؤں یہاں سے چند میل ہے۔"

میرے آدمیوں نے آپ کے ساتھ کوئی بدسلوکی تو نہیں کی؟

"نہیں، بلکہ میں اس ملاقات کے لیے ان کا شکر گزار ہُوں۔ لیکن آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ مَیں نے سُنا تھا کہ آپ شاہنور تک پہنچ گئے ہیں۔"

ڈھونڈیا واغ مسکرایا: "میرے دوست مَیں تو کسی دن پونا پہنچنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن اب میں شکست کھا چکا ہُوں۔ داودو پنت گوکھلے میرے آٹھ سو آدمیوں کے مقابلے میں تین ہزار سپاہی لے آیا تھا۔ شاہنور سے بھاگنے کے بعد میں یہ سمجھتا تھا کہ میرے لیے یہ علاقہ محفوظ ہو گا لیکن مرہٹے یہاں بھی میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ کل ہی مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ مرہٹہ سواروں کا ایک دستہ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر دیکھا گیا ہے۔"

"مرہٹہ سوار! آپ کا مطلب یہ ہے کہ مرہٹہ سوار ادھونی کے علاقے میں داخل ہو چکے ہیں؟"

"ہاں!"

"لیکن نظام یہ کیسے برداشت کرے گا؟"

"نظام کو اب بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ پونا کی افواج جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس مرتبہ سلطان کی جگہ نظام پر اپنی قوت آزمائیں گے۔"

مُراد علی نے کہا: "آپ زخمی ہیں؟"

"میرے زخم اب ٹھیک ہو گئے ہیں۔ آئیے!" ڈھونڈیا واغ مُراد علی کا بازو پکڑ کر خیمے کی طرف چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خیمے کے اندر بیٹھے اطمینان سے باتیں کر رہے تھے۔ ڈھونڈیا واغ نے کہا: "شاہنور پر حملہ کرنے کے بعد میں نے سلطانِ معظم کی خدمت میں ایک ایلچی بھیج کر مرہٹوں سے میسور کے مقبوضہ علاقے چھیننے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن ان کی طرف سے یہ جواب ملا کہ تم ہمارے لیے نئی پیچیدگیاں پیدا کرنے کی کوشش نہ کرو ہم سختی کے ساتھ صلح کی شرائط پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔"

مراد علی نے پوچھا: "اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

ڈھونڈیا واغ نے جواب دیا: "اب میسور کے سوا مجھے کوئی اور جائے پناہ نظر نہیں آتی۔ میرے آقا مجھ سے خفا ہیں۔ لیکن مجھے کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اگر میں اُن کے پاؤں پر گر پڑوں تو وہ میری خطائیں بھول جائیں گے۔ اگر آپ سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر میرے متعلق کچھ کہہ سکیں تو یہ بہت بڑا

احسان ہوگا۔ میرے پیچھے ساتھی زیادہ عرصہ اس حال میں نہیں رہ سکتے۔"

مراد علی نے جواب دیا۔"آپ کی اعانت میرا فرض ہے۔ میں چتل ڈرگ سے چند دنوں کی چھٹی پر آیا ہوں اور اب میں واپس پہنچتے ہی سرنگاپٹم جانے کے لیے مزید رخصت لینے کی کوشش کروں گا۔ میری حیثیت ایسی نہیں کہ اس مسئلہ میں براہ راست سلطان معظم سے کوئی بات کرسکوں، تاہم مجھے اُمید ہے کہ وہاں مجھے کئی مددگار مل جائیں گے۔ اگر مجھے چتل ڈرگ سے فوراً چھٹی نہ ملی تو آپ کو کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا۔ آپ کے ساتھیوں کی فوری اعانت کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ انھیں چتل ڈرگ کی فوج میں بھرتی کرلیا جائے۔ میری واپسی کے بعد انھیں وہاں بھیج دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا فوجدار انھیں اپنی فوج میں لینے سے انکار نہیں کرے گا۔"

ڈھونڈیا واغ نے کہا۔"نہیں جب تک مجھے سلطان کی طرف سے میسور کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملتی یہ لوگ میرے ساتھ رہیں گے۔ میرے بیشتر ساتھی ابھی تک دُور دُور کے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے ہوئے ہیں اور میں انھیں ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے دو آدمیوں کو آپ کے ساتھ بھیج دوں گا۔ آپ کب تک واپس ہوں گے؟"

"میں ایک ہفتہ تک واپس آجاؤں گا اور اگر آپ یہاں ہوئے تو آپ کے آدمیوں کو اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔"

"میں یہیں ہوں گا اور اگر کسی وجہ سے مجھے کوئی اور جائے پناہ تلاش کرنی پڑی تو بھی میں دو آدمیوں کو یہاں چھوڑ جاؤں گا اور وہ آپ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔"

مراد علی نے کہا۔"بہت اچھا۔ لیکن اگر کسی وجہ سے وہ مجھے یہاں نہ ملیں تو آپ انھیں چتل ڈرگ بھیج دیجیے۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"اتنی جلدی! کم ازکم ایک دن تو میرے پاس ٹھہر لیجیے!"

"نہیں میں آج شام سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔ اگر وقت ملا تو واپسی پر آپ کے پاس ٹھہر جاؤں گا۔"

"بہت اچھا اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں آپ کو مجبور نہیں کرسکتا۔"

خیمے سے باہر سرپٹ گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور مراد علی اور ڈھونڈیا واغ جلدی سے باہر نکل آئے۔ ایک سوار ڈھونڈیا واغ کے قریب پہنچ کر کود پڑا اور اس نے آگے بڑھ کر کہا۔"مہاراج! وہ سوار جو ہم نے کل دیکھے تھے مرہٹہ فوج کے سپاہی نہیں بلکہ لٹیرے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ چند دنوں سے اس علاقے میں لُوٹ مار کر رہے ہیں۔ پچھلے ہفتے اس علاقے کے لوگوں نے انھیں مار کر سرحد کے پار پہنچا دیا تھا لیکن اب وہ دوبارہ واپس آگئے ہیں۔ اس وقت وہ جنگل سے نکل کر افغانوں کی بستیوں کا رُخ کر رہے ہیں۔ میں نے ایک جھاڑی میں چھپ کر ان کی باتیں سُنی ہیں۔ وہ کسی بستی پر حملہ کرنے کی نیت سے جا رہے ہیں۔"

مراد علی نے پریشان ہوکر ڈھونڈیا واغ کی طرف دیکھا اور کہا۔"میرے دوست میری منزلِ مقصود انہی افغانوں کی ایک بستی ہے۔ اب شاید مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑے!"

"میں حاضر ہوں جناب!" ڈھونڈیا واغ یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔"تم کیا دیکھ رہے ہو! اپنے گھوڑے تیار کرو۔ سلطان ٹیپو کے ایک بہادر سپاہی کو تمھاری مدد کی ضرورت ہے!"

ڈھونڈیا واغ کے ساتھی اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈالنے میں مصروف ہوگئے اور اس نے مراد علی سے کہا۔"مجھے تیاری کے لیے صرف دو منٹ کی ضرورت ہے۔"

"نہیں نہیں آپ زخمی ہیں آپ آرام کریں۔"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" ڈھونڈیا واغ نے خیمے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مسلح ہوکر خیمے سے باہر نکلا اور ایک گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ مراد علی کے علاوہ کوئی پینتیس سوار اس کے پیچھے ہولیے۔

قریباً ایک گھنٹہ جنگل میں گھوڑے دوڑانے کے بعد انھیں ایک طرف سے بندوقوں کے دھماکے سنائی دیے۔ ڈھونڈیا واغ نے اپنا گھوڑا روک کر ہاتھ بلند کیا اور اس کے ساتھی رُک گئے۔ اس نے کہا: "اب جنگل ختم ہونے والا ہے اس لیے آگے پیدل چلنا پڑے گا۔"

ڈھونڈیا واغ کے ساتھیوں نے کسی توقف کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی اور وہ سات آدمی گھوڑوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر آگے بڑھا۔ جنگل کے آگے کچھ زمین خالی پڑی تھی اور اس سے آگے بستی کے قریب گنّے کے کھیت شروع ہوتے تھے۔ ڈھونڈیا واغ جلدی سے ایک اُونچے درخت پر چڑھا اور صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد نیچے اُتر کر مراد علی سے مخاطب ہوا: "ڈاکو ان کھیتوں سے آگے ایک باغ میں جمع ہو کر فائر کر رہے ہیں، باغ کے دائیں طرف ایک جوہڑ ہے۔ میں گنجان درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں کر سکا لیکن مجھے یقین ہے کہ عقب سے ہمارا اچانک حملہ انھیں بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔"

مراد علی نے بے چین ہو کر کہا: "ہم وقت ضائع کر رہے ہیں!"

ڈھونڈیا واغ نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ بھاگتے ہوئے گنّے کے کھیت عبور کرنے لگے۔ آخری کھیت کے کنارے پہنچ کر ڈھونڈیا واغ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم یہیں چھپے رہو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

ڈھونڈیا واغ کے ساتھی ایک قطار بنا کر کھیت کی مینڈ سے چند قدم دُور کھڑے ہو گئے اور وہ زمین پر لیٹ کر رینگتا ہُوا آگے بڑھا۔ مراد علی نے اس کی تقلید کی اور چند منٹ بعد دونوں کھیت کی مینڈ کی آڑ میں لیٹے باغ کا جائزہ لے رہے تھے۔ باغ کا پچھلا حصہ خالی تھا اور وہاں جگہ جگہ درختوں کے ساتھ ڈاکوؤں کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ڈاکو جن کی تعداد کوئی ڈیڑھ دو سو کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی، باغ کے اگلے حصے میں جمع تھے اور گاؤں کی طرف باغ کی مینڈ ان کے لیے مورچے کا کام دے رہی تھی۔ دس بارہ آدمی گھوڑوں کی حفاظت کے لیے کھڑے تھے۔ مراد علی نے اطمینان سے ڈھونڈیا واغ کی طرف دیکھا اور کہا: "اب ہمیں جلد بازی کی ضرورت

نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ باغ اور گاؤں کے درمیان کافی فاصلہ ہے اور ڈاکوؤں کی گولیاں گاؤں والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔"

ڈھونڈیا واغ نے کہا: "اس وقت ان لوگوں کا مقصد گاؤں والوں کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ ڈاکو صرف یہ چاہتے ہیں کہ گاؤں کے لوگ ڈر کر بھاگ نکلیں اور انھیں کھلے میدان شکار کھیلنے کا موقع مل جائے۔ اگر گاؤں والے جواب میں گولیاں نہ چلاتے تو یہ لوگ اس وقت ان کے گھروں میں لُوٹ مار کر رہے ہوتے۔ میں چند آدمیوں کے ساتھ گنّے کے کھیت کا چکر کاٹ کر باغ کی دائیں طرف سے حملہ کروں گا، آپ باقی آدمیوں کے ساتھ کھیت میں چھپے رہیں۔ جب ڈاکو افراتفری کی حالت میں اس طرف بھاگیں تو آپ حملہ کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ چند منٹ میں میدان صاف ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد ڈھونڈیا واغ پندرہ آدمیوں کے ساتھ گنّے کے کھیت میں غائب ہو چکا تھا اور مُراد علی مینڈ سے چند قدم پیچھے باقی آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اچانک باغ کے دائیں طرف سے بندوقوں کے دھماکوں کے ساتھ ڈاکوؤں کی چیخ و پکار سُنائی دی اور وہ سراسیمگی کی حالت میں باغ کے پچھلے حصّے کی طرف سمٹنے لگے۔ اتنی دیر میں مُراد علی اور اس کے ساتھی مینڈ کی آڑ میں لیٹ کر اپنی بندوقیں سیدھی کر چکے تھے۔ گھوڑوں کے قریب پہنچ کر ڈاکوؤں کی افراتفری کا یہ عالم تھا کہ کوئی رسّا کھول رہا تو دوسرا لگام پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی اپنے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں ڈال رہا تھا اور دُوسرا اس کے پاؤں کھینچ کر خود سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مراد علی نے فائر کرنے کا حکم دیا اور آن کی آن میں چند آدمی زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

کسی نے بلند آواز میں کہا: "بھاگو بھاگو اپنی جانیں بچاؤ۔ ہم چاروں طرف سے گھیرے میں آ چکے ہیں۔"

مُراد علی نے بارُعب آواز میں کہا: "تمھارے لیے اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں اپنے ہتھیار پھینک دو!"

چند ڈاکوؤں نے ہتھیار پھینک دیے۔ باقی چیختے چلّاتے واپس مُڑے۔ باغ کے عقب اور

دائیں طرف سے گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ نے انھیں بائیں طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد مراد علی اور اس کے ساتھی تلواریں سونت کر باغ کے اندر داخل ہو گئے اور شکست خوردہ ڈاکوؤں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکنے لگے۔ جن لوگوں کو گھوڑوں پر سوار ہونے کا موقع ملا تھا وہ باغ سے آگے جوہڑ عبور کرنے کے بعد مغرب کی طرف نکل گئے اور باقی پیدل ان کے پیچھے بھاگنے لگے۔ مراد علی کے ساتھی بھاگنے والوں کا پیچھا کرنے کا خیال چھوڑ کر ہتھیار ڈالنے والے ڈاکوؤں کو ایک جگہ جمع کرنے میں مصروف تھے۔

ڈھونڈیا واغ ایک قوی ہیکل آدمی کے گلے میں رسّا ڈالے نمودار ہوا۔ اُس کے ساتھی چار آدمیوں کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ ڈھونڈیا واغ نے دُور سے بلند آواز میں کہا: "ہم نے ڈاکوؤں کے سردار کو گرفتار کر لیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ اپنے قیدیوں سمیت باغ سے نکل کر گاؤں کے سامنے ایک کھلے میدان میں پہنچے۔ ڈھونڈیا واغ نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد کہا: "گاؤں کے لوگ ابھی تک سہمے ہوئے ہیں۔"

مراد علی نے کہا: "وہ شاید ہمیں بھی ڈاکوؤں کے ساتھی سمجھتے ہوں۔"

ڈھونڈیا واغ نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا: "گاؤں کے لوگ ہماری طرف سے دوستی کا ثبوت حاصل کیے بغیر باہر نہیں آئیں گے اس لیے ان قیدیوں کو درختوں کے ساتھ لٹکا دو اور سب سے پہلے ان کے سردار کو پھانسی دو۔"

مُراد علی نے کہا: "نہیں یہ لوگ ہتھیار ڈال چکے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ انھیں ادھونی کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔"

ڈھونڈیا واغ نے جواب دیا: "ادھونی میں جن ڈاکوؤں کی حکومت ہے وہ میری نظر میں ان سے بھی بدتر ہیں۔"

"بہرحال ہم ان لوگوں کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے پُرامید ہو کر کہا: "سرکار اگر آپ میری جان بخشی کریں تو میں بھگوان

کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آئندہ کوئی جُرم نہیں کروں گا۔"

مُراد علی نے کہا: "اگر اس علاقے کے لوگ تمھارے وعدے پر اعتبار کر سکیں تو ہمیں تمھاری جان بخشی پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

چند آدمی سامنے ایک مکان کی چھت پر کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ مُراد علی نے آگے بڑھ کر بلند آواز میں کہا: "بھائیو ہم تمھارے دوست ہیں۔ ڈاکو بھاگ گئے ہیں اور اب تم گھروں سے باہر آ سکتے ہو۔"

ڈھونڈیا واغ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجّہ ہوا: "تم واپس چلے جاؤ۔ اب یہاں تمھاری ضرورت نہیں۔ صرف آٹھ دس آدمی رہ جائیں۔ اگر ڈاکوؤں کا کوئی گھوڑا تمھیں پسند آئے تو لے جاؤ ورنہ گاؤں کے لوگوں کے لیے چھوڑ دو۔ ہم ابھی جنگل میں تم سے آ ملیں گے۔"

مراد علی نے کہا: "ان سے کہیں کہ ایک آدمی میرا گھوڑا یہاں پہنچا دے۔ میں یہیں سے اس علاقے کے سردار کے گاؤں کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔"

ڈھونڈیا واغ کے ساتھی وہاں سے چل دیے اور تھوڑی دیر بعد بستی کے تین آدمی ایک گلی سے نمودار ہوئے۔ مُراد علی اور ڈھونڈیا واغ نے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر چند منٹ کے اندر اندر گاؤں کے لوگوں کا ہجوم ان کے گرد جمع ہو گیا۔ مُراد علی سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ یک زبان ہو کر قیدیوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کا مُطالبہ کر رہے تھے۔

اچانک دائیں سمت سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر میں سرپٹ سوار نمودار ہوئے۔ سب سے آگے آنے والے سوار نے جس کے لمبے اور سُنہری بال ہوا میں لہرا رہے تھے، ہجوم کے قریب پہنچ کر اپنی پوری قوّت کے ساتھ گھوڑے کی باگ کھینچی اور گاؤں کے لوگ اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ ایک ثانیہ کے لیے مراد علی کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ یہ ایک لڑکی تھی۔ مُراد علی کو پہلی نظر میں ایسا محسوس ہُوا کہ ایک دلکش تصویر ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آ گئی ہے۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے اس کے گھوڑے کی باگ

پکڑتے ہوئے کہا: "آپ نے بہت دیر لگائی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان لوگوں کی بروقت مدد سے ہمارا گاؤں بچ گیا۔ ڈاکو بھاگ گئے اور ان کا سردار چند ساتھیوں سمیت گرفتار ہو چکا ہے۔"

لڑکی نے ایک ہاتھ سے پیشانی پر بکھرے ہوئے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے پوچھا: "ڈاکوؤں کا سردار کہاں ہے؟"

عمر رسیدہ آدمی نے ایک قوی ہیکل آدمی کی طرف جس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے اشارہ کر دیا۔

لڑکی گھوڑے سے اُتر کر سردار کی طرف بڑھی۔ مراد علی نے دبی زبان میں گاؤں کے ایک آدمی سے پوچھا: "یہ کون ہے؟"

"یہ سردار اکبر خان کی بیٹی ہیں۔"

"ثمینہ؟"

"جی ہاں!"

مُراد علی اب نسوانی حسن اور مردانہ وقار کے اس پیکر مجسم کی طرف دیکھنے کی بجائے ایک بھولی بھالی کمسن لڑکی کا تصور کر رہا تھا۔ ثمینہ اس کے پاس سے گزرتی ہوئی ڈاکوؤں کے سردار کے قریب رُکی۔ ایک ثانیہ توقف کے بعد اس نے مُڑ کر تماشائیوں کے ہجوم کی طرف دیکھا اور اچانک اپنی تلوار نیام سے نکالتے ہوئے غضبناک لہجے میں کہا: "یہ ابھی تک زندہ ہے!" اور پھر پلٹ کر اپنا تک سردار پر پے در پے دو وار کر دیے۔ جب اس نے تیسری بار ہاتھ اٹھایا تو مُراد علی نے بھاگ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے کہا: "اب جانے دیجیے وہ مر چکا ہے!"

ثمینہ نے غضبناک ہو کر مُراد علی کی طرف دیکھا لیکن اس کے ہاتھ کی آہنی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گئی۔ چند سوار گھوڑوں سے کُود کر آگے بڑھے۔ لیکن دیہاتیوں نے ان کا راستہ روک لیا اور چلا چلا کر کہنے لگے: "انھوں نے ہماری مدد کی ہے۔ انھوں نے ہماری جان بچائی ہے۔"

ثمینہ غور سے مُراد علی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا غصہ حیرت میں تبدیل ہو رہا تھا۔

اس نے پوچھا: "آپ کون ہیں؟"

"میں مُراد علی ہوں۔"

ثمینہ نے گردن جھکا لی اور مُراد علی اس کا بازو چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ تماشائی دم بخود ہو کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ثمینہ نے دوبارہ مراد علی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں انتقام کی چنگاریوں کی بجائے آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے کہا: "آپ کو معلوم نہیں ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے!"

"مجھے معلوم ہے لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم ......" یہاں تک کہہ کر مُراد علی کی زبان رُک گئی۔

"نہیں آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ان لوگوں نے میرے باپ اور بھائی کو کس حالت میں قتل کیا تھا۔ ورنہ آپ میرا ہاتھ نہ پکڑتے۔"

مُراد علی کا سارا جسم کپکپا اٹھا اور اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا: "مجھے یہ معلوم نہ تھا۔"

ڈھونڈیا داغ نے آگے بڑھ کر مُراد علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "میرے دوست بے لوگوں پر رحم کھانا پاپ ہے۔ اب بتایئے باقی قیدیوں کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟"

مراد علی نے جواب دیا: "مجھے ان کے متعلق فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

ثمینہ نے کہا: "اگر آپ ان لوگوں کی جان بخشی کرنا چاہتے ہیں تو میں اعتراض نہیں کروں گی۔"

مراد علی نے جواب دیا: "یہ لوگ کسی رحم کے مستحق نہیں لیکن میں صرف یہ چاہتا تھا کہ انھیں ادھونی کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔"

ثمینہ نے کہا: "ادھونی کی حکومت کی طرف سے ہمیں ایسے معاملات اپنی پنچایتوں کے سپرد کرنے کی اجازت ہے۔"

ڈھونڈیا داغ نے کہا: "کاش میں آپ کی پنچایت کا فیصلہ دیکھ کر جاتا۔ لیکن اب مجھے دیر ہو رہی ہے۔" پھر وہ مراد علی کی طرف متوجہ ہوا: "میں آپ کی واپسی کا انتظار کروں گا۔ اب

مجھے اجازت دیجیے!

ثمینہ نے پوچھا: "آپ ان کے ساتھ آئے ہیں؟"

"جی ہاں!"

"لیکن آپ مرہٹہ معلوم ہوتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ لیکن ہر مرہٹہ ڈاکو نہیں ہوتا۔"

"آپ نے میرے قبیلے کے لوگوں کی مدد کی ہے میں آپ کی شکرگزار ہوں لیکن آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں۔"

"کس جگہ؟"

"جنگل میں۔ اگر آپ کو کبھی میری مدد کی ضرورت پڑے تو مراد علی کو معلوم ہے کہ میں کہاں رہتا ہوں" ـــــ ڈھونڈیا داغ یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر ثمینہ سے کہا: "گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکو زیادہ دور نہیں گئے اور ان میں سے اکثر اپنے گھوڑے چھوڑ کر پیدل بھاگے ہیں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو ان کا پیچھا کیا جائے؟"

ثمینہ نے جواب دیا: "اب ان کا پیچھا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ جنگل میں داخل ہو چکے ہیں اور شام قریب آ رہی ہے۔ تم بیس آدمیوں کو اس گاؤں کی حفاظت کے لیے چھوڑ دو اور ان قیدیوں کو گاؤں کی پنچایت کے حوالے کر دو۔"

○

گاؤں کے لوگوں سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ثمینہ نے مراد علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "آئیے میں اب واپس جا رہی ہوں۔"

مراد علی نے جواب دیا: "میں اپنے گھوڑے کا انتظار کر رہا ہوں۔"

ثمینہ نے پوچھا: "آپ کا گھوڑا کہاں ہے؟"

"ہم ڈاکوؤں پر حملہ کرنے سے پہلے اپنے گھوڑے یہاں سے تھوڑی دور جنگل میں چھوڑ آئے تھے۔"

ایک دیہاتی نے کہا: "جناب باغ میں ڈاکو کئی گھوڑے چھوڑ گئے تھے۔ آپ کے ساتھی چند گھوڑے لے گئے ہیں لیکن باقی وہیں ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کے لیے ایک اچھا سا گھوڑا لے آؤں؟"

"نہیں ڈاکوؤں کے گھوڑے آپ کے پاس رہیں گے۔ میرا گھوڑا ابھی پہنچ جائے گا۔"

چند منٹ بعد ڈھونڈیا داغ کا ایک ساتھی مراد علی کا گھوڑا لے کر پہنچ گیا اور وہ گاؤں کے لوگوں کی دعائیں لیتا ہوا ثمینہ کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں مختلف بستیوں کے لوگ ان سے جدا ہوتے گئے اور کوئی پانچ میل چلنے کے بعد ان کے ساتھ صرف تیس آدمی رہ گئے۔ مراد علی کے دل و دماغ پر اکبر خان اور شہباز کی موت کا گہرا اثر تھا اور وہ راستے میں ثمینہ یا اس کے کسی ساتھی سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اکبر خان اور شہباز کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں اور اسے اس بات کا قطعاً احساس نہ تھا کہ وہ کس راستے جا رہا ہے، کس سمت جا رہا ہے اور کتنا فاصلہ طے کر چکا ہے۔ ثمینہ جسے اس نے تھوڑی دیر قبل ننگے سر دیکھا تھا۔ اب اپنے سنہری بالوں کو سفید اوڑھنی میں چھپائے ہوئے تھی۔ وہ کبھی کبھی بھاگتے ہوئے گھوڑے سے مڑ کر مراد علی کی طرف دیکھتی لیکن اسے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ ایک ٹیلے کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر دی اور قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے مراد علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "اب ہم پہنچ گئے۔ ہمارا گاؤں اس ٹیلے سے صرف ایک کوس دور ہے۔"

مراد علی نے کہا: "میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ کا گاؤں اس بستی سے زیادہ دور نہیں ہو گا۔"

ثمینہ نے جواب دیا: "وہ بستی سرحد کی طرف ہمارے قبیلے کی آخری آبادی ہے اور ہمارے گاؤں سے کافی دور ہے۔ آپ کی امی جان اور بھائی کا کیا حال ہے؟"

مُراد علی نے جواب دیا "بھائی جان بخیریت ہیں اور امّی جان فوت ہو چکی ہیں۔ آپ کی امّی جان کیسی ہیں؟"

"وہ ٹھیک ہیں۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ بالآخر مُراد علی نے پوچھا "چچا جان اور شہباز کب شہید ہوئے تھے؟"

"انھیں شہید ہوئے چار مہینے ہو چکے ہیں۔"

"تنویر اور ہاشم حیدرآباد میں ہیں؟"

"جی ہاں۔ وہ ابّا جان اور بھائی جان کی شہادت کے بعد آئے تھے اور کوئی ڈیڑھ مہینہ یہاں رہ کر واپس چلے گئے تھے۔"

ٹیلہ عبور کرنے کے بعد ان کے چند اور ساتھی راستے کی ایک بستی میں رُک گئے اور تمیز نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا "اب ہمیں جلد گھر پہنچنا چاہیے۔ امّی جان پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ گاؤں میں پہنچ گئے۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا اور گاؤں کی مسجد سے اذان سُنائی دے رہی تھی۔ مراد علی گھوڑے سے اُترپڑا اور تمیز کی طرف متوجّہ ہو کر بولا "میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔"

ایک آدمی نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور مراد علی اپنے کندھے سے بندوق اُتار کر اس کے حوالے کرنے کے بعد مسجد کی طرف چل دیا۔

تیئسواں باب

مُراد علی نماز سے فارغ ہو کر واپس آیا تو گھر کے چند نوکر ڈیوڑھی پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مُراد علی ان کے ساتھ مُصافحہ کر رہا تھا کہ ایک نوعمر لڑکا بھاگتا ہُوا آیا اور اس نے کہا۔

"جناب آپ کو بیگم صاحبہ نے بُلایا ہے!"

مُراد علی اس کے ساتھ چل دیا۔ مکان کے مردانہ حصّے سے نکل کر وہ اندرونی ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہُوئے۔ کمرے میں چراغ روشن تھا۔ لڑکا واپس چلا گیا اور مُراد علی ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں دیواروں کے ساتھ جگہ جگہ شیروں اور چیتوں کی کھالیں لٹکی ہُوئی تھیں۔ ایک کونے میں لکڑی کا ایک بڑا صندوق پڑا ہُوا تھا۔

اکبر جان کی بیوہ کے ساتھ ملاقات اسے اپنی زندگی کا ایک صبر آزما مرحلہ محسوس ہوتی تھی۔ بلقیس کمرے میں داخل ہُوئی اور مُراد علی نے انتہائی کوشش کے بعد اپنے ذہن میں تسلّی و تشفّی کے جو الفاظ جمع کیے تھے وہ یکسر منتشر ہو کر رہ گئے۔ وہ کُرسی سے اٹھا اور لرزتی ہُوئی آواز میں "چچی جان السلام علیکم" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"بیٹا جیتے رہو!" بلقیس یہ کہہ کر آگے بڑھی اور ایک ثانیہ توقّف کے بعد کُرسی پر بیٹھ گئی۔

مُراد علی نے اس کے سامنے بیٹھتے ہُوئے کہا "چچی جان مجھے ابھی تک چچا جان اور

شہباز خاں کی موت کا یقین نہیں آتا۔"

"بیٹا میں ان کی لاشیں دیکھ کر بھی اپنے آپ کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ زندہ ہیں لیکن موت ایسی حقیقت ہے جسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ ہم سب اس سال حج پر جانے کا ارادہ کر رہے تھے اور تمھارے چچا جان کی یہ خواہش تھی کہ حج پر روانہ ہونے سے پہلے ہم چند دن کے لیے سرنگاپٹم جائیں گے۔ ثمینہ نے مجھے تمھاری امّی جان کی وفات کی خبر سنائی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔"

"چچی جان میں ایک مدت سے یہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔"

بلقیس نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "وہ تمھیں بہت یاد کیا کرتے تھے۔"

"چچی جان مجھے ثمینہ یا گاؤں کے کسی آدمی سے ان کی شہادت کی تفصیلات پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں ان سے اتنی دور تھا۔"

"بیٹا ان کی موت کی تفصیلات بہت دردناک ہیں اور اگر تم یہاں ہوتے بھی تو کیا کر سکتے تھے۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔"

مراد علی کے مزید استفسار پر بلقیس نے اپنے شوہر اور بیٹے کی شہادت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا۔ "ایک دن ہمیں حیدرآباد سے تنویر کے خسر کی وفات کی اطلاع آئی اور اگلے دن ثمینہ کے ابا جان حیدرآباد جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم سب ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے لیکن ان کے سمجھانے پر ہم نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمیں حیدرآباد کے طویل سفر میں شہباز کی تکلیف کا خیال تھا۔ اس کی بینائی اس حد تک زائل ہو چکی تھی کہ وہ بڑی مشکل سے سیاہی اور سفیدی میں تمیز کر سکتا تھا۔ شہباز کے ابا جان نے گاؤں کے چھ آدمی اپنے ساتھ لیے اور علی الصباح حیدرآباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میں آخری بار انھیں رخصت کر رہی ہوں۔

اگلے دن پڑوس کی بستی کا ایک چرواہا دُہائی دیتا ہوا ہمارے گاؤں میں پہنچا اور اس نے یہ اطلاع دی کہ میں نے جنگل میں اپنے سردار اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں دیکھی ہیں۔ آن کی آن میں گاؤں کے لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر چرواہے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے اپنا ہوش نہ تھا اور جب میرے حواس درست ہوئے تو مجھے معلوم ہوا کہ شہباز بھی ان کے ساتھ جا چکا ہے۔ ثمینہ اپنے بھائی کے پیچھے جانے پر بضد تھی لیکن میں نے اسے روک لیا۔

شام کے وقت جب گاؤں کے لوگ واپس آئے تو وہ اپنے گھوڑوں پر تمھارے چچا جان اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ شہباز خان اور چودہ اور آدمیوں کی لاشیں لادے ہوئے تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ وہ یہاں سے چند میل دور جنگل میں پہنچے تو ایک درخت کے ساتھ ثمینہ کے ابا اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں۔ جب وہ درخت سے لاشیں اتار رہے تھے تو پاس ہی کسی طرف گھنی جھاڑیوں کی آڑ سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور ہمارے چند آدمی زخمی ہو کر گر پڑے۔ ہمارے آدمیوں نے جوابی حملہ کیا اور مرہٹے کچھ دیر مقابلہ کرنے کے بعد بھاگ گئے۔ انھوں نے پانچ مرہٹوں کو زندہ گرفتار کر لیا اور ان سے باز پرس کرنے کے بعد پتہ چلا کہ مرہٹوں کی باقاعدہ فوج کے چند آدمی میسور کی جنگ سے فارغ ہونے کے بعد اس طرف آ گئے ہیں اور دوسرے ڈاکوؤں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ دشمن کی پہلی گولی شہباز خاں کے سینے پر لگی تھی اور اس نے گرتے ہی دم توڑ دیا تھا۔

ان کا سایہ اٹھنے کی دیر تھی کہ سرحد پار کے وہ ڈاکو اور لٹیرے جو اس علاقے میں پاؤں رکھنے کی جرأت نہیں کرتے تھے شیر ہو گئے اور انھوں نے دس دن بعد اس علاقے کی ایک بستی پر حملہ کر دیا۔ ہمارے گاؤں کے چند آدمی یہ اطلاع ملتے ہی حملہ آوروں کے مقابلے پر جانے کے لیے تیار ہو گئے لیکن گاؤں کی اکثریت ان کا ساتھ دینے میں پس و پیش کر رہی تھی۔ جب لوگ ہمارے مکان کے سامنے جمع ہو کر بحث کر رہے تھے تو ثمینہ ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد نوکر بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے اور انھوں نے یہ اطلاع دی کہ ثمینہ گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل گئی ہے۔ میں جلدی سے ڈیوڑھی میں پہنچی تو ثمینہ گھوڑے کی زین پر بیٹھی گاؤں کے لوگوں کے سامنے تقریر کر رہی تھی۔ وہ اپنے سردار کی بیٹی کے منہ سے بزدلی اور بے غیرتی کے طعنے برداشت نہ کر سکے اور آن کی آن میں ہر بوڑھا اور جوان لڑائی پر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب وہ سوار ہو کر یہاں سے نکلے تو ثمینہ کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں ڈیوڑھی سے باہر نکل کر اس کا راستہ روک سکتی۔ میں نے ایک نوکر کو اس کے پیچھے روانہ کیا لیکن وہ اس کا ارادہ تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ راستے میں گاؤں کے لوگ بھی اسے سمجھاتے رہے لیکن وہ سب کو یہی جواب دیتی رہی کہ میں سردار اکبر خاں کی بیٹی ہوں اور اپنے قبیلے کے لوگوں کی حفاظت میرا فرض ہے۔

راستے میں کئی اور بستیوں کے لوگ ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور دوپہر کے وقت ہمیں یہ اطلاع ملی کہ لٹیرے تیس لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور دس آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ جب شام کے وقت ثمینہ واپس آئی تو اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ قیدیوں کو اسی درخت کے ساتھ پھانسی دی گئی ہے جہاں اس کے ابا جان اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں پائی گئی تھیں۔

قبیلے کے لوگوں نے اپنے سردار کی موت کے بعد ہمارے خاندان کے ایک با اثر آدمی کے سر پر پگڑی باندھ دی تھی۔ لیکن اس واقعہ کے بعد ثمینہ کا رتبہ سردار سے بلند سمجھا جاتا ہے اور قبیلے کے لوگ اس کے اشاروں پر جان دیتے ہیں۔ ہاشم اور اس کے خاندان کے کئی لوگ تعزیت کے لیے یہاں آئے تھے اور وہ ہمیں اپنے ساتھ حیدرآباد لے جانے پر مصر تھے۔ میں بھی یہ محسوس کرتی تھی کہ اب یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں۔ لیکن قبیلے کے لوگوں کی التجاؤں نے ہمیں اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ نیا سردار ہر گاؤں کے با اثر لوگوں کا ایک وفد لے کر ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اگر آپ لوگ چلے گئے تو ہم میں سے کوئی یہاں رہنا پسند نہ

کرے گا۔ اس علاقے کے لوگوں کا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے ثمینہ کا یہاں رہنا ضروری ہے اور ثمینہ یہ کہتی تھی کہ میں آخر دم تک اپنے قبیلے کا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں کروں گی ـــــ ثمینہ کے ابا جان کہا کرتے تھے کہ میری بھولی بھالی ثمینہ اپنے سینے میں ایک شیر کا دل رکھتی ہے۔ اور آج ہمارا سارا قبیلہ اس کی بہادری کے گیت گاتا ہے۔

شہباز اور اس کے ابا جان کی وفات کے دو مہینے بعد مرہٹوں نے دوبارہ سرحد عبور کر کے ہماری بستیوں کو لوٹنے کی کوشش کی تھی لیکن ثمینہ نے چند خونریز لڑائیوں کے بعد انھیں پھر بھگا دیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر امن رہا لیکن گزشتہ چند دنوں سے ڈاکوؤں نے پھر لوٹ مار شروع کر دی ہے۔"

بلقیس یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی۔ مراد علی نے کہا: "چچی جان آج مجھے بھی ثمینہ کی جرأت نے بہت متاثر کیا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ چچا جان اور بھائی شہباز کی موت کے بعد آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں۔"

"میں بھی یہی سوچتی ہوں لیکن ثمینہ کی مرضی کے خلاف میرے لیے یہ گھر چھوڑنا ممکن نہیں۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ ہمارا یہاں سے جانا اپنے قبیلے کے ساتھ بے وفائی اور بدعہدی کے مترادف ہو گا۔ بیٹا ثمینہ کی کئی باتیں میرے لیے معمہ ہیں۔ بھائی اور باپ کی موت کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے۔ لیکن وہ ہر شام ان کی قبروں پر چراغ جلانے جاتی ہے۔ شہباز عام طور پر اس کمرے میں رہا کرتا تھا اور ثمینہ نے اس کی موت کے بعد اس کی یادگاریں اس کمرے میں جمع کر دی ہیں۔ اس صندوق میں اس کی تلواروں اور بندوقوں کے علاوہ اس کے کپڑے اور جوتے ہیں اور یہ اس کے گھوڑے کی زین ہے اور کمرے کی دیواروں کے ساتھ اس کے شکار کیے ہوئے شیروں اور چیتوں کی کھالیں لٹک رہی ہیں۔ اس کمرے کو ہمیشہ قفل لگا رہتا ہے اور ثمینہ اپنے سوا کسی اور کو اس کی صفائی کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتی۔ لیکن آج میری توقع کے خلاف وہ خود ہی تم کو یہاں ٹھہرانے پر اصرار کر رہی تھی۔

ثمینہ کو شہباز سے بہت پیار تھا اور آنکھوں سے محروم ہو جانے کے بعد تو وہ اس کی

زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی بن چکا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہا کرتی تھی اور اسے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ بینائی سے محروم ہو چکا ہے۔ جب شہباز گھر بیٹھے بیٹھے اُکتاہٹ محسوس کرتا تو ثمینہ اسے سیر کے لیے باہر لے جاتی۔ شروع شروع میں وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کا عادی تھا لیکن بعد میں کسی دِقّت کے بغیر ثمینہ کے پیچھے پیچھے چلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا، "ثمینہ مجھے صرف ایک دُھندلے سے سائے کی طرح نظر آتی ہے لیکن اس کے قدموں کی آہٹ سے میں اپنا راستہ دیکھ سکتا ہوں۔"

بینائی سے محروم ہونے کے باوجود گھوڑے پر سواری کرنے کے لیے شہباز کے شوق میں کمی نہیں آئی تھی۔ شروع شروع میں ہمارا خیال تھا کہ مکمل آرام سے اس کی بینائی واپس آ جائے گی لیکن جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو شہباز کے ابّا جان نے اسے گھوڑے پر سواری کرنے کی اجازت دے دی اور وہ اور ثمینہ ہر روز علی الصباح گھوڑوں پر سیر کیا کرتے تھے۔ ثمینہ کو ہر وقت شہباز کے لیے کوئی نہ کوئی نئی دلچسپی تلاش کرنے کی فکر رہتی تھی۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ شہباز ثمینہ کے ساتھ باہر کے احاطے میں بندوق کے نشانے کی مشق کر رہا ہے اور مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں وہاں پہنچی تو شہباز اور ثمینہ چند نوکروں کے ساتھ صحن میں کھڑے تھے اور ان کے سامنے دیوار کے ساتھ ایک لکڑی کا تختہ لٹکا ہوا تھا۔ شہباز کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ ثمینہ نے ایک پتھر اُٹھایا اور کہا "بھائی جان آپ تیار ہو جائیں"۔ شہباز نے دیوار کی طرف بندوق سیدھی کرتے ہوئے کہا "میں تیار ہوں" —— پھر ثمینہ نے تختے پر پتھر مارا اور شہباز نے آواز سنتے ہی بندوق چلا دی۔ میں نے دیکھا کہ جس جگہ ثمینہ کا پتھر لگا تھا اس کے قریب ہی شہباز کی بندوق کی گولی سے ایک سوراخ ہو گیا ہے۔ ایک نوکر نے خالی بندوق اس کے ہاتھ سے پکڑ لی اور پھر بھری ہوئی بندوق اس کے ہاتھ میں دے دی۔ شہباز نے اسی طرح کئی فائر کیے اور میں کافی دیر وہاں کھڑی دیکھتی رہی۔ جب ثمینہ اسے یہ بتاتی کہ آپ کا نشانہ میرے پتھر سے بالکل قریب لگا ہے تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھتا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ابّا جان بھی وہاں آ گئے۔ انھوں نے یہ تماشا دیکھا تو مسکراتے

ہوئے دبے پاؤں آ کر ہمارے قریب کھڑے ہو گئے۔ شہباز کے چند نشانے دیکھنے کے بعد انھوں نے ایک لمبی چھڑی منگوائی اور کہا۔ "بیٹا اب ثمینہ کی بجائے میں تمھاری رہنمائی کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ دیوار کی طرف بڑھے اور تختے کے قریب کھڑے ہو گئے۔ پھر انھوں نے چھڑی کی نوک سے تختے پر ٹھک ٹھک کرنے کے بعد شہباز کو فائر کرنے کے لیے کہا تو وہ بولا "ابّا جان مجھے آپ کی آواز نشانے کے بالکل قریب سنائی دے رہی ہے۔" انھوں نے جواب دیا "تم میری فکر نہ کرو میں تختے سے کافی دُور ہوں۔ اب تیار ہو جاؤ"۔ یہ کہہ کر انھوں نے دوبارہ ٹھک ٹھک کیا اور شہباز نے گولی چلا دی۔ اس کا یہ نشانہ بالکل صحیح تھا۔ اس کے بعد چند ہفتوں میں شہباز کو اتنی مشق ہو گئی تھی کہ وہ پچاس ساٹھ قدم سے آہٹ سن کر نشانہ لگا سکتا تھا اور ثمینہ اسے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھتی تھی۔

ثمینہ میرے سامنے کبھی اپنے بھائی یا ابّا جان کا ذکر نہیں کرتی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس کی زندگی میری نسبت زیادہ المناک ہے۔ میں اپنی بپتا دوسروں کو سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں لیکن وہ اپنے غم میں کسی کو حصہ دار بنانا پسند نہیں کرتی۔"

ایک نوکر نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا "جناب گاؤں کے لوگ باہر جمع ہو رہے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

بلقیس نے کہا "تم انھیں بٹھاؤ۔ یہ اب کھانا کھا کر جائیں گے۔"

مراد علی نے کہا "چچی جان یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں کھانا کھانے سے پہلے انھیں مل آؤں؟"

"نہیں بیٹا، وہاں تمھیں دیر لگ جائے گی۔ میں کھانا بھیجتی ہوں۔" بلقیس یہ کہہ کر اُٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

○

رات کے دس بجے مراد علی اسی کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ دن بھر کے واقعات اُسے

ایک خواب معلوم ہوتے تھے۔ ثمینہ اس کمسن اور بھولی بھالی لڑکی سے کتنی مختلف تھی جسے اس نے پہلی بار اس گھر میں دیکھا تھا اور جس کے تصور سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجایا کرتی تھی۔ وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ ثمینہ اب بڑی ہوگئی ہوگی۔ اب وہ مجھے دیکھے تو شاید پہچان بھی نہ سکے، اور شاید میں بھی اسے نہ پہچان سکوں، اور چند سال بعد تو اسے میرا نام تک یاد نہ رہے گا —— سرنگاپٹم سے روانہ ہونے کے بعد راستے کی منازل میں اکبر خاں اور شہباز سے اپنی ملاقاتوں کے تصور کے ساتھ کبھی کبھی اس کی آنکھوں کے سامنے ثمینہ کی ایک مبہم سی تصویر آجاتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے یہ بھول جاتا کہ اس کے ماضی اور حال کے درمیان چھ سال کا بُعد حائل ہے اور پھر جب اسے اچانک یہ خیال آتا کہ ثمینہ اب جوان ہو چکی ہوگی اور وہ میرے سامنے آنے سے اجتناب کرے گی تو اسے ایک اُلجھن سی محسوس ہونے لگتی۔

اور اب وہ ثمینہ کو دیکھ چکا تھا لیکن اس کی اُلجھن کم ہونے کی بجائے زیادہ ہو رہی تھی۔ وقت کا یہ انقلاب جس نے اکبر خاں کی بیٹی اور شہباز کی بہن کو پھولوں سے کھیلنے کی بجائے تلوار اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا، مُراد علی کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ بار بار اپنے دل میں کہہ رہا تھا "ثمینہ ثمینہ کاش میں تمام عمر تمہارے گھر کے دروازے پر پہرہ دے سکتا۔ کاش میں انسانیت کے خرمن سے ظلم و وحشت کی وہ آگ بجھا سکتا جس کی حرارت نے تمہیں اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

دیر تک بے چینی کی حالت میں کروٹیں بدلنے کے بعد مُراد علی کو نیند آگئی۔ علی الصباح اس کی آنکھ کھلی تو نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہو کر واپس آیا تو ثمینہ کمرے میں اس کا بستر درست کر رہی تھی۔ وہ بے خیالی کے عالم میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور پریشان سا ہو کر بولا "معاف کیجیے مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ یہاں ہیں۔"

ثمینہ نے بے پروائی سے جواب دیا "میں آپ کا کمرہ صاف کر رہی تھی۔" پھر اس نے ایک کرسی پر پڑے ہوئے چند کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ کپڑے آپ کے لیے ہیں۔"

مُراد علی نے کہا "آپ کو اس تکلیف کی ضرورت نہ تھی۔ میرے گھوڑے کی خورجین میں چند نالتو جوڑے پڑے ہوئے ہیں۔"

ثمینہ نے مُراد علی کی طرف دیکھے بغیر کہا "بھائی جان نے اپنی موت سے پہلے چند کپڑے بنوائے تھے اور وہ اسی طرح پڑے ہوئے ہیں۔ یہ جوڑا میں نے خود تیار کیا تھا۔" ثمینہ یہ کہہ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

مُراد علی نے کہا "ثمینہ ٹھہرو!"

وہ رُک گئی۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں!"

ثمینہ نے مُڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مُراد علی کے خیالات پریشان ہو کر رہ گئے۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا "ثمینہ میں تمہیں بہت یاد کیا کرتا تھا لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ہم ان حالات میں ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔ مجھے تمہارے بھائی اور ابّا جان کی موت کا بہت افسوس ہے۔"

"مجھے معلوم ہے آپ کو ان کے ساتھ بہت محبت تھی اور میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ ادھونی میں آپ نے میرے بھائی کی مدد کی تھی۔ وہ آپ کو بہت یاد کیا کرتے تھے۔"

مُراد علی نے قدرے توقف کے بعد کہا "ثمینہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ حالات میں تمہیں اور چچی جان کو یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ حیدر آباد آپ کے لیے زیادہ محفوظ ہوگا۔ کاش حالات ایسے ہوتے کہ میں آپ کو سرنگاپٹم آنے کی دعوت دے سکتا۔"

ثمینہ نے فیصلہ کُن لہجے میں جواب دیا "ہم یہاں رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور آپ کو ہمارے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔"

مُراد علی کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ثمینہ کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ نڈھال سا ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

مُراد علی کو اپنے قیام کے دوران میں ثمینہ سے کوئی بات کرنے کا موقع نہ ملا لیکن بلقیس صبح شام اس کے پاس آتی اور کئی کئی گھنٹے پُرانے وقتوں کی باتیں کرتی۔ بلقیس کے سامنے بیٹھے بیٹھے جب وہ ثمینہ کے متعلق سوچتا تو اسے اپنے دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس ہونے لگتا۔ اپنے کمرے سے باہر اس کا بیشتر وقت آس پاس کی بستیوں کے اُن لوگوں کے ساتھ ملاقاتوں میں گزرتا تھا جو اسے اپنا محسن خیال کرتے تھے۔ پھر جب وہ واپس آتا تو کبھی کبھی کمرے کی صفائی یا اس کے ساز و سامان کی ترتیب میں معمولی سا تغیر و تبدل اس بات کی گواہی دیتا کہ ثمینہ وہاں آچکی ہے۔ کبھی اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ ثمینہ عمداً اس سے اجتناب کرتی ہے اور اس کا دل تھوڑی دیر کے لیے شکایات سے لبریز ہو جاتا۔ پھر خود ہی ثمینہ کے طرزِ عمل کے جواز میں مختلف دلائل تلاش کرتا۔ "ثمینہ کے دل و دماغ پر اپنے بھائی اور باپ کی موت کا گہرا اثر ہے اور میں نے یکایک اسے گاؤں سے ہجرت کا مشورہ دے کر خفا کر دیا ہے!"

پھر وہ تصور کے عالم میں ثمینہ کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا: "ثمینہ میرا مطلب یہ نہ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم بہت بہادر ہو۔ تمھاری رگوں میں ایک غیور باپ کا خون ہے۔ لیکن تم ایک لڑکی ہو اور قدرت نے تمھیں آگ کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ میں تم سے یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ تمھارے لیے یہ گاؤں محفوظ نہیں۔"

پانچویں روز وہ عشا کی نماز پڑھ کر گاؤں کی مسجد سے واپس آیا تو وہ کمسن لڑکا جو اس کے لیے صبح و شام کھانا لایا کرتا تھا اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ مُراد علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا: "تم جاؤ اور چچی جان سے کہو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

لڑکا "بہت اچھا جناب!" کہہ کر چلا گیا اور مُراد علی اپنے کمرے میں داخل ہُوا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بے چینی کی حالت میں کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا کہ بلقیس اندر داخل

ہُوئی اور اس نے کہا: "کیا بات ہے بیٹا؟"

"چچی جان تشریف رکھیے!"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور مُراد علی نے اس کے سامنے دُوسری کرسی پر بیٹھتے ہُوئے کہا "چچی جان معاف کیجیے میں نے اس وقت آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اب واپس جانا چاہتا ہُوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں؟"

"نہیں بیٹا اتنی جلدی نہ کرو!"

"چچی جان میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے خوشی سے اجازت دیں۔"

"میں تمھیں مجبور نہیں کر سکتی لیکن تم چند دن اور نہیں ٹھہر سکتے؟ —— تمھیں یہاں دیکھ کر میں اپنے بہت سے غم بھول گئی تھی۔"

"چچی جان آپ جانتی ہیں کہ مجھے یہاں سے جانے سے خوشی نہیں ہو گی لیکن یہ ایک مجبوری ہے۔"

"بہت اچھا بیٹا لیکن یہ وعدہ کرو کہ تم ہمیں بھول نہیں جاؤ گے!"

"چچی جان میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہُوں۔" مُراد علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے بالآخر مراد علی نے کہا "چچی جان میں نے ثمینہ سے اس دن کہا تھا کہ آپ کے لیے حیدر آباد چلے جانا بہتر ہو گا۔ لیکن وہ شاید میری باتوں سے ناراض ہو گئی ہے۔"

"نہیں بیٹا وہ تم سے ناراض نہیں۔ وہ یہ جانتی ہے کہ دُنیا میں تم سے زیادہ ہمارا کوئی خیر خواہ نہیں۔ لیکن ابھی تک اس کے دل و دماغ پر اپنے بھائی اور ابّا جان کی موت کا بہت گہرا اثر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصہ تک اس کی طبیعت سنبھل جائے گی۔"

مُراد علی نے کہا: "چچی جان مجھے سب سے زیادہ اس بات کا افسوس ہے کہ میں آپ کو سرنگاپٹم آنے کی دعوت نہیں دے سکتا۔ گزشتہ جنگ کے بعد ہم میسور کے اُفق پر ایک نئے طوفان کے آثار دیکھ رہے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اس طوفان سے سرخرو ہو کر نکلیں گے اور میں کسی دن صرف آپ اور ثمینہ ہی کو نہیں بلکہ آپ کے قبیلے کے ہر فرد کو یہ خوشخبری دینے کے لیے آؤں گا کہ

اب میسور کی سرزمین ہر مسلمان کے بہترین جائے پناہ ہے۔"

مُراد علی اور بلقیس کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ بالآخر بلقیس نے اٹھتے ہُوئے کہا "بیٹا تمھیں صبح سفر کرنا ہے۔ میں صبح تم کو رخصت کرنے آؤں گی۔"

"نہیں چچی جان آپ تکلیف نہ کریں میں پچھلے پہر روانہ ہو جاؤں گا۔"

بلقیس کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی۔ پھر اس نے آبدیدہ ہو کر کہا "بیٹا دوبارہ کب آؤ گے؟"

"چچی جان اگر میسور کے حالات بہتر ہو گئے تو میں بہت جلد آؤں گا۔ ممکن ہے کہ میرے ساتھ بھائی اور بھابی جان بھی آئیں۔ آپ دُعا کیا کریں کہ جنگ کا خطرہ ٹل جائے۔"

"اپنے بھائی اور بھابی جان کو میرا سلام کہنا!"

"بہت اچھا۔"

"اچھا بیٹا خدا حافظ!" ان الفاظ کے ساتھ بلقیس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

"خُدا حافظ چچی جان!"

بلقیس اپنے آنسو پونچھتی ہُوئی باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد ایک کمسن نوکر کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے کہا "جناب بی بی جی کہتی ہیں آپ صبح جا رہے ہیں؟"

"ہاں میں پچھلے پہر چاند نکلتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"بہت اچھا میں آپ کو جگا دُوں گا۔"

"مجھے جگانے کی ضرورت نہیں۔ تم باہر نوکروں سے کہہ دو کہ وہ چاند نکلتے ہی میرا گھوڑا تیار کر دیں اور یہ فالتو کپڑے لے جاؤ میری خرجین میں ڈال دو۔"

نوکر نے دیوار کی کھونٹیوں سے کپڑے اکٹھے کرنے کے بعد کہا "جناب اگر پچھلے پہر آپ کی آنکھ نہ کھلے تو مجھے کیا کرنا چاہیے ــــــ بیگم صاحبہ خفا ہوں گی کہ میں نے آپ کو جگایا نہیں۔"

مُراد علی مُسکرایا "تم جا کر اطمینان سے سو جاؤ ــــــ لیکن ٹھہرو!" اس نے اپنی جیب میں

ہاتھ ڈال کر ایک اشرفی نکالی اور آگے بڑھ کر کچھ کہے بغیر نوکر کی جیب میں ڈال دی۔"

کمسن لڑکے نے سراپا احتجاج بن کر کہا "نہیں جناب میں یہ نہیں لوں گا۔"

"وہ کیوں؟"

"جناب اگر ثمینہ بی بی کو پتہ چلا تو وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گی۔"

مُراد علی نے اُسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلتے ہُوئے کہا "تم فکر نہ کرو ثمینہ بی بی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

○

پچھلے پہر مُراد علی تیار ہو کر کمرے سے نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دروازے سے باہر کسی کے پاؤں کی ہلکی سی آہٹ سُنائی دی۔ پھر آہستہ آہستہ سے نیم وا دروازے کا ایک کواڑ کھُلا اور ثمینہ ایک ثانیہ جھانکنے کے بعد جھجکتی ہُوئی اندر داخل ہُوئی۔ مُراد علی چند لمحے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں کھڑا رہا۔ ثمینہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں ــــــ اور مجھے اس بات کا افسوس تھا ــــــ کہ میں جانے سے پہلے تمھیں نہیں دیکھ سکوں گا۔"

ثمینہ نے کہا "رات امی جان نے مجھے بتایا تھا کہ آپ جا رہے ہیں اور میں اسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتی تھی لیکن پھر سوچا کہ آپ کے آرام کا وقت ہے ــــــ میں آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں آپ سے خفا نہیں ہُوں۔"

مُراد علی کا دل اب شکایات کی بجائے تشکر کے جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ثمینہ بیٹھ جاؤ! میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہُوں۔"

ثمینہ نے ایک ثانیہ کے لیے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور قدرے تذبذب کے بعد آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

مُراد علی نے مغموم لہجے میں کہا۔" سرنگا پٹم سے روانہ ہوتے وقت یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میں تمھیں اس حال میں دیکھوں گا۔ ثمینہ، اس وقت ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جب مستقبل کے متعلق کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ تاہم میں اس اُمید کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو رہا ہوں کہ جب میں دوبارہ آؤں گا تو یہاں کے حالات بدل چکے ہوں گے اور میں تمھارے چہرے پر پھر ایک بار وہ مسکراہٹیں دیکھ سکوں گا جو میں نے کئی برس قبل دیکھی تھیں۔"

ثمینہ نے کہا۔" میرا خیال کہ آپ چند دن اور یہاں ٹھہریں گے۔"

"کاش میسور کے حالات ایسے ہوتے کہ میں باقی تمام عمر اطمینان کے ساتھ یہاں گزار سکتا لیکن جن فرائض کے احساس نے تمھیں یہاں رہنے پر مجبور کر دیا ہے وہی مجھے سرنگا پٹم بلا رہے ہیں۔ تم ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی ہو اور میں میسور کے حکمران کا سپاہی ہوں۔ تمھیں زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے ساتھ اس لیے محبت ہے کہ اس پر تمھارے باپ اور تمھارے بھائی کا خون گرا ہے اور مجھے اس سلطنت کے ساتھ محبت ہے جس کے پرچم کی حفاظت کے لیے میرے والد اور میرے دو بھائی جانیں دے چکے ہیں۔ ہم دونوں یکساں بے بس اور مجبور ہیں لیکن اگر حالات نے اجازت دی تو میں ضرور آؤں گا اور اگر میں دوبارہ یہاں نہ آ سکا تو یہ نہ سمجھنا کہ میں تمھیں بھول چکا ہوں۔ میں آگ اور خون کے طوفانوں میں کھڑا ہو کر بھی اکبر خاں کی بیٹی اور شہباز کی بہن کے لیے دعائیں کیا کروں گا۔"

ثمینہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ اس نے مراد علی کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ثانیہ کے لیے زندگی کی تمام حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ چکی تھیں۔ پھر اس نے ایک ہچکی لی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔" میں مرتے دم تک آپ کی راہ دیکھتی رہوں گی۔"

مُراد علی نے کمرے کے ایک کونے سے اپنی بندوق اُٹھا کر گلے میں ڈالتے ہوئے "خدا حافظ" کہا۔ لیکن ثمینہ دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی۔ مراد علی دروازے کی طرف بڑھا۔

رکا ــــ پھر تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

ثمینہ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ صحن عبور کرتے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہو چکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور سسکیاں لیتی ہوئی بستر پر گر پڑی۔

"ثمینہ ثمینہ!" کمرے کے دوسرے کونے سے بلقیس کی آواز آئی۔

ثمینہ انتہائی کوشش کے باوجود اپنی سسکیاں ضبط نہ کر سکی۔ بلقیس اپنے بستر سے اٹھی اور اس کے قریب آ کر بولی۔" ثمینہ کیا ہوا؟ تم رو رہی ہو!"

ثمینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔" امی جان وہ جا چکے ہیں۔"

بلقیس ثمینہ کا سر اپنی گود میں لے کر بیٹھ گئی اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔" وہ پھر آئے گا بیٹی ــــ وہ ضرور آئے گا۔"

ثمینہ نے کہا۔" امی جان!"

"ہاں بیٹی!"

"امی جان آپ غلط کہتی تھیں وہ مجھ سے خفا نہیں تھے۔"

"نہیں بیٹی، میں نے یہ کہا تھا کہ تمھاری باتوں نے شاید اسے پریشان کر دیا۔"

○

اڑھائی ماہ بعد مُراد علی اور غازی خاں شاہی محل کے ایک کشادہ کمرے میں چند اور ملاقاتیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک افسر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے غازی خاں کو سلام کرنے کے بعد کہا۔" جناب تشریف لائیے۔"

غازی خاں نے کرسی سے اُٹھ کر مُراد علی کی طرف دیکھا اور کہا۔" تم یہیں ٹھہرو اگر ضرورت ہوئی تو تمھیں اندر بلا لیا جائے گا۔"

غازی خاں فوجی افسر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا اور مُراد علی کچھ دیر پریشانی اور اضطراب کی حالت میں بیٹھا رہا۔ کوئی دس منٹ بعد وہی افسر دوبارہ کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے مُراد علی سے مخاطب ہو کر کہا: "آیئے!"

مُراد علی کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چل دیا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ایک کُشادہ کمرے میں داخل ہُوئے۔ مراد علی کا رہنما ایک کمرے کے دروازے پر رُکا اور اس نے کہا: "آپ اندر تشریف لے جائیں۔"

مُراد علی کو یہ اُمید نہ تھی کہ غازی خاں کے ساتھ اسے بھی سُلطان کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ اس کا اضطراب اب خوف میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ جھجکتا ہُوا کمرے کے اندر داخل ہُوا۔ میسُور کا حکمران اپنی مسند پر رونق افروز تھا اور غازی خاں اس کے سامنے بیٹھا ہُوا تھا۔

مراد علی نے سلام کیا اور مؤدّب کھڑا ہو گیا۔

سلطان نے کسی توقف کے بغیر سوال کیا: "تم نے ڈھونڈیا واغ کو کہاں دیکھا تھا؟"

"عالی جاہ! مَیں اسے ادھونی کے ایک جنگل میں ملا تھا۔"

"تم وہاں کیسے گئے تھے؟"

"عالی جاہ! اس علاقے کے ایک خاندان کے ساتھ ہمارے دیرینہ مراسم ہیں اور مَیں ان کے پاس گیا تھا۔"

سُلطان نے کہا: "ڈھونڈیا واغ ایک خُودسر آدمی ہے اور تمھیں غازی بابا کو میرے پاس اس کی سفارش کے لیے نہیں لانا چاہیے تھا۔"

مُراد علی کا دل بیٹھ گیا۔ تاہم اس نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہُوئے کہا: "عالی جاہ! وہ ایک اچھا سپاہی ہے اور اپنی سابقہ غلطیوں پر پشیمان ہے۔"

"ڈھونڈیا واغ ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنی غلطیوں پر پشیمان ہُوا کرتے ہیں۔"

"عالی جاہ! اب میسُور کے سوا اس کے لیے کوئی اور جائے پناہ نہیں۔"

"بیٹھ جاؤ!" سُلطان نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

مُراد علی غازی خاں کے قریب ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔

سُلطان کچھ دیر سوچتا رہا، بالآخر اس نے کہا: "میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اس کی خدمات کا لحاظ ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"عالی جاہ! وہ ادھونی کی طرف ہماری سرحد پر آپ کے حکم کا انتظار کر رہا ہے۔"

سُلطان نے کہا: "تم اُسے ہماری طرف سے یہ پیغام بھیج دو کہ وہ سرنگاپٹم آ سکتا ہے لیکن یہ اس کے لیے آخری موقع ہو گا۔ اگر اس نے دوبارہ کوئی غلطی کی تو اسے وہی سزا دی جائے گی جو ایک عام سپاہی کو دی جاتی ہے۔ ہم میر نظام علی، انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ آخری دم تک صلح نبھانا چاہتے ہیں۔"

مُراد علی کا چہرہ مسرت سے چمک اُٹھا اور اس نے کہا: "عالی جاہ! مَیں ڈھونڈیا واغ کے دو آدمی اپنے ساتھ لایا تھا۔ اگر حکم ہو تو انھیں آج ہی یہ پیغام دے کر واپس بھیج دُوں؟"

"بہت اچھا۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر ڈھونڈیا واغ نے پھر کوئی غلطی کی تو غازی بابا دوبارہ میرے پاس اس کے لیے سفارش لے کر نہیں آئیں گے۔"

"عالی جاہ! وہ اپنے طرزِ عمل پر بہت پشیمان ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ اس سے ایسی غلطی نہیں ہو گی۔"

مُراد علی اور غازی خاں اُٹھے اور ادب سے سلام کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئے۔

مُراد علی نے کہا: "جناب میں آپ کا بہت شکر گزار ہُوں۔"

غازی خاں نے بے پروائی سے جواب دیا: "بیٹا تمھیں شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں۔ مَیں نے تمھارے لیے کچھ نہیں کیا۔ صرف اپنی فوج کے لیے ایک بہادر سپاہی کی سفارش کی ہے۔ ڈھونڈیا واغ کو میری طرف سے بھی یہ پیغام دو کہ میرے دستوں میں ایک تجربہ کار افسر کی

جگہ خالی ہے۔"

چھ ہفتے بعد سرنگاپٹم کی گلیوں اور بازاروں میں اس بات کا چرچا ہو رہا تھا کہ ڈھونڈیا واغ واپس آگیا ہے اور اسے اور اس کے دو سو ساتھیوں کو دوبارہ سلطان کی فوج میں ملازمت مل گئی ہے ——— پھر چند دن بعد یہ خبر سُنی گئی کہ ڈھونڈیا واغ اور اس کے کئی ساتھی مسلمان ہو چکے ہیں اور اب اس نڈر سپاہی کو ڈھونڈیا واغ کی بجائے ملک جہان خاں کے نام سے پکارا جائے گا۔

چوبیسواں باب

جنگ کے بعد سلطان کی تمام تر توجہ سلطنت کے انتظام اور رعایا کی ترقی اور خوش حالی کے کاموں پر مرکوز ہو چکی تھی۔ لیکن میر نظام علی نے کرنول کا جھگڑا کھڑا کر کے پھر ایک ناخوشگوار صورت حال پیدا کر دی تھی۔ ابتدا میں میر نظام علی کو یہ توقع تھی کہ کرنول پر اپنا حق جتانے کے لیے وہ انگریزوں اور مرہٹوں کی تائید حاصل کر سکے گا لیکن مرہٹے نظام کی خاطر سلطان ٹیپو کے ساتھ بگاڑ پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوتے اور سرجان شور بھی صرف نظام کے فائدے کے لیے سلطان کے ساتھ الجھنے پر تیار نہ تھا۔ تاہم میر نظام علی کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر وہ زبردستی کرنول پر قبضہ کر لے تو سلطان ٹیپو ایک نئی جنگ کے خوف سے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اور اگر اس مسئلہ پر جنگ چھڑ گئی تو انگریز اور مرہٹے اپنی مرضی کے خلاف بھی اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

۱۷۹۵ء کے آغاز میں سلطان پر دباؤ ڈالنے کے لیے میر نظام علی کے لشکر نے نقل و حرکت شروع کر دی اور سلطان کی پریشان حال رعایا کو پھر ایک بار میسور کے افق پر جنگ کے بادل دکھائی دینے لگے۔ لیکن ایک دن میر نظام علی حیرت و استعجاب کے عالم میں یہ خبر سُن رہا تھا کہ مرہٹوں کی ٹڈی دل فوج پیش قدمی کر رہی ہے اور اس مرتبہ اس کا رُخ سرنگاپٹم کی بجائے

حیدر آباد کی طرف ہے۔ پھر چند دن بعد اسے یہ اطلاع ملی کہ وحشت و بربریت کا یہ سیلاب دکن کی سرحد عبور کر چکا ہے۔ میر نظام علی کو بادلِ ناخواستہ میدان میں آنا پڑا۔ مرہٹوں نے اسے عبرتناک شکست دی اور صلح کے لیے انتہائی توہین آمیز شرائط ماننے پر مجبور کر دیا۔ وہ مشیر الملک کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لے گئے اور میر عالم اس کی جگہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہُوا۔

جنگ کے اختتام سے ایک ہفتہ بعد میر عالم اور امتیاز الدولہ نظام کی مسند کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور میر نظام علی انتہائی اضطراب کی حالت میں میر عالم سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ "تم کہتے تھے کہ ہم کرنول پر زبردستی قبضہ کر لیں تو مرہٹے اور انگریز ہماری دیکھا دیکھی میسور کے چند اور علاقوں کا مطالبہ کر دیں گے پھر جب مرہٹہ فوج کی نقل و حرکت کی خبر آئی تو تم مجھے یہ خوشخبری سُنا رہے تھے کہ مرہٹے میسور کے کسی علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے ہم سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد جب یہ اطلاع آئی کہ ان کا رُخ ہماری طرف ہے تو بھی تم پورے وثوق کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ انگریز ہمارے خلاف ان کی کوئی زیادتی برداشت نہیں کریں گے سرجان شور بہت اچھا آدمی ہے اور وہ مرہٹوں کے حملے کی خبر سُنتے ہی ہماری مدد کے لیے فوج روانہ کر دے گا۔ اب تم ایک ہفتہ سے ہمیں یہ اُمید دلا رہے ہو کہ انگریز مرہٹوں کے خلاف ہمارے ساتھ دفاعی معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ تم کینا وے کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تمھاری بات چیت کا نتیجہ کب ظاہر ہوگا؟"

میر عالم نے کہا: "عالی جاہ سرجان کیناوے ابھی حضور کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے"

امتیاز الدولہ نے کہا: "عالی جاہ کینا وے کی حاضری ہماری شکست کا بدل نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہے گا کہ سرجان شور کو ان واقعات کا بہت افسوس ہے اور میں اس کی زبان سے یہ فقرہ کئی بار سُن چکا ہُوں۔"

میر عالم نے انتہائی غصّے کی حالت میں امتیاز الدولہ کی طرف دیکھا اور پھر میر نظام علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "عالی جاہ دکن پر مرہٹوں نے یہ حملہ سُلطان ٹیپو کے ایما پر کیا ہے۔ انگریز

مرہٹوں کے عزائم سے بے خبر تھے ورنہ وہ ضرور مداخلت کرتے۔ ہم نے اس جنگ میں بہت نقصان اٹھایا ہے لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہو گا کہ انگریز کرنول پر ہمارا حق تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ میں کینا وے سے یہ بات منوا چکا ہوں کہ سُلطان ٹیپو در پردہ مرہٹوں کا حلیف بن چکا ہے۔"

امتیاز الدولہ نے غصّے سے کانپتے ہُوئے کہا: "مجھے یقین ہے کہ جب میسُور کے ساتھ ایک نئی جنگ لڑنے کے لیے انگریزوں کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو وہ میر عالم کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہو جائیں گے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ جنگ جیتنے کے بعد میسُور کے مفتوحہ علاقوں پر حق نہیں جتائیں گے ——؟ عالی جاہ میں ایک بار پھر یہ عرض کرتا ہوں کہ جنوبی ہندوستان میں سُلطان ٹیپو کے سوا دکن کا کوئی دوست نہیں، آج مرہٹے بھی یہ حقیقت سمجھ چکے ہیں کہ انھوں نے گزشتہ جنگ میں سلطان ٹیپو کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینے میں غلطی کی تھی۔ لیکن ہم تک اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز نہیں کر سکے۔"

ایک افسر کمرے میں داخل ہُوا اور اس نے کورنش بجا لانے کے کہا: "عالی جاہ سرجان کیناوے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں؟"

"انھیں کہو کہ ہم ایک گھنٹے سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔"

افسر فرشی سلام کرنے کے بعد کمرے سے نکل گیا۔ چند ثانیے بعد سرجان کیناوے اندر داخل ہُوا اور نظام سے مصافحہ کرنے کے بعد میر عالم کے سامنے ایک کُرسی پر بیٹھتے ہُوئے بولا: "یور ہائی نس مجھے ابھی یہ اطلاع ملی ہے کہ مدراس کی حکومت نے پیشوا اور نانا فرنویس کو احتجاجی مراسلے بھیج دیے ہیں۔"

امتیاز الدولہ نے کہا: "جناب ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ لیکن احتجاجی مراسلوں سے کیا ہو گا؟"

"مجھے یقین ہے کہ مرہٹے دوبارہ ایسی جرأت نہیں کریں گے۔"

"اگر آپ کے احتجاجی مراسلات میں اتنا اثر ہے تو آپ کو جنگ سے پہلے یہ تکلیف کرنی چاہیے تھی۔"

کیناوے نے امتیاز الدولہ کی طرف توجہ دینے کی بجائے نظام سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یور ہائی نس میں آپ کو ایک اور خوشخبری سناتا ہوں۔ مجھے پونا سے یہ اطلاع ملی ہے کہ مرہٹہ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔"

امتیاز الدولہ نے پھر کہا۔ "مرہٹہ سرداروں کی پھوٹ ہماری عزت اور آزادی کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی وقت بھی متحد ہو سکتے ہیں۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آئندہ اگر وہ دکن پر حملہ کر دیں تو آپ کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟"

کیناوے نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ مرہٹے دوبارہ ایسا اقدام نہیں کریں گے۔"

میر نظام علی نے کہا۔ "مرہٹوں کو آئندہ ایسے اقدام سے باز رکھنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ ہمارے درمیان ایک دفاعی معاہدہ ہو جائے اور اگر آپ پسند کریں تو سلطان ٹیپو کو بھی اس معاہدے میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ مرہٹوں نے ہمیں سلطان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا ہے۔"

کیناوے نے کہا۔ "سلطان ٹیپو آپ کے ساتھ صرف ایک شرط پر دفاعی معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہوگا اور وہ یہ کہ آپ اس کے مقبوضہ علاقے اسے واپس کر دیں اور میرے خیال میں یہ شرط آپ کے لیے کسی صورت بھی قابلِ قبول نہیں ہوگی۔"

میر نظام علی سوچ میں پڑ گیا۔ امتیاز الدولہ نے کہا۔ "اگر سلطان ٹیپو اپنے علاقوں کا مطالبہ کیے بغیر ہمارے ساتھ معاہدہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا؟"

کیناوے نے جواب دیا۔ "پھر ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ اس معاہدے کے خلاف مرہٹوں کا ردِ عمل کیا ہوگا۔"

کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی اور نظام انتہائی بے بسی اور اضطراب کی حالت میں کیناوے کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر کیناوے نے کہا۔ "یور ہائی نس آپ کو ہم پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ مرہٹوں پر ہمارا احتجاج بے اثر ثابت نہیں ہوگا اور اگر وہ راہِ راست پر نہ آئے تو ہم پوری دیانت داری سے آپ کا ساتھ دیں گے۔"

میر نظام علی نے کہا۔ "لیکن آپ کو ہمارے ساتھ دفاعی معاہدہ کرنے میں کیا اعتراض ہے؟"

"ہمیں صرف یہ ڈر ہے کہ ایسا معاہدہ مرہٹوں کو برانگیختہ کر دے گا اور وہ ٹیپو کے ساتھ مل جائیں گے۔"

نظام نے کہا۔ "لیکن اگر سلطان ٹیپو ہمارے ساتھ معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو پھر آپ کا یہ خدشہ دُور نہیں ہو جاتے گا؟"

"نہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ مرہٹے ہماری نیت پر شک کرنے لگ جائیں گے۔ ہم اس بات کا ذمہ لینے کے لیے تیار ہیں کہ مرہٹے آپ کے ساتھ آئندہ کبھی لڑائی نہیں کریں گے۔ لیکن کمپنی سلطان ٹیپو کے ساتھ دفاعی معاہدہ کر کے مرہٹوں کے خلاف فریق بننے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔"

سر جان کیناوے کوئی ایک گھنٹہ میر نظام علی کے ساتھ بحث کرنے کے بعد چلا گیا اور میر نظام علی نے امتیاز الدولہ سے کہا۔ "امتیاز تم آج ہی سلطان ٹیپو کو یہ پیغام بھیج دو کہ ہم ان کے ساتھ دفاعی معاہدہ کی بات چیت کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

چند ہفتے بعد سلطان ٹیپو کے ایلچی حیدر آباد پہنچ چکے تھے اور میر نظام علی کے ساتھ ان کی طویل ملاقاتیں شروع ہو چکی تھیں۔ سلطان ٹیپو میر نظام علی کی تمام سابقہ غلطیاں بھول جانے پر آمادگی ظاہر کر چکا تھا لیکن نظام علی سلطان کی طرف اپنا میلان ظاہر کر کے صرف

انگریزوں کی منڈی میں اپنی قیمت بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ ایک طرف سلطان کے ایلچیوں سے ملاقاتیں کر رہا تھا اور دوسری طرف اس کے جاسوس سر جان کینا وے کو متاثر کرنے کے لیے اس قسم کی افواہیں پھیلا رہے تھے کہ میسور کا حکمران میر نظام علی کو انگریزوں کے خلاف اُکسا رہا ہے اور اس بات کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں کہ دکن اور میسور کی حکومتیں مرہٹوں کے علاوہ انگریزوں کے خلاف بھی کوئی دفاعی معاہدہ کر لیں۔ لیکن میر نظام علی کی منافقانہ روش زیادہ عرصہ سلطان ٹیپو کو دھوکا نہ دے سکی اور اس نے اپنے ایلچیوں کو واپس بلا لیا۔

○

گزشتہ جنگ میں آدھی سلطنت کی آمدنی سے محروم ہو جانے کے باوجود میسور کا عظیم معمار چند سال کے اندر اندر پھر ایک بار ایسٹ انڈیا کمپنی اور اپنے ہمسایہ حکمرانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر چکا تھا۔ سرنگا پٹم، چیتل ڈرگ، بنگلور، بدنور اور میسور کے دوسرے شہروں میں لاتعداد کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ ان کارخانوں کی مصنوعات مشرق کی منڈیوں میں یورپ کے مال سے زیادہ مقبول تھیں۔

تجارت کے میدان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سلطان بیرونی ممالک میں تجارت خانے قائم کر رہا تھا۔ میسور کے شہروں میں فرانس، ترکی، عرب، ایران، چین اور آرمینیہ کے کئی تاجر آباد ہو چکے تھے۔ اپنی رعایا کو تجارت کی طرف مائل کرنے کے لیے سلطان نے حکومت کی نگرانی میں ایک تجارتی کمپنی[1] قائم کی تھی جس میں ہر آدمی حصہ دار بن سکتا تھا۔

[1] اس کمپنی کے قیام کا مقصد امراء کی بجائے معمولی حیثیت کے لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچانا تھا مثلاً جو لوگ اس کمپنی میں پانچ ہزار سے زیادہ روپیہ لگاتے تھے انھیں ہر سال ۱۲ فیصد منافع ملتا تھا۔ اور جو لوگ پانچ ہزار تک لگاتے تھے انھیں ۲۵ فیصد منافع ملتا تھا لیکن پانچ (باقی اگلے صفحہ پر)

زراعت کے میدان میں بھی سلطنتِ خداداد ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کہیں آگے تھی۔ باقی ریاستوں میں لاکھوں کسان چند بڑے زمینداروں یا جاگیرداروں کے لیے عیش و آرام کا سامان مہیا کرتے تھے۔ لیکن میسور میں نئے نئے زرعی منصوبوں سے جو اراضیات آباد ہوتی تھیں ان پر کاشت کاروں کا حق مقدم سمجھا جاتا تھا اور بڑے بڑے زمینداروں کی فالتو اراضیات بھی کاشت کاروں میں تقسیم کی جا رہی تھیں۔

اپنے محدود وسائل سے سلطان ایک بڑی فوج رکھنے کے قابل نہ تھا۔ تاہم میسور کی تیسری جنگ کے بعد سلطان نے ملک کی دفاعی اور تجارتی ضرورت کے پیشِ نظر بڑی شدت کے ساتھ اپنے بحری بیڑے کو مضبوط بنانے کی کوشش کی چنانچہ منگلور اور واجد آباد کی گودیوں میں اس نے نئے جنگی اور تجارتی جہاز تعمیر کرنے کا حکم دیا اور ایک قلیل مدت میں میسور کے بحری بیڑے میں بائیس جنگی اور بیس تجارتی جہازوں کا اضافہ ہو چکا تھا اور ان جہازوں کے ماڈل سلطان نے خود تیار کیے تھے۔

میسور کے دشمن سلطان کی آدھی سلطنت چھیننے کے بعد یہ سمجھتے تھے کہ اب وہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہا اور اب اسے اپنی رعایا کے معاشی اور اقتصادی مسائل ہمیشہ پریشان رکھیں گے۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران تھے کہ میسور میں پھر ایک بار ولولوں کی نئی دنیا آباد ہو رہی ہے۔ اہلِ میسور کے وہ زخم جنھیں وہ دائمی ناسور خیال کرتے تھے مندمل ہو چکے تھے۔ وہ قافلہ جسے انھوں نے بھیانک تاریکیوں کی آغوش میں دھکیل دیا تھا ایک ناقابلِ یقین عزم و استقلال کے ساتھ اپنے روشن مستقبل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انھوں نے جن بستیوں کو ویران کر دیا تھا وہ دوبارہ آباد ہو رہی تھیں۔ میسور کے چرواہے، کسان، مزدور، سپاہی،

بقیہ فٹ نوٹ: سے پانچ سو تک کے حصہ داروں کو ہر سال ۵۰ فیصد منافع دیا جاتا تھا۔ ملک کے پسماندہ طبقے کو سرکاری اعانت کا زیادہ مستحق سمجھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ میسور میں ادنیٰ اور اعلیٰ طبقوں میں جو خلا تھا اُسے پُر کرنے کے لیے ایک متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔

تاجر اور صنعت کار پھر ایک بار زبانِ حال سے یہ کہہ رہے تھے کہ "میسور ہمارا ہے"!

اور انگریز یہ محسوس کر رہے کہ ہندوستان میں ان کے راستے کا آخری حصار پھر مضبوط ہو رہا ہے۔ اب دِلّی تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ قلعہ ہمیشہ کے لیے مسمار کر دیا جائے۔

سلطان ٹیپو کے خلاف انگریزوں کے نئے جارحانہ عزائم میں کچھ بیرونی محرکات بھی شامل تھے۔ نپولین بوناپارٹ کے عروج کے ساتھ فرانس کے تنِ مُردہ میں ایک نئی رُوح بیدار ہو رہی تھی۔ اس جوان سال جرنیل کی قیادت میں فرانس کی افواج آسٹریا کے شہنشاہ کو شکست دینے کے بعد اطالیہ پر اپنی فتوحات کے پرچم نصب کر چکی تھیں۔ ایک کمزور اور مفلوج بادشاہت کے خاتمے کے بعد فرانس کو ایک اولوالعزم لیڈر مل چکا تھا۔ نپولین نے ایک ہی یلغار میں یورپ میں طاقت کا توازن درہم برہم کر دیا تھا اور انگریز مشرق و مغرب میں اپنے اقتدار کے لیے ایک نیا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ یورپ میں نپولین کے ساتھ اُلجھنے کی صُورت میں ان کے لیے اپنے ہندوستانی مقبوضات کی حفاظت مشکل ہو جائے گی اور سلطان ٹیپو اپنی رہی سہی قوت کے ساتھ بھی ان کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن سکتا ہے۔ چنانچہ سرجان شور کے ریٹائر ہونے کے بعد انھیں ہندوستان میں اپنے سامراجی مقاصد کو تقویت دینے کے لیے کسی مضبوط اور ہوشیار آدمی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ مضبوط اور ہوشیار آدمی جس میں ایک سامراجی بھیڑیے کے تمام خصائل بدرجہ اتم موجود تھے، رچرڈ ولزلی (ارل آف مارننگٹن) تھا۔

○

ولزلی گورنر جنرل کے عہدے کا چارج لیتے ہی کسی تاخیر کے بغیر میسور پر دھاوا بولنے کے لیے بے تاب تھا۔ چنانچہ اس نے کمپنی کی افواج کو کارمنڈل اور مالابار کے ساحلوں پر جمع ہونے کا حکم دیا۔ میسور کے خلاف جارحانہ اقدام کے لیے ولزلی کو صرف ایک بہانے کی

ضرورت تھی چنانچہ اس نے سلطان ٹیپو پر یہ الزام لگا دیا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف فرانس کے ساتھ سازباز کر رہا ہے اور اس کے سفیر ماریشس کے گورنر کی وساطت سے فرانسیسی حکومت کے ساتھ ایک دفاعی اور جارحانہ مُعاہدہ کر چکے ہیں۔ اصل واقعہ صرف یہ تھا کہ نظام اور مرہٹے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کے لیے فرانسیسی سپاہیوں اور افسروں کو بھرتی کر رہے تھے۔ سُلطان ٹیپو نے بھی چند تجربہ کار یورپین افسروں کی ضرورت محسوس کی۔ سرنگاپٹم کے دو تاجر اپنے کاروبار کے سلسلے میں ماریشس جا رہے تھے اور سُلطان نے انھیں ہدایت کی کہ اگر ماریشس سے کوئی کارآمد آدمی ملیں تو وہ انھیں اپنے ساتھ لیتے آئیں۔ ان تاجروں نے ماریشس پہنچ کر وہاں کے فرانسیسی گورنر سے ملاقات کی اور انھیں قریباً ایک سَو بیکار آدمیوں کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت مل گئی۔ لیکن ان سَو آدمیوں میں سے بھی صرف چند ایسے تھے جو تھوڑا بہت فوجی تجربہ رکھتے تھے اور بیشتر وہ قیدی تھے جنھیں ماریشس کی حکومت نے جیلوں سے نکال کر سرنگاپٹم کے تاجروں کے ساتھ جہاز پر سوار کرا دیا تھا۔ لیکن کمپنی نے اس واقعہ کی آڑ لے کر سلطان کے خلاف بہتان تراشی کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ کلکتہ، مدراس اور بمبئی سے لے کر لندن تک برطانوی سامراج کے ڈھنڈورچیوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ انگلستان کے خلاف میسور اور فرانس کا مُعاہدہ ہو چکا ہے۔ ماریشس کی فرانسیسی فوج عنقریب ہندوستان کے ساحل پر اُترنے والی ہے اور سلطان ٹیپو ان کے پہنچتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے گا۔

ماریشس کے واقعات کے بارے میں ولزلی کے علاوہ کئی اور انگریزوں کے مُتضاد بیانات ان بے سروپا الزامات کو جھٹلانے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سلطان ٹیپو نے واقعی ماریشس کے گورنر کی وساطت سے فرانسیسی حکومت کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا تھا تو بھی کوئی انصاف پسند آدمی انگریزوں کو سلطان پر اعتراض کرنے کا حق نہیں دے سکتا۔ گزشتہ واقعات کی روشنی میں سُلطان کے بدترین دشمن بھی ان پر یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ انھوں نے صلح کی شرائط پورا کرنے میں کوئی کوتاہی کی تھی اور انگریزوں کے بہترین وکیل بھی ان کی

پے درپے بدعنوانیوں پر پردہ نہیں ڈال سکے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سرنگاپٹم کے معاہدے کی مضحکہ خیز تاویلوں سے یہ ثابت کرچکی تھی کہ انگریز صلح یا جنگ میں کسی ضابطۂ اخلاق کے پابند نہیں۔ ان کی مسلسل بدعہدیوں کے بعد یہ سلطان کا حق ہی نہیں بلکہ فرض تھا کہ وہ ان کا حساب چکانے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتا۔ اگر سلطان فرانسیسیوں پر اعتماد کرسکتا اور ان کی مدد سے انگریزوں کو اس ملک سے نکال سکتا اور اس کے باوجود وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تو میں اسے اس کی بصیرت اور جذبۂ حریت کی توہین سمجھتا۔ لیکن میسور کا یہ رجلِ عظیم ان لوگوں میں سے نہ تھا جو دانستہ ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسا جانا گوارا کرسکتے ہیں۔ فرانسیسی منگلور کی جنگ میں فیصلہ کن مرحلے میں اسے دھوکا دے چکے تھے اور اس کے بعد اس نے انگریزوں، مرہٹوں اور میر نظام علی کے ساتھ تمام جنگیں تن تنہا لڑی تھیں۔ فرانسیسی حکومت کی بدعہدیوں کے خلاف اس کا ردِعمل اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ سے تقریباً ایک سال بعد پانڈی چری کے فرانسیسی گورنر نے انگریزوں کی جارحیت سے مجبور ہوکر سلطان سے اعانت کی اپیل کی تھی تو اس نے اس کے خط کا جواب دینے سے انکار کردیا تھا اور فرانسیسیوں کو بحالتِ مجبوری پانڈی چری خالی کرنا پڑا تھا۔

رہا یہ سوال کہ سرنگاپٹم کے تاجر سلطان کے ایما پر ماریشس سے چند آدمی اپنے ساتھ لے آئے تھے تو یہ بات کتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ مرہٹوں اور نظام کی فوج میں تو سینکڑوں فرانسیسی انگریزوں کے لیے کسی خطرے کا باعث نہ تھے لیکن سلطان ٹیپو نے صرف سو آدمیوں کو اپنی ملازمت میں لے کر ان کے لیے ایک خطرہ پیدا کردیا تھا۔ پھر ان سو آدمیوں میں سے صرف چالیس فرانسیسی تھے اور باقی ماریشس کے مقامی باشندے تھے۔ سلطان کی فوج میں کوئی فرانسیسی یا یورپین کسی اہم عہدے پر فائز نہ تھا لیکن میر نظام علی کی فوج کے پندرہ ہزار سپاہی ایک فرانسیسی جرنیل کے ماتحت تھے اور سندھیا کی چالیس ہزار فوج کو ایک فرانسیسی افسر تربیت دے رہا تھا۔

انگریزوں نے ماریشس کے واقعات کی آڑ لے کر دو باتیں مشہور کی تھیں۔ اول یہ کہ نپولین بوناپارٹ مصر اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک کو فتح کرنے کے بعد خشکی کے راستے ہندوستان کا رخ کرے گا اور سلطان ٹیپو اس کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ ماریشس کے گورنر جنرل نے سلطان ٹیپو کے سفیروں کے ساتھ یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ عنقریب تیس چالیس ہزار سپاہی سلطان کی مدد کے لیے بھیج دے گا۔ انگریزوں کے اپنے بیانات اس بات کو جھٹلاتے ہیں کہ ماریشس میں فرانسیسیوں کی اتنی بڑی فوج موجود تھی اور سلطان ٹیپو جیسے باخبر انسان کے متعلق یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اسے ماریشس کے حالات کا صحیح علم نہ تھا۔ دوسری بات اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ سلطان کی عمر کے بیشتر ایام جنگ کے میدان میں گزرے تھے اور اس کے متعلق یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ اسے مصر اور میسور کے درمیان خشکی کے راستے سفر کی دشواریوں کا صحیح اندازہ نہ تھا۔

انگریزوں نے یہ تمام افواہیں صرف اس لیے پھیلائی تھیں کہ وہ نظام، مرہٹوں اور ہندوستان کے دوسرے حکمرانوں کو زیادہ سے زیادہ پریشان کرسکیں اور ان پر یہ ثابت کرسکیں کہ سلطان ٹیپو اور نپولین کے اتحاد کے باعث تمہیں ایک بہت بڑا خطرہ پیش آنے والا ہے۔

سلطان ٹیپو نے ان بے بنیاد الزامات کی تردید کی۔ لیکن انگریز جنگ کا بہترین موقع کھونے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ نپولین کے خلاف مشرقِ وسطیٰ یا یورپ میں سینہ سپر ہونے سے پہلے ہی اس طاقت کے ساتھ نپٹ لینا چاہتے تھے جو ہندوستان میں ان کے لیے خطرے کا باعث ہوسکتی تھی۔

تاہم ولزلی اپنے پلان کے مطابق فوراً جنگ شروع نہ کرسکا۔ مدراس کے گورنر نے اسے یہ اطلاع دی کہ کمپنی کی فوج چھ ماہ سے پہلے جنگ کے لیے تیار نہیں ہوسکتی۔ ولزلی دانت پیس کر رہ گیا۔ پھر جب اسے یہ اطلاع پہنچی کہ جنرل بوناپارٹ کی افواج مصر میں داخل ہوچکی ہیں اور کچھ عرصہ ہندوستان کو اپنی ساری توجہ بحیرۂ روم کی طرف مبذول رکھنی پڑے گی تو اس نے سلطان کے خلاف

مُعاندانہ طرزِ عمل میں فوراً تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ اب وہ میسور پر حملہ کرنے کی بجائے سُلطان کے ساتھ ان متنازعہ علاقوں کے بارے میں بھی گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر رہا تھا جن پر ایسٹ انڈیا کمپنی سرنگاپٹم کے مُعاہدے کے خلاف قبضہ جما ئے ہُوئے تھی۔ اب ترکی کے خلیفہ کی طرف سے سُلطان ٹیپو کی خدمت میں اس قسم کے خطُوط پیش کیے جا رہے تھے کہ اہلِ فرانس اسلام کے دشمن ہیں اس لیے کسی مسلمان حکمران کو ان کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر سلطان کو انگریزوں کے خلاف کوئی شکایت ہے تو ہم ثالثی کے لیے تیار ہیں۔

○

لارڈ ولزلی کے جارحانہ طرزِ عمل میں اچانک تبدیلی کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اسے لاہور کی طرف زمان شاہ والیٔ افغانستان کی پیش قدمی کی اطلاع موصُول ہو چکی تھی اور وہ یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر زمان شاہ دِلی پہنچ گیا تو سارے ہندوستان کے مُسلمان انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور سلطان ٹیپو ان حالات سے پُورا پُورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ سلطان کے سفیر زمان شاہ کے دربار میں موجُود تھے اور ان دو مُسلمان حکمرانوں کے درمیان دوستانہ خط و کتابت ہو رہی تھی۔ لارڈ ولزلی جس قدر مصر میں نپولین کی موجُودگی سے پریشان تھا اس سے کہیں زیادہ لاہور کی طرف شاہ زمان کی پیش قدمی سے خائف تھا۔ ان حالات میں مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ مناسب وقت تک سلطان ٹیپو کے خلاف اپنے جارحانہ عزائم کو دوستی کے دبیز پردوں میں چھپائے رکھے۔

دِلّی سے زمان شاہ کی توجہ ہٹانے کے لیے انگریزوں نے اپنے ایک ہوشیار جاسوس مہدی علی خاں کی خدمات حاصل کیں۔ مہدی علی خاں ایک ایرانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بوشہر میں رزیڈنٹ کے عُہدے پر فائز تھا۔ ولزلی کی ہدایات پر اس ملت فروش نے ایران کے حکمران کے دربار میں رسائی حاصل کی اور شیعہ سُنّی منافرت کا سہارا لے کر اُسے زمان شاہ کے خلاف اس قدر بھڑکایا کہ اس نے ایک طرف خراسان پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف ہرات کے معزول شدہ گورنر کو فوجی مدد دے کر زمان شاہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ ان حالات میں زمان شاہ کو دِلّی کی طرف پیش قدمی کا ارادہ ترک کر کے واپس جانا پڑا۔

مہدی علی خاں کی سازش نے ایک طرف ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری سہارا چھین لیا جو گزشتہ چالیس سال سے پانی پت کے میدان میں پھر کسی احمد شاہ ابدالی کا انتظار کر رہے تھے دوسری طرف حیدر آباد، پونا اور اودھ کی طرح شاہِ ایران کے دربار میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثر و نفوذ کا راستہ کھول دیا۔ مہدی علی خاں نے ایران کے حکمران کو یہ بھی اُمید دلائی کہ انگریز زمان شاہ سے ایران کے کھوئے ہوئے علاقے واپس دلانے میں اس کی مدد کریں گے اور ایران کے حکمران نے خراسان اور ہرات پر اس وقت تک اپنا دباؤ جاری رکھا جب تک کہ انگریز ہندوستان میں اپنے ارادے پُورے نہیں کر چکے تھے۔

بحیرۂ روم میں نپولین کے جنگی بیڑے کی تباہی اور لاہور سے زمان شاہ کی واپسی کے بعد لارڈ ولزلی کے وہ خدشات دُور ہو چکے تھے جن کے پیشِ نظر اس نے میسور پر اچانک دھاوا بولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اب وہ دِلّی کی طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے راستے کا آخری پتھر ہٹانے کے لیے بیتاب نظر آتا تھا اور سُلطان کے ساتھ اس کے دوستانہ لب و لہجہ میں اچانک تبدیلی آ چکی تھی۔

زمان شاہ کی واپسی ہندوستان کی تاریخ کا ایک انتہائی المناک واقعہ ہے۔ ۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی جنگ لڑی تھی تو مرہٹے اپنے قومی اتحاد کے باعث ایک عظیم فوج میدان میں لے آئے تھے۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ مرہٹے ایک اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو رہے تھے اور ان میں زمان شاہ کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ تھی۔ یہ درست ہے کہ دِلی کا مظلوم اور بے بس حکمران شاہ عالم ثانی مہادجی سندھیا کے بعد اب دولت راؤ سندھیا کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھا۔ لیکن دِلی پر مرہٹوں کے اقتدار کی وجہ ان کی غیر معمولی قوت نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ دِلّی کا نام نہاد شہنشاہ اب اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اسے اپنے تاج کا بوجھ اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

دلّی کے جنوب مغرب میں راجپوتوں کی ریاستیں بھی اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں انگریز ہندوستان کے اقتدار کے سب سے بڑے دعویدار بن چکے تھے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ پر ان کا قبضہ تھا۔ اودھ کی یہ حالت تھی کہ وہاں انگریز ریذیڈنٹ شجاع الدولہ کے جانشینوں سے زیادہ با اختیار تھا۔ جنوب میں راجہ ٹراونکوران کا باجگزار تھا اور ارکاٹ کا حکمران ایک ایسی لاش تھی جسے انگریزوں نے اپنی سنگینوں کا سہارا دے کر تخت پر بٹھا رکھا تھا۔ پونا اور حیدر آباد کی ریاستیں عملاً ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیادت تسلیم کر چکی تھیں۔ ان حالات میں دلّی کے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کیلیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے تابی ایک قدرتی بات تھی۔ انگریز اپنے راستے کے کئی پتھر ہٹا چکے تھے لیکن زمان شاہ کی پیش قدمی نے ان کے حوصلے سرد کر دیے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر انھیں زمان شاہ کے ساتھ جنگ لڑنی پڑی تو ٹیپو غیر جانب دار نہیں رہے گا اور صرف سلطان ٹیپو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر حکمران بالخصوص مرہٹے جنھیں کمپنی کے جارحانہ عزائم کے متعلق اب کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔ زمان شاہ کو ایک دشمن کی بجائے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے۔

مصر کی طرف نپولین کی پیش قدمی اور پنجاب کی طرف زمان شاہ کی یلغار کے ایام میں برطانوی سامراج کے علمبردار اپنی تاریخ کے ایک نازک ترین دور کا سامنا کر رہے تھے لیکن ان دو عظیم خطرات کے دور ہوتے ہی ہندوستان پھر ایک بار ان بھیڑیوں کی شکارگاہ بن چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی مشرق یا مغرب میں کسی نئے خطرے کا سامنا کرنے سے پہلے میسور پر دھاوا بولنے کے لیے بیتاب نظر آتی تھی۔

○

ایک دن تیسرے پہر میسور کا دیوان میر صادق سلطان سے ملاقات کے بعد محل سے باہر نکلا تو ڈیوڑھی کے قریب ملک جہان خان (دھونڈیا واغ) اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور ملتجی ہو کر کہا۔ حضور دیوان صاحب میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات ہے؟" میر صادق نے قدرے برہم ہو کر سوال کیا۔

"جناب میں صبح سے یہاں کھڑا ہوں لیکن مجھے سلطان معظم کی قدم بوسی کا موقع نہیں ملا۔ آپ میری مدد کریں۔ میرے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونا اشد ضروری ہے۔"

"سلطان معظم ان دنوں سخت مصروف ہیں اور میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"جناب یہ بہت ضروری ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کیجیے!"

"تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔" میر صادق یہ کہہ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا لیکن ملک جہان خان نے آگے بڑھ کر پھر اس کا راستہ روک لیا اور کہا۔ "ٹھہریے جناب میں سلطان معظم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میسور کے خلاف کوئی خطرناک سازش ہو رہی ہے۔"

"سازش؟" میر صادق نے چونک کر کہا۔

"ہاں جناب میرے پاس ایک خط ہے۔"

"کس کا خط؟"

"جناب اس پر کسی کا نام نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ انگریزوں کے کسی جاسوس نے رنگا پٹم کے کسی با اثر آدمی کے نام لکھا ہے۔"

میر صادق کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا۔ لیکن اس نے فوراً سنبھل کر کہا۔ "یہاں باتیں کرنا ٹھیک نہیں تم میرے ساتھ آؤ۔"

ملک جہان خان مذبذب سا ہو کر اس کے ساتھ چل دیا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ میر صادق کے ساتھ اس کے خوبصورت مکان کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ میر صادق نے ایک کشادہ میز کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو اور اطمینان سے میرے ساتھ باتیں کرو۔"

ملک جہان خان نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جناب اگر آپ مجھے یہاں لانے کی بجائے سلطان کے سامنے لے جاتے تو یہ آپ کی بہت بڑی نوازش ہوتی۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ

ہمیں سُلطان کو کسی تاخیر کے بغیر اس طرف متوجّہ کرنا چاہیے۔"

میر صادق نے جواب دیا "سلطان معظم صبح سے کام کر رہے تھے اور اب انھیں تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے۔ میں شام کے وقت ان سے دوبارہ ملاقات کی کوشش کروں گا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ وہ خط تمھارے ہاتھ کیسے لگا؟"

"جناب میں جنوب مشرق کی سرحدی چوکیوں کی حفاظت پر متعین تھا۔ دو آدمیوں نے رات کے وقت ایک جگہ سے سرحد عبور کر کے ہمارے علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ پہرہ داروں نے انھیں روکا۔ لیکن جب انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی تو پہرہ داروں نے گولی چلا دی۔ ایک آدمی بچ کر نکل گیا لیکن دوسرا زخمی ہو کر گر پڑا۔ سرحد کے محافظ اسے بے ہوشی کی حالت میں میرے پاس لے آئے۔ میں نے اس کی جامہ تلاشی لی تو یہ خط برآمد ہوا۔ کچھ دیر بعد زخمی نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو میں نے اس سے خط کے متعلق پوچھنے کی کوشش کی۔ وہ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کی سانس اُکھڑ گئی۔ مرتے وقت اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن میں انتہائی کوشش کے باوجود مطلب کی کوئی بات نہ سُن سکا۔ میں یہ خط لے کر پہلے بنگلور کے فوجدار کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے یہ خیال آیا کہ سُلطان کی خدمت میں حاضر ہونا زیادہ بہتر ہوگا۔"

میر صادق نے کہا "میں وہ خط دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ملک جہان خاں نے قدرے تذبذب کے بعد اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور میر صادق کو پیش کر دیا۔ میر صادق نے کاغذ کھول کر پڑھا اور اس کے چہرے پر پھر ایک بار زردی چھا گئی۔ خط کا مضمون یہ تھا:

"جناب والا: حامل ہذا ایک قابلِ اعتماد آدمی ہے اور وہ آپ سے تمام ضروری باتیں زبانی عرض کرے گا۔ آپ نے ہمیں جو ضروری اطلاعات فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ ابھی تک نہیں پہنچیں۔ اب حالات ایسے ہیں کہ آپ کی طرف سے

ذرا سی تاخیر بھی ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے اپنے وعدوں کا پاس کیا تو آپ کے تمام مطالبات پورے کیے جائیں گے۔ اب آپ کو خط لکھنے کی بجائے زبانی پیغام پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کو میرا سلام پہنچا دیجیے۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

آپ کا دوست

میر صادق نے کاغذ جہان خاں کو واپس دیتے ہوئے کہا "یہ خط میرے لیے ایک معمّا ہے۔ بہرحال یہ معاملہ سلطان معظم کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔ میں دارو غہ کو پیغام بھیجتا ہوں لیکن آج وہ اس قدر مصروف ہیں کہ شاید مجھے بھی دوبارہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہ مل سکے۔ اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ سُلطان معظم کے ساتھ آج کی بجائے کل ملاقات کی کوشش کی جائے۔"

"لیکن دیوان صاحب یہ مسئلہ بہت نازک ہے اور میں آج ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔"

میر صادق نے کہا "میں نے تمھیں بتایا ہے کہ آج سلطانِ معظم بہت مصروف ہیں اور میں اگر اس وقت دوبارہ واپس جا کر ان سے ملاقات کے لیے اصرار کروں تو میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ میں اس خط کے صحیح ہونے کے متعلق کوئی ناقابلِ تردید ثبوت پیش کر سکوں اور سلطانِ معظم یہ محسوس کریں گے کہ میں نے انھیں خواہ مخواہ پریشان کیا ہے۔"

جہان خاں نے کہا "دیوان صاحب معاف کیجیے میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

میر صادق نے جواب دیا "میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ خط ایک مذاق معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی دشمن نے ہمیں پریشان کرنے کے لیے شرارت کی ہو۔ اس میں نہ تو لکھنے والے کا نام ہے اور نہ مکتوب الیہ کی کوئی نشان دہی کی گئی ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ سُلطان معظم مجھے بے وقوف سمجھیں۔ اگر کل بھی سلطان معظم کے ساتھ تمھاری ملاقات کا بندوبست کرتے وقت میں اپنی طرف سے

اس خط کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کوئی ذمہ داری نہیں قبول کروں گا۔ میں صرف یہ کوشش کروں گا کہ تمہیں ملاقات کے لیے وقت مل جائے۔ لیکن اگر تم اسی وقت سلطانِ معظم سے ملنا ضروری سمجھتے ہو تو یہ بہتر ہو گا کہ تم پورنیا کے پاس چلے جاؤ۔ سلطانِ معظم نے انھیں کسی مسئلے پر کوئی مشورہ دینے کے لیے سہ پہر کے وقت طلب کیا ہے۔ وہ اگر سلطان سے یہ کہہ دیں کہ تم کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے آئے ہو تو ممکن ہے تمہیں آج ہی ملاقات کا وقت مل جائے۔ اگر تم کہو تو میں پورنیا کو اپنی طرف سے ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں۔"

ملک جہان خان نے پریشان ہو کر کہا: "میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن میں پورنیا سے اس خط کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔"

"تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سلطانِ معظم کے دربار میں پورنیا کا اثر و رسوخ میری نسبت کہیں زیادہ ہے۔"

"نہیں جناب آپ پورنیا سے اس خط کے متعلق کوئی ذکر نہ کریں۔ میں کل تک انتظار کر سکتا ہوں۔"

میر صادق نے غور سے جہان خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم پورنیا کو اعتماد میں لینے سے گھبراتے ہو۔"

"جناب میری گھبراہٹ بلاوجہ نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر پورنیا کو اس خط کا پتہ چل گیا تو اس کی کوشش یہی ہو گی کہ ۔ ۔ ۔"

جہان خان اپنا فقرہ پورا کیے بغیر تذبذب اور پریشانی کی حالت میں میر صادق کی طرف دیکھنے لگا۔

میر صادق نے ذرا رعب دار آواز میں کہا: "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"جناب میرا خیال ہے کہ مرتے وقت دشمن کے جاسوس نے پورنیا کا نام لینے کی کوشش کی تھی۔"

میر صادق کے چہرے پر پہلی بار اطمینان کی جھلک دکھائی دی اور اس نے کہا: "سلطان کے

ایک وزیر پر یہ الزام بہت سنگین ہے اور ان کے سامنے کوئی ایسی بات کہنے کی بجائے تمہیں اپنی جان کے متعلق اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔ تمہیں یقین ہے کہ جاسوس نے دیوان پورنیا کا نام لیا تھا؟"

"جناب اگر مجھے یقین ہوتا تو میں کسی سے مشورہ کیے بغیر اس کا سر کاٹ کر سلطان کے حضور میں پیش کر دیتا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے اچھی طرح پورنیا کا نام سنا تھا لیکن مرتے وقت جاسوس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ پورنیا کا نام لے رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سراسر میرا وہم ہو۔"

میر صادق نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا: "میں ایک غیر ذمہ دار آدمی کی باتوں پر توجہ دینے کی غلطی کر چکا ہوں لیکن میں کسی مزید حماقت کے لیے تیار نہیں۔ میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں کل سلطانِ معظم کے ساتھ تمہاری ملاقات کا انتظام کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر تم کل صبح محل کے دروازے پر پہنچ جاؤ تو میں یہ کوشش کروں گا کہ ملاقات کے لیے تمہاری درخواست سلطان کی خدمت میں پہنچ جائے۔ اس کے بعد مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہو گا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں یہ بھی تسلیم نہیں کروں گا کہ تم نے مجھ سے اس خط کا ذکر کیا ہے۔ تم ایک سپاہی ہو اور ممکن ہے کہ تمہارے خلوص سے متاثر ہو کر سلطانِ معظم تمہاری کوئی غلطی نظر انداز کر دیں لیکن میں ایک وزیر ہوں۔"

"جناب آپ مطمئن رہیں۔ میں سلطان سے آپ کا ذکر نہیں کروں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ غازی بابا سرنگا پٹم سے باہر ہیں ورنہ میں آپ کو پریشان نہ کرتا۔ میں کل شاہی محل کے دروازے پر آپ کا انتظار کروں گا۔"

"تم کہاں ٹھہرو گے؟"

"جناب میں سلطان کی فوج کے ایک افسر کے ہاں قیام کروں گا۔"

"اس افسر کا نام کیا ہے؟"

مُراد علی !" ملک جہان خاں یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

میر صادق نے کہا: "تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم نے صبح سے کھانا نہیں کھایا ہے؟"

"جناب میں نے کل شام سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ رات بھر میں نے سفر کیا ہے اور صبح سے شاہی محل کا طواف کر رہا ہوں۔"

"تو بیٹھ جاؤ میں تمہارے لیے کھانا بھیجتا ہوں۔"

"نہیں جناب آپ تکلیف نہ کریں۔"

"کیسی تکلیف سُلطان کے ایک وفادار سپاہی کی خدمت میرا فرض ہے۔" میر صادق یہ کہہ کر اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد میر صادق کا ایک نوکر ملک جہان خاں کو کھانا کھلا رہا تھا اور اس کے دو مُلازم ضروری پیغامات لے کر میر قمرالدین اور پورنیا کی قیام گاہوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔

کھانے کے چند لقمے حلق میں اُتارتے ہی ملک جہان خاں اپنے دماغ میں ایک غنودگی سی محسوس کرنے لگا۔ پہلے اس نے یہ محسوس کیا کہ یہ غنودگی کئی گھنٹوں کی تھکاوٹ اور بھوک کا نتیجہ ہے۔ لیکن جب اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی تو وہ جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میر صادق کے نوکر نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا: "کیا بات ہے جناب آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" ملک جہان خاں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن دروازے کی طرف چند قدم اٹھانے کے بعد وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

نوکر نے جلدی سے اس کی جیب سے کاغذ نکالا اور باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد میر صادق مکان کے ایک کشادہ کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا۔ میر قمرالدین داخل ہوا اور اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا: "میں آپ کا رُقعہ دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ ملک جہان خاں کہاں ہے؟"

"دُوسرے کمرے میں بے ہوش پڑا ہے۔ آپ پہلے یہ خط پڑھ لیں۔ پھر میں آپ سے تمام واقعات بیان کروں گا۔"

میر قمرالدین نے میر صادق کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھا اور پھر سراسیمگی کی حالت میں اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "یہ خط جہان خاں کے ہاتھ کیسے آ گیا؟"

"جہان خاں کے ساتھیوں نے آپ کے ایلچی کو واپسی پر سرحد عبور کرتے وقت قتل کر دیا تھا۔"

میر قمرالدین کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے دوبارہ خط کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "لیکن آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ اس خط کی وجہ سے ہمارے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو گیا ہے؟"

"ایلچی نے مرتے وقت ہمارے ایک ساتھی کا نام ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"اور وہ کون تھا؟"

"پورنیا۔ میں نے اسے بھی پیغام بھیجا ہے لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا۔ اب ملک جہان خاں کے متعلق کوئی مناسب بندوبست کرنا آپ کا کام ہے۔ میں نے اسے کھانے میں جو دوائی کھلائی ہے اس کا نشہ دو تین گھنٹے تک زائل ہو جائے گا۔"

"میرے خیال میں ہمارے لیے اب آسان ترین بات یہ ہے کہ ہم اسے قتل کر دیں۔"

"نہیں۔ ہمارے لیے آسان ترین بات یہ ہے کہ ہم اسے پورنیا کے حوالے کر دیں۔"

"آپ کا خیال ہے کہ پورنیا اس کے قتل کا مشورہ نہیں دے گا؟"

"ضرور دے گا۔ لیکن میں اسے قتل کرنے کی بجائے قید کرنے کے حق میں ہوں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ہمیں اس بات کی تسلی نہ ہو جائے کہ اس کا اور کوئی ساتھی ان واقعات سے باخبر نہیں۔ آپ آج ہی چند ہوشیار آدمیوں کو سرحد پر بھیج دیں جو جہان خاں کے ساتھیوں سے یہ پتہ لگائیں کہ وہ اس مسئلے کے متعلق کہاں تک باخبر ہیں۔ پھر اس کے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے اور سرِدست ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ ایک گمنام قیدی کی حیثیت میں قید خانے کے اندر پڑا رہے اور سلطان سے اس کی ملاقات نہ ہو سکے۔ اگر لارڈ ولزلی اور میر نظام علی کے وعدے درست ہیں تو چند ماہ بعد ملک جہان خاں جیسے لوگ ہمارے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہوں گے۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا خطرہ رہتا تھا کہ کہیں پورنیا ہمارے ساتھ دھوکا نہ کرے۔ لیکن

اب یہ خط ہمارے ہاتھ میں ایک تلوار ہوگا اور پورنیا کم ازکم اپنی سلامتی کے خوف سے ہمارے اشاروں پر چلنے پر مجبور ہوگا۔"

باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میر قمرالدین نے کہا: "شاید وہ آرہا ہے۔"

پورنیا ہانپتا کانپتا کمرے میں داخل ہوا۔ میر صادق نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "آیئے جناب یہ آپ کی خوش قسمتی تھی کہ ملک جہان خاں سلطان سے ملاقات کی بجائے میرے قبضے میں آگیا تھا۔ آپ کا ایلچی واپسی پر سرحد عبور کرتے وقت قتل ہوگیا تھا اور اس نے تمام واقعات ملک جہان خاں پر ظاہر کر دیے تھے۔ ہم اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔ ملک جہان خاں دو دن سے کمرے میں بیہوش پڑا ہوا ہے اب یہ ضروری ہے کہ آپ کچھ عرصہ اسے اپنی تحویل میں رکھیں۔ رات کے وقت ملک جہان خاں سرنگاپٹم کے قید خانے کی ایک کوٹھڑی میں پڑا ہوا تھا اور قید خانے کا داروغہ تمام پہرے داروں کو ایک جگہ جمع کر کے یہ ہدایت دے رہا تھا کہ قیدی ایک خطرناک جاسوس ہے اور پورنیا مہاراج نے بڑی سختی کے ساتھ یہ ہدایت کی ہے کہ قید خانے کا کوئی ملازم اس کے ساتھ بات نہ کرے۔"

پچیسواں باب

۱۷۹۹ء کے آغاز میں انگریزوں کی جنگی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ جنرل ہیرس کی کمان میں اکیس ہزار سپاہی کوچ کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ کمپنی کی ایک اور فوج جس کی تعداد قریباً سات ہزار تھی جنرل اسٹورٹ کی کمان میں کنانور میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ حیدرآباد سے سولہ ہزار آزمودہ کار سپاہی کرنل ولزلی[1] کی قیادت میں آمبور کا رخ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ کرنل براؤن اور کرنل ریڈ کے ماتحت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک اور فوج ترچناپلی سے کوچ کی تیاری کر رہی تھی۔

یہ بے پناہ تیاریاں اس حکمران کے خلاف تھیں جو گزشتہ جنگ میں اپنی آدھی سلطنت کھو بیٹھنے کے باوجود انگریزوں کو ہندوستان کا سب سے بڑا دفاعی حصار دکھائی دیتا تھا۔ چھ سال کے عرصہ میں شیر میسور کے زخم مندمل ہو چکے تھے اور انگریز بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہے تھے۔ سلطان ٹیپو کی زندگی کے ہر سانس کے ساتھ ان کے مستقبل کے لیے ایک نیا خطرہ پیدا ہوتا جا رہا ہے۔

---

[1] کرنل آرتھر ولزلی، لارڈ ولزلی کا چھوٹا بھائی جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن کے نام سے مشہور ہوا اور جس نے انگریزی سپاہ کے سالار کی حیثیت میں واٹرلو کی جنگ میں نپولین بوناپارٹ کو شکست دی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کی افواج کی نقل و حرکت کے بعد سلطان کو ان کے جارحانہ عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ شیرِ میسور پھر ایک بار اپنے مُٹھی بھر سرفروشوں کے ساتھ گیدڑوں اور بھیڑیوں کی لاتعداد افواج کے سامنے کھڑا تھا۔ مغرب کی جارحیت کے مقابلے میں عالم اسلام کو متحد و منظم کرنے کے لیے اس کی سر توڑ کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ ترکی میں عالم اسلام کا سب سے بڑا محافظ سلطان سلیم انگریزوں کا بے بس دُعا گو بن چکا تھا۔ ایران میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے سازشوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ زمان شاہ والی افغانستان ابھی تک اپنے مسائل میں اُلجھا ہُوا تھا اور ہندوستان میں جن طالع آزماؤں نے سلطنتِ مغلیہ کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کی مسندیں سجائی تھیں ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اس بدنصیب ملک کے مستقبل کے متعلق سوچ سکتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی حلیفوں کی حالت ان کُتوں سے بدتر تھی جو خشک ہڈیوں میں حصہ دار بننے کے لیے شکاریوں کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔

ہندوستان کی سیاست میں اگر کوئی انقلاب آیا تھا تو وہ یہ تھا کہ مرہٹے جنھوں نے کئی بار سلطان کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اب اپنی سابقہ غلطیوں کا احساس کر رہے تھے۔ مرہٹہ سرداروں میں سلطان ٹیپو کا سب سے بڑا طرف دار [illegible] وفات پا چکا تھا تاہم اس کا جانشین جسونت راؤ اپنے پیشرو کی طرح سلطان ٹیپو کو اجنبی اقتدار کے راستے کی سب سے بڑی دیوار سمجھتا تھا۔ اسی طرح مہادے جی سندھیا کا جانشین دولت راؤ سندھیا بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا تھا کہ سلطان ٹیپو کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا دُوسرا وار مرہٹوں پر ہوگا۔ پونا کے دربار میں سندھیا کے اثر و رسوخ نے سلطان ٹیپو کے لیے اُمید افزا حالات پیدا کر دیے تھے اور پیشوا ایسٹ انڈیا کمپنی کی بجائے سلطان ٹیپو کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کر چکا تھا۔ لیکن اپنی کمزوری اور تلوّن مزاجی کے باعث وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہا اور سلطان ٹیپو کی زیادہ سے زیادہ کامیابی یہ تھی کہ مرہٹے اس جنگ میں غیر جانب دار ہو گئے تھے۔

○

ایک روز آدھی رات کے وقت انور علی اور منیرہ چتل ڈرگ کے قلعے کی چار دیواری کے اندر کشادہ مکان کے ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" انور علی نے گہری نیند سے بیدار ہو کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

باہر سے کسی کی مانوس آواز سنائی دی۔ "میں مراد علی ہوں بھائی جان!"

انور علی نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ مراد علی کے ساتھ قلعے کا ایک پہرے دار مشعل اُٹھائے کھڑا تھا۔ انور علی نے اپنے چھوٹے بھائی سے بغل گیر ہو کر پوچھا: "تم ---- اس وقت ---- خیر تو ہے؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں بھائی جان۔ میں صرف آپ کو دیکھنے آیا ہوں۔ بھابی جان کیسی ہیں؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں آؤ!" انور علی نے یہ کہہ کر سپاہی کے ہاتھ سے مشعل پکڑ لی۔ اور مراد علی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہُوا۔ اس نے مشعل کی لَو سے کمرے کا چراغ جلایا اور مشعل باہر برآمدے میں رکھنے کے بعد واپس آ کر منیرہ کو آواز دی ---- "منیرہ منیرہ! مراد علی آیا ہے!"

برابر کے کمرے سے منیرہ کی آواز سُنائی دی: "کون آیا ہے؟"

"مراد آیا ہے منیرہ!"

"مراد!" منیرہ بھاگتی ہُوئی ان کے کمرے میں داخل ہُوئی اور مسرت اور اضطراب کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ مراد علی کی طرف دیکھنے لگی۔

مُراد علی نے سلام کرنے کے بعد کہا: "بھابی جان گھبرانے کی کوئی بات نہیں میں آپ کی خیریت معلوم کرنے آیا ہُوں۔"

انور علی نے کہا: "مراد تم کسی مہم پر جا رہے ہو۔ بیٹھ جاؤ منیرہ تم نوکر کو جگا کر اس کے لیے

کھانے کا انتظام کرو۔"

"بھائی جان میں کھانا کھا چکا ہوں۔ آپ تشریف رکھیں۔ مَیں تھوڑی دیر آپ سے باتیں کرنے کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟" انور علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

بھائی جان میں زمان شاہ والئ افغانستان کے پاس سلطانِ معظم کا ایک ضروری پیغام لے کر جا رہا ہوں۔ میرے ساتھی منگلور کی بندرگاہ سے جہاز پر سوار ہوں گے اور میں کندہ پور سے اُن کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔ سندھ کے ساحل پر پہنچ کر ہم خشکی کے راستے سفر کریں گے۔ مجھے یہ حکم غازی بابا اور سید غفار کی سفارش پر سونپی گئی ہے۔ مَیں نے سلطانِ معظم کی خدمت میں درخواست کی تھی کہ اگر مجھے جانے سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت دی جائے تو منگلور کے جہاز سے پہلے کندہ پور پہنچ جاؤں گا۔ سلطانِ معظم نے فرمایا تھا کہ ہم عنقریب تمھارے بھائی کو چتل ڈرگ کی بجائے سرنگا پٹم میں ایک اہم ذمہ داری سونپنے والے ہیں۔ سید غفار نے بھی مجھے بتایا تھا کہ سرنگا پٹم میں نائب فوجدار کے عہدہ کے لیے ایک قابل اعتماد اور تجربہ کار افسر کی ضرورت ہے اس لیے آپ کو ایک ہفتہ کے اندر اندر واپس بلا لیا جائے گا۔"

انور علی نے کہا: "اب زمان شاہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آخری اُمید ہے۔ سرنگا پٹم کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ولزلی سلطان کے ساتھ آخری جنگ لڑنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اسے صرف زمان شاہ کے حملہ کے خوف نے جنگ سے باز رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

مُراد علی نے کہا: "بھائی جان ان دنوں سلطان کے نام لارڈ ولزلی کے خطوط کا لب و لہجہ میسور کے خلاف اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر پچھلی مرتبہ زمان شاہ لاہور سے واپس نہ چلا جاتا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے طرزِ عمل میں یہ تبدیلی نہ آتی۔ اب افغانستان سے ہمارے سفیروں نے یہ اطلاع بھیجی ہے کہ زمان شاہ پھر لاہور کا رُخ کر رہے ہیں اور اس مرتبہ وہ دلی پہنچے بغیر دم نہیں لیں گے۔ خدا کرے یہ اطلاع درست ہو۔ اگر زمان شاہ لاہور پہنچ گئے تو میری یہ مُہم

بہت مختصر ہوگی۔ بصورتِ دیگر مجھے افغانستان جانا پڑے گا اور وہاں سے قلات کے راستے واپس آؤں گا۔"

انور علی نے کہا: "مُراد سلطان نے تمھیں ایک نہایت اہم مہم سونپی ہے اور میں تمھاری کامیابی کے لیے دعا کرتی ہوں۔ کاش زمان شاہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک اور احمد شاہ ابدالی بن سکے۔ تم تھکے ہوئے ہو تھوڑی دیر آرام کر لو۔ اگر تمھارا فوراً جانا ضروری ہے تو میں علی الصباح تمھیں جگا دوں گا۔"

مراد علی نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی تھیلی نکال کر انور علی کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان یہ رکھیے میں اس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔"

منیرہ نے پوچھا: "اس میں کیا ہے؟"

انور علی نے تھیلی پکڑ کر منیرہ کے ہاتھ میں رکھ دی اور کہا: "یہ بہت قیمتی جواہرات ہیں۔ انھیں سنبھال کر رکھو!"

تھوڑی دیر بعد مراد علی ایک کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ صبح کی اذان کے ساتھ انور علی نے اسے جگایا اور کہا: "مُراد اُٹھو اب نماز کا وقت ہے۔ مَیں نے تمھارے لیے تازہ دم گھوڑے پر زین ڈلوا دی ہے اور تمھاری بھابی ناشتہ تیار کر چکی ہیں۔"

مُراد علی نے اپنے بھائی کے ساتھ قلعے کی مسجد میں نماز ادا کی اور واپس آ کر ناشتے پر بیٹھ گیا۔ انور علی نے اس کے ساتھ چند نوالے کھائے لیکن منیرہ مغموم صورت بنائے ان کے قریب بیٹھی رہی۔ مراد علی نے کہا: "بھابی جان آپ کچھ نہیں کھائیں گی؟"

"مجھے اس وقت بھوک نہیں۔" منیرہ نے بڑی مُرجھائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "میں ذرا دیر سے ناشتہ کیا کرتی ہوں۔" پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد بولی: "مُراد تم نے گزشتہ خط میں اپنی چچی کے ہاں جانے کا خیال ظاہر کیا تھا؟"

"ہاں بھابی جان انھیں دیکھے بہت دیر ہو گئی تھی اور میرا ارادہ تھا کہ چند دن کے لیے

وہاں ہو آؤں۔ لیکن اب یہ کام وہاں جانے سے زیادہ ضروری ہے۔"

"تم نے انھیں کوئی خط بھی نہیں بھیجا؟"

"سرنگا پٹم سے روانہ ہوتے وقت میں نے انھیں ایک خط بھیجا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ میں اپنی مہم سے فارغ ہوتے ہی آپ کے پاس آؤں گا۔"

ناشتہ ختم کرنے کے بعد انور اور مراد اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مراد علی نے کہا۔ "بھائی جان اب مجھے اجازت دیجیے۔"

منیرہ نے کہا۔ "مراد جلد واپس آنے کی کوشش کرنا!"

"بھائی جان، میں انشاء اللہ بہت جلد آجاؤں گا۔ آپ دعا کریں کہ مجھے اپنی مہم میں کامیابی ہو۔"

انور علی مسکرایا۔ "منیرہ ہر نماز کے ساتھ تمھارے لیے دعا کیا کرتی ہے۔"

مراد علی منیرہ کو خدا حافظ کہہ کر انور علی کے ساتھ مکان سے باہر نکلا۔ قلعے کے دروازے پر پہریدار اس کے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ مراد علی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن انور علی نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے گلے سے لگا لیا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "مراد خدا حافظ!"

"خدا حافظ بھائی جان!" مراد علی پہریدار کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ پکڑ کر سوار ہو گیا۔ اس نے گھوڑا موڑ کر ایڑ لگا دی۔ لیکن انور علی جو بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک آگے بڑھ کر چلایا۔ "ٹھہرو میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں!"

مراد علی نے جلدی سے گھوڑا روکا اور مڑ کر بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ انور علی نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔ "مراد میں ابھی تک ایک اہم فرض پورا کرنے سے قاصر رہا ہوں اب میں پہلی فرصت میں چچا اکبر خاں کے گھر جاؤں گا ـــــ چچی جان کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے خاندانوں کے درمیان جو رشتہ چچا اکبر خاں کی زندگی میں قائم ہوا تھا وہ اُن کی

موت کے بعد ختم نہیں ہوا۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو؟"

"ہاں بھائی جان! آپ ضرور جائیں۔ اگر آپ کو موقع نہ ملے تو کم از کم کسی نوکر کو بھیج کر ان کی خیریت معلوم کر لیں۔"

"بہت اچھا خدا حافظ!"

مراد علی نے کہا۔ "بھائی جان موجودہ دور میں ہم اپنے مستقبل کے متعلق کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے لیکن اگر میں کسی وجہ سے واپس نہ آسکوں تو مجھے یقین ہے کہ آپ ثمینہ اور اس کی والدہ کا خیال رکھیں گے۔" پھر اس نے انور علی کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

○

مارچ ۱۷۹۹ء کے آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کی افواج نے مختلف محاذوں سے میسور پر حملہ کر دیا۔ دشمن کے مقابلے میں میسور کے جنگی وسائل بہت کم تھے۔ تاہم امن کے زمانے میں سلطان ٹیپو نے جو دفاعی انتظامات کیے تھے ان کے پیش نظر اسے اس بات کا پورا اطمینان تھا کہ دشمن کی افواج اپنے لامحدود جنگی وسائل کے باوجود موسم برسات سے پہلے سرنگا پٹم تک نہیں پہنچ سکیں گی اور موسم برسات کی طغیانیاں سلطنتِ خداداد کے لیے پھر ایک بار ناقابلِ تسخیر حلیف ثابت ہوں گی۔ لیکن لارڈ ولزلی اپنی افواج کو پیش قدمی کا حکم دینے سے پہلے اس بات کا پورا اطمینان کر چکا تھا کہ یہ جنگ چند ہفتوں کے اندر ختم ہو جائے گی اور اسے لارڈ کارنوالس کی طرح موسم برسات میں سرنگا پٹم کی دیواروں کے سامنے تباہی اور بربادی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ولزلی کو اپنے اور میر نظام علی کے لاتعداد لشکر کی جرأت و ہمت سے زیادہ ان غداروں اور ملت فروشوں کی اعانت پر بھروسہ تھا جو سرنگا پٹم میں بیٹھ کر سلطان کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔

سلطنتِ خداداد کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہاں ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی جو ایک عظیم سلطنت کی تعمیر میں حیدر علی اور سلطان ٹیپو جیسے اولوالعزم حکمرانوں کی امنگوں کا ساتھ دے سکتے تھے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے میسور کے حکمرانوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے مسلمانوں کا بہترین جوہر جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔ سرنگاپٹم میں ہر ذہین اور باہمت انسان کے لیے کامیابی اور ترقی کے دروازے کھلے تھے۔ حیدر علی اور اس کے بعد سلطان ٹیپو کی فیاضی کے باعث جہاں زمانے کے بہترین علماء، سپاہی، سیاست دان، تاجر اور صناع میسور میں جمع ہو گئے تھے وہاں ایسے ابنائے وقت کی بھی کمی نہ تھی جو صرف سلطنتِ خداداد کی خوشحالی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ جب تک میسور کے حالات سازگار رہے انھوں نے اپنا مستقبل سلطان ٹیپو کے ساتھ وابستہ رکھا۔ لیکن جب ان طالع آزماؤں نے یہ دیکھا کہ سلطان ٹیپو تن تنہا زیادہ عرصہ کے لیے ساری دنیا کے ساتھ نہیں لڑ سکتا تو انھوں نے اپنا مستقبل انگریزوں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ میسور کی تیسری جنگ کے بعد ہی یہ لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ سلطنتِ خداداد کی بنیادیں ہل چکی ہیں اور اب یہ عظیم عمارت زیادہ عرصہ وقت کی آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ اگر نپولین مشرق کا رُخ کرتا یا زمان شاہ احمد شاہ ابدالی کی طرح اسلام کی محبت سے سرشار ہو کر پانی پت تک پہنچ جاتا تو یہ لوگ شاید سلطان کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کرتے لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ یہ طالع آزما اپنی عزت اور اقتدار کے لیے سلطان کا ساتھ دے سکتے تھے لیکن عزت کی موت میں انھیں اس کا ساتھی بننا گوارا نہ تھا۔

چنانچہ دشمن کی پیش قدمی سے قبل غدار وزیروں اور نمک حرام افسروں کا ایک منظم گروہ انھیں تمام ضروری معلومات فراہم کر چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کی افواج کے سپہ سالاروں کو یہ معلوم تھا کہ سرنگاپٹم کی طرف ان کے لیے کون سے راستے محفوظ اور کون سے غیر محفوظ ہیں۔ وہ کون سے قلعے اور چوکیاں ہیں جن کے محافظ وقت آنے پر سلطان سے غداری کر کے ان کے ساتھ مل جائیں گے۔ گزشتہ جنگوں میں انگریز اور ان کے حلیف مختلف

محاذوں پر سلطان ٹیپو کے طوفانی دستوں کی نقل و حرکت سے بے خبر رہتے تھے۔ لیکن اب انھیں ہر آن اس قسم کی اطلاعات مل رہی تھیں کہ آج سلطان کا پڑاؤ فلاں جگہ ہے۔ اب وہ فلاں محاذ سے پیچھے ہٹنے اور فلاں محاذ پر جوابی حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ فلاں قلعے یا فوج کے افسر خریدے جا چکے ہیں اور وہ آپ کا راستہ نہیں روکیں گے۔ فلاں فلاں دستوں کے افسر سلطان کے وفادار ہیں اور وہ آخری دم تک لڑتے رہیں گے ـــــ اور دشمن ان اطلاعات کی روشنی میں اپنے جنگی نقشے تیار کر رہا تھا۔

مارچ کے پہلے ہفتے سلطان ٹیپو پریاپٹم کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ جنرل سٹورٹ کے ہراول دستے اس کی زد میں آ چکے تھے اور سلطان کے اچانک حملے کے باعث ان کی مکمل تباہی یقینی تھی لیکن کسی غدار نے جنرل اسٹورٹ کو سلطان کے عزائم سے بروقت خبردار کر دیا اور اس نے فوراً کمک بھیج کر اپنی فوج کو تباہی سے بچا لیا۔ اس کے باوجود چند روز معرکوں میں سلطان کا پلہ بھاری رہا لیکن دوسرے محاذ پر جنرل ہیرس کی پیش قدمی کے باعث سلطان کو پریاپٹم سے کوچ کرنا پڑا۔

سلطان ٹیپو پریاپٹم سے سرنگاپٹم واپس پہنچ کر جنرل ہیرس کے خلاف جوابی حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا اور میر معین الدین اور پورنیا کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ سرنگاپٹم کے راستے میں جنرل ہیرس کے لشکر کو الجھانے کی کوشش کریں گے لیکن انھوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور جنرل ہیرس کی لاتعداد افواج کسی دقت کے بغیر ملولی کے قریب پہنچ گئیں۔ میسور کے لیے پورنیا اور معین الدین کی اس غداری کے نتائج نہایت خطرناک ثابت ہوئے۔ اگر وہ ذرا بھی نیک نیتی کا ثبوت دیتے تو جنرل ہیرس کا چند دنوں کے اندر ملولی تک پہنچ جانا ممکن نہ تھا۔ جنرل ہیرس کی فوج جس شان سے سفر کر رہی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ساٹھ ہزار بیل رسد اور جنگی سامان کی گاڑیوں میں جُتے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہزاروں اونٹوں پر بھی سامان لدا ہوا تھا اور کئی ہاتھی خالی توپیں کھینچ رہے تھے

اسی طرح میر نظام علی کی فوج کے ساتھ ہاتھیوں اور اونٹوں کے علاوہ چھتیس ہزار بیل تھے۔ بنجاروں اور خیمہ برداروں کی تعداد لڑنے والے سپاہیوں سے پانچ گنا زیادہ تھی۔ پانی پت کی جنگ کے بعد ہندوستان کی کسی شاہراہ پر اتنا بڑا قافلہ نہیں دیکھا گیا تھا۔ قریباً ایک لاکھ بیلوں اونٹوں اور سینکڑوں ہاتھیوں کو چارا مہیا کرنا معمولی بات نہ تھی۔ منگلور تک پہنچتے پہنچتے اس قافلے کی حالت یہ تھی کہ راستے کی ہر منزل پر سینکڑوں مویشی چارے کی قلت کے باعث ہلاک ہو رہے تھے اور جنرل ہیرس مجبوری کی حالت میں اپنا بہت سا سامان راستے میں ضائع کر چکا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور حیدر آباد کے لشکر کی یہ پیش قدمی اتنی غیر منظم اور ان کی رفتار اس قدر سست تھی کہ وہ بمشکل پانچ سات میل فی دن کے حساب سے راستہ طے کر رہے تھے۔ انھیں اگر کسی بات کا اطمینان تھا تو یہ کہ سلطان نے اپنے جن جرنیلوں کو ان کا راستہ روکنے کا حکم دیا تھا وہ دشمن کے قریب آنے کی بجائے ان سے چند منازل دور رہنا پسند کرتے تھے۔ اگر میر معین الدین اور پورنیا غداری نہ کرتے تو ان کی معمولی مزاحمت بھی دشمن کے تمام منصوبے خاک میں ملا سکتی تھی۔ جنرل ہیرس کا لشکر ایک منظم فوج کی بجائے دیہاتی برات معلوم ہوتی تھی۔ راستے کی دشوار گزار گھاٹیوں اور ناہموار راستوں پر بے شمار مقامات ایسے تھے جہاں میسور کے چھاپہ مار سواروں کے اچانک حملے دشمن کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔ راستے میں جنرل ہیرس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اپنی ہزاروں بیل گاڑیوں اور ان پر لدے ہوئے ساز و سامان کی حفاظت تھا۔ اگر پورنیا اور معین الدین جنرل ہیرس کا راستہ روک سکتے تو بھی جنرل ہیرس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بے پناہ ساز و سامان سے لدی ہوئی بیل گاڑیوں کی کئی میل لمبی قطار کے ساتھ اتنی اطمینان سے سفر کر سکتا۔ آٹھ سال قبل جب لارڈ کارنوالس نے سرنگا پٹم پر چڑھائی کی تھی تو اپنے بھاری ساز و سامان کے باعث اسے ایک عبرتناک تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

لے لارڈ ولزلی کے قول کے مطابق منگلور تک پہنچتے پہنچتے بار برداری کے اتنے جانور ہلاک ہو چکے تھے کہ انگریزی فوج کے لیے اپنی پیش قدمی ملتوی کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

...اگر اسی مستعدی کے ساتھ اب جنرل ہیرس کا راستہ روکنے کی کوشش کی جاتی تو اسے دونوں ...پروگرام مہینوں پر ملتوی کرنے کے لیے مجبور کیا جا سکتا تھا۔

یہ درست ہے کہ ۱۷۹۹ء میں سلطان کے فوجی وسائل وہ نہ تھے جو آٹھ سال قبل تھے ...لیکن مرہٹوں کی غیر جانب داری کے باعث سلطان کی رہی سہی طاقت اس قابل ضرور تھی ...وہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ نظام اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی متحدہ قوت کا مقابلہ کر سکتا۔ ...از کم ۱۷۹۹ء کے موسم برسات تک جنرل ہیرس کی افواج کو سرنگا پٹم سے دور رکھنا اس ...لیے کوئی مشکل بات نہ تھی اور اس کے بعد جنگ کی طوالت سلطان کی نسبت لارڈ ولزلی ...اور میر نظام علی کے لیے زیادہ خطرناک ہو سکتی تھی ——— لیکن اب سلطنتِ خداداد کے لیے ...اندرونی غدار بیرونی حملوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہے تھے۔

ان حالات میں سلطان اپنے طوفانی دستوں کے ساتھ سرنگا پٹم سے نکلا اور اس نے ...ملّا کے قریب جنرل ہیرس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس عرصہ میں سلطان کے ...غداروں کی غداری کے باعث جنرل ہیرس اپنے راستے کی دشوار منازل طے کر چکا تھا۔ سلطان نے ...ملاولی کے قریب پے در پے حملے کر کے دشمن کے سینکڑوں سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیے ...لیکن جنرل ہیرس کی لاتعداد فوج کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔ پھر جب اسے یہ اطلاع ...ملی کہ مغرب کی طرف سے بمبئی کی افواج سرنگا پٹم کی طرف بڑھ رہی ہیں تو اسے ملاولی کے ...میدان میں فیصلہ کن جنگ لڑنے کا ارادہ ترک کر کے پیچھے ہٹنا پڑا۔ جنرل ہیرس نے اپنے ...راستے میں سلطان کے حملوں کا خطرہ محسوس کر کے براہِ راست سرنگا پٹم کی طرف پیش قدمی ...کرنے کی بجائے وہ طویل راستہ اختیار کیا جہاں میسور کے غداروں کے اثر و رسوخ کے باعث ...کسی کی مزاحمت کی توقع نہ تھی اور قلعے کے شمال کی طرف دو میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا ...سرنگا پٹم کے جزیرے اور جنرل ہیرس کے فوجی کیمپ کے درمیان دریائے کاویری کے ...اور سلطان کی بیرونی چوکیاں حائل تھیں۔ جن کے توپ خانے انگریزوں کو سخت نقصان پہنچا

رہے تھے۔ جنرل ہیرس نے چند پے درپے حملوں کے بعد ان چوکیوں پر قبضہ کر لیا اور سرنگاپٹم کی فصیل سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر اپنی بھاری توپیں نصب کر دیں۔

جنرل اسٹورٹ کی کمان میں بمبئی کی افواج سلطان کے چند وفادار افسروں کی مزاحمت کے باعث ابھی تک سرنگاپٹم سے کئی میل دور رکی ہوئی تھیں۔ جنرل ہیرس نے اسٹورٹ کی مدد کے لیے چند دستے مغرب کی طرف روانہ کر دیے۔ سلطان ٹیپو نے ان حالات سے باخبر ہوتے ہی میر قمرالدین کو اسٹورٹ کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کر دیا لیکن بدقسمتی سے سلطان کا یہ آزمودہ کار افسر بھی غداروں کے ساتھ مل چکا تھا۔ چنانچہ اس کی طرف سے کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر جنرل ہیرس کے دستے بمبئی کے لشکر سے آملے اور یہ لشکر کسی دقت کے بغیر سرنگاپٹم کے قریب پہنچ گیا۔ حملہ آور افواج کو جس کام کے لیے مہینے درکار تھے وہ چند دنوں میں پورا ہو چکا تھا۔

اپریل کے وسط تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کی تمام فوج سرنگاپٹم کے آس پاس جمع ہو چکی تھی لیکن اپنی تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود جنرل ہیرس یہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اڑھائی ہفتوں کے اندر اندر اس جنگ کا فیصلہ نہ ہو سکا تو اس کے ہزاروں سپاہی فاقہ کشی پر مجبور ہو جائیں گے۔ اسے یہ توقع تھی کہ بمبئی کی فوج اپنے ساتھ کافی رسد لا رہی ہے۔ لیکن جنرل اسٹورٹ کی آمد پر اسے یہ پتہ چلا کہ اس کے اپنے سپاہی رسد کی کمی محسوس کر رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۸ اپریل کے بعد جنرل ہیرس اپنے سپاہیوں کو نصف راشن پر گزارہ کرنے کا حکم دے چکا تھا لیکن اس کے اپنے اندازے کے مطابق یہ نصف راشن بھی صرف اٹھارہ دن کے لیے کافی تھا۔ مویشیوں کے لیے چارے کے ذخیرے کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ ان حالات میں آئندہ اڑھائی یا تین ہفتے جنوبی ہندوستان کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن دور کی حیثیت رکھتے تھے۔ موسم برسات تک جنگ کی طوالت کی صورت میں کوئی معجزہ ہی انگریزوں کو تباہی سے بچا سکتا تھا۔ جنرل ہیرس کے لیے چند دنوں کے اندر اندر سرنگاپٹم پر قبضہ کرنا زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ ابھی تک سرنگاپٹم کی فصیل اور حملہ آور لشکر کے درمیان کئی دفاعی چوکیاں حائل تھیں اور ان چوکیوں پر قبضہ کیے بغیر قلعے پر مؤثر گولہ باری کرنا ممکن نہ تھا۔ جنرل ہیرس اپنے شدید نقصانات سے بے پروا ہو کر چند دن پے درپے ان چوکیوں پر حملے کرتا رہا۔ چنانچہ ۲۶ اپریل تک وہ قلعے کے آس پاس کئی ایسے مقامات پر قبضہ کر چکا تھا جہاں سے اس کی توپوں کے گولے بآسانی فصیل میں شگاف ڈال سکتے تھے۔

؎ جنرل ہیرس ۱۸ اپریل کو لارڈ ولزلی کے نام ایک مکتوب میں لکھتا ہے: "کہ آج صبح چاول کی صحیح مقدار معلوم کی گئی تو یہ پتہ چلا کہ ہم لڑنے والے سپاہیوں کو نصف راشن دے کر بھی صرف اٹھارہ دن اور گزارہ کر سکتے ہیں اگر ۶ مئی تک کرنل ریڈ رسد لے کر نہ پہنچا تو ہمارا ذخیرہ بالکل ختم ہو جائے گا۔"

چھبّیسواں باب

شاہی محل کے ایک کمرے میں سلطان کے وُزرار اور بڑے بڑے سول اور فوجی افسر جمع تھے۔ باہر توپوں کے دھماکوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ حاضرین کی نگاہیں برابر کے ایک کمرے پر لگی ہوئی تھیں اور ان کے چہرے یہ بتا رہے تھے کہ وہ کسی اہم واقعے کے منتظر ہیں۔ اچانک سلطان ٹیپو فوجی لباس میں نمُودار ہُوا۔ حاضرین مؤدب کھڑے ہو گئے۔ سُلطان نے اُنھیں بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہُوا اپنی مسند پر بیٹھ گیا۔ پھر چند ثانیے حاضرین مجلس کی طرف دیکھنے کے بعد سُلطان نے کہا: "میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ بات تھی کہ میسور کی جنگ سرنگا پٹم کی چار دیواری کے اندر لڑی جائے۔ مَیں نے اس جنگ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن جنگ بند کرنے کے لیے دشمن نے جو شرائط پیش کی ہیں وہ یہ ہیں: اوّلاً ہم آدھی سلطنت ان کے حوالے کر دیں اور دو کروڑ روپیہ بطور تاوان ادا کریں۔ ثانیاً میں اپنے چار بیٹے اور اپنی فوج کے چار بڑے افسر بطور یرغمال ان کے حوالے کر دوں۔ ہمیں یہ شرائط منظور کرنے کے لیے چوبیس گھنٹے اور یرغمال پیش کرنے اور تاوان کی نصف رقم ادا کرنے کے لیے اڑتالیس گھنٹے کی مہلت دی گئی ہے۔ میں اپنا فیصلہ دینے سے پہلے تمھاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہُوں۔"

اہلِ دربار پر سناٹا چھا گیا۔ میر صادق اپنے دائیں بائیں پورنیا، قمر الدین، میر معین الدین اور دُوسرے وُزرار کی طرف دیکھنے کے بعد اُٹھا اور کہا: "عالیجاہ! رعایا کے مستقبل کے متعلق سوچنا ایک حکمران کا کام ہے۔ ہم حضور کے خادم ہیں اور حضور کے اشاروں پر جان دینا ہمارا جُزوِ ایمان ہے۔"

میر صادق یہ کہہ کر بیٹھ گیا اور میر معین الدین نے اُٹھ کر کہا: "عالی جاہ ان حالات میں ہمارے لیے دشمن کی شرائط قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ـــــ سرنگا پٹم کو تباہی سے بچانے کے لیے ـــــ"

سُلطان نے اپنی نگاہیں میر معین الدین کے چہرے پر گاڑ دیں اور اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ پچھلی صفوں میں فوج کے نوجوان افسر انتہائی اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سلطان نے میر معین الدین سے مخاطب ہو کر کہا: "کہیے آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

معین الدین نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا: "عالی جاہ! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہم زیادہ عرصہ دشمن کو سرنگا پٹم کی چار دیواری سے باہر نہیں روک سکتے۔ میں مانتا ہُوں کہ دشمن کی شرائط بہت توہین آمیز ہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر ہم نے آج مصالحت کا موقع کھو دیا تو چند دن بعد وہ ہم سے زیادہ کڑی شرائط منوانے کی کوشش کریں گے۔"

میر معین الدین بیٹھ گیا اور میسور کی فوج کا جہاندیدہ افسر غازی خاں جس کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں، اُٹھ کر بولا: "سلطانِ معظم ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے دشمن کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی ہے۔ انگریز ہمیں بار بار دھوکا نہیں دے سکتے۔ یہ ان کی آخری شرائط نہیں۔ جنرل ہیرس کا یہ خیال ہے کہ جب حضور کے صاحبزادے اس کے قبضے میں ہوں گے تو ہمیں ان سے بدتر شرائط ماننے پر مجبور کیا جا سکے گا۔ اگر میں جنگ کے نتائج کے متعلق بالکل نا اُمید ہوتا تو میرے لیے ایسی شرائط قابلِ قبول نہ ہوتیں لیکن مجھے سرنگا پٹم کے ان چالیس ہزار سرفروشوں کی

جرأت اور ہمت پر پورا بھروسہ ہے جو آپ کے حکم پر جان دینا اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میر معین الدین نے جنرل ہیرس کی شرائط قبول کرنے کا مشورہ دے کر ان حریت پسندوں کے احساسات کی صحیح ترجمانی نہیں کی۔ میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ دشمن نے اب تک جو کامیابیاں حاصل کی ہیں، ان کی وجہ یہ نہیں کہ میسور کے سپاہیوں نے کسی میدان میں بزدلی یا بے غیرتی کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری فوج کے بعض رہنماؤں نے مختلف محاذوں پر انتہائی نااہلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر ہمارے تمام سپہ دار فرض شناسی کا ثبوت دیتے تو آج دشمن کے لشکر کو سرنگاپٹم سے کئی منازل دور ہونا چاہیے تھا۔ میسور کا سپاہی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ دشمن اسے ہر محاذ پر شکست دینے کے بعد یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ اسے صرف یہ شکایت ہے کہ اسے کئی میدانوں میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں دیا گیا۔ میں اس وقت اپنے کسی ساتھی کی گزشتہ فروگذاشتوں پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتا۔ تاہم یہ ضرور کہوں گا کہ آج بھی ہم یہاں سے یہ عزم لے کر نکلیں کہ اب ہم سابقہ غلطیوں کا اعادہ نہیں ہونے دیں گے تو چند دنوں کے اندر اندر دشمن کے تمام منصوبے خاک میں ملائے جا سکتے ہیں۔"

غازی خان کی تقریر کے دوران میں پچھلی قطار میں بیٹھے ہوئے افسروں کے چہروں پر امید کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ جب وہ بیٹھ گیا تو نوجوان افسروں کی آخری قطار سے انور علی اٹھا اور اس نے کہا: "عالی جاہ! غازی بابا صلح کے لیے دشمن کی شرائط کے متعلق میسور کے تمام حریت پسندوں کے خیالات کی ترجمانی کر چکے ہیں۔ جن لوگوں کو آپ نے عزت کی زندگی کا راستہ دکھایا ہے ان کے لیے یہ شرائط تلوار کے زخموں سے زیادہ تکلیف دہ ہیں۔ ابھی ہم زندہ ہیں اور ایسی شرائط کے خلاف تو ہماری قبروں کی مٹی بھی احتجاج کرے گی۔ سید صاحب[1] نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر ہم نے آج صلح کے لیے دشمن کی شرائط قبول نہ کیں تو چند دن بعد وہ ہم سے زیادہ سخت شرائط منوانے

[1] میر معین الدین

کی کوشش کرے گا۔ لیکن اگر گستاخی نہ ہو تو میں ان کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ ہمیں اپنی موت سے پہلے لحد میں کودنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ آج جب ہمیں اس جگہ حاضر ہونے کا حکم ملا تھا تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں ماضی کی کوتاہیوں پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور ہم واپس جا کر مستقبل کے متعلق اپنے سپاہیوں کو مطمئن کر سکیں گے جنھیں یہ شکایت ہے کہ انھیں دشمن کو سرنگاپٹم سے کئی کوس دور روکنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ جنھیں اس قسم کی افواہوں نے پریشان کر دیا ہے کہ ہمارے بعض اکابر نے جان بوجھ کر ملک کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ عالی جاہ! میں کسی پر الزام نہیں لگاتا لیکن گزشتہ واقعات کے پیش نظر میسور کا ایک ادنیٰ سپاہی بھی یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ دشمن کی پیش قدمی روکنے میں ہمارے بعض اکابر نے جس نااہلیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی نظیر میسور کی گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔"

میر معین الدین، میر قمر الدین، میر صادق اور پورنیا سراپا احتجاج بن کر سلطان کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن سلطان کے تیور دیکھ کر کسی کو زبان ہلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ انور علی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: "عالی جاہ! ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم پوری قوت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کریں اور اس پر یہ ثابت کر دیں کہ اس ملک کے بچے، بوڑھے اور جوان اپنی آزادی کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہم لڑے بغیر غلامی کی زندگی پر قناعت کر لیں۔ پہلی صورت میں ہمیں ایک طویل اور صبر آزما جنگ کے مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کے جاں نثار آلام و مصائب کے ہر طوفان سے سرخرو ہو کر نکلیں گے۔ اگر ہم دوسرا راستہ اختیار کریں تو ہماری حالت ان لوگوں سے مختلف نہیں ہو گی جو موت کے خوف سے خودکشی کر لیتے ہیں۔ جنرل ہیرس ایک طرف سرنگاپٹم کے گرد اپنا گھیرا مکمل کر رہا ہے اور دوسری طرف صلح کی بات چیت جاری رکھنا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمیں اس وقت تک خوش فہمی میں مبتلا رکھا جائے جب تک کہ اس کی تلوار ہماری شہ رگ تک نہیں پہنچ جاتی۔"

سلطان ٹیپو نے ہاتھ بلند کیا اور علی خاموش ہو گیا۔ سلطان نے کہا "نوجوان تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں دشمن کی یہ توہین آمیز شرائط تسلیم کرنے پر آمادہ ہو چکا ہوں؟"

انور علی نے جواب دیا "عالی جاہ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی کہ آپ ایسی توہین آمیز شرائط تسلیم کر سکتے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر ہم میں سے کسی کو انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی خوش فہمی ہے تو وہ دور ہو جانی چاہیے۔ ہمارے لیے صرف وہ معاہدہ آبرومندانہ ہوگا جو میسور کے سپاہی کی تلوار کی نوک سے لکھا جائے گا اور میں اپنے رہنماؤں اور ساتھیوں کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اس جنگ میں فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں پوری نیک نیتی کے ساتھ اس بات کا عہد کرنا پڑے گا کہ وہ آئندہ ان غلطیوں کا اعادہ نہیں کریں گے جن کے باعث وہ فوج جسے ہم کئی مہینے میسور کی سرحدوں پر روک سکتے تھے چند دن کے اندر اندر سرنگاپٹم کی چار دیواری تک پہنچ چکی ہے۔ میں جنگ کے نتائج کے متعلق مایوس نہیں ہوں لیکن اب حالات ایسے ہیں کہ ہم کسی اور غلطی یا کوتاہی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمیں ہر مرحلہ پر ایسے لوگوں سے خبردار رہنا چاہیے جنھیں انگریزوں کی غلامی کا طوق خوشنما زیور دکھائی دیتا ہے۔"

انور علی نے تقریر ختم کی اور بیٹھ گیا۔ سلطان ٹیپو نے کہا "ہم گزشتہ واقعات سے بے خبر نہیں ہیں اور ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارے بعض انتہائی قابلِ اعتماد افسروں نے ایک شرمناک غفلت اور کوتاہی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر وہ فرض شناسی کا ثبوت دیتے تو دشمن کا لشکر آج سرنگاپٹم سے کوسوں دور ہوتا۔ لیکن اس وقت ہم ماضی کے واقعات پر بحث کرنے میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتے۔ میں تم میں سے ہر ایک کو اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کا موقع دینا چاہتا ہوں ـــــ اور یہ اس لیے نہیں کہ مجھے اپنے بیٹوں کا خیال ہے۔ اگر میں یہ شرائط تسلیم کرنے میں اپنی رعایا کا کوئی فائدہ دیکھتا اور انگریز یرغمال کے لیے میرے تمام بیٹوں کا مطالبہ کرتے تو میں تمھارا مشورہ لیے بغیر انھیں انگریزوں کے حوالے کر دیتا لیکن

مجھے اپنی رعایا کے ہر بچے کا مستقبل اپنے بچوں کے مستقبل سے زیادہ عزیز ہے۔ اگر تم سب صدقِ دل سے میرا ساتھ دینا چاہتے ہو اور یہ وعدہ کرتے ہو کہ آئندہ تمھاری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی تو میں پورے وثوق کے ساتھ تمھیں یہ خوشخبری دے سکتا ہوں کہ خدا ہمیں اس جنگ میں فتح دے گا۔ میسور میں تمھاری عزت اور آزادی کے پرچم سرنگوں نہیں ہوں گے۔

دشمن کے حالات ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس وقت اس کے سپاہی آدھے راشن پر گزارہ کر رہے ہیں اور چند دن تک وہ بھوکوں مرنا شروع کر دیں گے۔ چارے کی کمی کے باعث ان کے ہزاروں گھوڑے اور بیل روزانہ ہلاک ہو رہے ہیں۔ چند دنوں تک برسات شروع ہو جائے گی۔ جنرل ہیرس بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہا ہے کہ اگر موسم برسات سے قبل یہ جنگ ختم نہ ہوئی تو اسے ایک عبرتناک تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے تمھیں ہر وقت چوکس رہنا چاہیے۔ جس دن دریائے کاویری کے پانی کی سطح بلند ہونی شروع ہوگی میں پورے وثوق اور اطمینان کے ساتھ تمھیں یہ خوشخبری سنا سکوں گا کہ ہم جنگ جیت چکے ہیں۔ برسات کے موسم میں دشمن کی لاتعداد فوج ہمارے رحم و کرم پر ہوگی اور ہم جوابی حملہ کرنے کی بجائے صرف رسد اور کمک کے راستوں کی ناکہ بندی سے دشمن کے پڑاؤ کو ایک وسیع قبرستان میں تبدیل کر دیں گے۔ اس وقت ہمارے سامنے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ ہم موسم برسات کے آغاز تک دشمن کو سرنگاپٹم کی چار دیواری سے دور رکھیں اور برسات کے ایام میں دشمن کی حالت اس ہاتھی سے مختلف نہیں ہوگی جو اپنے بھاری سازوسامان سمیت دلدل میں پھنس کر دم توڑ رہا ہو۔ تم مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا حق رکھتے ہو کہ اگر دشمن نے اپنے شدید نقصانات کے باوجود برسات کے اختتام تک سرنگاپٹم کا محاصرہ جاری رکھا تو ہم کب تک اس کا مقابلہ کر سکیں گے؟ میرا جواب یہ ہے کہ دشمن کو اپنی طاقت سے زیادہ ہماری کمزوری کے احساس نے اس جارحیت کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ اس نے سرنگاپٹم پر اس وقت حملہ کیا ہے جبکہ یورپ اور ہندوستان میں

وہ اپنے فوری خطرات سے آزاد ہو چکا ہے اور اسے اس بات کا یقین ہے کہ ہمیں باہر سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ لیکن میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ دشمن نے جن حالات سے فائدہ اٹھایا ہے وہ ہر وقت بدل سکتے ہیں۔ زمان شاہ کی واپسی کا یہ مطلب نہیں کہ قدرت نے ہمارا یہ آخری سہارا ہمیشہ کے لیے چھین لیا ہے۔ میں نے جو ایلچی لاہور روانہ کیے تھے انھوں نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ افغانستان کے حکمران کی واپسی چند مجبوریوں کا نتیجہ تھی۔ وہ افغانستان کے حالات درست کرتے ہی واپس آئیں گے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ ہندوستان میں انگریزوں کی جارحیت کا خطرہ ہمیشہ کے لیے دُور نہیں ہو جاتا۔ میرے ایلچی زمان شاہ کے پیچھے لاہور سے افغانستان روانہ ہو چکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر خدا نے چاہا تو وہ ناکام واپس نہیں آئیں گے اور تم عنقریب یہ خوشخبری سنو گے کہ زمان شاہ دوبارہ دلی کا رُخ کر رہا ہے۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ بحیرۂ روم میں فرانس کے جنگی بیڑے کو شکست دے کر انگریزوں نے جو اطمینان حاصل کیا ہے وہ نہایت عارضی ثابت ہو گا اور نپولین بہت جلد یورپ میں ایسے حالات پیدا کر دے گا کہ انگریز وہاں اُلجھ کر رہ جائیں گے اور ہندوستان سے پاؤں کھینچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اس جنگ میں مرہٹوں کی غیر جانب داری ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنا دوست نہیں سمجھتے۔ میں ابھی تک انھیں اپنا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں کر سکا۔ تاہم مجھے اُمید ہے کہ اگر یہ جنگ کچھ عرصہ جاری رہی اور ہم ثابت قدمی سے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے تو مرہٹے اس ملک کو کمپنی کی جارحیت سے نجات دلانے کے لیے ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ انھیں صرف یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ میسور کا سپاہی ہندوستان کے بدترین دشمن کے خلاف آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

میں ہر لحاظ سے اس جنگ کے نتائج کے متعلق پُر امید ہوں۔ لیکن اگر میں پُر اُمید نہ ہوتا تو بھی میں تم سے یہی کہتا کہ ہمارے لیے لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس دُنیا میں عزت اور آزادی کی زندگی کے تمام دروازے بند ہو جانے کے بعد ہمارے لیے ایک راستہ ہر وقت کھلا رہے گا اور

وہ عزت کی موت کا راستہ ہے۔ میں نے تمھیں صرف یہ بتانے کے لیے یہاں جمع کیا تھا کہ تمھارے دشمن کے عزائم کیا ہیں اور اگر تم عزت کی زندگی یا عزت کی موت کے طلبگار ہو تو قدرت تم سے کیا چاہتی ہے۔ اس کے بعد میں تمھاری کوئی کوتاہی یا بزدلی برداشت نہیں کروں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

○

اسی رات فوج کے چند افسر قلعے کے ایک کشادہ کمرے میں سرنگاپٹم کے فوجدار سید غفار کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ انور علی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے سید غفار کو سلام کرنے کے بعد کہا: "جناب معاف کیجیے مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ شمالی فصیل پر دشمن کی شدید گولہ باری کے باعث میرے دو بہترین افسر زخمی ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کی حالت بہت نازک تھی اور مجھے کچھ دیر اس کے پاس ٹھہرنا پڑا۔"

سید غفار نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے حاضرین کی طرف دیکھا اور کہا: "غازی خاں ابھی تک نہیں آئے اور ہم زیادہ دیر ان کا انتظار نہیں کر سکتے۔ میں نے آپ کو ایک اہم مشورے کے لیے یہاں جمع ہونے کی تکلیف دی ہے لیکن اپنی بات شروع کرنے سے پہلے میں تم سب سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ ہماری کوئی بات اس کمرے سے باہر نہیں جائے گی۔"

ایک افسر نے اٹھ کر کہا: "جناب ہم سب حلف اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔"

"نہیں حلف اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے ذرا سی بے احتیاطی کی تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر سید غفار نے کمرے کے دروازے کے سامنے دو پہریداروں کی طرف دیکھا اور انھیں حکم دیا: "تم یہ دروازہ بند کر دو اور باہر کھڑے رہو۔ اگر غازی بابا تشریف لائیں تو انھیں اندر بھیج دو۔ ان کے سوا کسی اور کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں۔"

پہریداروں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور سید غفار نے دوبارہ حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

ہمارے کسی ساتھی اس بات پر سخت مضطرب ہیں کہ سلطان معظم نے ابھی تک ان بڑے بڑے افسروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جنھوں نے دشمن کا راستہ روکنے میں واضح طور پر غفلت، کوتاہی یا بدنیتی کا ثبوت دیا ہے۔"

حاضرینِ مجلس کی نگاہیں اچانک انور علی کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں اور اس نے جلدی سے اُٹھ کر کہا: "جناب میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں اُن لوگوں کا ہم خیال ہوں جو سلطنت کے نااہل یا بددیانت افسروں کے خلاف فوری اقدام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور صرف میں ہی نہیں، سلطان کا ہر جاں نثار اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہے۔"

سید غفار نے قدرے برہم ہو کر کہا: "انور علی بیٹھ جاؤ۔ تمھیں اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے۔ میں اس صورتِ حال سے کم پریشان نہیں ہوں۔ لیکن میں ابھی سلطان معظم سے ملاقات کر کے آیا ہوں اور تمھیں یہ اطمینان دلا سکتا ہوں کہ ان معاملات کے متعلق ان کی معلومات ہم سے زیادہ ہیں۔ تم نے اپنی تقریر میں صرف ان چند آدمیوں کی طرف مبہم سا اشارہ کیا تھا جو اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن تمھیں یہ معلوم نہیں کہ یہ زہر کہاں تک پھیل چکا ہے۔ اگر چند بڑے افسروں کے خلاف فوری کارروائی سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا تو سلطانِ معظم ایک لمحہ کے لیے بھی توقف نہ کرتے۔ ہمارے محکمۂ سراغ رسانی کے افسروں نے سرنگاپٹم کے اندر اور سرنگاپٹم کے باہر غداروں کی جو فہرست پیش کی ہے وہ ہماری توقعات سے کہیں زیادہ طویل ہے اور اس میں بعض ایسے لوگوں کے نام بھی شامل ہیں جو کل تک سلطان کے جاں نثاروں کی صفِ اوّل میں شمار کیے جاتے تھے اور جن کی سابقہ خدمات کے پیشِ نظر شاید تمھارے لیے بھی یہ یقین کرنا مشکل ہو کہ وہ سلطان کے ساتھ غداری کر سکتے ہیں۔ سلطانِ معظم کو صرف اس بات کا افسوس ہے کہ انھیں ان لوگوں کے عزائم کا اس وقت پتہ چلا ہے جبکہ دشمن کی تلوار ہماری شہ رگ کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اگر انھیں دشمن کی پیش قدمی سے قبل ان حالات کا علم ہو جاتا تو ان سے نپٹنا مشکل نہ تھا۔ لیکن موجودہ حالات ہمیں کسی فوری اقدام کی اجازت نہیں دیتے۔ دشمن ایک طرف رسد کی کمی اور دوسری طرف موسم بر

کی آمد کے خوف سے آئندہ دس پندرہ دن کے اندر اندر سرنگاپٹم پر فیصلہ کن حملہ کرنے کی کوشش کرے گا اور ان ایام میں ہم کسی اندرونی خلفشار کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ تین ہفتے احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ اس کے بعد دشمن کی طرف سے مطمئن ہوتے ہی ہم اپنے گھر کی صفائی پر توجہ دے سکیں گے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ سرنگاپٹم کے اندر اور باہر تمام غداروں کو بیک وقت گرفتار کر لیا جائے اور کسی کو فتنہ پیدا کرنے یا بھاگنے کا موقع نہ دیا جائے۔ غداروں پر فوراً ہاتھ ڈالنے میں سلطانِ معظم کے تذبذب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے محکمۂ جاسوسی نے جن لوگوں کی فہرست پیش کی ہے ان میں اکثر ایسے ہیں جن کے خلاف ابھی تک کوئی واضح ثبوت نہیں مل سکا۔"

انور علی نے کہا: "آپ کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک میر قمر الدین، میر معین الدین اور پورنیا جیسے لوگ بھی مجرم ثابت نہیں ہوئے؟"

سید غفار نے جواب دیا: "واقعات کی روشنی میں ان لوگوں پر نااہلیت یا بزدلی کا الزام درست ہو سکتا ہے لیکن انھیں غدار ثابت کرنے کے لیے ہمارے جاسوس ابھی تک کوئی قابلِ یقین ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ پورنیا کے متعلق تو میں بھی یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ ایک فوجی مہم کے لیے اس کا انتخاب سراسر غلط تھا اور اس نے عمداً کوئی کوتاہی نہیں کی۔ لیکن قمر الدین اور سید صاحب کے متعلق سلطانِ معظم کے خیالات وہی ہیں جو ہمارے ہیں۔ سلطانِ معظم نے مجھے اس بات کی تسلی دی ہے کہ انھیں آئندہ کوئی اہم ذمہ داری نہیں سونپی جائے گی۔ تاہم جب تک وہ فوج میں ہیں میسور کے ہر دیانت دار افسر اور سپاہی کو ان پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیے۔ معین الدین اور قمر الدین کے علاوہ کوئی تیس آدمی اور ایسے ہیں جن کے خلاف خفیہ تحقیقات شروع ہو چکی ہے اور جب تک اس تحقیقات کے نتائج ہمارے سامنے نہیں آتے ہمارے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ہم ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔"

ایک افسر نے اٹھ کر سوال کیا: "جناب وہ تیس آدمی کون ہیں؟"

"اُن کے نام آپ کو غازی بابا سے معلوم ہوں گے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟"

○

اچانک کمرے سے باہر چند آدمیوں کا شور سنائی دیا اور حاضرین دم بخود ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر کوئی بلند آواز میں کہہ رہا تھا: "فوجدار صاحب مصروف ہیں آپ اندر نہیں جا سکتے ——" پھر کسی نے بارُعب آواز میں جواب دیا: "فوجدار صاحب سے کہو کہ غازی بابا زخمی ہیں اور ان کی حالت بہت خراب ہے۔"

سیّد غفار اضطراب کی حالت میں کرسی سے اُٹھا اور اس نے بھاگ کر دروازہ کھولتے ہوئے پُوچھا: "غازی بابا کہاں ہیں؟ وہ کیسے زخمی ہو گئے؟"

"جناب وہ ابھی قلعے کے دروازے کے قریب پہنچ کر گر پڑے تھے۔ سپاہیوں نے انھیں اٹھا کر دروازے کے پاس ہی ایک کمرے میں لٹا دیا ہے۔ وہ بے ہوش ہیں اور ان کا لباس خُون سے تر ہے۔ طبیب کہتا ہے کہ زخم بہت خطرناک ہے۔"

سیّد غفار کچھ کہے بغیر سپاہی کے ساتھ چل دیا اور اس کے ساتھی جواب کمرے سے باہر آ چکے تھے اس کے پیچھے ہو لیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ غازی خاں کے بستر کے قریب کھڑے تھے۔ میسُور کا عمر رسیدہ جرنیل نزع کے عالم میں تھا۔ طبیب نے اس کے سینے پر پٹی باندھی تھی وہ خون سے تر ہو چکی تھی۔ سیّد غفار نے جُھک کر غازی خاں کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا اور طبیب کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"ان کے سینے پر گولی لگی ہے۔" طبیب نے کہا۔

"غازی بابا آپ کہاں تھے؟ آپ کیسے زخمی ہوئے؟" سید غفار نے مُضطرب ہو کر پُوچھا۔

غازی بابا نے جواب میں اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور ڈوبتی ہُوئی آواز میں جواب

دیا: "میں اس طرف آ رہا تھا —— راستے میں ملک جہان خاں کا سراغ مل گیا —— اور میں —"

غازی خاں یہاں تک کہہ کر کھانسنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے مُنہ سے خُون آ گیا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سید غفار نے بھرّائی ہُوئی آواز میں پوچھا: "غازی بابا ملک جہان خاں کہاں ہے؟"

غازی خاں نے آنکھیں کھولیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی سانس اُکھڑ گئی۔ انور علی انتہائی کرب کی حالت میں آگے بڑھا اور اس نے غازی کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "غازی بابا خدا کے لیے بتائیے آپ کیسے زخمی ہوئے؟ ملک جہان خاں کہاں ہے؟"

غازی خاں کے ہونٹوں میں ایک ہلکی سی جُنبش پیدا ہُوئی لیکن انور علی ایک مبہم سی آواز کے سوا کچھ نہ سُن سکا۔ چند ثانیے بعد وہ ایک گہری اور لمبی سانس کے ساتھ اپنا سفرِ حیات ختم کر چکا تھا۔

طبیب باہر جانے لگا تو انور علی نے جلدی سے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا: "مجھے اُمید ہے کہ آپ سے جو باتیں اس کمرے میں سنی ہیں وہ اپنے تک محدود رکھیں گے۔ ملک جہان خاں ایک عرصہ سے لاپتہ ہے ممکن ہے کہ غازی خاں کے قاتل تلاش کرنے کے بعد ہمیں ملک جہان خاں کا سراغ بھی مل جائے اگر کوئی آپ سے پُوچھے تو آپ صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ غازی بابا بیہوشی کی حالت میں وفات پا گئے تھے۔"

طبیب نے کہا: "آپ مطمئن رہیں میری طرف سے کوئی بات ظاہر نہیں ہو گی۔"

طبیب باہر نکل گیا تو انور علی نے باقی آدمیوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا: "اس سلسلہ میں ہم سب کو انتہائی رازداری سے کام لینا پڑے گا۔ غازی بابا کسی خطرناک سازش کے تحت قتل کیے گئے ہیں۔ وہ ہمارے اجتماع میں شرکت کے لیے آ رہے تھے اور انھیں نو بجے یہاں پہنچنا تھا۔ ان کی قیام گاہ اور قلعے کے درمیان کوئی دس بارہ منٹ کا راستہ ہے اس لیے وہ کوئی پونے نو بجے روانہ ہوئے ہوں گے۔ اس سلسلہ میں ہمیں کسی قیاس سے کام لینے کی بھی ضرورت نہیں

غازی بابا کی روانگی کا وقت ان کی قیام گاہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے اگر وہ نو بجے سے قبل روانہ ہوتے ہوں تو ہمارے لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زخمی ہو کر یہاں پہنچنے سے پہلے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ کہاں تھے۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ملک جہان خاں کی تلاش میں گئے تھے لیکن ہمارے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں کہ وہ کس طرف گئے تھے اور ملک جہان خاں کے متعلق انھیں کس نے خبر دی تھی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ معمولی تحقیقات کے بعد اس معاملے کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔ غازی بابا کوئی غیر معروف شخصیت نہ تھے۔ انھیں سرینگا پٹم کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ شہر کے بازاروں یا گلیوں میں چلتے وقت انھیں کسی نے ضرور پہچان لیا ہوگا۔ کم از کم رات کے پہرے داروں نے انھیں ضرور دیکھا ہوگا۔ غازی بابا کو ملک جہان خاں کے ساتھ بہت زیادہ اُنس تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے قاتلوں نے انھیں ورغلانے کے لیے جہان خاں کے متعلق کوئی فرضی کہانی سنائی ہو۔ لیکن اگر ملک جہان خاں سرینگا پٹم میں موجود ہے تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی جان بھی خطرے میں ہے۔ کیونکہ میسور کے جن دشمنوں نے غازی بابا کو قتل کیا ہے وہ ملک جہان خاں کو زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ غازی بابا مرنے سے پہلے ملک جہان خاں کے متعلق کچھ کہہ گئے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں اس حادثہ کی تحقیقات کے دوران میں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔"

سید غفار نے شفقت سے انور علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "میں تمھیں اس حادثے کی تفتیش کے لیے مکمل اختیارات دیتا ہوں۔"

○

ایک رات منیرہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر مختلف اطراف سے لگاتار توپوں اور بندوقوں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ فضا گندھک اور بارود کے دھوئیں سے متعفن ہو چکی

تھی۔ خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا: "بیگم صاحبہ! خان صاحب شاید آج بھی نہ آئیں۔ اب بہت دیر ہو گئی ہے آپ کا کھانا لے آؤں؟"

منیرہ نے جواب دیا: "نہیں مجھے ابھی بھوک نہیں۔ تم جا کر سو جاؤ۔ اگر وہ آگئے تو میں خود کھانا لے آؤں گی۔"

خادمہ نے کہا: "بی بی جی آج دشمن نے سارا دن دم نہیں لیا۔ ان کی توپیں صبح سے آگ برسا رہی ہیں۔ منور کہتا تھا کہ ابھی چند گولے ہمارے پڑوس میں گرے تھے اور ہمارے پاس ہی ایک مکان کی چھت میں شگاف پیدا ہو گئے ہیں۔"

منیرہ نے جواب دیا: "منور نے سب سے پہلے یہ خبر مجھے سنائی تھی اور پڑوس کے مکان کی چھت پر جو گولا گرا تھا میں نے اس کا دھماکہ سنا تھا۔"

خادمہ نے کہا: "بی بی جی آپ چند نوالے کھا لیتیں تو بہتر ہوتا۔"

"میں کھا لوں گی تم جاؤ۔"

خادمہ کمرے سے باہر نکل گئی اور منیرہ کرسی سے اُٹھ کر دریچے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بستر پر لیٹ گئی۔ آدھی رات تک بے چینی کی حالت میں کروٹیں بدلنے کے بعد اس پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ لیکن اچانک سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور اس کا سینہ مسرت کی دھڑکنوں سے لبریز تھا۔ انور علی کمرے میں داخل ہوا اور وہ بے اختیار آگے بڑھ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ انور علی نے اس کے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تھکی آواز میں کہا: "منیرہ تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

منیرہ نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا ——— مسکرائی ——— اور اس کے ساتھ ہی اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک پڑے۔

اس نے کہا: "تشریف رکھیں میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔"

انور علی نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا: "میں کھانا کھا چکا ہوں اس وقت مجھے تھوڑی دیر آرام

کی ضرورت ہے۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں!" منیرہ نے کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تھک گیا ہوں منیرہ ۔۔۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اگر ہم تمام افسروں پر یکساں اعتماد کر سکتے تو یہ جنگ بہت آسان تھی لیکن ہمیں ہر وقت یہ خدشہ رہتا ہے کہ بعض لوگ ہمیں کسی وقت بھی دھوکہ دے سکتے ہیں۔ مجھے گزشتہ تین راتوں میں زیادہ سے زیادہ چھ یا سات گھنٹے سونے کا موقع ملا ہے۔ آج میں تھکاوٹ اور نیند سے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا اور سید غفار نے مجھے صبح تک گھر میں آرام کرنے کا حکم دیا ہے۔"

منیرہ نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ میسور کا کوئی سپاہی سلطان کے ساتھ غداری کر سکتا ہے۔"

"منیرہ ہمیں میسور کے عام سپاہیوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ مرتے دم تک سلطان کے وفادار رہیں گے۔ ہمیں صرف اُوپر کے طبقے کے ان مفاد پرست لوگوں سے خطرہ ہے جو تاریک گزرگاہوں میں قوم کا ساتھ نہیں دیا کرتے۔"

منیرہ نے سوال کیا۔ "ایسے ناقابلِ اعتماد لوگوں کو فوج سے علیحدہ کیوں نہیں کیا گیا؟"

انور علی نے جواب دیا۔ "منیرہ بعض اوقات ایک غلط وقت پر ایک صحیح اقدام بھی خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرتا۔ ہماری تاریخ کے یہ چند دن ایسے ہیں کہ ہم کسی اندرونی انتشار کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر خُدا کا فضل شاملِ حال رہا تو دو ہفتوں کے اندر اندر جنگ کے حالات ہمارے موافق ہو جائیں گے اور ہم اپنے اندرونی حالات پر پُوری توجہ دے سکیں گے۔ ابھی تک ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ دشمن کے ساتھ سازباز کرنے والے غداروں کی صحیح تعداد کیا ہے۔ تاہم تمہارے اطمینان کے لیے میں یہ بتا سکتا ہُوں کہ جن لوگوں کی وفاداری مشکوک ہے انھیں جنگ کے دوران میں کوئی اہم ذمّہ داری نہیں سونپی جائے گی۔ پھر جب مُناسب وقت آئیگا تو تم ایک ساتھ دو اہم خبریں سنو گی۔ ایک یہ کہ ہم نے دشمن کو پسپائی پر مجبور کر دیا ہے اور دُوسری یہ کہ ہم نے سرنگاپٹم کے اندر اور سرنگاپٹم سے باہر دُوسرے شہروں اور قلعوں میں سلطان کے خلاف ایک خطرناک سازش میں حصّہ لینے والے تمام مجرموں کو گرفتار کر لیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو غدار ابھی تک ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں وہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر سلطان کا وفادار ثابت کرنے کی کوشش کریں اور ہم فوج کے اندر بے چینی اور بددلی کا خطرہ مول لیے بغیر اس سازش کے سرغنوں سے نجات حاصل کر لیں۔"

منیرہ نے چند ثانیے سوچنے کے بعد پُوچھا: "آپ کو یقین ہے کہ چند دنوں تک جنگ کا پانسہ پلٹ جائے گا؟"

"ہاں منیرہ مجھے یقین ہے۔ وہ سپاہی جنھیں سُلطان ٹیپو جیسا رہنما ملا ہو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتے ۔۔۔۔" انور علی نے یہ کہہ کر اپنے جُوتے اتار دیے اور ایک جمائی لے کر بستر پر لیٹ گیا۔ منیرہ نے ذرا آگے جھک کر اپنی نازک اور خوبصورت انگلیوں سے اس کے سر کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا: "غازی خان کے قاتلوں کا سُراغ ملا؟"

"نہیں ابھی تک ہمیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس مردِ مجاہد کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔"

منیرہ نے کہا: "میں ابھی آپ کے آنے سے پہلے یہ سوچ رہی تھی کہ اس وقت مراد کہاں ہوگا۔ لاہور سے افغانستان کا رُخ کرنے کے بعد اس نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔"

"مجھے یقین ہے کہ اگر زمان شاہ کے ساتھ اس کی ملاقات ہو گئی تو وہ بہت جلد واپس پہنچ جائے گا۔" انور علی نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں اور چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

○

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر قبل میر قمرالدین اپنے شاندار محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ایک نوکر نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "حضور سید صاحب تشریف

لاتے ہیں۔"

قمرالدین جلدی سے باہر نکلا تو میر معین الدین برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ قمرالدین نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "آپ نے بہت دیر لگائی میں سخت پریشان تھا۔ ابھی تک ہمارے باقی دوستوں میں سے بھی کوئی نہیں پہنچا۔"

میر معین الدین نے کہا: "انھیں میر صادق نے یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔"

میر قمرالدین پریشانی اور اضطراب کی حالت میں میر معین الدین کی طرف دیکھنے لگا اور معین الدین نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا: "میر صاحب پریشانی کی کوئی بات نہیں موجودہ حالات میں ہمارا ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنا ضروری ہے۔ ابھی میر صادق کا ایک آدمی میرے پاس یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ حکومت کے جاسوس خاص طور پر میرا اور آپ کا پیچھا کر رہے ہیں، اس لیے ہمارے باقی ساتھیوں کو ہم سے الگ تھلگ رہنا چاہیے۔ میرا اور آپ کا معاملہ میر صادق، بدرالزماں خاں اور میر غلام علی سے مختلف ہے۔ بدرالزماں کے متعلق تو سلطان یہ سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوگا کہ وہ کوئی بدعہدی کر سکتا ہے۔ پورنیا فوجی معاملات میں اپنی نااہلیت اور بے سمجھی کا اعتراف کرنے کے بعد کافی حد تک سلطان کے شبہات دور کر چکا ہے لیکن جو افسر براہِ راست ہمارے ماتحت تھے ان پر کڑی نگرانی رکھی جا رہی ہے۔ اگر ہمیں ابھی تک گرفتار نہیں کیا گیا تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سلطان کے دربار میں بدرالزماں خاں کا اثر و رسوخ کم نہیں ہوا اور ان کا یہ مشورہ مان لیا گیا ہے کہ حالات کی پوری چھان بین سے قبل اس سلسلہ میں کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔"

قمرالدین مسکرایا: "سید صاحب ہمارے فوراً گرفتار نہ کیے جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میر صادق کی کوششوں سے غدّاروں کی فہرست میں کئی ایسے آدمیوں کے نام بھی شامل کر دیے گئے ہیں جنھیں میسور کے سپاہی شک و شبہ سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ محکمۂ جاسوسی کا ایک بڑا افسر میر صادق کے ہاتھ میں ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں۔ میر صادق ہمیں تمام باتیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔ اس کے اپنے جاسوس ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے سرنگاپٹم کے اندر اور سرنگاپٹم سے باہر ہمارے تمام ساتھیوں کا علم ہے لیکن ہمیں اس کے بیشتر ساتھیوں کے متعلق کوئی علم نہیں۔ اسے یہ معلوم ہے کہ انگریز کس دن اور کس وقت سرنگاپٹم پر فیصلہ کن حملہ کریں گے۔ فصیل کے کون سے حصے میں شگاف ڈالا جائے گا اور جنرل ہیرس کا راستہ صاف کرنے کے لیے کون سے اقدامات کیے جائیں گے۔"

میر معین الدین نے کہا: "مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کہیں ہم نے اتنے ہوشیار آدمی کو اپنا ساتھی سمجھنے میں غلطی نہ کی ہو۔ اگر جنگ کے حالات بدل گئے تو ایسے ہوشیار آدمی سے یہ بات غیر متوقع نہیں کہ وہ دشمن کی کامیابی سے مایوس ہو کر اپنا مفاد سلطان کے ساتھ وابستہ کر دے۔ اگر وہ سلطان کے ساتھ غدّاری کر سکتا ہے تو ہمیں بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ ہمارے خلاف اس کے پاس اتنا مواد ہے کہ وہ جب چاہے ہماری گردن میں پھانسی کا پھندا ڈلوا سکتا ہے لیکن ہم اس پر کوئی جرم ثابت نہیں کر سکیں گے۔"

قمرالدین نے جواب دیا: "سید صاحب جب تک ملک جہان خاں سرنگاپٹم کے قید خانے میں موجود ہے ہمیں میر صادق سے کوئی خطرہ نہیں۔ اس نے پورنیا کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے ملک جہان خاں کے قتل کی مخالفت کی تھی۔ اب ہماری کوشش یہ ہوگی کہ جب تک ہمارے خدشات دور نہیں ہوتے ملک جہان خاں کا بال بیکا نہ ہو اور میں نے اس بات کا پورا انتظام کر لیا ہے۔ قید خانے کا داروغہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک ایسی تحریر ہے جو آخری وقت تک میر صادق کی شہ رگ پر خنجر کا کام دیتی رہے گی۔"

میر معین الدین دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور قمرالدین نے قدرے توقف کے بعد کہا: "میرے پاس سلطان کے نام ملک جہان خاں کی ایک درخواست ہے جس میں اس نے

اپنی گرفتاری کے تمام واقعات بیان کیے ہیں؟

"یہ درخواست آپ کے پاس کیسے پہنچی؟"

میر قمرالدین نے جواب دیا: "میں نے قید خانے کے داروغہ کو مشورہ دیا تھا اور اس نے ملک جہان خاں سے یہ درخواست لکھوا کر میرے حوالے کر دی تھی۔ اب صورت یہ ہے کہ قید خانے کا داروغہ میر صادق اور میں ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ میں احتیاط کے طور پر اس درخواست کے متعلق پر رنیا اور میر صادق کو بھی بتا چکا ہوں۔ ہمارے لیے اپنے تمام ساتھیوں کو اس بات کا یقین دلانا ضروری تھا کہ پھانسی کا پھندا ہم سب کے لیے یکساں تکلیف دہ ہوگا۔"

معین الدین نے کہا: "میر صاحب غازی خاں کا قتل میرے لیے ابھی تک ایک معمّا ہے۔"

"لیکن میرے لیے یہ معمّا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے میر صادق کے آدمیوں نے قتل کیا ہے اور اسے قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ جس قدر ذہین اور تجربہ کار تھا اسی قدر ہمارے لیے خطرناک تھا۔"

"آپ نے میر صادق سے اس کے متعلق پوچھا ہے؟"

"نہیں، لیکن غازی خاں کے قتل سے پہلے میر صادق نے ایک دن میرے ساتھ جو باتیں کی تھیں ان سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے آدمی غازی خاں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

ستائیسواں باب

مئی ۱۷۹۹ء کے آغاز کے ساتھ سرنگاپٹم پر دشمن کی گولہ باری انتہائی شدت اختیار کر چکی تھی۔ میسور کے غدار دفاعی استحکامات کے متعلق دشمن کو تمام ضروری معلومات فراہم کر چکے تھے اور شہر پناہ کے کمزور حصوں پر دشمن کی گولہ باری نسبتاً زیادہ شدید تھی۔ انگریز آہستہ آہستہ اپنی قلعہ شکن توپیں آگے لا رہے تھے اور ان کے پیادہ دستے حملے کے لیے فصیل کے اردگرد خندقیں کھود رہے تھے۔ قلعے کی بیرونی فصیل کے مورچوں سے دشمن پر اہل سرنگاپٹم کی گولہ باری کافی موثر ثابت ہو سکتی تھی اور انھیں بآسانی پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا۔ لیکن جو افسر غدارانِ قوم کے ساتھ مل چکے تھے وہ صرف نمائشی کارگزاری پر اکتفا کر رہے تھے۔ دشمن کو صرف ان مورچوں سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جہاں سلطان کے وفادار افسر موجود تھے۔

اس طوفان میں عام سپاہیوں کے حوصلے قائم رکھنا سلطان کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ کبھی پیدل اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر جگہ جگہ دفاعی استحکامات کا معائنہ کرتا اسے اپنی تھکاوٹ، بھوک اور پیاس کا احساس نہ تھا۔ لیکن غدار اپنا کام کر چکے تھے۔ وہ سلطان کو دیکھنے پر دشمن پر گولہ باری شروع کر دیتے اور جب سلطان کی توجہ کسی دوسرے محاذ پر مبذول ہوتی تو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے۔ سلطان کے وفادار افسر بھی اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے

دن رات مصروف رہتے تھے۔ لیکن ان کی ہمّت اور ان کا ایثار و خلوص دشمنانِ وطن کے ارادوں کا توڑ ثابت نہ ہوسکا۔ جو افسر میر صادق اور دُوسرے غدّاروں کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے وہ نمائشی گولہ باری کے وقت بھی اس بات کی تسلّی کر لیتے تھے کہ دشمن ان کی توپوں اور بندوقوں کی زد سے باہر ہے۔

۳ مئی کے دن فصیل میں چند شگاف پیدا ہو چکے تھے اور شہر میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ سلطان آدھی رات تک مختلف مورچوں میں گشت کرتا رہا۔ تیسرے پہر اس نے محل میں جانے کی بجائے شمالی دیوار کے ساتھ ہی ایک خیمے میں کچھ دیر آرام کیا۔ صبح کے وقت وہ کھانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو خیمے کے دروازے کے سامنے فوج کے چند افسر اور چند ہندو سادھو اور جوتشی کھڑے تھے۔ ایک افسر نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کہا: "عالیجاہ! رات کے وقت دشمن کی مسلسل گولہ باری کے باعث شہر پناہ کے جنوب مغربی کونے میں ایک وسیع شگاف پڑ چکا ہے۔"

سلطان نے کسی توقف کے بغیر اپنا گھوڑا لانے کا حکم دیا۔ لیکن سرنگا پٹم کے مشہور جوتشی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا: "اَن داتا آج کا دن آپ کے لیے بہت منحوس ہے۔ اس لیے آپ کو اپنے محل میں قیام کرنا چاہیے۔"

سلطان مسکرایا: "اگر تم مجھے موت سے ڈرانا چاہتے ہو تو تمھیں مایوسی ہوگی۔"

"نہیں نہیں اَن داتا آج آپ باہر نہ نکلیں۔"

سلطان نے کہا: "اس دنیا میں ہر مسافر کی ایک آخری منزل ہوتی ہے اور میں اپنی تقدیر سے بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

جوتشی نے کہا: "اَن داتا بھگوان آپ کو رہتی دُنیا تک سلامت رکھے لیکن آج آپ دان ضرور کریں۔"

سلطان نے پاس ہی ایک سپاہی کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا: "سونے اور چاندی کے دان کے لیے محل کے داروغہ کو میرا حکم پہنچ چکا ہے لیکن ایک حکمران کا سب سے بڑا دان یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی عزّت اور آزادی کے لیے اپنے خُون کے چند قطرے پیش کر دے۔"

سُلطان نے زین پر بیٹھتے ہی گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ شگاف کے قریب پہنچا تو انور علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا: "عالی جاہ آگے مت جائیے!"

سُلطان نے کہا: "کیوں کیا بات ہے تم اس قدر بدحواس کیوں ہو؟"

انور علی کی طرف سے کسی جواب سے قبل یکے بعد دیگرے توپ کے تین گولے چند قدم دُور گرے اور لوہے کا ایک ٹکڑا سُلطان کا بازو چھُوتا ہُوا نکل گیا۔ بائیں طرف فوج کے افسروں اور سپاہیوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ تین آدمی سُلطان کو دیکھتے ہی بھاگتے ہُوئے اس کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک بدرالزمان دُوسرا میر صادق اور تیسرا یورپین دستوں کا افسرِ اعلیٰ موسیو چیپوئے تھا۔ ان کے نزدیک آنے تک شگاف کے قریب چند اور گولے گرے۔ سُلطان اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ بدرالزمان خان، میر صادق اور فرانسیسی افسر سلام کرنے کے بعد ادب سے سلطان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور فرانسیسی افسر نے کسی تمہید کے بغیر کہا: "حضور میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہُوں۔"

"کہو!"

"عالی جاہ آپ کے جاں نثاروں کے لیے یہ صورتِ حال بہت پریشان کُن ہے۔ اب مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں کہ ہماری فوج میں کوئی ایسے غدّار ضرور ہیں جو ہمارے مورچوں کے اندر بیٹھ کر دشمن کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ یہ قلعے کا سب سے کمزور حصّہ ہے اور اس پر مسلسل گولہ باری اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دشمن سے ہماری کوئی کمزوری پوشیدہ نہیں۔ دشمن چاروں طرف اپنے مورچے اتنے قریب لا چکا ہے کہ وہ کسی وقت بھی سرنگا پٹم پر یلغار کر سکتا ہے۔

ہمارے لیے جنگ کو موسم برسات تک طول دینا زندگی اور موت کا مسئلہ ہے لیکن بعض انتہائی ذمہ دار افسروں کے سابقہ کردار کے پیشِ نظر مجھے یہ توقع نہیں کہ ہم زیادہ دیر دشمن کو سرنگاپٹم کی دیواروں سے باہر روک سکیں گے۔ اگر مجھے بُزدل یا نمک حرام نہ سمجھ لیا جائے تو میں ــــ"

"مگر تم رُک کیوں گئے۔ اگر تم کوئی مفید تجویز پیش کر سکتے ہو تو ہم سُننے کے لیے تیار ہیں۔"

"عالی جاہ! میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سرنگاپٹم کی بجائے سرایا چتل ڈرگ کو اپنا مستقر بنا کر دشمن کے ساتھ جنگ جاری رکھیں۔ اگر آپ دس ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادہ سپاہی اپنے ساتھ لے جائیں تو بھی سرنگاپٹم کی دفاعی قوت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوگی۔ سرنگاپٹم کو اگر کوئی فوری خطرہ ہے تو وہ ان غداروں کی طرف سے ہے جن کی سازشوں کے باعث ابھی حضور کے وفادار سپاہیوں کو اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ اگر آپ میری تجویز مانیں تو میں آخری دم تک سرنگاپٹم کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔"

میر صادق نے بدرالزماں کی طرف دیکھا اور اس نے کہا: "عالی جاہ! موسیو چیپوئے اور ان کے ساتھیوں کے خلوص اور وفاداری کا مجھے اعتراف ہے۔ لیکن حضور کے سرنگاپٹم سے چلے جانے کے بعد ہمارے سپاہیوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ سرنگاپٹم میں کوئی سازش ہو رہی ہے۔ لیکن ہم میں اگر کوئی نمک حرام موجود ہیں تو بھی حضور کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ ورنہ ان کے حوصلے بہت بلند ہو جائیں گے۔"

میر صادق نے کہا: "عالی جاہ! میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری ڈھال اور تلوار صرف آپ کی ذات ہے۔ ہمارے سپاہی، ہماری توپیں اور بندوقیں یا ہماری فصیلیں اور خندقیں آپ کی جگہ نہیں لے سکتیں۔"

فرانسیسی افسر نے مایوس ہو کر کہا: "عالی جاہ! اگر حضور کو میری یہ تجویز منظور نہ ہو تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انگریزوں کو حضور کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ہم فرانسیسی جنھیں وہ اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں آپ کی فوج میں ملازم ہیں۔ اگر ہماری قربانی دے کر

آپ دشمن کے ساتھ مصالحت کر سکیں تو میسور کی خاطر میرے تمام ساتھی انگریزوں کی قید میں جانے کیلئے تیار ہیں۔"

"نہیں۔" سلطان ٹیپو نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا: "یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ان شریف اور بہادر وفادار ساتھیوں کو دشمن کے حوالے نہیں کر سکتا جو میری دعوت پر اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ یہ بات میسور کے ایک معمولی سپاہی کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہوگی۔"

سُلطان گھوڑے پر سوار ہو کر سپاہیوں کے ہجوم کی طرف بڑھا اور وہ صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ سُلطان نے ان کے قریب پہنچ کر کہا: "تم نے اس شگاف کی مُرمّت کیوں نہیں کی؟"

ایک افسر نے جواب دیا: "عالی جاہ! ہم نے پچھلے پہر سیّد غفار کے حکم سے اس کی مُرمّت شروع کر دی تھی لیکن میر صاحب کا خیال تھا کہ ہمیں دشمن کی گولہ باری تھم جانے کا انتظار کرنا چاہیے۔"

"کون سے میر صاحب؟" سلطان نے غصّے کے لہجے میں سوال کیا۔

"دیوان صاحب عالی جاہ!"

سلطان نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اتنی دیر میں میر صادق اور اس کے ساتھی قریب پہنچ چکے تھے۔ سلطان نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے میر صادق سے کہا: "تمھیں معلوم ہے کہ اس شگاف اور دشمن کی خندقوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں، اس کے باوجود تم نے انھیں شگاف بند کرنے سے منع کیا ہے؟"

"عالی جاہ! دشمن کی گولہ باری بہت شدید تھی اور میں نے اپنے سپاہیوں کی جانیں بلاوجہ خطرے میں ڈالنا مناسب خیال نہیں کیا۔"

سلطان نے کہا: "چند جانوں کے لیے پُورے میسور کی عزّت اور آزادی خطرے میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ میں حکم دیتا ہوں کہ یہ شگاف کسی تاخیر کے بغیر بند کر دیا جائے اور باقی افسروں کو حکم دو کہ وہ اپنے اپنے مورچے میں چلے جائیں۔"

"بہت اچھا عالی جاہ!"

اس کے بعد سلطان نے مشرق کی طرف باگ موڑی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ قریباً تین گھنٹے شہر کے تمام مورچوں کا معائنہ کرنے، افسروں اور سپاہیوں کو ضروری ہدایات دینے اور رات کی لڑائی میں زخمی ہونے والے سپاہیوں کو دیکھنے کے بعد وہ اپنے محل کا رُخ کر رہا تھا۔

○

دوپہر کے وقت شمالی فصیل کے وسطی حصے پر سخت گولہ باری ہو رہی تھی۔ سید غفار اپنے چند افسروں کے ہمراہ شہر کے مختلف حصوں میں گشت کرتا ہُوا وہاں پہنچا اور گھوڑے سے کُود کر بھاگتا ہوا ایک بُرج کی طرف بڑھا۔ دائیں طرف سے کسی کی آواز آئی: "فوجدار صاحب ٹھہریں!"

سید غفار رُک گیا اور سرنگاپٹم کے قید خانے کے داروغہ نے آگے بڑھ کر کہا: "میں بڑی دیر سے آپ کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔ میں نے جنوبی دروازے کے قریب بھی آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی، لیکن آپ میری طرف توجہ دیے بغیر آگے نکل گئے تھے۔ آپ سے پہلے میں سلطانِ معظم کی خدمت میں حاضر ہونے کی کوشش کر چکا ہُوں لیکن مجھے کامیابی نہیں ہُوئی۔"

پاس ہی فصیل پر ایک گولہ پھٹا اور اینٹوں کے کئی ٹکڑے اِدھر اُدھر گر پڑے۔ سید غفار نے کہا: "تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو جلدی کہو میرا وقت ضائع مت کرو۔"

داروغہ نے کہا: "جناب قلعے کے جنوب مغربی کونے میں جو بڑا شگاف پیدا ہو چکا ہے آپ کو اس کی طرف فوری توجہ دینی چاہیے۔"

"تم کو شگاف کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ آج شام تک وہ بند کر دیا جائے گا۔ اور میں نے وہاں کافی سپاہی بھیج دیے ہیں۔ میر صادق وہاں موجود ہیں۔ اگر تم کوئی بہتر مشورہ

دے سکتے ہو تو ان کے پاس چلے جاؤ۔"

سید غفار یہ کہہ کر تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا اور آن کی آن میں برج پر جا پہنچا۔ بُرج کے اندر تین توپیں نصب تھیں اور انور علی دُوربین کی مدد سے دریا کے پار دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے بعد توپچیوں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ سید غفار نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے دُوربین پکڑ لی اور آنکھ سے لگاتے ہُوئے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ آج دشمن اپنی توپیں اور آگے لے آیا ہے لیکن دریا کے کنارے ان کی خندقوں میں مکمل سکوت ہے۔"

انور علی نے کہا: "فصیل کے مشرقی حصے کے سامنے ہم نے دشمن کے بیشتر توپ خانوں کو پیچھے ہٹا دیا ہے۔"

سید غفار نے دُوربین نیچے کرتے ہوئے کہا: "مجھے پانی دو!"

ایک سپاہی نے اپنی چھاگل اتار کر پیش کر دی اور پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد سید غفار کے تھکے اور مرجھائے ہوئے چہرے پر قدرے تازگی آگئی۔ قید خانے کا داروغہ سیڑھیوں سے نمودار ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر کہا: "جناب میں آپ سے ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

سید غفار نے برہم ہو کر کہا: "میں نے تمہیں میر صادق کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا۔"

"جناب اگر میں میر صادق سے کوئی بات کر سکتا تو مجھے تمام شہر میں آپ کو تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر میر صادق کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں اس وقت آپ کے پاس کھڑا ہوں تو وہ مجھے بات کرنے کا موقع نہیں دے گا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"جناب! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گزشتہ رات پچھلے پہر ایک انگریز افسر بڑے شگاف کا معائنہ کرنے کے لیے آیا تھا اور میر صادق نے شگاف سے باہر نکل کر اس کے ساتھ راز و نیاز

کی باتیں کی تھیں:

سید غفار پر ایک ثانیہ کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: تمھیں معلوم ہے کہ موجودہ حالات میں ایسی خطرناک افواہیں پھیلانے والوں کی سزا موت ہے؟"

"مجھے معلوم ہے جناب۔ لیکن یہ افواہ نہیں۔ جب میر صادق جنرل ہیرس کے جاسوس سے سرنگاپٹم کا سودا چکا رہا تھا تو وہاں چند اور افسر موجود تھے اور ان میں سے ایک ـــ میرا بیٹا تھا:"

"تمھارا بیٹا!" سید غفار اور انور علی نے یک زبان ہو کر کہا:

انور علی اور سید غفار کی طرح توپ خانے کے سپاہی بھی حیرانی اور اضطراب کی حالت میں داروغہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سید غفار نے ان میں سے ایک افسر کے ہاتھ میں دوربین دیتے ہوئے کہا: تم اپنا کام جاری رکھو۔"

انور علی نے داروغہ سے مخاطب ہو کر کہا: آپ کے بیٹے کا نام سلیمان ہے؟"

"جی ہاں!"

"وہ یہ گواہی دے گا؟"

"جی نہیں ـــ وہ مر چکا ہے۔ آج نو بجے کے قریب اسے زخمی حالت میں میرے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرتے وقت اس نے یہ درخواست کی تھی کہ میں سلطان کے پاس جا کر اس کے اور اپنے جرم کا اقبال کروں۔ اس نے مجھے یہ بتایا تھا کہ انگریز آج ٹھیک ایک بجے اس شگاف کی طرف سے حملہ کریں گے۔ آپ میر صادق کی غداری پر یقین نہیں کریں گے۔ لیکن میرے پاس اس کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ آپ ملک جہان خاں کو جانتے ہیں وہ اس وقت سرنگاپٹم کے قید خانے کی ایک زمین دوز کوٹھڑی میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے میر صادق، میر قمر الدین، پورنیا اور معین الدین کے حکم پر اسے قید خانے میں رکھا تھا۔ انھوں نے مجھے اس جرم پر آمادہ کرنے کے لیے ایک معقول رقم دی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے یہ راز ظاہر کر دیا تو مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

پچھلے دنوں میں نے اپنے ضمیر کی ملامت سے مجبور ہو کر غازی خاں کے پاس اپنا آدمی بھیجا تھا اور انھیں اس واقعے کی اطلاع دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ قید خانے کے راستے میں قتل کر دیے گئے اور میرا آدمی جو ان کے ساتھ آرہا تھا ان پر حملہ کے وقت بھاگ آیا تھا۔ قاتلوں کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون تھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ قتل بھی انھی غداروں کی سازش کا نتیجہ تھا جو غازی بابا کا زندہ رہنا اپنے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ غازی خاں کے قتل کے بعد میں نے اپنا مستقبل پھر انھی لوگوں کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ انھوں نے میرے بیٹے کو انگریزوں سے بہت بڑی جاگیر دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب مجھے نہ تو اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ موت کا ڈر ہے۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ یہ انکشاف اب آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ میرے بیٹے نے مرتے وقت یہ بتایا تھا کہ دشمن دوپہر کے وقت ایک بجے عام حملہ کر دے گا۔"

"ایک بجے!" سید غفار نے جلدی سے اپنی جیب سے گھڑی نکالتے ہوئے کہا "اور ایک بجنے میں صرف دس منٹ باقی ہیں۔ تم نے ہمارا اتنا وقت ضائع کر دیا۔"

سید غفار اور انور علی بھاگتے ہوئے فصیل سے نیچے اترے۔ سوار ابھی تک سیڑھیوں کے سامنے کھڑے تھے۔ سید غفار نے اپنے گھوڑے کی زین پر کودتے ہوئے بلند آواز میں کہا "تم فوراً افسروں کو میرا یہ حکم پہنچا دو کہ وہ اپنے تمام فالتو دستے جنوب مغرب کی طرف بڑے شگاف کی حفاظت کے لیے بھیج دیں۔ دشمن اس طرف سے حملہ کر رہا ہے۔"

سید غفار نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور انور علی اس کے پیچھے ہو لیا۔ باقی سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے ادھر ادھر نکل گئے۔ چند منٹ بعد سید غفار اور انور علی شگاف کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن یہ دیکھ کر سید غفار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جس جگہ کچھ دیر قبل سلطان کے حکم سے دو ہزار سپاہی متعین کیے گئے تھے وہاں صرف پندرہ بیس آدمی کھڑے

تھے۔ آس پاس فصیل کے مورچوں پر بھی سپاہیوں کی تعداد بہت کم معلوم ہوتی تھی۔ سیّد غفار سپاہیوں کے قریب گھوڑا روکتے ہوئے چلّایا: "باقی آدمی کہاں ہیں؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا: "جناب وہ خزانے سے تنخواہیں وصول کرنے گئے ہیں۔"

"کس کی اجازت سے؟"

"جناب! دیوان صاحب میر صادق نے حکم دیا تھا۔"

سیّد غفار اور انور علی گھوڑے سے کُود کر بھاگتے ہوئے شگاف سے تھوڑی دُور ایک سیڑھی کے راستے فصیل پر چڑھے اور دریا کے پار دشمن کی خندقوں کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں کسی نقل و حرکت کے آثار نہ پاکر سیّد غفار نے قدرے مطمئن ہوکر انور علی کی طرف دیکھا اور کہا: "مجھے داروغہ کے بیان پر یقین نہیں آتا۔ اب ایک بج چکا ہے۔"

"اِدھر دیکھیے!" انور علی نے بلندی سے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سیّد غفار نے آنکھیں پھاڑ کر جنوب مشرق کی طرف دیکھا تو ہزاروں انگریز خندقوں اور مورچوں سے نکل کر بے تحاشا فصیل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک افسر فصیل پر بھاگتا ہُوا آیا اور دُور سے ہی سیّد غفار کو پہچان کر چلّانے لگا: "جناب دشمن شمال مشرق کے مورچوں سے نکل کر دریا عبور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

سیّد غفار نے انور علی سے کہا: "انور تم فوراً سلطان کی خدمت میں پہنچنے کی کوشش کرو اور انھیں اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر سرنگاپٹم سے نکلنے کی کوشش کریں۔ اب دشمن کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کی آخری صورت یہی ہے کہ وہ چتل ڈرگ پہنچ جائیں۔"

انور علی بھاگتا ہُوا فصیل سے نیچے اُترا اور گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

○

خندقوں سے قریباً سو گز آگے حملہ آور فوج کے راستے میں دریا حائل تھا اور دریا کا پاٹ

تین سو گز کے قریب تھا۔ موسمِ گرما کے آغاز سے اب تک بارش کی کمی کے باعث پانی کی گہرائی کسی جگہ ٹخنے اور کسی جگہ کمر کے برابر تھی۔ دریا سے آگے کوئی ساٹھ گز چوڑی خندق تھی اور اس خندق سے آگے فصیل کا شگاف تھا۔ فوجی لحاظ سے دن کے وقت جنرل ہیرس کا یہ حملہ خودکشی کے مترادف تھا اور آس پاس کے بُرجوں پر مُٹھی بھر سپاہیوں کی مزاحمت بھی بڑی سے بڑی فوج کے عزائم خاک میں ملا سکتی تھی لیکن شگاف کے آس پاس فصیل پر جو افسر موجود تھے ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو غدارانِ وطن کے ساتھ اپنے ضمیر کا سودا کرچکے تھے۔ سیّد غفار کی ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکیوں سے مرعوب ہوکر انھوں نے فائرنگ شروع کی لیکن ان کی توپوں اور بندوقوں کا کوئی نشانہ ٹھکانے پر نہیں لگتا تھا۔ صرف چند وفادار تھے جو فرض شناسی کا ثبوت دے رہے تھے۔

حملہ آوروں کی ایک ٹولی خندق کے قریب پہنچ چکی تھی۔ سیّد غفار نے ایک سپاہی کے ہاتھ سے بندوق چھین کر یکے بعد دیگرے چند فائر کیے اور چند آدمی زخمی ہوکر گر پڑے۔ اس کے ساتھ ہی ایک افسر اور پانچ سپاہی فصیل پر بھاگتے ہوئے شگاف کے قریب ایک مورچے میں داخل ہوئے اور انھوں نے تین غداروں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد مورچے کی توپوں پر قبضہ کر لیا اور دشمن پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس کے بعد دشمن کے توپ خانے حرکت میں آگئے اور شگاف کے آس پاس گولے برسنے لگے۔ سیّد غفار فائر کرنے کے بعد بندوق بھر رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے توپوں کے گولے گر رہے تھے۔ ایک وفادار سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا: "جناب یہاں سے ہٹ جائیں!"

سیّد غفار نے گرج کر کہا: "تم میری طرف دیکھنے کی بجائے دشمن کی طرف خیال رکھو۔"

سپاہی کچھ کہے بغیر پیچھے ہٹ گیا۔ سیّد غفار نے اپنے دائیں طرف دیکھا تو ایک اور سپاہی چند قدم دُور کھڑا اپنی بندوق زمین کی بجائے آسمان کی طرف کیے ہوئے تھا۔

غدار! سیّد غفار نے غصّے سے کانپتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نیام سے تلوار نکالی اور اس کا سر قلم کر دیا۔ پھر وہ بلند آواز میں چلّایا: "ظالمو تم اگر اب

بھی سنبھل جاؤ تو ہم یہ جنگ جیت سکتے ہیں۔ چند منٹ میں فوج کے دس ہزار سپاہی یہاں جمع ہو جائیں گے۔ سلطانِ معظم خود یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ خدا کے لیے ان لوگوں کا ساتھ دینے کی کوشش نہ کرو جو ذلت کے چند ٹکڑوں کے عوض تمھیں ہمیشہ کے لیے انگریزوں کا غلام بنا جائیں گے۔" —— اس کے ساتھ ہی توپ کا ایک گولہ سید غفار کے سر پر لگا اور فصیل پر اس کی لاش دکھائی دے رہی تھی۔

سید غفار کے گرتے ہی کسی نے فصیل پر سے سفید جھنڈا بلند کر دیا۔ پھر چند منٹ بعد جب سپاہیوں کے دستے وہاں پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ دشمن چند منٹ کے اندر اندر اُس دریا، اُس خندق اور اُس فصیل کو عبور کر چکا ہے جو برسوں سے اجنبی اقتدار کا راستہ روکے ہوئے تھی۔ فصیل کے شگاف پر انگریزوں کا جھنڈا اس حقیقت کی گواہی دے رہا تھا کہ جو قوم اپنے آغوش میں غداروں کو پناہ دیتی ہے اس کے عظیم ترین قلعے بھی ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں۔

شگاف کے آس پاس پاؤں جمانے کے بعد انگریزوں کی فوج دو حصوں میں تقسیم ہو کر شمال اور جنوب کی فصیلوں پر یلغار کر رہی تھی اور جو دستے فصیل کے نیچے جمع ہو رہے تھے انھیں سید غفار کی موت اور میر صادق کی غداری کی اطلاعات نے اس قدر بددل کر دیا تھا کہ وہ جوابی حملہ کرنے کی بجائے اندرونی فصیل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اندرونی اور بیرونی فصیلوں کے درمیان ایک اور خندق تھی جو پانی سے بھری ہوئی تھی۔ یہ خندق اگرچہ بیرونی خندق کی طرح زیادہ چوڑی نہ تھی تاہم اسے عبور کرتے وقت اندرونی فصیل کی حفاظت کرنے والے سپاہیوں کی گولہ باری انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن انگریزوں کے چند دستوں نے کسی توقف کے بغیر حملہ کر دیا اور میسور کے سپاہیوں کو دائیں بائیں دھکیلنے کے بعد دوسری خندق عبور کر کے اندرونی فصیل کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا۔

○

انور علی گھوڑا بھگاتا ہوا منتشر سپاہیوں کے قریب گیا اور اس نے ایک عقابی نگاہ سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد بلند آواز میں کہا: "میسور کے مجاہدو ہمت سے کام لو، سلطانِ معظم تشریف لا رہے ہیں اور تھوڑی دیر میں ہماری بیشتر فوج یہاں جمع ہو جائے گی۔ آگے بڑھو اور دشمن کی مزید فوج کو اندر آنے سے روکنے کی کوشش کرو۔ دشمن کے جو دستے قلعے کے اندر داخل ہو چکے ہیں ان پر یہ ثابت کر دو کہ چند گیدڑ ہزاروں شیروں کی آزادی کا سودا نہیں کر سکتے۔"

انور علی نے یہ کہہ کر گھوڑے سے چھلانگ لگا دی اور تلوار سونت کر انگریزوں کے ایک دستے پر جو اندرونی فصیل کی طرف بڑھ رہا تھا ٹوٹ پڑا۔ جانبازوں کے چند دستوں نے اس کا ساتھ دیا اور انگریز اندرونی خندق کے قریب کئی لاشیں چھوڑنے کے بعد بیرونی فصیل کی طرف ہٹنے لگے۔

لیکن تھوڑی دیر میں انگریزوں کے کئی اور دستے وہاں پہنچ گئے اور میسور کے سپاہی اندرونی خندق کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف ہٹنے لگے۔ میسور کے چند سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے لڑنے والے سپاہیوں کے عقب میں پہنچے اور ان میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا: "سپاہیو! دشمن ہمارے بیشتر مورچوں پر قبضہ کر چکا ہے۔ اب بے فائدہ جانیں دینے کی کوشش نہ کرو۔ ہتھیار ڈال دو، میں تمھاری جانیں بچانے کا ذمہ لیتا ہوں۔"

انور علی نے مڑ کر دیکھا، یہ میر معین تھا اور اس کے ساتھ دوسرا سوار جو سفید جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا، میر صادق تھا۔ تیسرا غدار میر قمرالدین اپنے ساتھیوں سے چند قدم پیچھے تھا۔ انور علی غضبناک ہو کر بلند آواز میں چلّایا: "سپاہیو! یہ وہ غدار ہیں جنھوں نے ذلت کے چند ٹکڑوں کے عوض فرنگیوں کے ساتھ تمھاری عزت اور آزادی کا سودا کیا ہے۔ اس جنگ میں تمھارے جو بھائی اور بیٹے شہید ہوں گے ان سب کا خون ان کی گردنوں پر ہے۔"

انگریزی فوج کے افسروں نے ان غداروں کو پہچانتے ہی اپنے سپاہیوں کو روک لیا اور ایک ثانیہ کے لیے لڑائی بند ہو گئی۔ سرنگاپٹم کے سپاہی تذبذب اور پریشانی کی حالت میں

کبھی دشمن اور کبھی میر معین الدین اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک میر قمرالدین نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑ کر ایڑ لگا دی۔ انور علی چلّایا۔ "میر قمر! اپنے غداروں کو بھاگنے کا موقع نہ دو۔ سلطانِ معظم انھیں موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دے چکے ہیں!"

میر معین الدین اور اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں۔ انور علی نے اپنا طپنچہ نکال کر فائر کیا۔ میر صادق کے بازو پر گولی لگی اور اس کے ہاتھ سے سفید جھنڈا گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی چند اور ساتھیوں نے بھی فائر کر دیے اور سات آدمی زخمی ہو کر بھاگتے ہوئے گھوڑوں سے گر پڑے۔ ایک گولی میر معین الدین کے گھوڑے کی ٹانگ میں لگی۔ گھوڑا زخمی ہو کر خندق کے قریب گر پڑا اور میر معین الدین زین سے اچھل کر خندق میں جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے حملہ کر دیا اور انور علی اور اس کے بیشتر ساتھی ان کا سامنا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن چند آدمی بھاگتے ہوئے میر معین الدین کی طرف بڑھے۔ وہ خندق سے نکل بھاگا۔ لیکن ایک نوجوان نے اسے مشرقی دروازے سے کچھ فاصلے پر جا لیا۔ میر معین الدین چلّایا۔ "خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، میں نے کوئی غداری نہیں کی۔ میں صرف تم لوگوں کو تباہی سے بچانا چاہتا تھا۔ میں تمھارا وزیر ہوں۔ میں تمھارے سلطان کا خادم ہوں۔ میں ...."

میر معین الدین اپنا فقرا پورا نہ کر سکا۔ سپاہی کی تلوار اس کے سر پر لگی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس عرصہ میں تین سوار میر قمرالدین اور میر صادق کے پیچھے روانہ ہو چکے تھے۔

سلطان اپنے باڈی گارڈ دستوں کے ساتھ نمودار ہوا اور اسے دیکھتے ہی شمال کی اندرونی اور بیرونی فصیلوں کے درمیان لڑنے والے مجاہدین میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور وہ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ سلطان اپنے گھوڑے سے کود کر ان کی اگلی صف میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر میں مختلف اطراف سے میسور کے کئی دستے اس کے گرد جمع ہو کر جان کی بازی لگا رہے تھے۔ لیکن اس دوران میں انگریز دونوں فصیلوں کے درمیان کئی مورچوں پر قابض ہو چکے تھے اور بلندی سے ان کی گولیاں سلطان کے جانبازوں کے لیے سخت مشکلات پیدا

کر رہی تھیں۔ وہ افسر جو وطن کے غداروں کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے اس محاذ سے غیر حاضر تھے لیکن یہ مسئلہ اب میسور کے جانبازوں کے لیے کسی پریشانی کا باعث نہ تھا۔ ان کی عزت اور آزادی کا محافظ ان کے ساتھ تھا۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ دشمن چند منٹ کے اندر اندر ہفتوں اور مہینوں کا سفر طے کر کے سرنگا پٹم میں داخل ہو چکا ہے۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ ان پر گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ وہ عظیم ہستی جس نے ان کے سینوں میں زندگی کے ولولے بیدار کیے تھے اب موت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا لیکن اب موت کا چہرہ انھیں زندگی سے زیادہ حسین اور دلکش دکھائی دیتا تھا۔ سلطان زخمی ہو چکا تھا اور وہ اپنے سینوں کے زخموں سے بھی ایک طرح کی آسودگی محسوس کرتے تھے۔ سلطان کا خون سرنگا پٹم کی خاک پر گر رہا تھا اور وہ اس خاک کے ہر ذرّے کو اپنے خون سے سیراب کر دینا چاہتے تھے۔

دوسری گولی لگنے کے بعد شیرِ میسور پر نقاہت کے آثار ظاہر ہونے لگے، لیکن وہ لڑتا رہا۔ دوسرے جانباز زندگی اور موت سے بے پرواہ ہو کر اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اندرونی خندق کے آس پاس دشمن کی لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ سینکڑوں انگریز زخمی ہونے کے بعد خندق میں دم توڑ رہے تھے۔ فصیلوں کے اوپر سے دشمن کی دو طرفہ فائرنگ ہر لحظہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میسور کے شہیدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ جب زخموں کے باعث سلطان کی ہمت جواب دینے لگی تو باڈی گارڈ دستے کے افسر نے کہا۔ "عالی جاہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیں۔"

"نہیں۔" سلطان نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ "میرے لیے شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔"

تھوڑی دیر بعد سلطان اپنے افسروں کے ساتھ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور میسور کے سپاہی اس کے پیچھے قلعے کے اندرونی حصے کی طرف سمٹنے لگے۔ لیکن جب وہ شمالی دروازے

کے قریب پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں بھی بعض مورچوں پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ سلح سپاہیوں کے علاوہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا ایک بے پناہ ہجوم باہر نکلنے کے لیے جدّوجہد کر رہا تھا اور انگریز اپنی سنگینوں کی مدد سے انھیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہے تھے۔ انھوں نے میسور کے سپاہیوں کو دروازے کی طرف آتے دیکھا تو پلٹ کر فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی قلعے کی فصیل کے بعض مورچوں سے بھی گولیوں کی بارش ہونے لگی۔

ایک گولی سلطان کے گھوڑے کے پیٹ میں لگی اور اس نے گرتے ہی دم توڑ دیا۔ گھوڑے کے ساتھ گرتے وقت سلطان کی دستار اس کے سر سے علیحدہ ہو گئی۔ سلطان لڑکھڑاتا ہوا اٹھا لیکن ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ اس کے سینے پر گولی لگی اور وہ نیم جان ہو کر گر پڑا۔ پاس ہی ایک انگریز نے سلطان کی کمر سے تلوار کی مرصع پیٹی اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن شیرِ میسور میں ابھی زندگی کے چند آخری سانس باقی تھے اور وہ یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ سلطان نے اچانک اٹھ کر تلوار بلند کی اور پوری قوت کے ساتھ اس پر وار کر دیا۔ انگریز نے اپنی بندوق آگے کر دی۔ سلطان کی تلوار بندوق پر لگی اور ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور انگریز سپاہی نے اپنی بندوق کی نالی کا سرا سلطان کی کنپٹی کے ساتھ لگاتے ہوئے فائر کر دیا اور وہ آفتاب جس کی روشنی میں اہلِ میسور نے آزادی کی حسین منازل دیکھی تھیں، ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔

○

انور علی نے سلطان کو اس وقت گرتے دیکھا تھا جب کہ اس کی بائیں ران پر گولی لگ چکی تھی۔ اس کے ساتھی دروازے کے قریب انگریزوں کے ساتھ گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ وہ چند سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد سلطان کی لاش کے قریب پہنچا تو فصیل سے ایک گولی اس کے سر پر لگی اور وہ ایک ثانیہ لڑکھڑانے کے بعد منھ کے بل گر پڑا۔ اس عرصے میں سلطان شہید کی لاش پر چند جانبازوں کی لاشیں گر چکی تھیں اور انور علی کو نیم بے ہوشی کی

حالت میں صرف اس کے پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ رینگتا ہوا آگے بڑھا اور اپنا سر سلطان کے پاؤں پر رکھ دیا۔ گولی کھوپڑی کے اوپر سے پھسل جانے کے باعث سر کا زخم زیادہ گہرا نہ تھا۔ اس سے قبل ٹانگ کے زخم سے خون بہنے کے باعث اس کے جسم میں کافی نقاہت آ چکی تھی۔ اس نے ہوش میں آتے ہی اٹھنے کی کوشش کی لیکن پیچھے بعد دیگرے چند اور جانباز زخمی ہو کر اس کے اوپر گر پڑے۔

کچھ دیر بعد وہ بڑی مشکل سے لاشوں کے انبار سے نکلا تو میدان صاف ہو چکا تھا اور انگریزی فوج کے دستے دروازے کے سامنے دور دور تک بکھری ہوئی لاشیں روندتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ انور علی دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور کچھ دیر دم سادھے پڑا رہا۔ شہر کے دوسرے حصوں میں لوگوں کی چیخ و پکار یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ابھی تک اہلِ میسور کا قتلِ عام جاری ہے۔

سلطان شہید ہو چکا ہے۔ ہماری آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔ چند آدمیوں کی غداری کے باعث آج میسور کے کتنے بیٹے موت کے گھاٹ اتار دیے جائیں گے۔ آج میسور کی کتنی بیٹیوں کی عصمت پر ڈاکے ڈالے جائیں گے۔ کتنی عورتیں بیوہ اور کتنے بچے یتیم ہو چکے ہیں۔ میرے باپ، میرے بھائی اور میرے بے شمار دوستوں اور ساتھیوں کی قربانیوں کا حاصل کیا ہے۔ صرف چند گھنٹے قبل ہم ایک آزاد وطن کے مالک تھے۔ ہم اپنے ماضی پر فخر کر سکتے تھے اور ہمارے دلوں میں حال کے مصائب سے لڑنے کی ہمت تھی۔ ہم اپنے مستقبل کے متعلق حسین سپنے دیکھ سکتے تھے اور اب ہمارا ماضی، ہمارا حال اور ہمارا مستقبل سب لاشوں کے اس انبار کے نیچے دفن ہو چکا ہے۔ سلطان فتح علی ٹیپو شہید نہیں ہوا بلکہ ہم سب مر چکے ہیں۔ جس خاک پر سلطان ٹیپو کا خون گرا ہے، ہماری آئندہ نسلیں تا قیامت اسے اپنے آنسوؤں سے سیراب کرتی رہیں گی۔ آج کے بعد میسور کا آفتاب ہمارے چہروں پر مسرت کی مسکراہٹیں نہیں دیکھے گا۔ میسور کی ہواؤں کی سرسراہٹ ہمارے سینوں میں آزادی کے نغمے بیدار نہیں کرے گی۔ جس قوم کے اکابر

نے سلطان ٹیپو جیسے محسن کو دھوکا دیا ہے اسے کارکنانِ قضا و قدر رحم اور مروّت کا مستحق نہیں سمجھیں گے —— انور علی اپنے دل میں اس قسم کے خیالات لے کر اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ غیر شعوری حالت میں اس کے پاؤں اپنے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ کسی مکان سے چند عورتوں کی چیخیں سنائی دیں اور اس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ اس کے تمام خیالات سمٹ کر منیرہ پر مرکوز ہو چکے تھے۔ سرنگاپٹم کی فضا میں اسے ہر چیخ منیرہ کی چیخ محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اپنی تلوار لاشوں کے انبار میں چھوڑ آیا ہے۔ سامنے چند سپاہیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے جلدی سے جھک کر ایک سپاہی کی تلوار اٹھا لی۔ اب گھر تک پہنچنا اس کے لیے زندگی کا اہم ترین مسئلہ بن چکا تھا اور وہ دشمن کی نگاہوں سے بچنے کے لیے ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔

میسور کے سپاہی افراتفری کی حالت میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چند نوجوان انور علی کو پہچان کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک آدمی "انور علی انور علی" کہتا ہوا آگے بڑھا اور اسے بازو سے کھینچتا ہوا قریب ہی ایک مکان کی ڈیوڑھی میں لے گیا۔ یہ قید خانے کا داروغہ تھا۔ انور علی چلایا: "مجھے چھوڑ دو تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

داروغہ نے کہا: "آپ کے زخموں سے خون بند کرنا ضروری ہے۔"

انور علی کے احتجاج کے باوجود داروغہ اور اس کے ساتھیوں نے اُسے زبردستی ایک کھاٹ پر لٹا دیا اور ایک سپاہی کا پٹکا اتار کر اس کے زخموں پر پٹیاں باندھ دیں۔

"آپ کے سر کا زخم زیادہ تشویشناک نہیں لیکن ٹانگ کا زخم بہت گہرا ہے۔ میں ابھی کسی طبیب کو تلاش کرتا ہوں۔"

انور علی کرب کی حالت میں اُٹھ کر چلّایا: "میرے پاس طبیب کا انتظار کرنے کے لیے وقت نہیں!"

داروغہ نے کہا: "اگر آپ سلطانِ معظم کو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی کوشش بے سود ہے۔ شہر میں یہ افواہ گرم ہے کہ وہ سرنگاپٹم سے نکل گئے ہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" انور علی نے کہا: "میں نے انھیں اپنی آنکھوں سے شہید ہوتے دیکھا ہے۔"

انور علی کے گرد جمع ہونے والے آدمیوں کے چہروں پر مایوسی چھا گئی۔ اندر سے ایک عمر رسیدہ عورت دھاڑیں مارتی ہوئی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی اور اس نے کہا: "سلطانِ معظم شہید ہو گئے ہیں اور تم ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہو۔ کاش میرا بیٹا آج زندہ ہوتا!"

داروغہ نے کہا: "میری بہن اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر سلطان شہید ہو چکے ہیں تو ہماری تلواریں ٹوٹ چکی ہیں اور ہمارے بازو کٹ چکے ہیں۔"

گلی میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ ایک سپاہی نے نیم وا دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا اور پھر جلدی سے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا: "یہ نظام علی کی فوج کے سپاہی ہیں۔"

انور علی اور اس کے ساتھی تھوڑی دیر دم بخود ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے بالآخر جب سوار آگے نکل گئے تو ایک سپاہی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے کے بعد کہا: "وہ چلے گئے ہیں۔"

انور علی نے داروغہ سے مخاطب ہو کر کہا: "تم نے ملک جہان خاں کے متعلق کیا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" داروغہ نے جواب دیا: "میں ابھی تک قید خانے کی طرف نہیں جا سکا۔ میں میر صادق کی تلاش میں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک غدار کو ٹھکانے لگا کر شاید میں اپنے گناہوں کا بوجھ ہلکا کر سکوں لیکن مجھے یہ سعادت بھی نصیب نہ ہو سکی۔ میں نے میر صادق کی بجائے اس کی لاش دیکھی ہے۔ چند آدمی تلوار کی پے در پے ضربوں سے اس کا حلیہ بگاڑ رہے تھے۔ میں نے سُنا ہے کہ میر معین بھی مارا جا چکا ہے؟"

انور علی نے کہا: "اب ان غداروں کے متعلق سوچنے کا وقت نہیں۔ تم فوراً قید خانے جاؤ اور ملک جہان خاں کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔ میری ہمت جواب دے چکی ہے ورنہ میں تمھارے ساتھ چلتا۔"

داروغہ نے کہا: "آپ کو میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر میں انگریزوں کے

قبضہ سے پہلے قید خانے تک پہنچ سکا تو ملک جہان خاں کو آزاد کرتے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

گلی میں عورتوں اور مردوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ انور علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور جھانکنے لگا۔ تباہ حال شہریوں کا ایک ہجوم مشرق سے مغرب کی طرف بھاگ رہا تھا اور ان کے پیچھے چند انگریز مار دھاڑ کرتے چلے آ رہے تھے۔ انور علی کچھ دیر دروازے کے ساتھ کھڑا رہا۔ جب انگریز سپاہی لوگوں کے ہجوم کو اپنی تلواروں سے ہانکتے ہوئے آگے نکل گئے تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ڈیوڑھی سے باہر نکلا اور عقب سے انگریزوں پر ٹوٹ پڑا۔ آن کی آن میں کوئی بیس انگریز زمین پر ڈھیر ہو گئے اس کے ساتھ ہی اہلِ شہر نے بھی پلٹ کر ان پر حملہ کر دیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد انگریزی فوج کا پورا دستہ موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی انور علی کی قوت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ایک سپاہی نے کہا، "انھیں گھر پہنچانا چاہیے۔"

اٹھائیسواں باب

انور علی کو ہوش آیا تو وہ اپنے مکان کی نچلی منزل کے ایک کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ منیرہ، گھر کے نوکر اور محلے کا ایک طبیب اس کے بستر کے گرد کھڑے تھے۔ رات ہو چکی تھی اور کمرے کے اندر فانوس روشن تھا۔ ایک ثانیہ اپنے تیمارداروں کی طرف دیکھنے کے بعد انور علی کی نگاہیں منیرہ کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ منیرہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ انور علی نے پانی مانگا اور منور جلدی سے پانی کا کٹورا بھر لایا۔ کریم خاں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور انور علی نے پانی پینے کے بعد دوبارہ سر تکیے پر رکھ دیا۔ طبیب نے اپنے تھیلے سے ایک شیشی نکال کر دوائی کے چند گھونٹ ایک پیالی میں ڈالے اور انور علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا "یہ دوائی پینے کے بعد آپ کچھ طاقت محسوس کریں گے۔ میں آپ کے زخم دیکھ چکا ہوں۔ سر کا زخم جلد سے نیچے نہیں گیا اور گولی نکل جانے کے بعد ٹانگ کا زخم بھی زیادہ خطرناک نہیں۔ اگر خون بروقت بند ہو جاتا تو آپ کی یہ حالت نہ ہوتی۔"

انور علی نے کوئی جواب دیے بغیر دوائی پی لی اور احسان مندی سے طبیب کی طرف دیکھنے لگا۔ منیرہ جو چند ثانیے قبل حزن و یاس کی تصویر نظر آتی تھی اب قدرے پُرامید ہو کر اپنے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ طبیب نے منیرہ سے مخاطب ہو کر کہا: "آپ ہر گھنٹے کے بعد

انھیں اس دوائی کے دو گھونٹ پلاتی رہیں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو میں صبح سے پہلے ایک بار پھر انھیں دیکھنے کی کوشش کروں گا۔"

انور علی نے کہا: "حکیم صاحب آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ آج سرنگا پٹم کی ہر گلی اور ہر گھر میں لاتعداد زخمی پڑے ہوئے ہیں آپ کو اُن کی طرف توجّہ دینی چاہیے۔"

طبیب نے اپنا تھیلا اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "شہر میں یہ افواہ گرم ہے کہ سُلطان معظّم شہید ہو چکے ہیں؟"

"ہاں: میں اُن کی لاشں دیکھ چکا ہوں اور مجھے اس بات کا ملال ہے کہ میں ان کے قدموں میں سر رکھ کر جان نہ دے سکا۔"

طبیب کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ منّور، کریم اور خادمہ کوئی ایک منٹ مذبذب کی حالت میں کھڑے رہے پھر خادمہ انھیں ہاتھ سے اشارہ کرنے کے بعد دروازے کی طرف بڑھی اور وہ اس کے پیچھے چل دیے۔ انور علی نے منیرہ کی طرف دیکھا اور بے اختیار اپنے ہاتھ پھیلا دیے منیرہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

"منیرہ!" انور علی نے اس کے سُنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "میں جنّت کے دروازے پر دستک دینے کے بعد واپس آگیا ہوں۔ میں لاشوں کے انبار میں پڑا ہُوا تھا اور مجھے تمھاری آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ تمام واقعات ایک خواب معلوم ہوتے ہیں۔ آج سے کوئی چالیس سال قبل جب مُرشد آباد پر اسی قسم کی تاریکی چھا گئی تھی تو میرے والد نے میسور کے اُفق پر ایک نئی صبح کے آثار دیکھے تھے اور وہ سرنگا پٹم آگئے تھے۔ لیکن جو رات سرنگا پٹم پر آئی ہے وہ صبح کا پیام دینے والے ستاروں کے وجُود سے خالی ہے۔ آج کے بعد آزادی کے متلاشیوں کے جو قافلے سرنگا پٹم سے نکلیں گے ان کے سامنے مُہیب تاریکیوں کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

منیرہ! تم جس ملک کی تاریکی سے گھبرا کر یہاں آئی تھیں آج اس کی فضاؤں میں آزادی کے نغمے گونج رہے ہیں۔ تمھارے ہم وطن اپنی قسمت پر ناز کر سکتے ہیں۔ لیکن میرے میسُور کی

عظمت قصّہ ماضی بن چکی ہے۔ تمھاری رفاقت میں میری زندگی کا ہر سانس مسرّتوں سے لبریز تھا لیکن اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ کسی دن میری قوم کی تقدیر میر صادق جیسے غدّاروں کے ہاتھ میں آجائے گی تو میں تمھارا رفیقِ حیات بننے کی تمنا نہ کرتا۔ میں رُوئے زمین کی تمام خوشیاں تمھارے قدموں میں ڈھیر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب میری پُونجی ایک لٹی ہوئی قوم کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ جب میں لاشوں کے انبار میں پڑا ہُوا تھا تو میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ کاش تم سرنگا پٹم میں نہ ہوتیں اور میں ایک شکست خوردہ قوم کی سسکیاں سُننے کی بجائے وہیں جان دے دیتا۔ میں مرنے سے پہلے تمھیں کسی محفوظ جگہ دیکھنا چاہتا تھا—— کسی ایسی محفوظ جگہ جس کے مکین غدّاری اور ملّت فروشی کے الفاظ سے نا آشنا ہوں۔"

انور علی کی گفتگو کے دوران میں منیرہ کی آہیں سسکیوں اور سسکیاں دبی دبی چیخوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ جب اس نے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"انور!" اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہُوئے کرب انگیز لہجے میں کہا: "میرا وطن فرانس نہیں سرنگا پٹم ہے اور مجھے اپنے حال یا مستقبل سے کوئی شکایت نہیں۔ مسرّت کے وہ ایّام جو مجھے آپ کی رفاقت میں نصیب ہوئے ہیں میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ آپ کے ساتھ مستقبل کی تاریک ترین منازل کی طرف قدم اٹھاتے ہُوئے میرے پاؤں نہیں ڈگمگائیں گے۔ اگر میسور کی زمین ہمارے لیے تنگ ہو گئی تو ہم کہیں دُور چلے جائیں گے۔ وہاں بھی مجھے اس سرنگا پٹم کی یاد ہمیشہ مسرُور رکھے گی جس کا پہلا منظر میں نے آپ کے ساتھ کاویری کے کنارے ایک ٹیلے کی چوٹی سے دیکھا تھا۔ خوشی کے وہ لمحات جو میں نے آپ کے ساتھ اس گھر کی چار دیواری میں گزارے ہیں۔ میری باقی زندگی کے مہینوں اور برسوں پر حاوی رہیں گے۔"

انور علی نے کہا: "منیرہ میں سرنگا پٹم چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں اس مٹّی میں دفن ہونے کی سعادت سے محروم ہونا پسند نہیں کروں گا جس پر سُلطان ٹیپو کا خُون گرا ہے اور موت سے پہلے میسُور میں میرے حصّے کا بہت سا کام باقی ہے۔ مجھے سرنگا پٹم کے شہیدوں کی ارواح کی قسم ہیں

اپنے ہم وطنوں کی عزت اور آزادی کو تجارت کا مال سمجھنے والے غداروں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ گدھ فرنگی بھیڑیوں کے ساتھ مل کر ہماری بوٹیاں نہیں نوچ سکیں گے۔"

کسی نے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور انور علی خاموش ہو گیا۔ منیرہ نے پوچھا "کون ہے؟"

منور خاں نے اندر جھانکتے ہوئے کہا "بی بی جی میں دودھ لایا ہوں۔"

"لے آؤ" منیرہ نے کہا۔

منور خاں ایک طشت میں دودھ کا کٹورا لیے کمرے میں داخل ہوا۔ منیرہ نے انور علی کو ہاتھ کا سہارا دے کر اٹھایا اور پھر طشت سے دودھ کا پیالہ اٹھا کر اس کے منہ کو لگا دیا۔ دودھ کے چند گھونٹ پینے کے بعد انور علی دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ منور خاں پیالہ لے کر واپس جانے لگا تو انور علی نے کہا "منور بالائی منزل کے بڑے کمرے سے تمام بندوقیں، طپنچے اور بارود لا کر میرے پاس رکھ دو!"

منیرہ نے کہا "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جو اس گھر کی نسبت زیادہ محفوظ ہو۔ شہر میں آپ کے کئی دوست ہیں؟"

انور علی نے جواب دیا "آج سرنگا پٹم میں میرے کسی دوست کا گھر محفوظ نہیں۔"

منور خاں نے جلدی جلدی چار بندوقیں، دو طپنچے اور بارود کی پانچ تھیلیاں لا کر انور علی کے کمرے میں رکھ دیں اور کہا "جناب اگر حکم ہو تو بندوقیں بھر دوں؟"

"ہاں!"

منور خاں نے فرش پر بیٹھ کر یکے بعد دیگرے بندوقیں بھر کر انور علی کے سرہانے دیوار کے ساتھ کھڑی کر دیں اور طپنچے تپائی پر رکھ دیے۔ اس کے بعد اس نے کہا "کریم خاں اور سائیس باہر ڈیوڑھی کے دروازے پر پہرہ دے رہے ہیں۔ سائیس کے پاس بندوق نہیں تھی اور میں نے اپنی بندوق اسے دے دی ہے۔ اگر اجازت ہو تو ایک بندوق یہاں سے لیتا جاؤں۔"

"نہیں" انور علی نے جواب دیا "تم انھیں میری طرف سے حکم دو کہ اگر کوئی مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ مداخلت نہ کریں۔ اب تم اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر کوئی مکان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو تم مجھے خبردار کر دو۔"

منور خاں کچھ دیر تذبذب کی حالت میں انور علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "بھائی جان میری ایک درخواست مان لیجیے۔"

"کہو!"

"بھائی جان میں چاہتا ہوں کہ اگر دشمن آ جائے تو آپ میرے لیے کمرے کا دروازہ بند نہ کریں۔ میں آخری دم تک آپ کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔"

"نہیں منور!" انور علی نے کرب انگیز لہجے میں کہا "تم جاؤ!"

منور نے آبدیدہ ہو کر انور علی کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر دروازے کی طرف چل دیا۔

"ٹھہرو!" انور علی نے کہا۔

منور رک گیا۔ انور علی نے منیرہ سے مخاطب ہو کر کہا "منیرہ امی جان کی وہ تھیلی جو مراد ہمارے حوالے کر گیا تھا کہاں ہے؟"

"وہ اوپر ایک صندوق میں پڑی ہے۔"

"اسے لے آؤ۔"

منیرہ کمرے سے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد مخمل کی ایک تھیلی اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ انور علی نے بستر پر لیٹے لیٹے منیرہ کے ہاتھ سے تھیلی لے کر کھولی اور ایک ہیرہ نکال کر منور خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "منور لو یہ تمھارے کام آئے گا۔"

"نہیں نہیں!" منور نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

"منور!" انور علی نے کہا "تم ہمیشہ میرا حکم مانا کرتے تھے یہ لے لو ورنہ میں خفا ہو جاؤں گا۔"

میرہ نے آگے بڑھ کر انور علی کے ہاتھ سے ہیرے لے لیا اور منوّر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

انور علی نے تین اور چھوٹے چھوٹے ہیرے تھیلی سے نکالے اور منوّر خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ بھی لو منوّر۔ ان میں سے ایک کریم خاں، دوسرا سامیں اور تیسرا خادمہ کو دے دو، اور انھیں یہ سمجھا دو کہ وہ کچھ عرصہ انھیں چھپا کر رکھیں۔ یہ بہت قیمتی ہیں۔"

منوّر خاں نے ہیرے لے لیے اور پھر چند ثانیے غور سے انور علی کی طرف دیکھنے کے بعد کہا: "بھائی جان آپ کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمیں یہاں چھوڑ کر کہیں جا رہے ہیں۔"

انور علی نے جواب دیا: "میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"تو پھر یہ ہیرے اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے؟"

انور علی نے قدرے تلخ ہو کر کہا: "منوّر خدا کے لیے جاؤ!"

منوّر اس تلخی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اس نے سراپا احتجاج بن کر پہلے انور علی اور پھر میرہ کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ انور علی نے مخمل کی تھیلی اپنے تکیے کے نیچے رکھ دی۔

○

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور وہ دم بخود ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"کون ہے؟" انور علی نے جلدی سے طمنچہ اٹھا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں جہان خاں ہوں۔ مجھے اندر آنے کی اجازت ہے؟"

انور علی نے میرہ کی طرف دیکھا اور اس نے ایک کھونٹی سے ایک سفید چادر اتار کر اپنے اوپر ڈال لی۔ انور علی نے آواز دی: "آئیے!"

ملک جہان خاں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود تلوار تھی اور لباس پر بھی خون کے چھینٹے نظر آتے تھے۔ اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا: "معاف کیجیے میں آپ کے نوکروں کو اطلاع کیے بغیر اندر آ گیا ہوں۔ سڑک پر جگہ جگہ انگریز سپاہی گشت کر رہے ہیں اور مجھے عقب سے

دیوار پھاند کر اندر آنا پڑا۔ آپ کے متعلق داروغہ کی اطلاع بہت پریشان کن تھی۔ اب آپ کا کیا حال ہے؟"

"میں زخموں سے زیادہ تھکاوٹ کے باعث نڈھال ہو گیا تھا۔ آپ تشریف رکھیے!"

"نہیں، میں راتوں رات یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایسے حالات میں بھی اپنے ایک ساتھی کو فراموش نہیں کیا۔"

"اب آپ کہاں جائیں گے؟"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ فتح حیدر کا لشکر کری گھاٹ کی پہاڑی کے عقب میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور میں کسی تاخیر کے بغیر ان کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔ اگر شہزادے نے میر قمرالدین جیسے غداروں کی باتوں میں آ کر ہتھیار نہ ڈال دیے تو میں آخری دم تک اس کا ساتھ دوں گا۔ ابھی تک سلطان کے جن وفادار ساتھیوں سے میری ملاقات ہوئی ہے ان سب کی یہی رائے ہے کہ ہم شہزادہ فتح حیدر کے پاس پہنچ جائیں۔ اب سرنگاپٹم کو تباہی سے بچانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ شہر میں انگریزوں کی وحشت اور بربریت کے جو بھیانک مناظر دیکھنے میں آتے ہیں وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ آج سرنگاپٹم میں کسی عورت کی عصمت محفوظ نہیں۔ میں نے اپنے ہاتھ سے پانچ انگریز قتل کیے ہیں۔ ایک گلی میں چند انگریزوں نے چار لڑکیوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور حیدر آباد کے سپاہی منت و زاری سے انھیں چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے ساتھیوں نے اچانک حملہ کیا اور آن کی آن میں دس بارہ انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حیدر آباد کے اکثر سپاہی غیر جانبدار رہے لیکن چند ایسے بھی تھے جنھوں نے لڑائی میں ہمارا ساتھ دیا۔"

انور علی نے پوچھا: "آپ نے شاہی محل کے حالات معلوم کیے ہیں؟"

"نہیں، اس طرف کے تمام راستے بند ہیں۔ میں صرف اتنا معلوم کر سکا ہوں کہ آٹھ بجے تک محل کے دروازے پر شدید لڑائی ہو رہی تھی اور فرانسیسی دستہ محل کے محافظوں کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد یک لخت فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ قلعے کا کماندار میر ندیم

دشمن کے ساتھ ملا ہُوا ہے۔ ان حالات میں اگر لڑائی جاری رہتی تو بھی انگریزوں کو محل پر قبضہ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ زخمی ہیں اور میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ دشمن شاہی محل سے فارغ ہوتے ہی ایک نئی شدت کے ساتھ لُوٹ مار اور قتل و غارت شروع کریں گے اور آپ کا مکان انتہائی غیر محفوظ ہوگا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ کو کسی ایسے دوست کے پاس پہنچا دیا جائے جس کا گھر نسبتاً محفوظ ہو؟"

انور علی نے جواب دیا۔ "آج میرے لیے سرنگا پٹم کے تمام گھر یکساں غیر محفوظ ہیں۔ مجھے اس وقت کوئی پریشانی ہے تو اپنی بیوی کے متعلق ہے اگر آپ انھیں شہزادہ فتح حیدر کے پاس پہنچا سکیں تو یہ مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔"

جہان خاں نے کہا۔ "اگر یہ فوراً چلنے کے لیے تیار ہو جائیں تو میں انھیں شہزادہ کے پاس پہنچانے کا ذمّہ لے سکتا ہوں لیکن چند گھنٹے بعد یہ کام بہت مشکل ہوگا۔"

منیرہ نے سراپا احتجاج بن کر کہا۔ "نہیں نہیں! میں آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

انور نے کہا۔ "منیرہ تمھارا میرے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں۔ اگر میں گرفتار ہو گیا تو انگریز زیادہ سے زیادہ مجھے اس وقت تک قید میں رکھیں گے جب تک کہ میسور کے کسی لشکر کی طرف سے مزاحمت کا خدشہ باقی رہے گا۔ لیکن ان درندوں کے ہاتھوں سرنگا پٹم کی کسی عورت کی عزت محفوظ نہیں اور اگر انھیں یہ پتہ چل گیا کہ تم فرانسیسی قوم سے تعلق رکھتی ہو تو تمھارا انجام شاید میری قوم کی بہو بیٹیوں سے زیادہ المناک ہوگا۔"

منیرہ نے کہا۔ "اب میں فرانسیسی نہیں بلکہ میسور کی بہو بیٹیوں میں سے ایک ہوں۔"

جہان خاں نے کہا۔ "میری بہن سرنگا پٹم کے لیے یہ تین چار دن بہت خطرناک ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ یہ قوم فتح کے نشے میں کیا کیا کرتی ہے۔"

منیرہ نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔ لیکن میری عزت، میری زندگی اور موت میرے شوہر کے ساتھ ہے۔ میں انھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

انور علی نے کہا۔ "منیرہ! آئندہ ایک دو دن سرنگا پٹم پر فاتح لشکر کی حکومت ہوگی اور انسانیت کو سر چھپانے کے لیے جگہ نہیں ملے گی۔ جب یہ طوفان گزر جائے گا تو میں تم سے آملوں گا۔ میں سنوّر اور کریم خاں کو تمھارے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ اگر ملک جہان خاں تمھارے لیے میسور کی حدود میں کوئی جائے پناہ تلاش نہ کر سکے تو یہ تمھیں چچا اکبر خاں کے گاؤں پہنچانے کا انتظام کر دیں گے اور مجھے یقین ہے کہ حالات ساز گار ہونے تک ثمینہ اور اس کی والدہ تمھیں اپنے گھر میں پناہ دے سکیں گی۔"

منیرہ نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اس وقت آپ کو میری ضرورت ہے۔" اور ان الفاظ کے ساتھ منیرہ کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔

جہان خاں نے کہا۔ "انور علی، میری بہن درست کہتی ہے۔ آپ کو ان کے متعلق فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ انگریز شراب کے نشے میں بھی ایک فرانسیسی لڑکی کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ ہمارا ٹیپو شہید ہو چکا ہے۔ ہم اپنی تلوار اور ڈھال سے محروم ہو چکے ہیں لیکن فرانس کا نپولین ابھی تک زندہ ہے۔ میں آپ سے اجازت لیتا ہوں۔"

جہان خاں دروازے کی طرف بڑھا لیکن انور علی نے کہا۔ "ٹھہریے میں آپ سے ایک اور درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہیے۔" جہان خاں نے مُڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"مُراد علی ابھی تک افغانستان کی مہم سے واپس نہیں آیا۔ اگر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تو اُسے ایک یا دو ہفتوں کے اندر اندر یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ اگر وہ کہیں آپ سے ملے تو اسے موجودہ حالات میں سرنگا پٹم آنے سے منع کیجیے۔ اسے میری طرف سے کہیے کہ اکبر خاں کے گھر میں تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں ان کی طرف سے ایک ایلچی تمھارا حال معلوم کرنے آیا تھا۔ اگر آپ کو گھوڑے کی ضرورت ہو تو میرے اصطبل سے لے جائیے۔"

"نہیں اس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر سرنگاپٹم سے نکلنا بہت مشکل ہے۔"

"اچھا خدا حافظ!" انور علی نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جہان خاں نے اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد منیرہ کو سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

انور علی نے منیرہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "منیرہ میں تمھارا شکر گزار ہوں۔"

"کس بات پر؟"

"تم نے میرا کہا نہیں مانا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر تمھیں یہاں سے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اگر تم میرا مشورہ مان لیتیں تو ممکن تھا میں تمھیں رخصت کرنے کے چند ثانیے بعد دیوانگی کی حالت میں باہر نکل آتا اور چلا چلا کر یہ کہتا: "منیرہ منیرہ! واپس آجاؤ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔"

منیرہ تشکر کے آنسوؤں کے ساتھ اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔

انور علی نے تھکی ہوئی آواز میں کہا: "میں بہت تھک گیا ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ تم دروازہ بند کر دو اور روشنی بجھا دو۔ اگر باہر سے کوئی آہٹ سنائی دے تو مجھے جگا دینا۔ مجھے گھٹن محسوس ہو رہی ہے ایک کھڑکی کھول دو۔ لیکن جب تمھیں نیند آنے لگے تو اسے بند کر دینا۔"

○

غروب آفتاب سے کوئی تین گھنٹے بعد سرنگاپٹم کے شہر، قلعے اور محل پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا اور میر عالم کی قیادت میں دکن کی فوج کے چند دستے بھی شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ شہر کی چار دیواری کے اندر میسور کے بارہ ہزار سورماؤں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں لیکن ابھی تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کے سپاہیوں کے لیے یہ فتح نامکمل تھی۔ وہ سلطان کی تلاش میں محل کا کونا کونا چھان چکے تھے۔ غداروں کی نشان دہی پر سلطان کے وفادار افسروں کے گھروں کی تلاشی ہو رہی تھی۔ کمسن شہزادوں کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ زخمیوں اور مقتولوں کے سینوں پر سنگینیں رکھ کر یہ پوچھا جا رہا تھا کہ سلطان کہاں ہے؟ سرنگاپٹم کے بیشتر سپاہی سلطان کی شہادت کے وقت مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے اور وہ انگریزوں کو کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے تھے لیکن جن سپاہیوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے محبوب حکمران کو گرتے دیکھا تھا انھیں بھی کوئی خوف یا لالچ سلطان کی شہادت کے متعلق کچھ بتانے پر آمادہ نہ کر سکا۔ ان میں سے بعض سلطان کو زندہ سمجھ کر اسے لاشوں کے انبار سے نکالنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے اور جنھیں سلطان کی موت کا یقین ہو چکا تھا انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ دشمن کے ناپاک ہاتھ سلطان کی لاش تک پہنچ سکیں۔

"سلطان شہید ہو چکا ہے لیکن اس کے وفادار ساتھیوں نے اس کی لاش کہیں گم کر دی ہے۔۔۔۔ سلطان شہید نہیں ہوا۔۔۔۔ سلطان زخمی ہونے کے بعد کہیں روپوش ہو گیا تھا۔۔۔۔ سلطان حملے سے پہلے ہی سرنگاپٹم سے جا چکا تھا۔۔۔۔ سلطان شہزادہ فتح حیدر کے پاس پہنچ چکا ہے۔۔۔۔ سلطان سرایا چتل ڈرگ کو اپنا مستقر بنا کر لڑائی جاری رکھے گا۔۔۔۔" اس قسم کی افواہیں صرف انگریزوں اور میر نظام علی کی فوج کے افسروں کیلیے ہی نہیں بلکہ ان غداروں کے لیے بھی انتہائی پریشان کن تھیں جو میسور کی آزادی کے عوض اپنے آقاؤں سے بڑی بڑی جاگیروں کے وعدے لے چکے تھے۔ میر صادق اور معین الدین کا انجام دیکھنے کے بعد انھیں اپنے انجام کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔

آدھی رات کے قریب محل کے سامنے میر قمر الدین، پورنیا اور بدر الزماں چند انگریز افسروں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے، چند سپاہی مشعلیں لیے ان کے گرد کھڑے تھے۔ میر ندیم بھاگتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور بلند آواز میں چلایا: "مجھے ابھی سلطان کے متعلق اطلاع ملی ہے اس کی لاش شمالی دروازے کے سامنے دوسری لاشوں کے انبار میں دبی ہوئی ملی ہے۔ چلیے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔"

وہ کسی توقف کے بغیر اس کے ساتھ چل دیے۔

تھوڑی دیر بعد وہ لاشوں کے انبار کے گرد کھڑے تھے۔ انگریز افسر کے حکم سے تمام لاشیں ایک ایک کر کے علیٰحدہ کی جانے لگیں۔ چند لاشیں ہٹانے کے بعد ایک انگریز سپاہی نے ایک لاش کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے کی کوشش کی تو اُسے اپنے ہاتھ میں کسی سخت چیز کی چبھن محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی لاش کے سر سے پگڑی اُتر گئی اور اس کے لمبے لمبے سیاہ بال بکھر گئے۔ انگریز سپاہی نے انگریزی زبان میں کچھ کہہ کر اپنے افسروں کو اس طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے مشعلیں قریب کر کے دیکھا تو یہ ایک عورت تھی جس کی باہوں میں سونے کے کنگن چمک رہے تھے۔ اس کے بعد ایک اور عورت کی لاش برآمد ہوئی جس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ پورنیا نے ایک سپاہی کے ہاتھ سے مشعل لے کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

"آپ اسے پہچانتے ہیں؟" ایک انگریز افسر نے سوال کیا

"ہاں، یہ ایک یتیم ہندو لڑکی ہے جسے سلطان نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ اس کا باپ گزشتہ جنگ میں مارا گیا تھا۔"

"اور دوسری عورت کون ہے؟"

"اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔"

تھوڑی دیر بعد باقی تمام لاشیں ہٹائی جا چکی تھیں اور یہ لوگ سکتے کے عالم میں شیرِ میسور کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سلطان ٹیپو کا لباس خون سے تر تھا لیکن اس کے چہرے کے رُعب و جلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی تلوار کا قبضہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا لباس فوج کے افسروں سے مختلف نہ تھا۔ وہ دستار جو اسے دوسروں سے تمیز کرتی تھی، چند قدم دُور پڑی ہوئی تھی۔ بدرالزمان نے آگے بڑھ کر دستار اٹھالی۔

ایک افسر نے پوچھا "یہ سلطان ٹیپو ہے؟"

میر قمرالدین نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا: "جی ہاں۔ آپ کو فتح مبارک ہو!"

انگریز سپاہی چلایا "یہ زندہ ہے!" ——— اور چند آدمیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔ انگریز افسر جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور سلطان کی نبض ٹٹولنے کے بعد اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "یہ مر چکا ہے۔"

بدرالزمان نے سلطان کی دستار کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا "اس کے قاتل آپ نہیں ہم ہیں۔ ہم نے اسے قتل کیا ہے اور ہماری آئندہ نسلیں اس کی قبر پر پھول چڑھایا کریں گی۔"

"ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔" انگریز افسر یہ کہہ کر میر قمرالدین کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ انھیں پالکی میں ڈال کر محل میں پہنچانے کا انتظام کریں۔ میں جنرل ہیرس کو اطلاع دیتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد قلعے کے ہر گوشے سے فتح کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ پھر انگریز سپاہی اچھلتے کودتے، چیختے چلاتے قلعے سے نکلے اور لوگوں کے گھروں کا رُخ کرنے لگے۔ وہ جتھے جو شہر کے مختلف حصوں میں سلطان کو تلاش کر رہے تھے ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور لوٹ مار، قتل و غارت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

کارکنانِ قضا و قدر نے اس قوم کی ہزاروں بیٹیوں کی چیخ و پکار کی طرف سے کان بند کر لیے تھے جن کی چند ماؤں نے میر صادق جیسے غداروں کو دودھ پلایا تھا۔ سرنگاپٹم کا کوئی گھر وحشت اور بربریت کے اس طوفان سے محفوظ نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ غدار بھی جنھوں نے میر صادق، پورنیا، قمرالدین اور معین الدین جیسے بے ضمیر انسانوں کا ساتھ دیا تھا اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ انھوں نے صرف قوم کی آزادی اور قوم کے شہیدوں کی قیمت ہی وصول نہیں کی بلکہ اپنی بہو بیٹیوں کی عزت کا سودا بھی کر چکے ہیں۔ میر صادق اور میر معین الدین اپنی غداری کا صلہ حاصل کرنے سے پہلے ہی قتل ہو چکے تھے لیکن ان کی ارواح انھی درندوں کے ہاتھوں اپنے گھروں کی بربادی کا تماشا دیکھ رہی تھیں جن کے لیے انھوں نے سرنگاپٹم کا راستہ صاف کیا تھا۔ ان کی بہو بیٹیوں کے لباس نوچے جا رہے تھے اور شراب سے

بدستت انگریز اُن کی چیخوں کے جواب میں قہقہے لگا رہے تھے۔

"میں میر صادق کی بیوی ہوں۔ میں میر صادق کی بہن ہوں۔ میں میر صادق کی بیٹی ہوں ـــــ یہ معین الدین کا گھر ہے، وہ لارڈ ولزلی کے دوست تھے۔ جنرل ہیرس انھیں جانتا ہے۔ انھیں لوگوں نے انگریزوں کا دوست ہونے کے جرم میں قتل کر دیا ہے۔ تم دوسرے کمرے میں اس کی لاش دیکھ سکتے ہو۔ تمھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوست اور اپنی قوم کے محسن کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ میں میر معین الدین کا بیٹا ہوں۔ یہ میری بیوی ہے، یہ میری بہنیں ہیں۔ ہمیں جنرل ہیرس کے پاس لے چلو ـــــ" انگریزوں کے پاس مہیب قہقہوں کے سوا ان التجاؤں کا کوئی جواب نہ تھا۔

جو لوگ سلطان کی موت کے بعد جنگ کے نتائج کے متعلق مایوس ہو کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے وہ اب گھروں کی حفاظت کے لیے لڑ رہے تھے اور سرنگا پٹم کی گلیوں اور بازاروں میں خون کی ایک نئی تہہ جم رہی تھی ٭

○

انور علی بندوقوں کے لگاتار دھماکوں اور عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سن کر گہری نیند سے بیدار ہوا تو صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ منیرہ ایک بندوق اٹھائے نیم وا دریچے کے سامنے کھڑی صحن کی طرف جھانک رہی تھی۔ انور علی نے اُٹھ کر دوسری بندوق پکڑتے ہوئے پوچھا "کیا ہے منیرہ؟"

"ہمارے مکان کے آس پاس چاروں طرف لوٹ مار شروع ہو چکی ہے۔" انور علی جلدی سے دریچے کی طرف بڑھا تو اسے اپنے زخموں میں ٹیسیں محسوس ہونے لگیں۔ اس نے منیرہ کو ایک طرف ہٹا کر دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "تم نے مجھے کیوں نہ جگایا؟"

"آپ گہری نیند سو رہے تھے اور آپ کو آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچا اگر کوئی

اس طرف آیا تو آپ کو جگا دوں گی۔"

انور علی نے دریچے کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا "تمھیں اس طرح دریچے کے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہیے تھا اور تمھیں بندوق چلانے کی بھی ضرورت نہیں، تم اگر ضرورت کے وقت صرف خالی بندوقیں بھر بھر کر مجھے دیتی رہو تو یہ کافی ہو گا۔"

منیرہ نے باقی تمام اسلحہ اٹھا کر دریچے کے قریب رکھ دیا اور انور علی کے قریب بیٹھ گئی۔ اسے خوف اور اضطراب کا ایک ایک لمحہ مہینوں سے زیادہ طویل معلوم ہوتا تھا، چند منٹ بعد ڈیوڑھی کی طرف شور سنائی دیا اور انور علی ذرا گردن اونچی کر کے باہر جھانکنے لگا۔ منور خاں بھاگتا ہوا صحن میں داخل ہوا اور اس نے برآمدے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا "بھائی جان! بھائی جان! وہ پڑوس کے مکان میں آگ لگا کر اس طرف آگئے ہیں اور ہماری ڈیوڑھی کا دروازہ توڑ رہے ہیں۔"

انور علی نے دریچے سے باہر سر نکالتے ہوئے کہا "منور! کریم خاں سے کہو دروازہ کھول دے اور اپنی بندوق ان کے سامنے پھینک دے۔"

منور خاں نے بدحواس ہو کر جواب دیا "جناب اگر ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا گیا تو وہ فوراً اندر آ جائیں گے۔"

"تم ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے بھی انھیں اندر آنے سے نہیں روک سکتے۔"

منور خاں نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازہ کو دھکا دیتے ہوئے کہا "بھائی جان خدا کے لیے مجھے اندر آنے دیجیے میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ میں بندوق چلا سکتا ہوں۔"

انور علی مضطرب ہو کر آگے بڑھا اور دروازے کی کنڈی کھولنے کے بعد منور خاں کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا "تمھارا فائدہ اسی میں ہے کہ تم اپنی کوٹھڑی میں پڑے رہو۔ جو لوگ میری تلاش میں آتے ہیں وہ تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ یہاں تم میری کوئی مدد

نہیں کر سکتے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تم بلاوجہ مارے جاؤ۔ اگر اُنھوں نے ہمیں کسی انسانی سلوک کا حقدار سمجھا تو میرے نوکروں کو بھی کوئی خطرہ نہیں اور اگر ہمیں اپنی عزت بچانے کے لیے جان کی بازی لگانی پڑی تو بھی تم لوگ ہم سے دُور رہ کر اپنی جانیں بچا سکو گے۔ ہمیں مرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب باتوں کا وقت نہیں جاؤ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلوا دو۔ اگر وہ پوچھیں تو انھیں یہ بتا دو کہ اس گھر میں ایک زخمی اور ایک عورت کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

منور خاں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن انور علی نے اسے باہر صحن کی طرف دھکیل کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ خادمہ ہانپتی کانپتی دریچے کے سامنے نمودار ہوئی اور انور علی اسے دیکھتے ہی چلایا "چچی آپ یا تو اپنی کوٹھڑی میں پڑی رہیں ورنہ چھت کے اُوپر چلی جائیں اور جب تک ہم آواز نہ دیں اس طرف آنے کی کوشش نہ کریں!"

خادمہ ایک ثانیہ پریشانی اور اضطراب کی حالت میں کھڑی رہی اور پھر تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی زینے کی طرف چلی گئی۔ انور علی دریچے کے سامنے بیٹھ گیا۔ ڈیوڑھی کی طرف آدمیوں کا شور بتدریج بڑھ رہا تھا۔ منیرہ دم بخود ہو کر اپنے شوہر کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا "آپ کے زخم تکلیف تو نہیں دیتے؟"

"نہیں میرا سر کچھ بوجھل ہے۔ ابھی اٹھ کر دروازہ کھولتے وقت مجھے چکر آگیا تھا اب ٹھیک ہوں۔ منیرہ تمھیں ڈر تو نہیں لگتا؟"

"نہیں آپ کی موجودگی میں مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔"

انور علی نے کہا "منیرہ میرا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مجھے اگر کوئی خوف ہے تو وہ یہ ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔ وہ آرہے ہیں ——— منیرہ وہ آرہے ہیں؟"

منیرہ نے نیم وا دریچے سے باہر دیکھا تو مسلح انگریزوں کی ایک ٹولی صحن کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ انور علی نے اسے اپنے ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا "منیرہ

اپنا سر نیچے رکھو۔"

پندرہ بیس مسلح انگریز صحن کے دروازے کے آگے رُکے، پھر دو آدمی اپنی بندوقیں سیدھی کیے آگے بڑھے۔ انور علی نے اپنی بندوق کی نالی ذرا باہر نکالتے ہوئے بلند آواز سے انگریزی زبان میں کہا "ٹھہرو!"

وہ رُک گئے۔ ایک سپاہی نے کہا "ہم تمھارے مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں تمھیں ہتھیار پھینک کر باہر آنے کے لیے ایک منٹ دیا جاتا ہے۔ ایک منٹ کے بعد ہم فائرنگ شروع کر دیں گے پھر تم کسی رعایت کے مستحق نہیں سمجھے جاؤ گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم زخمی ہو۔"

انور علی نے کہا "میں تمھارے کسی ذمہ دار افسر کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہمارے افسر آج بہت مصروف ہیں اور شاید تمھیں معلوم نہیں ہم باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم انسانیت کے بدترین دشمن ہو لیکن اگر تم میرا گھر لوٹنا چاہتے ہو تو میں مزاحمت نہیں کروں گا تمھیں مجھے صرف یہ اطمینان دلانا پڑے گا کہ اگر میں ہتھیار ڈال دوں تو میرے ساتھ ایک جنگی قیدی کا سلوک کیا جائے گا اور یہ اطمینان مجھے اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ تمھاری فوج کا کوئی با اختیار افسر یہاں موجود ہو۔ میں تمھارے ساتھ یہ وعدہ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ جب مجھے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ تم میرے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کرو گے تو اس گھر کی کوئی چیز تم سے چھپانے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔"

پیچھے کھڑے ہونے والے انگریزوں کی ٹولی سے کسی نے آواز دی "ہمیں ایسے بیوقوفوں کے ساتھ باتیں کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اب ایک منٹ ختم ہو چکا ہے۔"

دونوں سپاہی جو انور علی سے باتیں کر رہے تھے واپس مڑ کر اپنے ساتھیوں سے جا

ملے۔ پھر وہ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔

انور علی نے کہا: "منیرہ اگر مجھے تمہارے متعلق یہ اطمینان ہوتا کہ وہ تمہارے ساتھ بدسلوکی نہیں کریں گے تو میں ہتھیار پھینک کر باہر نکل جاتا لیکن یہ تمام سپاہی ہیں اور شراب سے بدمست ہیں۔ مجھے ان سے کسی انسانی سلوک کی توقع نہیں۔"

"منیرہ منیرہ! فرش پر لیٹ جاؤ اور اوپر سر اُٹھانے کی کوشش نہ کرو!"

انور علی کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ صحن میں بندوقوں کے دھماکے سُنائی دینے لگے اور کئی گولیاں بند دروازے اور نیم وا دریچے کے پٹ چیرتی ہوئی عقبی دیوار سے جا ٹکرائیں۔ انور علی نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور دو آدمی گولی کھا کر گر پڑے، باقی افراتفری کی حالت میں پسپا ہونے لگے انور علی نے آن کی آن میں دو اور آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنانے کے بعد دونوں طپنچے اٹھا لیے لیکن اتنی دیر میں صحن خالی ہو چکا تھا۔ چند انگریز اندرونی صحن سے نکل کر باہر کے احاطے میں پہنچ چکے تھے اور باقی مکان کی دائیں طرف آم کے دو درختوں کے پیچھے غائب ہو چکے تھے۔

○

پانچ منٹ تک کمرے میں مکمل سکوت طاری رہا اور اس عرصہ میں انور علی اور منیرہ خالی بندوقیں بھر چکے تھے۔ پھر صحن کی دیوار کے اُوپر سے گولیاں آنے لگیں اور انور علی کو کچھ دیر دریچے کے سامنے سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ منیرہ نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"میں ٹھیک ہوں تم اپنا سر نیچے رکھو!"

فائرنگ اچانک بند ہو گئی۔ انور علی نے ذرا گردن اُٹھا کر باہر جھانکا تو اُسے سامنے صحن کی دیوار کے عقب سے چند انگریزوں کی ٹوپیاں دکھائی دیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں

طپنچے لیے دریچے سے ذرا بائیں طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور ایک طرف جھک کر باہر جھانکنے لگا اب ان آدمیوں کے سر اس کی زد میں تھے جو صحن کی دیوار کے عقب میں کھڑے تھے۔ وہ بیک وقت دونوں آدمیوں کو اپنے طپنچوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے صحن کی بائیں طرف کے درختوں میں کوئی آہٹ محسوس ہوئی اور وہ دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا درخت کی ایک شاخ جس کا کچھ حصہ وہ دریچے سے دیکھ سکتا تھا ہل رہی تھی۔ اس نے گردن ذرا آگے کی تو اسے پتوں کی آڑ میں ایک شاخ پر کوئی آدمی دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں بندوق کا دھماکا سُنائی دیا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی۔ وہ اپنے زخم پر ہاتھ رکھ کر لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف ہٹا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ منیرہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ اسے سہارا دینے کے لیے اُٹھ کر آگے بڑھی۔ وہ چلّایا: "منیرہ لیٹ جاؤ۔ منیرہ!"

بندوق کا ایک اور دھماکا سنائی دیا اور منیرہ اس کے قدموں پر گر پڑی۔ انور علی کے ہاتھوں سے طپنچے گر پڑے اور وہ "منیرہ منیرہ!" کہتا ہوا اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ لیکن منیرہ کے پاس اس کی التجاؤں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کی پیشانی سے خون کا فوّارہ چھوٹ رہا تھا اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی اُمیدوں، آرزوؤں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کی دُنیا کو الوداع کہہ رہا تھا۔

"منیرہ منیرہ! میری منیرہ، میری جان!!" انور علی نے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچتے ہُوئے کہا: "تم نے وعدہ کیا تھا کہ زندگی اور موت میں ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں؟"

اس نے منیرہ کو فرش پر لٹا دیا اور طپنچے اٹھا کر دریچے کی طرف بڑھا۔ اسے اپنے زخموں کا احساس نہ تھا۔ اسے دیوار کی طرف سے دشمن کی گولیوں کی پروا نہ تھی۔ وہ زندگی اور موت سے بے نیاز دریچے سے باہر سر نکالے درخت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آن کی آن میں اس نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور دو لاشیں زمین پر آ رہیں۔ اس کے ساتھ ہی دیوار کی طرف سے بیک وقت چند گولیاں آئیں اور انور علی اپنے بازو اور پسلیوں پر زخم کھانے کے بعد گر

پڑا۔ پھر اس نے دائیں ہاتھ سے ایک بندوق پکڑ لی اور رہی سہی قوت سے کام لیتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا بایاں بازو جواب دے چکا تھا۔ بیرونی احاطے میں گھوڑوں کی ٹاپ اور اس کے ساتھ ہی بگل کی آواز سنائی دی اور فائرنگ بند ہو گئی۔ انور علی ایک ہاتھ سے بندوق کا سہارا لے کر دریچے میں رکھ کر باہر جھانکنے لگا۔ کچھ دیر اسے باہر جمع ہونے والے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر صحن کے دروازے کی طرف سے کسی نے بلند آواز میں کہا: "انور علی، انور علی! میں ہاشم بیگ ہوں۔ فائرنگ بند کر دو۔ کرنل ولزلی نے تمہاری جان بچانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ میرے ساتھ ہیں۔ میں اندر آ رہا ہوں۔ میں ہاشم بیگ ہوں۔"

چند ثانیے توقف کے بعد ہاشم بیگ صحن میں داخل ہوا اور انور علی کوئی جواب دینے کی بجائے بندوق پھینک کر رینگتا ہوا ایک طرف بڑھ کر منیرہ کی لاش کے ساتھ لپٹ گیا۔ ہاشم بیگ نے دریچے سے اندر جھانکنے کے بعد کمرے کے دروازے کو دھکا دیا اور دروازہ بند پا کر دریچے کے راستے کمرے کے اندر داخل ہوا۔

"انور علی، انور علی!" اس نے جلدی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا: "میں تمہارے لیے جان بخشی کا وعدہ لے کر آیا ہوں۔"

"تم بہت دیر سے آئے ہو ہاشم!" انور علی نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے جواب دیا۔ "اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔"

ہاشم بیگ نے اسے لٹاتے ہوئے کہا: "میں انگریزی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

انور علی نے کہا: "نہیں! میں کسی انگریز کو اپنے زخموں پر ہاتھ رکھنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہاشم میں تمہیں اس فتح کی مبارکباد دیتا ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ انگریز حیدرآباد کے سپاہیوں کو سرنگا پٹم کے مالِ غنیمت سے کوئی حصہ نہیں دیں گے۔ تاہم میں تمہیں مایوس نہیں ہونے دوں گا۔"

ہاشم بیگ ندامت، پریشانی اور کرب کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انور علی کو سہارا دیتے وقت اس کے ہاتھ خون ... تر ہو چکے تھے۔ انور علی فرش پر رینگتا ہوا بستر کی طرف بڑھا۔ اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور مخمل کی تھیلی نکال کر ہاشم بیگ کے پاؤں میں پھینک دی۔

"ہاشم میرے دوست یہ تھیلی اُٹھا لو۔ اس میں چند بیش قیمت ہیرے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ انعام جو میرے دادا نے سراج الدولہ کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ پیش کر کے حاصل کیا تھا کسی انگریز کے ہاتھ آ جائے۔"

ہاشم بیگ نے کرب انگیز لہجے میں کہا: "انور علی تم اس سے زیادہ تلخ باتیں کہنے کا حق رکھتے ہو۔ حیدرآباد کی فوج کے سپاہی اس قتل و خون میں برابر کے حصہ دار ہیں اور حیدرآباد کے مسلمانوں کی آئندہ نسلیں اس دن کی یاد میں قیامت تک آنسو بہائیں گی لیکن اس خون کے دھبے ان کے دامن سے نہیں دُھل سکیں گے۔ اپنے متعلق میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس لڑائی میں غیر حاضر رہنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن تنویر کی یہ خواہش تھی کہ میں فوج کے ساتھ ضرور جاؤں۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں خطرے کے وقت سرنگا پٹم کے کسی مسلمان کی جان بچا سکوں۔ یہاں بھی میں فوج کے ان چند افسروں کے ساتھ تھا جنہوں نے لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ہمیں میر عالم نے ناقابلِ اعتماد سمجھ کر اپنے پڑاؤ سے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ ہمیں اس وقت شہر میں داخل ہونے کا موقع ملا جب جنگ ختم ہو چکی تھی۔ میں رات کے وقت تمہارا گھر تلاش نہیں کر سکا۔ صبح یہاں پہنچا تو حملہ ہو چکا تھا۔ انگریز دیوار کی اوٹ سے گولیاں برسا رہے تھے۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے بندوق میری طرف سیدھی کر دی۔ میں کسی افسر کی مدد لینے کے لیے نکلا تو اتفاق سے کرنل ولزلی اس طرف آ رہا تھا۔"

انور علی نے نقاہت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا: "میرے دوست اگر میری باتوں سے تمہیں تکلیف ہوئی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔"

ہاشم بیگ نے آبدیدہ ہو کر کہا: "انور علی میں مُراد کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔"

”مُراد یہاں نہیں ہے۔ وہ لڑائی سے پہلے افغانستان جا چکا تھا۔ اگر وہ ملے تو میں اس کی حفاظت آپ کو سونپتا ہوں۔ اگر آپ میرے نوکروں کی کوئی مدد کر سکیں تو یہ ایک احسان ہو گا یہ میری بیوی ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ اس کی لاش پر کسی انگریز کی نگاہ پڑے۔ اگر ہو سکے تو ہمیں اسی مکان کے کسی گوشے میں دفن کر دیجیے۔“

انور علی کے چہرے پر موت کی زردی چھا رہی تھی۔ کمرے سے باہر بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے نحیف آواز میں کہا: ”ہاشم یہ تھیلی چھپا لو، اب یہ مُراد کی امانت ہے۔ اگر وہ تمہیں ملے تو اسے [illegible] کی چھوٹی بہن کے پاس پہنچا دینا۔ مجھے یقین ہے کہ مُراد کسی دن ان کے ہاں ضرور جائے گا۔“

ہاشم بیگ نے تھیلی اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہاشم بیگ نے اُٹھ کر بستر سے چادر اٹھائی اور منیرہ کی لاش پر پردہ ڈال لینے کے بعد آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ کرنل ولزلی اندر داخل ہوا اور باقی سپاہی ہاشم کے اشارے پر رک گئے۔ کرنل ولزلی نے ایک ثانیہ کے لیے انور علی کی طرف دیکھا اور پھر ہاشم بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”اگر آپ اس گھر کا تمام اسلحہ جمع کرنے کا ذمہ لیتے ہیں تو میرے آدمی یہاں سے چلے جائیں گے۔“

ہاشم بیگ نے جواب دیا: ”میں اس کا ذمہ لیتا ہوں۔ لیکن آپ کو اسلحہ کی بجائے ان بھیڑیوں کو قابو میں رکھنے کی فکر کرنی چاہیے۔“

کرنل ولزلی نے واپس مڑتے ہوئے کہا: ”ان بھیڑیوں کو قابو میں رکھنا اب میرے بس کی بات نہیں۔“

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

انور علی آنکھیں بند کیے اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔ ہاشم دوبارہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ انور علی نے آنکھیں کھول کر پانی مانگا۔ ہاشم بیگ نے کمرے کے کونے میں پڑی ہوئی صراحی سے پانی کا ایک کٹورا بھرا اور اس کی گردن کو ہاتھ کا سہارا دے کر کٹورا اس کے منہ کو لگا دیا۔

پانی کا ایک گھونٹ پینے کے بعد انور علی نے ایک ہچکی لی اور اس کے منہ سے خون کے چند قطرے نکل کر پانی میں شامل ہو گئے۔ ہاشم نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ انور علی چند ثانیے بے حس و حرکت پڑا رہا۔

”انور علی انور علی!“ ہاشم بیگ نے مضطرب ہو کر کہا۔

انور علی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی رُوح سرنگاپٹم کے شہیدوں کی ارواح سے جا ملی۔

○

اگلے دن شام کے چار بجے کے قریب سرنگاپٹم کے قلعے سے سلطان شہید کا جنازہ نکلا۔ شہزادوں اور سلطنت کے عہدیداروں کے علاوہ گورا فوج کی چار کمپنیاں جنازے کے ساتھ تھیں۔ سلطان کے جاں نثار جن میں سے اکثر زخمی تھے آگے بڑھ بڑھ کر جنازے کو کندھا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ گزشتہ لوٹ مار اور قتل و غارت کے باعث اہلِ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا، گلیاں اور بازار سنسان نظر آتے تھے لیکن سلطان کی میت قلعے سے باہر نکلی تو سرنگاپٹم کے مرد و زن، بچے اور بوڑھے بلا امتیاز مذہب و ملت اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکل کر جنازے کے ساتھ شریک ہونے لگے۔ راستے کے گلی کوچوں میں لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ ان کا خوف و ہراس دور ہو چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بدنصیب لوگ اپنے حکمران کی لاش کو بھی اپنا محافظ خیال کرتے ہیں۔ سرنگاپٹم کے بیٹے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور سرنگاپٹم کی بیٹیاں اپنے سر کے بال نوچ رہی تھیں۔

جنازہ اٹھا تو ہوا بند تھی اور گرمی کی شدت اور حبس کے باعث دم گھٹا جا رہا تھا۔ لوگ اُفق پر ایک خوفناک آندھی کے آثار دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں یہ تاریک آندھی سارے آسمان پر چھا گئی۔ جنازہ لال باغ میں پہنچا۔ شہر کے قاضی نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جب میت کو لحد

میں اتارا جارہا تھا تو فضا میں چاروں طرف بجلیوں کی مہیب کڑک سنائی دینے لگی۔ لوگوں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ گورا فوج کو سلامی کا حکم دیا گیا لیکن ان کی بندوقوں کی آواز بادلوں کی خوفناک گرج میں دب کر رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پر جاہ و جلال کے اس پیکرِ مجسم کی روح کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

فضا کی تاریکی بڑھتی گئی اور بجلیوں اور چمک میں اضافہ ہوتا گیا۔[1] سرنگا پٹم کے در و دیوار ہل رہے تھے۔ وہ غدار جو انگریزی سنگینوں کے پہرے میں جنازے کے ساتھ آئے تھے سہمے جارہے تھے۔ سلطان کی تدفین سے فارغ ہونے کی دیر تھی کہ آسمان پھٹ پڑا اور آن کی آن میں سرنگا پٹم کی گلیاں اور بازار ندیاں اور نالے نظر آنے لگے۔

کچھ دیر بعد ٹیپو کی فوج کے چند افسر اور سپاہی دریائے کاویری کی طغیانی کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ایک بوڑھا افسر دھاڑیں مار مار کر کہہ رہا تھا: "میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی کے پہلے ہفتے میں دریائے کاویری میں ایسا سیلاب نہیں دیکھا۔ میسور کے غدارو! کاش تم ایک دن اور صبر کر لیتے۔ قدرت ہماری مدد کرنا چاہتی تھی لیکن تم نے اسے موقع نہ دیا۔ آج اگر تم سرنگا پٹم کے تمام دروازے دشمن کے لیے کھول دیتے تو بھی ہم ایک گولی ضائع کیے بغیر اس کے عزائم خاک میں ملا سکتے تھے۔"

پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا: "میرے دوستو! یہ وہ دن تھا جس کا ہمارے سلطان کو انتظار رہتا۔ ہم کتنے بدقسمت ہیں آج جن بادلوں کو ہماری فتح کا مژدہ لے کر آنا تھا وہ ہمارے شکست خوردہ سپاہیوں کے آنسو دھو رہے ہیں۔"

[1] جنرل میڈوز، میجر بیٹسن اور ولکس نے اپنی تصانیف میں بجلیوں کے اس مہیب طوفان کے چشم دید حالات بیان کیے ہیں جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ شہر کے دوسرے حصوں کی طرح بجلی کی انگریزی فوج کے کیمپ پر بھی بجلیاں گری تھیں جن سے دو آدمی ہلاک اور متعدد آدمی شدید مجروح ہوئے۔

انتیسواں باب

ایک شام مراد علی کے ساتھ آٹھ سوار دریائے کابل کے کنارے مہمند قبیلے کے ایک سردار کی بستی میں داخل ہوئے۔ آن کی آن میں بستی کے چند آدمی ان کے گرد جمع ہوگئے۔ مراد علی نے فارسی زبان میں کہا: "ہم اس گاؤں کے سردار سے ملنا چاہتے ہیں۔"

بستی کے لوگوں کے ہجوم سے ایک خوش وضع نوجوان آگے بڑھا اور اس نے کہا: "آیئے!"

مراد علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں سے اتر پڑے اور نوجوان انھیں ساتھ لے کر ایک قلعہ نما مکان کی طرف چل دیا۔ راستے میں مراد علی نے پوچھا: "آپ اس گاؤں کے سردار ہیں؟"

"نہیں، میں سردار کا پوتا ہوں۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

مراد علی نے جواب دیا: "ہم میسور کے رہنے والے ہیں لیکن اس وقت کابل سے آرہے ہیں۔"

نوجوان نے کہا: "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں نے اس سے پہلے میسور کا کوئی باشندہ نہیں دیکھا تھا۔ اس راستے ہندوستان کے جو مسافر آتے جاتے ہیں وہ ہمیں سلطان ٹیپو کے متعلق بڑی دلچسپ باتیں سنایا کرتے ہیں۔ آپ کابل کیا لینے گئے تھے؟"

"ہم آپ کے حکمران کی خدمت میں ایک ضروری پیغام لے کر آئے تھے۔"

"اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"اب ہم واپس جا رہے ہیں اور آج رات آپ کے مہمان ہیں۔"

نوجوان نے جواب دیا ــــ "آپ کی خدمت ہمارے لیے راحت کا باعث ہوگی۔"

مکان کے احاطے سے باہر سردار کے آدمیوں نے ان کے گھوڑے پکڑ لیے اور نوجوان انھیں مہمان خانے میں لے گیا۔ مہمان خانے میں ایک وسیع کمرہ خوبصورت قالینوں سے آراستہ تھا۔ مُراد علی اور اس کے ساتھی اپنے میزبان کے اشارے پر وہاں بیٹھ گئے۔ نوجوان کا نام محمود خاں تھا اور مُراد علی کو اس سے چند سوال پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ قبیلے کے سردار کا نام مکرّم خاں ہے اور محمود خاں اُس کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ اس کا باپ، دو بڑے بھائی، ایک چچا اور اس کے تین بیٹے زمان شاہ کی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ محمود خاں مُراد علی کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد سردار کو اطلاع دینے کے لیے مکان کے دُوسرے حصّے میں چلا گیا۔

چند منٹ کے بعد محمود خاں کے ساتھ ایک سفید ریش اور بلند قامت آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے کندھوں پر ایک بھاری پوستین ڈالے ہوئے تھا۔ بڑھاپے کے باوجود وہ تندرست اور توانا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے "السلام علیکم" کہا اور مراد علی اور اس کے ساتھی "وعلیکم السلام" کہہ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ مکرّم خاں نے یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور ان کے درمیان ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"آپ میسور کے رہنے والے ہیں؟" اس نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"جی ہاں!"

"آپ کابل سے ہو کر آئے ہیں؟"

"جی ہاں!"

"زمان شاہ سے ملے تھے؟"

"جی ہاں!" مُراد علی نے جواب دیا۔ "ہم ان کی خدمت میں سلطان ٹیپو کی طرف سے ایک ضروری پیغام لے کر آئے تھے۔"

بوڑھے سردار نے غور سے مُراد علی کی طرف دیکھا اور کہا: "آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ کو اپنی مہم میں کامیابی نہیں ہوئی۔"

مُراد علی اور اس کے ساتھی پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ مکرّم خاں مسکرایا۔ "آپ کو میری باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے میسور کے حالات معلوم ہیں۔ اگر سلطان ٹیپو نے آپ لوگوں کو کوئی ضروری پیغام دے کر زمان شاہ کے پاس بھیجا تھا تو میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ وہ پیغام کیا ہو سکتا ہے۔ میں لاہور کی طرف زمان شاہ کی پیش قدمی سے چند ماہ قبل کابل گیا تھا۔ میں وہاں ان کے وزیر وفادار خاں کا مہمان تھا۔ میں سلطان ٹیپوؒ کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا اور جب میرے میزبان نے مجھے یہ بتایا کہ سُلطان کے سفیر ایک عرصے سے کابل میں مقیم ہیں تو میں نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ وفادار خاں نے اگلے دن انھیں کھانے پر بُلایا۔ آپ کے سفیر میر حبیب اللہ اور ان کے ایک اور ساتھی میر رضا کے ساتھ میری پہلی ملاقات انتہائی دوستانہ تھی۔ وہ دیر تک سلطان ٹیپو کی شخصیت اور اس کے مجاہدانہ کارناموں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ پھر وفادار خاں کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس مقصد سے کابل تشریف لائے ہیں۔ اس کے بعد اگلے دن میں نے اعلیٰ حضرت زمان شاہ سے ملاقات کی۔ میں پانی پت کی جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تھا اور اس کے بعد تیمور شاہ کے ساتھ پنجاب کے سکھوں کے خلاف کئی معرکوں میں حصّہ لے چکا ہوں۔ زمان شاہ میری بہت عزّت کرتے ہیں۔ میں نے ان پر زور دیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اعانت آپ پر فرض ہے۔ سلطان ٹیپو تن تنہا کئی برس سے انگریزوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اگر اسے شکست ہو گئی تو انگریز مرہٹوں کی نسبت کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے یقین دلایا کہ ہم ہندوستان پر چڑھائی کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

چند ماہ بعد اعلیٰ حضرت کی افواج لاہور کی طرف روانہ ہو چکی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ اب عنقریب کسی میدان میں پانی پت کی تاریخ دُہرائی جائے گی اور میسور اور افغانستان کے سپاہی متحد ہو کر چند ماہ کے اندر اندر ہندوستان کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر دیں گے۔ لیکن یہ مسلمانوں کی بدبختی تھی کہ افغانستان کی اندرونی سازشوں اور بیرونی خطرات نے زمان شاہ کو لاہور سے آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا۔ جب وہ پشاور پہنچے تھے تو میں نے وہاں جا کر ان سے ملاقات کی تھی اور انھوں نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ افغانستان کے حالات ٹھیک ہوتے ہی میں دوبارہ دلّی کا رُخ کروں گا۔"

مراد علی نے کہا: "ہمارے کابل پہنچنے سے دو دن قبل وہ ہرات کی طرف پیش قدمی کر چکے تھے اور ہم نے کابل سے چند کوس آگے جا کر ان سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے ہمیں یہ اطمینان دلایا تھا کہ وہ ہرات کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد ہی سلطان کو کوئی تسلّی بخش جواب دے سکیں گے۔"

مکرم خاں نے کہا: "میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اب افغانستان کے اپنے حالات بہت خراب ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ہفتے میں نے یہ افواہ سنی تھی کہ باغیوں نے قندھار پر قبضہ کر لیا ہے اور آج صبح پشاور سے یہ خبر آئی ہے کہ شجاع الملک نے اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔"

مراد علی اور اس کے ساتھی رنج و کرب کی حالت میں کبھی بوڑھے سردار اور کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کی مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دی اور وہ سردار کے ساتھ باہر نکل آئے۔

○

رات کے وقت مکرم خاں کے دسترخوان پر مہمانوں کے علاوہ بستی کے چند معززین

بھی موجود تھے۔ پُرتکلف کھانا ایک افغان سردار کی روایتی مہمان نوازی کا آئینہ دار تھا۔ کھانے کے بعد مہمانوں کی خاطرداری کے لیے گاؤں کے ایک گویّے کو بلایا گیا۔ گویّے نے اپنے سردار کی فرمائش پر دلکش لَے میں پشتو کا ایک گیت چھیڑا۔ مُراد علی اور اس کے ساتھی پانی پت اور احمد شاہ ابدالی کے الفاظ کے سوا کچھ نہ سمجھ سکے۔ لیکن بستی کے لوگوں پر رقت طاری ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد گویا خاموش ہو گیا تو سردار نے کہا: "اب فارسی کی کوئی چیز سناؤ ہمارے مہمان پشتو نہیں جانتے۔" پھر وہ مراد علی کی طرف متوجہ ہُوا۔ "یہ احمد شاہ ابدالی اور پانی پت کی جنگ کے متعلق گا رہا تھا۔ مجھے یہ راگ بہت پسند ہے۔"

مراد علی نے کہا: "ہم اس کا راگ نہیں سمجھ سکے لیکن ہمارے لیے ایک افغان کے منھ سے پانی پت اور احمد شاہ ابدالی کے الفاظ سن لینا کافی ہے۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا گا رہا ہوگا۔ پانی پت کے متعلق ہندوستان کے مسلمان بھی گایا کرتے ہیں۔"

مکرم خاں نے کہا: "بیٹا جب پانی پت کی جنگ لڑی گئی تھی تو میری عمر پچیس سال تھی، اُس وقت میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی دن احمد شاہ ابدالی اس دنیا میں نہیں ہوگا اور ہم اس کے متعلق صرف گیت سن کر اپنا جی بہلایا کریں گے۔ وہ عجیب زمانہ تھا۔ مرہٹوں کی فوج حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن ہم ایسا محسوس کرتے تھے کہ اگر ہندوستان کی تمام زمین ان سے بھر جائے تو بھی ہم انھیں شکست دے سکتے ہیں۔ آفتاب دوبارہ ہندوستان کے کسی میدان میں مسلمانوں کا وہ جاہ و جلال نہیں دیکھے گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ابھی کل کی بات ہے۔ شاہ ولی خاں، شاہ پسند خاں، برخوردار خاں، نصیر خاں بلوچ، نجیب الدولہ، رحمت خاں روہیلہ اور مغل سرداروں کی صورتیں اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔"

حاضرین کی نگاہیں اب گویّے سے ہٹ کر بوڑھے سردار کے چہرے پر مرکوز ہو چکی تھیں اور وہ پانی پت کی جنگ کے چشم دید حالات بیان کر رہا تھا۔ اس نے کہا: "آخری معرکے سے پہلے پانی پت کے میدان میں بڑی دلچسپ باتیں ہُوا کرتی تھیں۔ ہماری فوج

کے جوان گھوڑے دوڑاتے ہوئے مرہٹوں کے پڑاؤ کے قریب پہنچ جاتے اور مرہٹہ سورماؤں کو مقابلے کے لیے للکارتے۔ ایک جوان کسی مرہٹہ سردار کو موت کے گھاٹ اتار کر آتا تو اس کا انتقام لینے کے لیے ان کی طرف سے کوئی ہمارے پڑاؤ کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ میں نے ان مقابلوں میں تین مرہٹہ جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر شاہ ولی خاں سے انعام حاصل کیا تھا۔ اس کی تلوار ابھی تک میرے پاس ہے۔"

مراد علی نے کہا: "آپ کے ساتھ ایک اور جوان بھی تھا جو کبھی افغان، کبھی بلوچ، کبھی مغل اور کبھی روہیلہ سپاہی کا لباس پہن کر مرہٹوں کو للکارا کرتا تھا؟"

بوڑھے سردار نے چونک کر مراد علی کی طرف دیکھا۔ "ہاں! میں اس جوان کو کیسے بھول سکتا ہوں جس کے سر پر نصیر خان بلوچ نے اپنا پٹکا اتار کر رکھ دیا تھا۔ اس نے کئی اور سرداروں سے بھی انعامات حاصل کیے تھے۔ ہم لوگ اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔"

مراد علی نے کہا: "اس کا نام اکبر خان تھا۔"

"ہاں! لیکن تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

مراد علی آبدیدہ ہو کر مسکرایا: "وہ میرے باپ کے دوست تھے۔"

مکرم خان نے غور سے مراد علی کی طرف دیکھا اور کہا: "تمہارے والد ——!"

"وہ پانی پت کی جنگ میں شریک تھے اور ایک ہزار روہیلہ سپاہی ان کی کمان میں تھے جن میں سے اکثر اکبر خاں کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔"

مکرم خاں کچھ دیر ایک سکتے کی سی حالت میں مراد علی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر دونوں ہاتھ مراد علی کے کندھوں پر رکھ کر بولا: "تم —— تم معظم علی کے بیٹے ہو؟"

"جی ہاں!" اور ان الفاظ کے ساتھ مراد علی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

مکرم خاں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا: "تم بالکل وہی ہو۔ مجھے تمہیں دیکھتے ہی یہ محسوس ہوا تھا کہ ایسی صورت میں نے پہلے بھی شاید کہیں دیکھی ہے۔ تم اس مجاہد کے بیٹے ہو جسے احمد شاہ ابدالی نے اپنے کپڑے پہنائے تھے۔ میں ہمیشہ اسے اکبر خاں کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔ میں نے دلی کی مسجد میں اس کی تقریر سنی تھی۔ آج چالیس سال بعد میرے گھر اس مجاہد کا بیٹا آیا ہے جس کی صورت دیکھ کر ہمارا ایمان تازہ ہو جاتا تھا اور میں اسے پہچان نہ سکا۔"

بوڑھے سردار کی آواز بیٹھ گئی اور وہ اپنا منہ آستین میں چھپا کر سسکیاں لینے لگا۔ حاضرینِ مجلس پر رقت طاری ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد مکرم خاں نے اپنے آنسو پونچھے اور مراد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تمہارا باپ زندہ ہے؟"

"جی نہیں، وہ میسور میں انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔"

"اور اکبر خاں؟"

"انہیں مرہٹوں نے شہید کر دیا تھا۔"

مکرم خاں کے چند سوالات کے جواب میں مراد علی نے مختصراً اپنے اور اکبر خاں کے خاندان کی سرگزشت بیان کر دی۔ جب روہیل کھنڈ سے اکبر خاں کے قبیلے کی ہجرت کا ذکر آیا تو مکرم خاں نے کہا: "روہیل کھنڈ سے جو لوگ ہجرت کر کے یہاں آئے تھے، ان کے چند خاندان یہاں سے شمال کی طرف چند کوس دور آباد ہیں لیکن مجھے معلوم نہیں کہ ان میں کوئی اکبر خاں کا عزیز بھی ہے یا نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں ان کے سرکردہ آدمیوں سے آپ کی ملاقات کا انتظام کر سکتا ہوں۔"

"نہیں، میں اب فوراً سرنگا پٹم واپس پہنچنا چاہتا ہوں۔ خدا معلوم وہاں کیا ہو رہا ہے۔"

مکرم خاں مراد علی کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اب ان کی گفتگو کا موضوع انگریزوں، مرہٹوں اور میر نظام علی کے خلاف سلطان ٹیپو کی جنگیں تھیں۔ آدھی رات کے قریب یہ مجلس برخاست ہوئی۔ سردار اٹھ کر جانے لگا تو حاضرین احترام سے کھڑے ہو گئے۔ سردار نے کمرے سے نکلتے وقت مراد علی کی طرف دیکھا اور گلے لگاتے ہوئے کہا: "میرے عزیز! تم اس گھر میں مہمان نہیں ہو۔ میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ اب آرام کرو۔"

اگلے دن مکرم خاں بستی سے ایک میل دُور جا کر مراد علی اور اس کے ساتھیوں کو الوداع کہہ رہا تھا۔ پشاور میں بغاوت کے باعث راستے کے مخدوش حالات کے پیشِ نظر مکرم خاں کے قبیلے کے بیس مسلح آدمی ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ مراد علی کے ساتھ مصافحہ کرتے وقت بوڑھے سردار کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ اس نے کہا: "بیٹا میری زندگی میں شاید تم دوبارہ ادھر نہ آ سکو لیکن یہ یاد رکھو کہ میرے گھر کا دروازہ ہمیشہ تمھارے لیے کھلا رہے گا۔ اگر میں نہ ہُوا تو بھی میرے خاندان کے بچے اور جوان تمھیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔"

پھر وہ محمود خاں کی طرف متوجہ ہُوا: "بیٹا تم انھیں اٹک کے پار پہنچا کر واپس آ جانا۔"

○

سلطان کی شہادت سے چھ دن بعد شہزادہ فتح حیدر نے جنرل ہیرس کے وعدوں اور قمرالدین، پورنیا اور میر غلام علی کے مشوروں سے متاثر ہو کر ہتھیار پھینک دیے۔ میسور کے حریت پسندوں کی رگوں میں ابھی تک خون کے چند قطرے باقی تھے اور وہ آخری وقت تک شہزادہ فتح حیدر کو جنگ جاری رکھنے کا مشورہ دیتے رہے۔ ملک جہان خاں سرنگاپٹم سے فرار ہونے کے بعد ان حریت پسندوں کا رہنما بن چکا تھا۔ اس نے شہزادہ فتح حیدر کو یہ سمجھانے کی کوشش کی "آپ کو کسی تاخیر کے بغیر چتل ڈرگ پہنچ جانا چاہیے۔ وہاں چند دن کے اندر اندر سلطان شہید کے ہزاروں جاں نثار جمع ہو جائیں گے اور یہ لوگ آخری وقت تک آپ کا ساتھ دیں گے۔ میسور کے شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا۔ سرنگاپٹم کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر انگریزوں نے جو مظالم توڑے ہیں۔ ان کے بعد ان سے کسی انسانی سلوک کی توقع رکھنا پرلے درجے کی خود فریبی ہے۔ آپ ان وطن فروشوں کے مشوروں پر یقین نہ کریں جنھوں نے اپنے ہاتھوں سے سرنگاپٹم پر انگریزوں کے پرچم نصب کیے ہیں۔ ان غداروں کو ہمیشہ اس بات کا خوف رہے گا کہ سلطان کے جاں نثار انھیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ میر قمرالدین، پورنیا اور ان کے ساتھیوں کی آخری

کوشش یہ ہوگی کہ میسور سے آپ کے خاندان کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

یہ درست ہے کہ ان حالات میں ہم ایک لامتناہی عرصہ کے لیے دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے سرنگاپٹم پر انگریزوں کے مظالم ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ اگر ہم چند ہفتے یا چند مہینے لڑتے رہیں گے تو ہماری جنگ صرف میسور ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کی آزادی کی جنگ بن جائے گی۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس ملک کے تمام حکمران میر نظام علی کی طرح بے ضمیر ثابت نہیں ہوں گے۔ اب ان پر انگریزوں کے جارحانہ عزائم بے نقاب ہو چکے ہیں اور سرنگاپٹم کے واقعات کے بعد وہ اپنی بقا کے لیے ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس جنگ میں پیشوا اور مرہٹہ سرداروں کا طرزِ عمل یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ انھیں اپنی سابقہ غلطیوں کا احساس ہو چکا ہے۔

سلطان شہید نے انگریزوں کے خلاف ہندوستان، افغانستان اور ایران کے جس اتحاد کا خواب دیکھا تھا وہ کسی دن ضرور پورا ہوگا۔ ممکن ہے ہندوستان پر زمان شاہ کی چڑھائی اس ملک کی سیاست کا نقشہ بدل دے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گا اور اس ملک کے بیشتر حکمران اسے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے اور جو اس کا ساتھ نہیں دیں گے انھیں وطن کی عزّت اور آزادی کا دشمن سمجھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا سلطان شہید کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی اور اُن کی یہ خواہش پوری ہو کر رہے گی۔"

لیکن شہزادہ فتح حیدر کو ملک جہان خاں اور اس کے ساتھیوں کی التجائیں متاثر نہ کر سکیں۔ اس کے بھائی اور خاندان کے باقی تمام افراد سرنگاپٹم میں انگریزوں کے رحم و کرم پر تھے۔ فوج کے بہت کم سپاہی اور افسر ایسے تھے جو اپنے اندر گرتی ہوئی دیواروں کی پناہ لے کر جنگ جاری رکھنے کا حوصلہ پاتے تھے۔ سلطان کی شہادت اور سرنگاپٹم کے سقوط نے انھیں بددل

اور مایوس کر دیا تھا اور ان میں سے کئی ایسے تھے جن کے بال بچے سرنگا پٹم میں تھے۔

شہزادہ فتح حیدر کو جنرل ہیرس کے وعدوں کے باوجود انگریزوں سے کسی نیک سلوک کی توقع نہ تھی۔ اسے ان ملت فروشوں کے متعلق بھی کوئی خوش فہمی نہ تھی جو انگریزوں کے دکیل بن کر اسے اپنے خاندان کے مستقبل کے متعلق سبز باغ دکھا رہے تھے۔ اس کے نزدیک سلطان کی شہادت کے بعد میسور کی آزادی کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور وہ ایک بے بس سپاہی ہونے کے باوجود رات کی تاریکیوں میں ایک لٹے ہوئے قافلے کی رہنمائی کے لیے تیار نہ تھا۔

جب شہزادہ فتح حیدر انگریزوں کی اطاعت قبول کرنے کے لیے سرنگا پٹم کا رخ کر رہا تھا تو ملک جہان خاں گجل ہٹی کی ایک پہاڑی کے دامن میں چند سرپھروں کے سامنے یہ تقریر کر رہا تھا:۔

"شہزادے نے میرا کہنا نہیں مانا اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حالات نے اُسے بے بس و مجبور بنا دیا ہے۔ لیکن میں سلطان شہید کے مقدس خون کی قسم کھا کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ جب تک میری رگوں میں خون کا ایک قطرہ باقی ہے میں میسور کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔ میں ان غداروں کو کبھی معاف نہیں کروں گا جنھوں نے میری قوم کو یہ دن دکھایا ہے۔ ان حالات میں میں تم سے کسی شاندار فتح کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں تمھارے ساتھ ایک وعدہ کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ انگریز اور ان کے حلیف تمھارے ہاتھوں میں غلامی کی زنجیریں نہیں پہنا سکیں گے۔ آزادی کی زندگی سے مایوس ہونے کے بعد ایک مسلمان جس چیز کی تمنا کر سکتا ہے وہ عزت کی موت ہے اور جو لوگ عزت کی موت کے لیے میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں میں انھیں مایوس نہیں کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ملک جہان خاں کی رہنمائی میں ڈیڑھ سو سوار کسی نامعلوم منزل کا رخ

کر رہے تھے۔

شہزادہ فتح حیدر کے ہتھیار ڈالنے کے بعد میسور کی وہ داستان جس کے حسین عنوان حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے اپنی تلواروں کی نوک سے لکھے تھے، ختم ہو چکی تھی۔ سرا اور چیتل ڈرگ کے کمانڈر بھی میسور کے مستقبل سے مایوس ہو کر ہتھیار ڈال چکے تھے۔ اب سلطنت خداداد ایک لاش تھی جسے انگریز گدھوں کی طرح نوچ رہے تھے۔ ولزلی نے مال غنیمت کے چند ٹکڑے نظام کے آگے ڈال دیے اور ساحل کے تمام اضلاع اور کوئمبٹور کے علاوہ سرنگا پٹم کا جزیرہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

سلطنت خداداد کی بندر بانٹ کے بعد انگریزوں نے سابق ہندو راجہ کے خاندان سے ایک پانچ سالہ بچہ تلاش کیا اور اسے تخت پر بٹھا دیا۔ نیا راجہ ہندوستان کی بساطِ سیاست پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے بے بس اور حقیر مُہرہ تھا۔ اس کی ریاست میسور کے چند وسطی اضلاع تک محدود تھی۔ غداری کے صلے میں پورنیا کو نئے راجہ کا دیوان مقرر کیا گیا۔ میر قمر الدین کو گرم کنڈہ کی جاگیر عطا کی گئی اور میر معین الدین کے جانشینوں اور دوسرے غداروں کو بھی ان کے سابقہ مراتب کے لحاظ سے جاگیریں دی گئیں۔ شہزادوں کو جلاوطن کر کے ویلور بھیج دیا گیا۔ اب انگریز پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے اہلِ میسور کی کتابِ زندگی سے آزادی کا لفظ خارج کر دیا ہے۔

لیکن میسور کی راکھ میں ابھی تک چند چنگاریاں سُلگ رہی تھیں۔ چنانچہ نئے راجہ کی تاجپوشی کے دو دن بعد جنرل ہیرس[1] لارڈ ولزلی کو یہ خط لکھ رہا تھا کہ ہمارے خلاف ملک جہان خاں کی

---

[1] میر نظام علی کی عمر بھر کی ملت فروشی کا یہ صلہ اس کے ساتھ ایک مذاق تھا۔ نظام کو گوٹی اور چیتل ڈرگ کا کچھ حصہ دیا گیا۔ انگریزوں نے سب سڈیری سسٹم قبول کرنے کی شرط پر مرہٹوں کو تنگ بھدرہ کے شمال میں چند علاقے پیش کیے لیکن مرہٹوں کے پیشوا نے ان کی یہ پیش کش ٹھکرا دی اور یہ علاقے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی اور حیدر آباد کی حکومتوں نے آپس میں تقسیم کر لیے لیکن میر نظام علی کے لیے ذلت کے یہ ٹکڑے حاصل کرنے کی خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی۔ ۱۸۰۰ء کے آغاز میں لارڈ ولزلی کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے یہ تمام علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کو واپس کر دیے۔

کارروائیاں اب باقاعدہ ایک جنگ کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ آج یہ اطلاع آئی ہے کہ اس نے چتل درگ کے مغرب میں ہماری ایک چوکی پر حملہ کر کے ہمارے پچاس آدمی موت کے گھاٹ اُتار دیے ہیں۔ پچھلے ہفتے انھوں نے حیدر آباد کی سرحد پر میر نظام علی کے چند دستوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ہماری اطلاعات کے مُطابق ملک جہان خاں کے ساتھ پانچ ہزار باغی جمع ہو چکے ہیں اور ان کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

تیسواں باب

ایک دوپہر بلقیس اپنے مکان کے صحن میں ایک درخت کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ ثمینہ ایک کمرے سے نکلی اور بلقیس کی کھاٹ کے پاس ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ فضا میں حبس تھا۔ بلقیس نے پنکھے سے اپنے چہرے کو ہَوا دیتے ہُوئے کہا: "آج ہوا بالکل بند ہے، بارش ضرور آئے گی۔"

ثمینہ کچھ کہے بغیر ماں کے ہاتھ سے پنکھا پکڑ کر اسے جھلنے لگی۔

ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہُوا صحن میں داخل ہُوا اور اس نے بلقیس کی طرف ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا: "بی بی جی! ہاشم بیگ صاحب کا آدمی آگیا ہے اور اس نے یہ خط دیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ میں مُراد علی کا نوکر ہُوں۔"

بلقیس نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ پکڑ لیا اور نوکر واپس چلا گیا۔

ثمینہ کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ انتہائی بے چینی کی حالت میں اپنی ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بلقیس نے خط کھولے بغیر ثمینہ کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔ "بیٹی مجھے پڑھ کر سُناؤ۔"

ثمینہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا اور پڑھ کر سنانے لگی۔ ہاشم بیگ نے

لکھا تھا:۔

"خالہ جان! السلام علیکم۔ مجھے افسوس ہے کہ میں مُراد علی کو آپ کا پیغام نہیں پہنچا سکا۔ وہ آپ کا خط موصول ہونے سے چار دن قبل رات کے وقت اپنے گھر پہنچا تھا اور تھوڑی دیر بعد شہر میں اپنے کسی دوست کا حال معلوم کرنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ابھی تک واپس گھر نہیں آیا۔

علی الصباح اس کے نوکر نے مجھے یہ اطلاع دی تو میں نے سرنگاپٹم کا کونا کونا چھان مارا۔ اس کے نوکر کہتے ہیں کہ اپنے بھائی اور اس کی بیوی کی موت کے واقعات سُننے کے بعد اس نے ان کی قبریں دیکھیں پھر کسی سے بات کیے بغیر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ایک نوکر نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور اس نے جواب دیا کہ میں ایک دوست کا حال معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ رات کے وقت سرنگاپٹم میں نہیں ٹھہرا۔ ممکن ہے کہ میرے خط سے قبل وہ آپ کے پاس پہنچ چکا ہو۔

مجھے سرنگاپٹم سے ادھونی پہنچنے کا حکم مل چکا ہے اور میں اسی ہفتے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ میری فوج کو مستقل طور پر وہیں روک لیا جائے۔ مُراد علی کے نوکروں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ایک نوکر میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے اور دوسرا آپ کے پاس بھیج رہا ہوں اور باقی سرنگاپٹم چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔

اگر مُراد علی آپ کے پاس پہنچ چکا ہو تو اسے میرا سلام پہنچا دیں۔ اس زخموں کا مداوا اب کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اگر وہ آپ کے پاس نہیں پہنچا تو میں اس کی تلاش جاری رکھوں گا۔ مجھے صرف ایک بات کا خطرہ ہے کہیں وہ باغیوں کے ساتھ نہ مل گیا ہو۔ اس صورت

میں اس کی مدد کرنا میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔ ثمینہ کو سلام۔"

خط کے اختتام پر ثمینہ کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: "وہ ضرور آئیں گے امی جان انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ انگریزوں نے انھیں گھر سے نکلتے ہی گرفتار کر لیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گرفتاری کا خطرہ محسوس کر کے کہیں چھپ گئے ہوں اور ان کے نوکروں نے بھائی جان کو ناقابلِ اعتماد سمجھ کر ان کا پتہ نہ دیا ہو۔ آپ ان کے نوکر کو اندر بلا کر پوچھیں۔"

بلقیس نے کہا: "اچھا بیٹی خادمہ سے کہو اسے بُلا لائے۔"

ثمینہ اُٹھ کر خادمہ کو آوازیں دیتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھی۔

خادمہ نے باورچی خانے کے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا: "کیا بات ہے بی بی جی؟"

ثمینہ نے کہا: "تم باہر جاؤ اور نوکروں سے کہو سرنگاپٹم سے مُراد علی کا جو نوکر آیا ہے اسے اندر بھیج دو۔"

خادمہ چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد منوّر خاں صحن میں داخل ہوا۔ بلقیس اور ثمینہ کو سلام کرنے کے بعد وہ مؤدب کھڑا ہو گیا۔ ثمینہ نے اُٹھ کر اپنا مونڈھا ذرا آگے کر دیا اور خود ماں کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" بلقیس نے مونڈھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور منوّر خاں ہچکچاتا ہوا مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ بلقیس اور اس کے بعد ثمینہ کے متعدد سوالات کے جواب میں اس نے سرنگاپٹم کے تمام واقعات بیان کر دیے۔ اپنی سرگزشت کا آخری حصہ سناتے وقت اس کی قوتِ گویائی جواب دے چکی تھی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب بلقیس نے مراد علی کے متعلق پوچھا تو اس نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ

کہہ رہا تھا: "بی بی جی میرا خیال تھا کہ وہ آپ کے پاس پہنچ چکے ہوں گے لیکن آپ کے ذکر کہتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں آئے۔ جب وہ گھر سے نکل رہے تھے تو میں نے ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی تھی۔ میں نے پوچھا آپ کہاں جا رہے ہیں؛ تو کہتے تھے مجھے معلوم نہیں۔ میں نے ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تو انھوں نے کہا کہ اب تم لوگ میرا ساتھ نہیں دے سکتے؛ میں اور کریم خاں ڈیوڑھی تک ان کے ساتھ آئے۔ آخری بات جو انھوں نے ہماری تسلّی کے لیے کہی تھی وہ یہ تھی کہ میں کسی دوست کا حال معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئے۔ ہم سرنگا پٹم کا کونا کونا چھان چکے ہیں لیکن شہر میں ان کے کسی دوست کو ان کا حال معلوم نہیں۔ مرزا ہاشم بیگ صاحب نے بھی انھیں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی اور انھیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ سیدھے آپ کے پاس پہنچ چکے ہوں گے۔ بی بی جی اگر آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہو تو خدا کے لیے مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کیجیے۔"

منوّر خاں کی آنکھیں دوبارہ آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ بلقیس نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا: "بیٹا تمھیں حوصلہ سے کام لینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ مُراد علی یہاں ضرور آئے گا۔ میں ہاشم کو پیغام بھیجوں گی کہ اس کی تلاش جاری رکھے اور میں یہ چاہتی ہوں کہ جب تک مُراد علی کا پتہ نہیں چلتا تم ہمارے پاس رہو۔"

○

پانچ مہینے اور گزر گئے لیکن مراد علی کا کوئی سُراغ نہ ملا۔

اس عرصہ میں انگریزوں کے خلاف ملک جہان خاں کی سرگرمیاں ایک باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ کبھی اس کے متعلق یہ اطلاع آتی کہ اس نے میسور کے فلاں علاقے پر اچانک حملہ کر کے انگریزوں کی چند چوکیوں کا صفایا کر دیا ہے

اور کبھی یہ سُنا جاتا ہے کہ انگریزی فوج نے باغیوں کو شکست دے کر مرہٹہ علاقوں کی طرف ہٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد یہ اطلاع آتی کہ ملک جہاں خاں کا لشکر مرہٹوں کے علاقے سے نکل کر مملکتِ نظام کی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔

ملک جہان خاں کے ساتھیوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا۔ میسور کے حریت پسند اسے اپنی آخری اُمید سمجھ کر جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے اور بعض وہ مرہٹہ سردار بھی جنھیں سرنگا پٹم کی تسخیر کے بعد اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ سلطنتِ خداداد کے خاتمے کے بعد انگریزوں کی تلوار ان کی اپنی شہ رگ تک پہنچ چکی ہے، درپردہ ملک جہان خاں کی اعانت کر رہے تھے۔ میسور کی شمالی اور مغربی سرحدوں پر بعض دُشوار گزار پہاڑ اور جنگل ان باغیوں کے لیے ناقابلِ تسخیر قلعوں کا کام دے رہے تھے۔ جب ایک مقام پر انگریزوں کا گھیرا تنگ ہونے لگتا تو یہ لوگ ایک حیرت انگیز رفتار کے ساتھ کوسوں دُور کسی اور جگہ جا نکلتے۔ مقامی باشندوں کے عدم تعاون کے باعث انگریزوں کے لیے باغیوں کی نقل و حرکت معلوم کرنا مشکل تھا۔ رسد اور اسلحہ حاصل کرنے کے لیے باغیوں کو ہر جگہ مقامی لوگوں کا تعاون حاصل تھا۔

حیدر آبادی اور انگریزی سپاہیوں کی طرح ملک جہان خاں اُن مرہٹہ سرداروں کو بھی ناقابلِ معافی سمجھتا تھا، جنھوں نے میسور کے خلاف سابقہ جنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا چنانچہ پرسس رام بھاؤ کے بعض چیدہ چیدہ ساتھی قتل ہو چکے تھے اور بعض سرحدی علاقوں کو اپنے لیے غیر محفوظ سمجھ کر راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔ میسور کے جن غدّاروں نے ملّت فروشی کے عوض انگریزوں سے بڑی بڑی جاگیریں حاصل کی تھیں ان پر ملک جہاں خاں کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے گھروں سے باہر جھانکنے میں بھی خطرہ محسوس کرتے تھے۔

○

ثمینہ کی زندگی کی تمام دلچسپیاں اب مُراد علی کے انتظار تک محدود ہو چکی تھیں۔

ایک شام وہ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ مغرب کے اُفق پر پہلی رات کا چاند نمودار ہو چکا تھا۔ ثمینہ نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس کی نگاہوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہونے لگے۔

خادمہ سیڑھی سے نمودار ہُوئی اور وہ ثمینہ کو دُعا میں مصروف دیکھ کر چند قدم دُور رُک گئی۔ ثمینہ نے دُعا ختم کی اور اس نے کہا "بی بی جی آپ کے بہنوئی تشریف لائے ہیں۔"

ثمینہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وہ اکیلے آئے ہیں؟"

"جی نہیں ان کے ساتھ نوکر بھی ہے۔"

ثمینہ نے گھُٹی ہُوئی آواز میں پُوچھا "وہ مراد علی کے متعلق کوئی خبر لائے ہیں؟"

"جی نہیں۔"

ثمینہ کے دل کی دھڑکنیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی زینے کی طرف بڑھی اور نیچے اُترنے لگی۔ مکان کے ایک کمرے سے اس کی ماں اور ہاشم بیگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھی لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ہاشم بیگ کہہ رہا تھا "خالہ جان! اب اس کا خیال چھوڑ دیجیے۔ اب وہ واپس نہیں آسکتا۔ اس ملک کی زمین اس کے لیے تنگ ہو چکی ہے وہ مُراد جسے تم اپنا بیٹا سمجھتی تھیں مر چکا ہے۔"

بلقیس کی آواز آئی "نہیں بیٹا خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔"

"خالہ جان! میں اس کے متعلق کم پریشان نہیں ہوں۔ لیکن وہ ایک ایسے گروہ میں شامل ہو چکا ہے جس کی جدّوجہد کا انجام مجھے تباہی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ مجھے افسوس ہے کہ سرنگاپٹم میں اس کے ساتھ میری مُلاقات نہیں ہو سکی۔ ورنہ میں اسے ملک جہان خاں

کا ساتھی بننے سے روک لیتا۔"

"لیکن بیٹا تمھیں یہ کیسے پتہ چلا کہ وہ ملک جہان خاں کے ساتھ شامل ہو چکا ہے؟"

"خالہ جان پچھلے دنوں انگریزوں نے اعلان کیا تھا کہ جو باغی ملک جہان خاں کا ساتھ چھوڑ کر واپس آ جائیں گے انھیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی اور بعض آدمی جو اس کا ساتھ چھوڑ کر سرنگاپٹم واپس آ گئے ہیں۔ میں ان سے مل چکا ہُوں۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ باغیوں کا لشکر ملک جہان خاں کے بعد مراد علی کو اپنا سب سے زیادہ ذہین اور قابلِ اعتماد افسر خیال کرتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مراد علی کسی قیمت پر ملک جہان خاں کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو گا۔ اسے اب زندگی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رہی۔"

ثمینہ کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی وہ اچانک کمرے میں داخل ہُوئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہاشم بیگ کی طرف دیکھنے لگی۔

ہاشم بیگ نے قدرے توقف کے بعد کہا "بیٹھ جاؤ ثمینہ! مجھے افسوس ہے کہ میں مراد علی کے متعلق کوئی تسلی بخش خبر نہیں لایا۔"

ثمینہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور لرزتی ہُوئی آواز میں کہا "امّی جان وہ ضرور آئیں گے۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ جھُوٹا وعدہ نہیں کر سکتے۔ کاش میں ان کے پاس جا سکتی!"

ان الفاظ کے ساتھ ثمینہ کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور وہ سسکیاں لیتی ہُوئی برابر کے کمرے میں چلی گئی۔

ہاشم بیگ پریشانی اور اضطراب کی حالت میں کچھ دیر بلقیس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا "خالہ جان مجھے معلوم نہ تھا کہ ثمینہ ——— میں نے اس سے پہلے کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔"

بلقیس نے گھُٹی ہوئی آواز میں جواب دیا "بیٹا ثمینہ بدل چکی ہے۔"

ہاشم نے کرسی سے اُٹھ کر برابر کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "خالہ جان میں پتھر کے موم ہو جانے کا یقین کر سکتا ہوں ثمینہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ برابر کے کمرے میں داخل ہوا۔ ثمینہ منہ کے بل بستر پر پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے جھک کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ثمینہ! میری ننھی بہن! حوصلے سے کام لو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود اُن کے پاس جاؤں گا میں اس سے یہ کہوں گا کہ ہماری ننھی ثمینہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

ثمینہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور ملتجی نگاہوں سے ہاشم کی طرف دیکھنے لگی۔

ہاشم نے کہا "ثمینہ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس بیوقوف نے تمہیں اس قدر پریشان کیا ہے۔"

ثمینہ نے گردن جھکا لی۔ ہاشم بیگ نے اپنی قبا کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مخمل کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی اور دوسرا ہاتھ ثمینہ کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا "ثمینہ یہ لو۔ یہ مُراد علی کی امانت ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُس کے آنے تک تم اس کی حفاظت کر سکو گی۔"

ثمینہ مذبذب سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

ہاشم بیگ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی ہتھیلی میں جواہرات کی تھیلی رکھ کر کچھ کہے بغیر بلقیس کے کمرے میں چلا گیا۔

"خالہ جان میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟"

"میں مُراد علی کی تلاش میں جا رہا ہوں خالہ جان!"

○

بیس دن بعد ایک دوپہر ہاشم بیگ ایک دشوار گزار پہاڑی علاقے میں سفر کر رہا تھا۔ ایک پہاڑ کے دامن میں گھنا جنگل عبور کرنے کے بعد اس نے ایک ندی کے کنارے رُک کر اپنے گھوڑے کو پانی پلایا۔ پھر نیچے اُتر کر اپنی پیاس بجھائی۔ اس کے بعد اپنی جیب سے ایک نقشہ کھولا اور ندی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد اس نے نقشہ لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا اور اُٹھ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ندی عبور کرنے کے بعد اس نے دوسرے کنارے ایک درخت کے قریب رُک کر اپنی تلوار نکالی اور ایک جھکے ہوئے درخت کی چند شاخیں کاٹنے کے بعد ندی کے ساتھ ساتھ بائیں طرف چل دیا۔ کوئی آدھ میل چلنے کے بعد اس ندی میں ایک اور ندی آ ملی اور ہاشم بیگ دائیں ہاتھ مُڑ کر دوسری ندی کے کنارے ہو لیا۔ اچانک اسے گھنے درختوں میں کوئی آہٹ محسوس ہوئی اور اس نے گھوڑا روک لیا۔

درختوں سے ایک آدمی اس کی طرف بندوق سیدھی کیے نمودار ہوا اور اس نے کسی توقف کے بغیر آگے بڑھتے ہوئے کہا "تم کون ہو؟"

ہاشم بیگ نے اطمینان سے جواب دیا "اگر تم ملک جہان خاں کے آدمی ہو تو مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ملک جہان خاں یہاں رہتے ہیں؟" اجنبی نے یہ کہہ کر آگے بڑھتے ہوئے بندوق کی نال ہاشم بیگ کے منہ کے آگے کر دی۔

ہاشم بیگ نے قدرے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے اپنے آگے پیچھے اور دائیں طرف چند اور مسلح آدمی دکھائی دیے۔ اجنبی نے کہا "تم گھوڑے سے اُترو اور اپنی تلوار اور بندوق ہمارے حوالے کر دو!"

ہاشم بیگ نے کسی پس و پیش کے بغیر اس حکم کی تعمیل کی اور کہا "تم لوگوں کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ میں یہاں تک پہنچنے کے بعد بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے ملک جہان خاں کے پاس لے چلو۔"

اتنی دیر میں دس آدمی ہاشم بیگ کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے کہا: "تم دوسری ندی کے پار کوئی نقشہ دیکھ رہے تھے؟"

"ہاں!"

"لاؤ وہ نقشہ بھی ہمارے حوالے کر دو!"

ہاشم بیگ نے اپنی جیب سے نقشہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نوجوان نے نقشہ کھول کر اپنے ساتھیوں کو دکھایا اور پھر ہاشم بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "تمھیں معلوم ہے کہ ملک جہان خاں انگریزوں کے جاسوسوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟"

"مجھے معلوم ہے۔" ہاشم بیگ نے جواب دیا: "میں یہاں سے دو تین میل دور ایک درخت پر لٹکی ہوئی پانچ لاشیں دیکھ چکا ہوں۔ لیکن میں جاسوس نہیں ہوں۔"

"یہ نقشہ تمھیں کس نے دیا؟"

ہاشم بیگ نے کہا: "دیکھو میں ملک جہان خاں سے ملنا چاہتا ہوں اور میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے ساتھ میری ملاقات کے بعد تمھیں ایسے سوالات پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

نوجوان نے دو عمر رسیدہ آدمیوں کو ایک طرف لے جا کر ان کے ساتھ کچھ دیر باتیں کیں اور پھر ہاشم بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "ہم تمھاری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ملک جہان خاں کے پاس لے چلیں گے۔"

ہاشم بیگ نے جواب دیا: "اگر یہ ضروری ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد ہاشم بیگ آنکھوں پر پٹی بندھوا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ایک آدمی نے باگ پکڑ لی۔

راستے میں ان لوگوں نے ہاشم بیگ سے کوئی بات نہ کی۔ وہ گھوڑے کی زین پر سے صرف یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ایک جنگل کے ناہموار اور دشوار گزار راستے سے گزر رہا ہے۔

کوئی تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد یہ لوگ رک گئے اور کسی نے ہاشم بیگ کو گھوڑے سے اترنے کے لیے کہا۔ ہاشم بیگ نے حکم کی تعمیل کی اور کسی نے اس کی آنکھوں سے پٹی کھولتے ہوئے کہا: "تم یہاں بیٹھ جاؤ، ہم ابھی ملک جہان خاں کو اطلاع دیتے ہیں۔"

ہاشم بیگ کو تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دو آدمی سامنے ایک بلند پہاڑی کی طرف چل دیئے اور باقی اس کے گرد بیٹھ گئے۔ ہاشم نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو اسے ایک تنگ وادی کا نشیب اور باقی تین اطراف بلند پہاڑیاں دکھائی دیں۔ چند منٹ وہ بے حس و حرکت بیٹھا ان لوگوں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے جرأت سے کام لیتے ہوئے سوال کیا: "مجھے کب تک یہاں ٹھہرنا پڑے گا؟"

ایک آدمی نے جواب دیا: "ہم نے ملک جہان خاں کو پیغام بھیج دیا ہے انھیں یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

قریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد ہاشم بیگ کو قریب ہی گھنے درختوں میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔

"وہ آ رہے ہیں!" ایک آدمی نے اٹھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھی کھڑے ہو گئے ہاشم بیگ نے بھی ان کی تقلید کی۔

تین سوار ان کے قریب پہنچ کر گھوڑوں سے اتر پڑے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں وہ نقشہ تھا جو انھوں نے ہاشم بیگ سے چھینا تھا۔ وہ فوراً ہاشم بیگ کی طرف بڑھا اور اسے نقشہ دکھاتے ہوئے بولا: "تم اس نقشے کی مدد سے یہاں تک پہنچے ہو؟"

"ہاں!" ہاشم بیگ نے جواب دیا۔

"تم نے یہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟"

ہاشم بیگ نے جواب دیا: "میں ایسے سوالات کا جواب صرف ملک جہان خاں کو دے سکتا ہوں۔"

"میں ملک جہان خاں ہوں اور تمھیں میرے ساتھ کوئی بات کرنے سے پہلے یہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ مجھے جھوٹ اور سچ پرکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ اب بتاؤ کہ یہ نقشہ تم کو کہاں سے ملا؟"

"یہ نقشہ میں نے آپ کے ایک مفرور قیدی سے حاصل کیا تھا۔ اس کے ساتھ میری ملاقات میر قمرالدین کے ہاں ہوئی تھی۔ میرے لیے آپ تک رسائی حاصل کرنا ضروری تھا۔"

"تم مجھے اس شخص کا نام بتا سکتے ہو؟"

"اس کا نام سراج الدین تھا۔"

"تم جھوٹ کہتے ہو میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔"

ملک جہان خاں کے ساتھی اب ہاشم بیگ کی طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے سنبھل کر کہا: "ہو سکتا ہے کہ اس نے مجھے غلط نام بتایا ہو۔"

ملک جہان خاں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ایک آدمی جلدی سے درخت پر چڑھ گیا اور اس نے ایک مضبوط شاخ کے ساتھ ایک رسّا باندھ کر نیچے لٹکا دیا۔ دو آدمی ہاشم بیگ کو پکڑ کر درخت کے نیچے لے گئے اور انھوں نے رسّے کے سرے کا پھندا بنا کر ہاشم بیگ کے گلے میں ڈال دیا۔

ملک جہان خان نے کہا: "اب بتاؤ تم یہاں کس لیے آئے ہو اور تمھارے ساتھ جو فوج آ رہی ہے وہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

ہاشم بیگ نے اطمینان سے جواب دیا: "میں اپنے ایک عزیز کی تلاش میں آیا ہوں اور میرے ساتھ کوئی فوج نہیں آئی ہے۔ اس کے باوجود اگر مجھے پھانسی دے کر آپ کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو خوشی سے یہ شوق پورا کر لیجیے۔"

"یہاں تمھارا عزیز کون ہے؟"

"مُراد علی۔"

ملک جہان خاں چند ثانیے پریشانی اور تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے ہاشم بیگ کے گلے سے پھندا اُتارتے ہوئے کہا: "مُراد علی کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"آپ یہ سمجھ لیجیے کہ وہ میرا بھائی ہے۔"

"سرنگا پٹم میں جو لوگ مُراد علی کو اپنا بھائی کہہ سکتے ہیں میں ان کو جانتا ہوں اور تمھاری شکل و صورت ان سب سے مختلف ہے۔"

"میرا گھر سرنگا پٹم نہیں حیدر آباد ہے۔"

ملک جہان خان نے جھنجھلا کر کہا: "تم ابھی کہتے تھے میں سرنگا پٹم سے آ رہا ہوں۔ میرے لیے معمّا بننے کی کوشش نہ کرو۔ تمھارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام ہاشم بیگ ہے اور میں کئی دن شمال کی سرحد کی خاک چھاننے کے بعد آپ کی جائے پناہ کا پتہ معلوم کرنے کے لیے سرنگا پٹم گیا تھا لیکن اگر آپ مجھے مُراد علی کے سامنے لے جائیں تو یہ معمّا اسی وقت حل ہو سکتا ہے۔"

ملک جہاں خاں نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا: "تم اسے پڑاؤ میں لے آؤ!" پھر گھوڑے پر سوار ہوتے ہی اسے ایڑ لگا کر گھنے درختوں میں رُوپوش ہو گیا۔

○

ہاشم بیگ گھوڑے پر سوار ہو کر باقی آدمیوں کے ساتھ چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بلند پہاڑی کی دوسری طرف ایک اور تنگ وادی میں جگہ جگہ بوسیدہ خیمے اور گھاس پھونس کے چھپّر دیکھ رہا تھا۔ وادی میں داخل ہونے کے بعد ایک کُشادہ خیمے کے سامنے اسے ملک جہان خاں اور مُراد علی دکھائی دیے۔ وہ گھوڑے سے چھلانگ لگا بھاگتا ہُوا آگے بڑھا لیکن

مراد علی نے منہ پھیر لیا اور ہاشم بیگ کے پاؤں زمین کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے۔ پھر اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: "مراد! میں ہاشم ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن آپ کو میری تلاش میں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا!"

ہاشم کا دل بیٹھ گیا تاہم اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اُس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "مراد میں بے گناہ ہوں۔"

مراد علی نے جواب دیا: "آپ کو صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ نے میرے بھائی کی جان بچانے کی کوشش کی تھی اور میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"

ہاشم بیگ نے ملتجی ہو کر ملک جہان خاں کی طرف دیکھا اور کہا: "اگر آپ اجازت دیں تو میں چند منٹ تنہائی میں ان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

مراد علی نے کہا: "نہیں اب باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر آپ مجھے یہ بتانے آئے ہیں کہ آپ کی سفارش پر انگریزوں نے میری خطائیں معاف کر دی ہیں اور میں اپنے گھر واپس جا سکتا ہوں تو آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

مراد علی کے بازو پر ہاشم بیگ کے ہاتھ کی گرفت اچانک ڈھیلی پڑ گئی اور وہ انتہائی مایوسی اور اضطراب کی حالت میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

مراد علی نے ملک جہان خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "میں اس بات کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ یہ ہمارے متعلق کوئی بُرا ارادہ لے کر نہیں آئے۔ آپ انھیں واپس پہنچانے کا انتظام کر دیجیے۔"

ہاشم بیگ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز بیٹھ گئی۔ مراد علی خیمے کی طرف بڑھا۔ ہاشم چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچنے کے بعد پوری قوت سے چلایا: "مراد ٹھہرو! مجھے ثمینہ نے بھیجا ہے۔"

مراد علی کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ لیکن وہ مُڑ کر ہاشم بیگ کی طرف دیکھنے

کی بجائے گردن جھکائے کھڑا رہا۔

ہاشم بیگ بھاگ کر آگے بڑھا اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ "مراد میں نے شہباز اور ان کے والد کی موت پر ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے۔ لیکن اب کی وہ رو رہی تھی۔ میں تمھیں لینے آیا ہوں۔"

مراد علی نے مضطرب ہو کر جواب دیا: "میں نے ثمینہ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اگر میں زندہ رہا تو کسی دن ضرور واپس آؤں گا۔ لیکن اب آپ اسے یہ پیغام بھیج دیجیے کہ مراد مر چکا ہے اور آپ نے جس آدمی کے ساتھ اس جنگل میں ملاقات کی تھی وہ اس کی لاش تھی۔"

"مراد میں اطمینان سے بیٹھ کر تمھارے ساتھ چند باتیں کرنا چاہتا ہوں میں نے تمھیں بڑی مشکل سے تلاش کیا ہے۔"

"بہت اچھا آئیے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ میری باتوں سے آپ کو تکلیف ہو گی۔"

وہ خیمے میں داخل ہوئے اور چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ہاشم بیگ نے کہا: "مراد مجھے معلوم ہے کہ میری باتوں سے تمھیں تکلیف ہو گی۔ لیکن تم مجھے اگر یہ سمجھا سکو کہ تمھاری اس جنگ سے اہلِ میسور کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو میں تمھارا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

مراد علی نے جواب دیا: "دیکھیے ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم لوگ اس قوم کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر سکتے جس کا دامن سلطانِ شہید کے خون سے آلودہ ہے۔ ہم ان لوگوں کو عزت اور آزادی کا راستہ نہیں دکھا سکتے جن کی صفوں میں میر قمر الدین جیسے غدار گھسے ہوئے ہیں۔ ہم اُس ماضی کو واپس نہیں لا سکتے جس کا ہر لمحہ زندگی کی خواہشات سے لبریز تھا ——— یہ دُنیا ہمارے لیے تاریک ہو چکی ہے۔ ہماری عزت اور آزادی کے دشمن ہم سے زندگی کی تمام راحتیں چھین چکے ہیں۔ اب آخری جو چیز ہمارے لیے رہ گئی ہے وہ عزت کی موت ہے اور وہ ہمیں اس سے محروم نہیں کر سکتے۔ آپ مجھے زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا سکتے ہیں کہ ہماری جنگ بے سُود ہے۔ لیکن میرا

آخری جواب یہی ہوگا کہ میں آخری دم تک ملک جہان خاں کا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے ڈھونڈنے میں اتنی تکلیف اٹھائی ہے لیکن مجھے یہ مشورہ نہ دیں کہ میں ملک جہان خاں سے بدعہدی کر کے واپس چلا جاؤں۔ اپنے ساتھیوں سے بدعہدی اور بے وفائی کے بعد میں ان لوگوں کو منہ نہیں دکھا سکوں گا جو مجھے انور علی کا بھائی اور معظم علی کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟"

ہاشم بیگ نے جواب دیا "کچھ نہیں۔ میں اب کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اب وسیلوں سے زیادہ آپ کو دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"تو پھر یہ دعا کیجیے کہ زندہ رہنے کی خواہش مجھے قیامت کے دن سرنگاپٹم کے شہیدوں کے ساتھ اٹھنے کی سعادت سے محروم نہ کر دے۔"

ہاشم بیگ نے کہا "مراد بعض اوقات لڑنے کی بجائے اپنی تلوار نیام میں ڈالنے کے لیے زیادہ ہمت، زیادہ حوصلہ اور زیادہ صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں خدا سے دعا کروں گا کہ آپ کسی دن ان لوگوں کے متعلق بھی سوچ سکیں جنہیں مستقبل کے متعلق اپنے حوصلے اور ولولے بلند رکھنے کے لیے آپ جیسے اولوالعزم انسانوں کی رفاقت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔

میں جانے سے پہلے آپ کی یہ غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو انگریزوں کی اطاعت قبول کر لینے کا مشورہ دینے آیا تھا۔ نہیں میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا۔ میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا تھا کہ سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد میسور کے حریت پسندوں کا آخری قلعہ مسمار ہو چکا ہے لیکن اگر آپ مستقبل کی امید پر زندہ رہنے کی کوشش کریں تو خدا کی رحمت سے یہ بعید نہیں کہ آپ میسور سے باہر کوئی اور قلعہ تلاش کر سکیں۔ میں ملک جہان خاں کے جذبۂ حریت کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن وہ ایک ایسی قوم کی ڈھال اور تلوار نہیں بن سکتا جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ ڈالا ہو۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں آپ کو کوئی نصیحت کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ میں ان بدقسمت انسانوں میں سے ہوں جو اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف حالات کی مجبوریوں کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔"

ہاشم بیگ یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

مراد علی نے کہا "آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں اب یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے۔"

"آپ تھکے ہوں گے لیکن میں آپ کو یہاں ٹھہرنے کی دعوت نہیں دے سکتا۔ ان دنوں ہمیں ہر وقت دشمن کے حملے کا خطرہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ لڑائی کے وقت یہاں ہوں۔"

مراد علی یہ کہہ کر اٹھا اور ہاشم بیگ کے ساتھ خیمے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہاشم بیگ کو جنگل سے باہر پہنچانے کے لیے بیس آدمیوں کا قافلہ تیار ہو چکا تھا۔ اس نے ملک جہان خاں کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد مراد علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میں نے آپ کو ایک بات نہیں بتائی۔ ثمینہ یہ کہتی تھی کہ وہ مرتے دم تک آپ کا انتظار کرے گی۔ ہاں مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ تمہارے بھائی نے مرتے وقت جواہرات کی ایک تھیلی میرے حوالے کی تھی۔ میں تمہاری یہ امانت ثمینہ کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ اگر تم وہاں جانا پسند نہیں کرتے تو اپنی امانت کسی آدمی کو بھیج کر منگوا لینا۔"

مراد علی نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "آپ وہاں جائیں گے؟"

"ہاں میں پہلے وہاں جاؤں گا۔"

"ثمینہ سے کہیے ——" مراد علی اپنا فقرہ پورا کرنے کی بجائے ہاشم بیگ کی طرف دیکھتا رہا۔

"کیا کہوں ——؟ بولو مراد۔ خاموش کیوں ہو گئے؟"

"کچھ نہیں۔ خدا حافظ!" مراد علی یہ کہہ کر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا خیمے کی طرف چل دیا۔

خیمے میں داخل ہونے کے بعد وہ نڈھال سا ہو کر چٹائی پر لیٹ گیا۔ باہر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ ملک جہان خاں خیمے میں داخل ہوا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جہان خاں نے کہا: "مُراد اگر تم جانا چاہتے ہو تو میں تم پر کوئی پابندی عائد نہیں کرونگا۔"

مُراد علی نے کچھ کہے بغیر سر پھیر دیا۔

چند دن بعد ہاشم بیگ، بلقیس اور ثمینہ کے سامنے اپنے سفر کے واقعات بیان کر رہا تھا اور ثمینہ ماں اور بھوٹی کو قائل کرنے سے زیادہ اپنے دل کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے بار بار یہ کہہ رہی تھی: "وہ ضرور آئیں گے۔ بھائی جان وہ ضرور آئیں گے۔ امی جان مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئیں گے۔"

اکتیسواں باب

بلقیس کے ہاں قریباً ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد ہاشم بیگ ادھونی واپس چلا گیا۔ اس کے بعد ثمینہ کچھ عرصہ ملک جہان خاں کی سرگرمیوں کے متعلق مختلف اور متضاد خبریں سنتی رہی۔ کبھی یہ خبر آتی کہ وہ جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے کے بعد فلاں علاقہ فتح کر چکا ہے اور کبھی یہ خبر آتی کہ وہ فلاں مقام پر انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد پسپا ہو چکا ہے۔

۱۸۰۰ء کے موسم برسات میں انگریزوں کے لیے ملک جہان خاں کی سرگرمیاں کافی پریشان کن ثابت ہو رہی تھیں۔ لیکن میسور کی ہمسایہ ریاستوں کے حکمرانوں کی غیر جانبداری کے باعث جہان خاں کی یہ اِکا دُکا لڑائیاں ایک وسیع پیمانے پر جنگ آزادی کا پیش خیمہ نہ بن سکیں۔ گزشتہ جنگوں میں اس کے کئی ساتھی مارے جا چکے تھے اور کئی مایوس اور بد دل ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ انگریزوں نے ان سرفروشوں کی جماعت کے ساتھ اپنے جاسوسوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شامل کر دی تھی۔ یہ لوگ ایک طرف جہان خاں کے ساتھیوں میں مایوسی اور بد دلی پھیلاتے اور دوسری طرف انگریزوں کو ملک جہان خاں کی سرگرمیوں سے باخبر رکھتے۔

موسم برسات کے اختتام پر میسور کی شمالی سرحد سے اس قسم کی خبریں آ رہی تھیں کہ کرنل آرتھر ولزلی جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک جہان خاں کی سرکوبی کی مہم سونپی تھی،

ایک بھاری لشکر کے ساتھ شمالی سرحد کے جنگلوں اور پہاڑوں میں باغیوں کا پیچھا کر رہا ہے۔
پھر ایک دن یہ خبر مشہور ہوئی کہ ملک جہان خاں ایک خونریز معرکے میں شکست کھانے کے بعد شہید ہو چکا ہے اور کرنل ولزلی کے دستے ان کے رہے سہے ساتھیوں کی سرکوبی میں مصروف ہیں۔

بلقیس نے صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے گاؤں کا ایک آدمی ہاشم بیگ کے پاس بھیجا۔ ہاشم بیگ نے اس خط کے جواب میں ملک جہان خاں کی موت کی خبر کی تصدیق کر دی۔ لیکن مراد علی کے بارے میں اس کا جواب یہ تھا کہ مجھے انتہائی کوشش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

ملک جہان خاں کی موت کی خبر سننے کے بعد مراد علی کے متعلق ثمینہ کی بے قراری اور بے چینی میں آئے دن اضافہ ہوتا گیا۔ انتظار کے لمحات اسے برسوں سے زیادہ طویل محسوس ہوتے تھے۔ ماہ اکتوبر کی ایک شام وہ حسب معمول تنہا اپنے مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ ہوا خوشگوار تھی۔ گاؤں کے چرواہے اور کسان دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس آ رہے تھے۔ دُور دُور کی بستیوں کے گھروں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ گاؤں کی فضا ارد گرد درختوں پر جمع ہونے والے پرندوں کے چہچہوں سے لبریز تھی۔

تھوڑی دیر بعد گاؤں پر رات کا سکوت طاری ہو گیا اور آسمان پر اکا دکا ستارے نظر آنے لگے۔ پھر مشرق کی ایک پہاڑی کے عقب سے چاند نمودار ہونے لگا۔ ڈیوڑھی سے باہر آنکھ مچولی کھیلنے والے بچوں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ثمینہ تھوڑی دیر چھت پر ٹہلنے کے بعد منڈیر پر بیٹھ گئی۔ چاند اب پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا۔ نیچے مردانہ حویلی کے صحن میں نوکر باتیں کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد گاؤں کی مسجد سے عشا کی اذان سنائی دینے لگی۔ ثمینہ نیچے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اسے ڈیوڑھی کی طرف گھوڑے کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ آنکھیں پھاڑ

پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک گھوڑا جس کا سوار زین پر جھکا ہوا تھا، آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا ڈیوڑھی کے راستے بیرونی صحن میں داخل ہوا۔
"کون ہے؟" ایک نوکر نے کہا۔

سوار نے کوئی جواب دیے بغیر گھوڑے سے اترنے کی کوشش کی لیکن زمین پر پاؤں رکھتے ہی وہ مُنہ کے بل گر پڑا۔ نوکر بھاگتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔

"یہ کون ہے؛ اسے کیا ہوا؟"

"یہ زخمی ہے —— یہ بے ہوش ہے —— یہ بیمار ہے۔" وہ ایک دوسرے کو بتانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ثمینہ اُٹھ کر زینے کی طرف بڑھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ نیچے اتر کر باہر کی حویلی کی طرف بڑھی۔ پیچھے سے ماں کی آواز آئی۔ "ثمینہ کہاں جا رہی ہو؟"

ثمینہ نے مڑ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔ "امی جان میں یہیں ہوں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"
اتنی دیر میں نوکر نووارد کو ایک گھاٹ پر لٹا چکے تھے۔ منور خاں ثمینہ کو دیکھ کر چلّایا۔
"بی بی جی! یہ آ گئے۔ میرا خواب درست نکلا۔ لیکن یہ بے ہوش ہیں۔ یہ بخار سے جل رہے ہیں۔ اگر گاؤں میں کوئی اچھا طبیب ہو تو اسے بلوائیے!"

ثمینہ کی نگاہیں نووارد کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر وہ اچانک آگے بڑھی اور مراد علی کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے چلّائی۔ "انھیں اندر لے چلو اور طبیب کو فوراً بلاؤ۔ منور تم امی جان کو اطلاع دو۔"

○

کوئی ایک گھنٹے بعد مراد علی نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں تو وہ ایک کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ ایک عمر رسیدہ طبیب اس کے زخمی بازو پر پٹی باندھ رہا تھا اور گھر کے نوکر

گھر کے نوکر اور گاؤں کے چند آدمی اس کے گرد جمع تھے اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد منوّر خاں کی طرف نظریں گاڑ دیں اور اسے پانی لانے کے لیے کہا۔

منوّر بھاگتا ہُوا باہر نکلا اور پانی کا کٹورا لے آیا۔ مراد علی نے پانی پینے کے لیے سر اٹھایا لیکن نقاہت کے باعث اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس نے دوبارہ اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔ ایک آدمی نے جلدی سے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور پانی کے چند گھونٹ پلانے کے بعد دوبارہ لٹا دیا۔

طبیب نے مرہم پٹی سے فارغ ہونے کے بعد اسے ایک دوائی پلائی اور کمرے میں جمع ہونے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا " انھیں آرام کی ضرورت ہے اس لیے آپ تشریف لے جائیں۔"

وہ یکے بعد دیگرے کمرے سے نکل گئے۔ لیکن منوّر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ مراد علی نے نحیف آواز میں کہا " منوّر تم یہاں کیسے پہنچ گئے ؟"

منوّر کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آئے اور کچھ دیر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہُوئے کہا " مجھے اکرم بیگ صاحب نے یہاں بھیج دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ یہاں پہنچ چکے ہوں گے۔"

مراد علی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ منوّر کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا اور جب مراد علی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ مضطرب سا ہو کر چلّایا۔

" بھائی جان ! بھائی جان !"

طبیب جلدی سے اس کی نبض ٹٹولنے لگا۔

مراد علی نے آنکھیں کھولیں اور اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہُوئے کہا " میں ٹھیک ہُوں ___ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔"

" آپ تھوڑا سا دُودھ پی لیں " طبیب نے کہا۔

" نہیں ابھی نہیں " مراد علی نے آنکھیں بند کرتے ہُوئے جواب دیا۔

طبیب نے منوّر کی طرف متوجہ ہو کر کہا " میں جاتا ہوں تم بیگم صاحبہ کو اطلاع دے دو اب ان کی طبیعت ٹھیک ہے لیکن انھیں آرام کی اشد ضرورت ہے اگر رات کے وقت ضرورت پڑے تو مجھے اطلاع دیں۔"

مراد علی کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ روشندان سے سُورج کی ابتدائی کرنیں کمرے میں آرہی تھیں۔ ثمینہ اس کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی سو رہی تھی اور منوّر دروازے کے پاس ایک چٹائی پر لیٹا خرّاٹے لے رہا تھا۔ ثمینہ کی گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی اور بالوں کی ایک لٹ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔

یہ کمرہ وہی تھا جہاں ثمینہ کے ساتھ اس کی آخری ملاقات ہُوئی تھی۔ شہباز کی یادگاریں اسی طرح پڑی ہُوئی تھیں۔ کچھ دیر وہ بستر پر پڑا ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پیاس کی شدّت سے اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس کے بستر کی دائیں طرف ایک تپائی پر پانی کی صُراحی پڑی ہوئی تھی۔ مراد علی، ثمینہ یا منوّر کو آواز دینے کی بجائے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے صراحی سے پانی کا ایک کٹورا بھر کر پیا اور جب وہ دُوسری بار کٹورے میں پانی ڈال رہا تھا تو ثمینہ نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ مراد علی کی طرف ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے صراحی پکڑ لی اور کٹورے میں پانی بھر کر اسے پیش کر دیا۔ مراد علی کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ پانی پینے کے بعد لیٹ گیا اور ثمینہ اپنے بالوں کو درست کرتی ہوئی کرسی سے اٹھی اور اس نے کہا " امی جان رات کے وقت آپ کے لیے دُودھ لائی تھیں اور وہ یہاں پڑا پڑا خراب ہو گیا۔ آپ سو رہے تھے ہم نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ امی جان ابھی اٹھ کر گئی ہیں۔ آپ کو بھوک لگی ہو گی میں تازہ دُودھ لے آؤں ؟"

مراد علی نے نحیف آواز میں کہا " بیٹھ جاؤ ثمینہ۔"

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی اور کچھ دیر توقف کے بعد بولی " رات کے وقت آپ کو بہت بخار

تھا۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ راستے میں مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ میں شاید یہاں تک نہ پہنچ سکوں۔ رات کے وقت مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں ایک مدت کے بعد اس طرح سویا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اتنی تکلیف دی۔ آپ شاید ساری رات نہیں سوئیں۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔" یہ کہتے ہوئے ثمینہ نے ذرا گردن اٹھا کر مراد علی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

مراد علی نے کہا "ثمینہ میرے لیے دنیا میں اس گھر کے سوا کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

ثمینہ نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا "گاؤں کا طبیب زیادہ تجربہ کار نہیں۔ امی جان نے ادھونی میں بھائی جان ہاشم بیگ کو پیغام بھیج دیا ہے کہ وہ کوئی اچھا طبیب لے کر یہاں پہنچ جائیں۔"

مراد علی نے کہا "انہیں تکلیف دینے کی ضرورت نہ تھی۔"

"میں امی جان کو اطلاع دیتی ہوں۔" ثمینہ یہ کہہ کر اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

رہائشی مکان کا صحن عبور کرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ بلقیس جس نے اس کے ساتھ ساری رات آنکھوں میں کاٹی تھی، اپنے بستر پر پڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ ثمینہ بے اختیار آگے بڑھی اور اس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔

ماں نے انتہائی گھبراہٹ کی حالت میں کہا "کیا ہوا ثمینہ۔ بولتی کیوں نہیں، مراد کیسا ہے؟"

"امی جان! امی جان! وہ ٹھیک ہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ ابھی میرے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔"

تھوڑی دیر بعد بلقیس اور ثمینہ مراد علی کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ انہیں اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ ملک جہان خاں کی آخری جنگ اور اپنے زخمی ہونے کے واقعات بیان کرنے کے بعد اس نے بلقیس سے مخاطب ہو کر کہا "چچی جان شکست کے بعد میسور کی حدود میں میرے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ انگریزوں نے میرے سر کی قیمت مقرر کر رکھی ہے۔ میرے ساتھ پانچ آدمیوں نے سرحد کے ایک مرہٹہ سردار کے پاس پناہ لی تھی۔ ہم اسے اپنا دوست سمجھتے تھے وہ گزشتہ لڑائیوں میں درپردہ ہماری مدد کیا کرتا تھا لیکن ملک جہان خاں کی موت کے بعد دنیا بدل چکی تھی اور ہمیں پتہ چلا کہ یہ شخص ہمیں انگریزوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ایک رشتہ دار نے ہمیں خبردار کر دیا اور ہم وہاں سے نکل آئے۔ زخمی اور بیمار ہونے کے باعث میں زیادہ دور تک اپنے دوستوں کا ساتھ نہ دے سکا اور وہ میرے اصرار پر مجھے جنگل کی ایک بستی میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس بستی کے کسان اور چرواہے نہایت نیک دل ثابت ہوئے۔ لیکن میری حالت بہت خراب تھی اور مجھے وہاں مرنا پسند نہ تھا۔"

بلقیس نے آبدیدہ ہو کر کہا "بیٹا تم سیدھے یہاں کیوں نہ آئے؟"

"چچی جان مجھے ڈر تھا کہ آپ میری وجہ سے کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں اور اب بھی میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ میں سواری کے قابل ہوتے ہی آپ سے اجازت لوں گا۔"

ثمینہ کے چہرے پر غم کے بادل چھا گئے۔

بلقیس نے کہا "بیٹا یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اگر کوئی مشکل پیش آئی بھی تو مجھے یقین ہے کہ ہاشم تمہاری مدد کر سکے گا۔ حیدرآباد اور ادھونی کے کئی با اثر حکام اس کے دوست ہیں۔"

مراد علی نے کہا "چچی جان جو امراء دکن کی حکومت کو سلطان ٹیپو کے قتل میں حصہ دار بننے سے نہیں روک سکے وہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ نظام نے انگریزوں کی خوشنودی

حاصل کرنے کے لیے صرف اہلِ میسور کے قتلِ عام میں حصّہ ہی نہیں لیا بلکہ اپنی رعایا کو بھی بے دست دپا بنا کر ان کے آگے ڈال دیا ہے۔ اس سے یہ توقع رکھنا خود فریبی ہے کہ وہ میری خاطر اپنے فرنگی آقاؤں کو ناراض کرنا پسند کرے گا۔ اگر مجھے اس سے کسی نیک سلوک کی توقع ہوتی بھی تو میں اس کی پناہ لینا گوارا نہ کرتا۔ اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ اب ذلّت اور غلامی کی زندگی اختیار کیے بغیر میرے لیے اور کوئی چارہ نہیں تو بھی میں ایک ایسے آقا کی اطاعت قبول نہیں کروں گا جو خود انگریزوں کا غلام ہو۔"

"لیکن تم کہاں جاؤ گے؟" بلقیس نے مغموم لہجے میں سوال کیا۔

مُراد علی نے جواب دیا: "چچی جان میں ایک ایسا مُلک دیکھ آیا ہُوں جس کے کسان اور چرواہے ابھی تک آزادی کے گیت گا رہے ہیں۔ میں افغانستان جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ مجھے مایوس نہیں کریں گے جنھیں دلّی کے مسلمانوں کی فریاد پانی پت کے میدان میں لے آئی تھی۔ دریائے کابل کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی ہے اور اس بستی کا عمر رسیدہ سردار پانی پت کے مجاہدوں کے ساتھ تھا۔ وہ چچا اکبر خاں اور ابا جان کو جانتا تھا اور اس نے مجھے آپ کے قبیلے کے ان لوگوں کا پتہ دیا تھا جو روہیل کھنڈ سے ہجرت کرنے کے بعد وہاں آباد ہو گئے تھے۔"

ثمینہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی قوّتِ گویائی جواب دے چکی تھی۔ بلقیس نے انتہائی کرب کی حالت میں مُراد علی کی طرف دیکھا اور کہا: "بیٹا تم افغانستان کے تازہ حالات سے باخبر نہیں ہو۔ وہاں خانہ جنگی شروع ہو چکی ہے اور زمان شاہ کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہے کہ وہ باغیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگ چکا ہے؟"

مُراد علی نے کہا: "چچی جان میں اپنے مصائب کے بدترین ایّام میں بھی افغانستان کے حالات سے بے خبر نہیں تھا۔ میں زمان شاہ کے متعلق تمام افواہیں سُن چکا ہوں اور ممکن ہے یہ افواہیں صحیح ہُوں لیکن اگر قوم زندہ ہو تو وہ بدترین حالات کو بھی اپنے لیے سازگار بنا لیتی

ہے۔ مجھے یقین ہے کہ افغانستان کے باشندے زمان شاہ کے بعد بھی اپنی آزادی کے پرچم سرنگوں نہیں ہونے دیں گے۔ جب کوئی بیرونی خطرہ پیش آئے گا تو افغان سرداروں کو متحد اور منظم ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ ان تشویشناک خبروں نے افغانستان جانے کے متعلق میرا ارادہ زیادہ پختہ کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ میں ان لوگوں کی کوئی خدمت کر سکوں اور انھیں انگریزی استبداد کے اس سیلاب کی تندی و تیزی کا احساس دلا سکوں جو میسور کے عظیم قلعے مسمار کرنے کے بعد بڑی تیزی سے شمال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں احمد شاہ ابدالی کے بیٹوں کے پاس اسلام کی ان بیٹیوں کی فریاد لے کر جاؤں گا جنھوں نے اپنی آنکھوں سے سرنگاپٹم کا روزِ قیامت دیکھا تھا۔ میں انھیں یہ بتاؤں گا کہ قوموں کی عزت اور آزادی کے لیے اندرونی غدّار کس قدر خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ اسلام کی ناموس کے رکھوالو تم سرنگاپٹم کے واقعات سے سبق سیکھو۔ اگر تمھاری صفوں میں کوئی میر صادق ہے تو وقت آنے سے پہلے اس سے نجات حاصل کر لو۔ اگر تم بیرونی خطرات سے آنکھیں بند کر کے آپس میں اُلجھ گئے تو تمھارا انجام ہم سے مختلف نہیں ہوگا۔"

مراد علی جوش کی حالت میں بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بلقیس اضطراب کی حالت میں اُٹھ کر آگے بڑھی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہُوئے بولی: "بیٹا تم کو بخار ہے۔ لیٹ جاؤ۔ جب تم تندرست ہو جاؤ گے تو میں تمھارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔"

وہ لیٹ گیا۔ بلقیس نے ثمینہ کی طرف دیکھا اور کہا: "آؤ بیٹی انھیں آرام کرنے دو۔"

چار دن بعد ادھونی کا طبیب بلقیس کے گھر پہنچ گیا اور اس نے مُراد علی کے ساتھ رسمی علیک سلیک کے بعد اپنی جیب سے ایک خط نکال کر اسے پیش کر دیا۔

مراد علی نے خط کھول کر پڑھا۔ ہاشم بیگ نے لکھا تھا:۔

عزیز بھائی: خدا کا شکر ہے کہ آپ خالہ جان کے پاس پہنچ گئے۔ میں ادھونی کے قابل ترین طبیب حکیم مصطفےٰ خاں کو آپ کے علاج کے لیے بھیج رہا ہوں۔ میں

خود حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن مجھے شاید ایک ہفتہ تک چھٹی نہ مل سکے۔ تنویر اور
امی جان میرے ساتھ ہیں اور وہ بھی آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ ہم انشاء اللہ
زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ دن تک آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔

تمہارا بھائی ہاشم

حکیم مصطفٰے خاں کا علاج شروع کرنے سے پانچ دن بعد مراد علی کا بخار اُتر چکا تھا اور
اس کا زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہا تھا۔ آٹھ دن کے بعد اس نے پہلی بار گھر سے نکل کر گاؤں کی
مسجد میں نماز ادا کی اور اس سے اگلے روز حکیم مصطفٰے خاں واپس چلا گیا۔

○

مراد علی کی علالت کے ایام میں ثمینہ بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کرتی تھی کہ زمانے
کے انقلاب نے ان کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار کھڑی کر دی ہے۔ وہ اس کی آمد سے قبل
وہ ان جنگلوں اور پہاڑوں کا تصور کیا کرتی تھی جہاں ملک جہان خاں کے ساتھی مصروفِ پیکار تھے
ان سرپھروں کی رفاقت میں مراد علی کی زندگی کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آ
جاتیں۔ کبھی وہ دیکھتی کہ وہ جنگ کے میدان میں شمشیر بکف کھڑا ہے اور اسے بندوقوں کے
دھماکے، تلواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی چیخیں سنائی دینے لگتیں۔ کبھی وہ دیکھتی کہ وہ بھوکا
پیاسا زخموں کے ساتھ کسی تاریک غار میں پڑا ہوا ہے اور دشمن کی افواج جنگل اور
پہاڑوں میں اسے تلاش کر رہی ہیں ـــــ رات کو سوتے وقت یہ اضطراب انگیز
خیالات بھیانک سپنوں میں تبدیل ہو جاتے۔

باغیوں کی شکست اور ملک جہان خاں کی موت کی خبر سننے کے بعد اس کا اضطراب
جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ تاہم اس کی یہ اُمید آخری وقت تک قائم رہی کہ اگر مُراد علی
زندہ ہے تو وہ ضرور آئے گا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ میری زندگی کا ہر

لمحہ اس کی یاد سے لبریز ہے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کی واپسی کا تصور کیا کرتی۔
پھر بار گاہِ ایزدی میں اس کی دعائیں مستجاب ہوئیں اور مُراد علی اس کے گھر پہنچ گیا۔ لیکن یہ
وہ نوجوان نہ تھا جو چند برس قبل اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہُوا تھا ـــــ
جس کے تصورات سے اس کی امیدوں اور سپنوں کی دنیا آباد تھی ـــــ مراد علی بدل چکا
تھا۔ اب اس کی اُجڑی ہوئی دنیا میں ثمینہ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ افغانستان جانے کا ارادہ
ظاہر کرنے کے بعد اس نے مستقبل کے متعلق ثمینہ کی آرزوؤں اور اُمیدوں کے ٹمٹماتے چراغ
بجھا دیے تھے۔ اسے یہ شکایت نہ تھی کہ وہ افغانستان کیوں جا رہا ہے۔ ثمینہ کو صرف یہ
گلہ تھا کہ مراد نے اپنے زخموں کا مداوا سوچتے وقت اسے قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ کاش وہ
صرف ایک بار یہ کہہ سکتا کہ ہمیں مستقبل کی تاریکیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دُوسرے کے سہارے
کی ضرورت ہے۔ اگر تم چاہو تو میں دریائے کابل کے کنارے تمہارے لیے ایک جھونپڑی
تعمیر کر سکتا ہوں۔

وہ بار بار یہ سوچتی "کیا یہ ہو سکتا ہے کہ مُراد علی میرے احساسات سے بالکل غافل ہو۔
کیا میرے تمام سپنوں کی تعبیر یہی تھی کہ وہ یہاں چند دن کے لیے آئے اور پھر ہمیشہ کے لیے
کہیں چلا جائے ـــــ" وہ اپنے دل میں شکایات کا ایک طوفان لیے اس کے کمرے میں
داخل ہوتی لیکن مراد علی کا نحیف اور لاغر چہرہ اور اس کی کھوئی کھوئی نگاہیں اس کے ہونٹوں پر
مُہر لگا دیتیں۔ وہ ایک ثانیہ کے لیے ثمینہ کی طرف دیکھتا اور اس کے بعد کمرے کی چھت یا کسی
دیوار کی طرف نگاہیں گاڑ دیتا اور وہ انتہائی کوشش کے باوجود اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتی۔
"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

ادھونی کے طبیب کی واپسی کے دو دن بعد ایک دوپہر مراد علی نیم خوابی کی حالت میں
بستر پر پڑا ہوا تھا۔ ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ مُراد علی نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور وہ اُٹھ کر
بیٹھ گیا۔ وہ بولی: "ہاشم بھائی جان اور تنویر آپا کا پیغام آیا ہے۔ وہ ادھونی سے روانہ ہو چکے ہیں

میں ہاشم بیگ سے ملتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا؟

"مجھے آپ کی مجبوریوں کا علم ہے اور میں آپ کا راستہ نہیں روک سکتی لیکن آپ یہاں سے تنہا نہیں جائیں گے۔" ثمینہ یہ کہہ کر اٹھی اور دروازے کی طرف چل پڑی۔

"ثمینہ ثمینہ!" مراد علی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور وہ دروازے کے قریب رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

مراد علی نے کرب انگیز لہجے میں کہا: "تم ایک ایسے انسان کی رفاقت قبول کرو گی جس کے راستے میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں؟"

ثمینہ جواب دینے کی بجائے مسکرائی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو امڈ پڑے۔

"ثمینہ میری بات کا جواب دو۔ میں شہباز کی بہن اور سردار اکبر خاں کی بیٹی سے پوچھتا ہوں کیا وہ ایک معمولی چرواہے یا کسان کے ساتھ ایک تنگ جھونپڑے میں زندگی بسر کر سکے گی؟"

اس نے جواب دیا: "آپ کی تنگ جھونپڑی مجھے نظام کے محلات سے زیادہ کشادہ نظر آئے گی۔"

بلقیس کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا: "بیٹا ہاشم بیگ کا پیغام آیا ہے؟"

"ہاں چچی جان مجھے ثمینہ نے بتایا ہے۔"

بلقیس ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ثمینہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

مراد علی نے کہا "چچی جان اگر آپ کی اجازت ہو تو میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

بلقیس نے شفقت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی "کہو بیٹا!"

مراد علی کچھ دیر مذبذب سا ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا "چچی جان لوگ کہتے ہیں کہ رات کی تاریکی میں انسان کا سایہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے لیکن آپ کے پاس آکر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میں اس دنیا میں تنہا نہیں ہوں —— میں آپ سے یہ کہنا

اور کل یا پرسوں تک پہنچ جائیں گے۔ منور کہتا تھا کہ آج صبح آپ سیر کے لیے گئے تھے حکیم صاحب نے تاکید کی تھی کہ آپ کو چند دن چلنے پھرنے سے پرہیز کرنا چاہیے؟"

"میں زیادہ دور نہیں گیا تھا۔"

ثمینہ چند ثانیے تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

"ثمینہ!" مراد علی نے کہا۔

وہ رک گئی اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ ثمینہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

ثمینہ نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں اور وہ آگے بڑھ کر اس کے دائیں ہاتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ثمینہ!" مراد علی نے قدرے توقف کے بعد کہا "تم مجھ سے خفا ہو؟"

"وہ کس بات پر؟" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم اس بات پر خفا ہو کہ میں افغانستان جا رہا ہوں۔"

ثمینہ نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"میرے خفا ہونے سے کیا ہوتا ہے۔"

"ثمینہ میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب میں آخری بار تم سے رخصت ہوا تھا تو میرے افق پر ایک تاریک آندھی کے آثار دیکھنے کے باوجود میری دنیا زندگی کے ولولوں سے لبریز تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں کسی دن واپس آکر روئے زمین کی تمام خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر سکوں گا۔ میں تمہیں اس وطن اور اس گھر کی زینت بناؤں گا جو تمہارے وطن اور تمہارے گھر سے بہتر ہے۔ لیکن اب میری دنیا بدل چکی ہے۔ میرا کوئی وطن نہیں میرا کوئی گھر نہیں۔ میں وہ تہی دست مسافر ہوں جس کا قافلہ لٹ چکا ہے۔ اب میں تمہیں اپنے آلام و مصائب میں حصہ دار نہیں بنا سکتا

تھا کہ ـــــ"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو بیٹا خاموش کیوں ہو گئے؟"

"چچی جان! اس نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: آج ثمینہ کے ساتھ گفتگو کے بعد میں اپنے دل میں زندگی کے دامن کی طرف ہاتھ بڑھانے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میرا حال آپ سے پوشیدہ نہیں اور اپنے مستقبل کے متعلق بھی میں کوئی حوصلہ افزا بات نہیں کہہ سکتا۔ میری تمام پونجی صرف ماضی کی یادوں تک محدود ہے۔ لیکن اپنی کم مائیگی، بے بسی اور بے چارگی کے باوجود میں ثمینہ کو اپنے مستقبل کی تاریکی میں حصہ دار بنانا چاہتا ہوں۔"

بلقیس نے پیار سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیے اور کہا: "میرے بیٹے تمہیں یہ بات کہنے کے لیے اتنی لمبی تمہید کی ضرورت نہ تھی۔ میں ثمینہ کی ماں ہوں اور جانتی ہوں کہ وہ تمھارے راستے کے کانٹوں کو پھولوں سے زیادہ دلفریب سمجھتی ہے۔ میں اپنے دل میں ثمینہ کے مستقبل کے متعلق اُس دن فیصلہ کر چکی تھی۔ جب تم پچھلی مرتبہ یہاں آئے تھے۔"

مراد علی نے تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا: "چچی جان وہ زمانہ اور تھا۔ اُس وقت میں فخر اور غرور کے ساتھ سر اونچا کر کے آپ سے کوئی بات کر سکتا تھا لیکن اب وہ غرور سرنگا پٹم کی خاک میں دفن ہو چکا ہے۔"

بلقیس نے کہا: "میرے لیے صرف یہ جاننا کافی ہے کہ تم معظم علی کے بیٹے ہو۔"

ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے آگے بڑھ کر مراد علی کی طرف مخمل کی ایک چھوٹی سی تھیلی بڑھاتے ہوئے کہا: "لیجیے یہ آپ کی امانت ہے میں بھول گئی تھی۔"

آن کی آن میں مراد علی کے خیالات کہیں سے کہیں پہنچ چکے تھے۔ اس نے تھیلی کو ہاتھ لگائے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "ثمینہ! اسے اپنے پاس رہنے دو۔"

ثمینہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر تھیلی سنبھالے کمرے سے باہر نکل گئی۔

بلقیس نے کہا: "بیٹا ہاشم بیگ کہتا تھا کہ وہ جواہرات بہت قیمتی ہیں۔ لیکن فرض کرو اگر تم دنیا کے غریب ترین انسان ہوتے تو بھی میں ثمینہ کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں دیتے ہوئے فخر محسوس کرتی۔"

○

اگلے روز مراد علی گاؤں کی مسجد میں عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد واپس آیا تو اسے پتہ چلا کہ ہاشم بیگ پہنچ چکا ہے۔ وہ اپنے کمرے کے قریب پہنچا تو خادم نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا: "جناب! آپ کو بیگم صاحبہ بلاتی ہیں۔"

وہ اس کے ساتھ چل دیا۔ دو منٹ بعد وہ رہائشی مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں ہاشم بیگ، تنویر اور بلقیس آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مراد علی نے السلام علیکم کہا اور ہاشم بیگ نے جلدی سے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا اور پھر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا: "ہم ابھی ابھی آپ کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ میں ثمینہ اور خالہ جان کو مبارک باد دے چکا ہوں اور مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ اب کسی تاخیر کے بغیر آپ کی شادی کر دی جائے۔

موجودہ حالات میں آپ زیادہ عرصہ یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ جنوبی ہندوستان کے کونے کونے میں جہان خاں کے ساتھیوں کی تلاش جاری ہے۔ جس دن مجھے آپ کے یہاں پہنچنے کی اطلاع ملی تھی اس سے دو دن بعد دکن کی حکومت نے ادھونی کے قریب ایک جنگل سے دس آدمیوں کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے انھیں بچانے کی کوشش کی تھی لیکن وہاں میرا بس نہیں چلا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض مرہٹہ سرداروں نے بھی آپ کے کئی ساتھیوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا ہے۔ ابھی تک انگریزوں کو آپ کے متعلق شاید علم نہیں لیکن آپ زیادہ عرصہ یہاں چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ میرے لیے یہ کہنا بہت تکلیف دہ ہے کہ آپ کے لیے یہ علاقہ محفوظ نہیں لیکن آپ کی سلامتی ہمارا پہلا فرض ہے۔"

مُراد علی نے جواب دیا: "میں صرف آپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔"

ہاشم بیگ نے کہا: "خالہ جان نے مجھے بتایا ہے کہ آپ افغانستان جانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں!"

ہاشم بیگ بلقیس کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "خالہ جان اگر آپ میری رائے سے اتفاق کریں تو کل یا پرسوں ان کی شادی کا انتظام کر دیا جائے۔ ہمیں کسی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت نہیں۔ صرف خاندان کے چند معززین کو بُلا لینا کافی ہوگا۔ انھیں رخصت کرنے کے بعد ہم آپ کو اپنے ساتھ ادہونی لے جائیں گے۔"

ایک کمسن لڑکا دوسرے کمرے سے نکلا اور سیدھا مراد علی کے قریب آ کر بولا: "آپ کا نام مُراد علی ہے؟"

"ہاں میرا نام مُراد علی ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

ہاشم بیگ نے کہا: "یہ آپ کا بھتیجا ہے۔"

کمسن لڑکے نے کہا: "بھتیجا نہیں بھانجا ہوں۔ کیوں جی آپ میرے ماموں ہیں نا؟"

"ہاں لیکن تمھیں کس نے بتایا؟"

"مجھے خالہ ثمینہ نے بتایا ہے۔"

تنویر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بُلاتے ہوئے کہا: "یہ تمھارے خالو ہیں بیٹا!"

لڑکا مراد کو ایک ثانیہ بغور دیکھنے کے بعد بھاگ کر دُوسرے کمرے میں ثمینہ کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں بولا: "خالہ جان! امی کہتی ہیں وہ میرے ماموں نہیں خالو ہیں ———!" اور ثمینہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے مُنھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تین دن بعد مُراد علی اور ثمینہ کی شادی ہو چکی تھی ٭

○

چار ماہ بعد مراد اور ثمینہ پہاڑی کے دامن میں بل کھاتی ہوئی ایک سڑک پر گھوڑے روک کر نیچے وادی میں بہتے ہُوئے دریا کا دلکش منظر دیکھ رہے تھے۔ منوّر خاں کے علاوہ پانچ اور نوکران سے چند قدم آگے سڑک کے ایک موڑ پر سامان سے لدے ہُوئے چار اُونٹوں کے پاس کھڑے تھے۔ کابل کا رُخ کرنے والے تاجروں کا ایک قافلہ جس کے ساتھ انھوں نے پشاور سے آگے چند منازل طے کی تھیں کوئی دو میل پیچھے ایک گھاٹی سے گزر رہا تھا۔

مُراد علی نے دریا کے کنارے ایک بستی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: "ثمینہ وہ سردار کرم خاں کی بستی ہے اور وہ ہماری آخری منزل ہے اور دریا کے دُوسرے کنارے ان سنگلاخ چٹانوں کے پیچھے تمھارے قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ ہم کسی دن ان کے پاس جائیں گے۔ یہ وہ زمین ہے جس نے محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کا جاہ و جلال دیکھا ہے۔ یہ وہ مقدّس خاک ہے جس کے ذرّے ذرّے پر مسلمانوں کی عظمت کی داستانیں لکھی ہُوئی ہیں۔ ہندوستان میں ہماری آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں اور تلوار ٹوٹ چکی ہے جو برسوں سے جنوب میں انگریزوں کی جارحیت کا سیلاب روکے ہوئے تھی۔ ہمارے تمام حوصلے اور ولولے سلطان شہید کے ساتھ سرنگاپٹم کی خاک میں دفن ہو چکے ہیں۔ اب ہندوستان کا کوئی قلعہ، کوئی دریا یا پہاڑ فرنگی جارحیت کے سیلاب کو نہیں روک سکے گا۔ افغانستان کے موجودہ حالات بھی کافی حوصلہ شکن ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ سنگلاخ چٹانیں اس سیلاب کے سامنے آخری دیوار ثابت ہوں گی۔ میں یہاں کے امراء کی خانہ جنگیوں سے بددل نہیں ہوں۔ مجھے ان کسانوں اور چرواہوں کی جرأت و ہمت پر بھروسہ ہے جو خطرے کے وقت اپنے جھونپڑوں کو اسلام کے ناقابلِ تسخیر قلعوں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ میں اس ملک میں یہ اُمید لے کر آیا ہوں کہ کسی دن ہندوستان میں میرے مظلوم بھائیوں اور بہنوں کی فریاد ان لوگوں کو بے چین کر دے گی۔ ان پہاڑوں سے کوئی محمود نمودار ہوگا اور سُلطان

شہید کی روح دریائے کاویری کے کنارے اس کا استقبال کرے گی۔ اس خاک سے کوئی احمد شاہ ابدالی اٹھے گا اور ہندوستان کے مسلمان اپنے ظلمت کدوں میں ایک نئی صبح کے آفتاب کی روشنی دیکھیں گے۔ پھر اگر ہم نہ ہوں گے تو ہماری آئندہ نسلیں یہاں سے جنوب اور مشرق کا رخ کرنے والے مجاہدین کے ہمرکاب ہوں گی۔

ثمینہ اس ملک کے غیور اور بہادر انسانوں کے دلوں میں ہمیں اسلام کی وہ تڑپ اور ولولہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو محمود غزنوی کو سومنات اور احمد شاہ ابدالی کو پانی پت کے میدان میں لے گیا تھا۔ کرم خان سے ملاقات کے بعد میں یہ احساس لے کر واپس گیا تھا کہ اگر افغانستان میں کوئی خدا کا بندہ اسلام کی صحیح رُوح بیدار کر سکا تو یہ سرزمین عالم اسلام کا ایک ناقابل تسخیر قلعہ ثابت ہو گی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں اپنے مستقبل کے متعلق میں نے جو خواب دیکھے ہیں، وہ کس حد تک پورے ہوں گے لیکن میں تم سے ایک وعدہ کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ اب ہمارے مقدر میں انگریزوں کی غلامی نہیں ہو گی۔"

چند منٹ اپنے حال اور مستقبل کے متعلق باتیں کرنے کے بعد وہ آگے بڑھے اور ان کے تھکے ہوئے گھوڑے آہستہ آہستہ وادی کی طرف اترنے لگے۔ اگلے موڑ پر منوّر اور دوسرے آدمی ان کے ساتھ آ ملے۔ عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ تھوڑی بعد وہ دریائے کابل کے کنارے پہنچ گئے۔ مراد علی گھوڑے سے اُترا اور وضو کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے دریائے کاویری کے دلکش مناظر آ گئے۔ وہ تصور کے عالم میں سرنگاپٹم کے قلعے کی فصیلیں اور بُرج دیکھ رہا تھا۔ وہ شہر کی پُررونق گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ اپنے بچپن اور جوانی کے ساتھیوں کے ہمراہ سرنگاپٹم کے خوبصورت باغات کی سیر کر رہا تھا۔ وہ ان دلکش مساجد کا طواف کر رہا تھا جہاں کبھی ہر نماز کے ساتھ سلطان ٹیپو کی فتح کی دُعائیں مانگی جاتی تھیں ـــــــ پھر یکے بعد دیگرے اس کے سامنے اپنے گھر کی مختلف تصویریں آنے لگیں۔ زندگی کی کتنی مسرّتیں تھیں جو وہاں دفن ہو چکی تھیں۔ کتنے قہقہے تھے جو خاموش ہو گئے تھے۔

"بہت دیر ہو گئی آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" ثمینہ نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

مُراد نے مڑ کر دیکھا اور اس کی چھلکتی ہوئی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

"کیا ہوا؟" ثمینہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "آپ رو رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں ثمینہ۔ یہ آنسو دریائے کاویری سے دریائے کابل تک پہنچنے والے مسافر کی زندگی کی آخری متاع ہیں" ⁂